

علم الإنسان الموعود



کتابیات

جامعہ ملیہ اسلامیہ

دہلی

۰۵۱

شعبہ

۷۵۲

شمارہ

۱۷۶۹

عدد خانہ

کتاب خانہ اسلامیہ دہلی

زندگی آمیز و زندگی آموز ادب کا نمونہ

نقوشِ لاهور

دس سالہ نمبر

۶۸۶۷۷
جول ۱۹۵۸ء

محب طغیلا

ادارہ فروغِ اردو، لاہور

ترتیب

رد پور تناژ	صفحہ
۱۔ ستمبر کا چاند	۱
۲۔ کلمہ کی ماں	۲
۳۔ پری تو	۳
۴۔ انشائیہ	۴
۵۔ قہر	۵
۶۔ دھند	۶
۷۔ رات، چور اور چپانہ	۷
۸۔ دل کی پیاس	۸
۹۔ تاریک قلب اور زرد چاند	۹
۱۰۔ جو بیکس	۱۰
۱۱۔ رات کی آنکھیں	۱۱
۱۲۔ ایمان کی سلامتی	۱۲
۱۳۔ انسان اور صلیب	۱۳
۲۹۔ قرۃ العین جبر، ۲۳۔	
۵۔ عصمت چغتائی، ۱۱۔	
۱۹۔ احمد ندیم خاں، ۲۳۔	
۱۲۲۔ ممتاز مفتی، ۱۳۸۔	
۱۶۹۔ خدیجہ مستور، ۱۶۸۔	
۱۹۲۔ مندر ناتھ، ۲۰۰۔	
۲۰۵۔ جلالی بانو، ۲۱۳۔	
محمد طفیل، ۲۹۔	

- ۱۲ - جو ہر روز روپے کا چیک
۱۵ - انسان، اس کا گھوڑا اور خدا
۱۶ - بچتے چراغ
۱۷ - ایک رات

- دیو در اختر ، ۲۲۲
احمد سعید ، ۲۲۶
رام نعل ، ۲۲۷
ڈاکٹر شفیق ، ۲۵۵

درائے

- ۱۸ - کھلی کھریاں
۱۹ - قوشب آفریدی چراغ آفریدم

- ہاجرہ مسرور ، ۲۶۱
سلام علی شہری ، ۲۹۳

مترن و متران

- ۱ - ...
۲ - برائے وزن بیت

- کنیت لال پور ، ۲۸۲
امجد حسین ، ۲۸۷

نظمیں ، غزلیں

- ۱ - خاکِ متوج
۲ - محبت زندگی ہی زندگی ہے
۳ - مشرق و مغرب
۴ - فقط یہی نہیں حال بلا کشاں نہ کہو
۵ - ایک مفلوج دوست سے
۶ - خود ہے مجبور عقل حیراں پہ کہیں ہوش کا نہیں ہے
۷ - ہر داغ دل کس طرح جلدن لئے
۸ - قطعات
۹ - جس سمت بھی چن میں وہ خیمہ ہی گیا
۱۰ - دور
۱۱ - دہم شہستان طرب
۱۲ - ہم ان کے مفاصل کو ادا جان رہے ہیں
۱۳ - وہ جو دھڑکی کریں ، وہ جو پردا کریں
۱۴ - جار و بکش
۱۵ - ساتی کے حضور
۱۶ - آنکھ تم سو تو کس ہانے سے
۱۷ - اک حادثہ مشرق کہ داں بھول چلا تھا
۱۸ - درائے قیاس و گمان جاری ہے
۱۹ - شراب
۲۰ - ایک ملاقات
۲۱ - محبت مجھ کیسے آئی کہاں تک
۲۲ - روئے جمن پہ نکھار آج نہیں کل سی
۲۳ - ماضی ، حال ، مستقبل
۲۴ - آنچل کی چھاؤں میں
۲۵ - کون ترے مذاق خوشی کے لئے
۲۶ - مریم نقیہ
۲۷ - فریاد بھی ہے سوء ادب اپنے شہریں

- جوش ملیح آبادی ، ۳۱۰
جاوید آبادی ، ۳۱۱
احمد ندیم قاسمی ، ۳۱۲
اثر کھنوی ، ۳۱۵
تلوک چند محروم ، ۳۱۶
افقر مولانی ، ۳۱۷
جذبی ، ۳۱۸
اختر انصاری ، ۳۱۹
ہدم ، ۳۲۰
اختر الامان ، ۳۲۱
تقیل شغائی ، ۳۲۲
تقیل شغائی ، ۳۲۳
شاو عارفی ، ۳۲۴
مجید امجد ، ۳۲۵
پروفیسر سٹور ، ۳۲۶
پروفیسر سٹور ، ۳۲۷
غلام ربانی تاباں ، ۳۲۸
جد امجد حیرت ، ۳۲۹
منیر نیازی ، ۳۳۰
ظہور نظر ، ۳۳۱
اقبال صفی پوری ، ۳۳۲
آغا صادق ، ۳۳۳
فارغ بخاری ، ۳۳۴
خلیل الرحمن جلی ، ۳۳۵
فضا ابن فیضی ، ۳۳۶
شاد نکست ، ۳۳۷
حافظ غزنوی ، ۳۳۹

- ۲۸ - ذکر ستم سے کیا ہو گا ؟
 ۲۹ - شعاع فردا کے راز دافو !
 ۳۰ - کب زلف نے کی دواؤں کا گلہ کرتے ہیں
 ۳۱ - فطرت کا وہ پیلان وفا یاد نہیں ہے
 ۳۲ - اقصاء میں خون وک سے چکنے کا کلم
 ۳۳ - ہم تو مرتے رہے بقا کے لئے
 ۳۴ - رات کے مینے میں یہ چاند کا جادو کیلئے
 ۳۵ - دل میں جذبہ رخصا آنکھوں سے ہویدانہ ہوا
 ۳۶ - آرزو کا صلہ ہے کیا کیا کچھ
 ۳۷ - پانچ چینی نظیں
 ۳۸ - ۱۔ کسے کیسے لوگ
 ۳۹ - ۲۔ جتنو سے !
 ۴۰ - ۳۔ کوہ
 ۴۱ - ۴۔ سرخ رنگ دھو نہیں
 ۴۲ - ۵۔ برت کا کھالا

مقالے

- ۱ - تنقید شعر اور عالی
 ۲ - دارا شکوہ کا دیوان
 ۳ - گل بجاؤ لی
 ۴ - حضرت سید احمد بریلوی کی داستان جہاد
 ۵ - آگرہ کی ادبی شخصیتیں
 ۶ - غالب کی شاعری
 ۷ - واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط
 ۸ - قطب شاہی دور میں اردو ادب کی رفتار
 ۹ - شیبہ جو فردی کا آغاز
 ۱۰ - قرۃ العین طاہرہ
 ۳۵۳ - عبد القادر سروری
 ۳۶۲ - پروفیسر عظیم الدین سائیک
 ۳۷۰ - محمد عبداللہ قریشی
 ۳۸۲ - ڈاکٹر غلام جیلانی برق
 ۳۸۷ - میکش اکبر آبادی
 ۳۹۵ - عطا محمد شحہ
 ۴۱۱ - تمکین کاظمی
 ۴۲۸ - نصیر الدین عاشقی
 ۴۳۳ - سید علی عباس جلال پوری
 ۴۴۶ - منظور الہی

تبصرے

- ۱۔ غریب بگر ہونے تک
 ۲۔ داغ داغ اجالا
 م۔ ط
 ج۔ ق

طلوع

یوں تو بات گل کی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نقوش کی اشاعت کو دس برس ہوئے کو اسے ہی بلکہ اب قسم گیا رھویں میں ہے۔ ان دس برسوں میں ہم نے جو کچھ پیش کیا وہ سب آپ کے سامنے ہے۔ اس کا معیار بھی اس کی اہمیت بھی۔ نقوش کا پہلا شمارہ ۱۹۴۴ء میں نکلا تھا۔ اس وقت اس کے لائق مدیر واجد مسعود اور احمد ندیم قاسمی تھے۔ کئی ہفتی بات کو پھر دہرانا ہمیں کہ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے نقوش کو صفتِ اول کا جبریدہ بنایا ہی نہیں بلکہ نیا ہی۔ ۱۹۵۰ء میں سید وقار غنیہ نے اس کی ادارت کے فرائض نبھائے جس عرصے کے ساتھ انھوں نے نقوش کو دو تانتا اور میانہ روی کا انداز سکھایا، وہی انداز اب اس کی روایت ہے، اس کی جان ہے۔

اس کے بعد نقوش کی ادارت میرے حصہ میں آئی۔ یقین کیجئے میں اس کا خواہاں نہ تھا بلکہ نقوش ہی نے مجھے اپنے لیے مقرب کر لیا تھا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا وہ بھی آپ سے ڈھکا چھپا نہیں، عیاں ہے۔

ادبی رسالہ چھاپنا نہ پہلے خال جی کا گھر تھا نہ اب ہے۔ ایک امتحان پہلے ہی تھا ایک امتحان اب بھی ہے مگر اب دن بہ دن مشکل بڑھ رہی ہیں۔ نہ لکھنے والوں میں وہ پہلا ساذوق و مشوق ہے نہ پڑھنے والوں میں یہی وجہ ہے کہ میں ادب کی موجودہ رفتار سے بڑی حد تک دل برداشتہ ہوں۔ کچھ دنوں میں نے تمام ادیبوں کو اس مضمون کا خط لکھا تھا۔

”اچھی تخلیقات کے حصول میں جتنی مشکلیں آج ہیں پہلے نہ تھیں۔ اہل قلم میں بھی وہ پہلی سی تخلیقی لگن نہیں رہی۔ قاری تازہ واردانی ادب کے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی رسالے دم توڑ رہے ہیں۔

جو خال خال رہ گئے ہیں ان میں انھیں تو کسی طرح زندہ رکھنا چاہیے۔ کیا ہم سب مل کر لمبی چنڈا اچھے پچوں کو زندہ نہیں رکھ سکتے؟ میری بے انتہا خواہش رہی ہے کہ برابر باری اور نئی تخلیقات ہی کو پیش کرنا رہوں۔ مگر تازہ تخلیقات کو لاؤں کہاں سے؟ یونہی سا پچہ چھاپنا مجھے پسند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں مجبوراً مستقل موضوعات پر کام کر کے نقوش کی زندگی کو کھینچ رہا ہوں۔ اگر اہل قلم کی بے فوجی کا یہی عالم، لاؤ مجبوراً چند اہم موضوعات پر کام کر کے نقوش کو زندہ کرنا پڑے گا۔ بجائے اس کے کہ نقوش میں روکنے سے روکیں اور اپنی کی طرح اڑیاں اڑا کر گرے گئے ہیں اسے پسند کروں گا کہ یہ اپنے عہدِ شباب ہی میں سب سے برا ادب نصبت ہو جائے۔“

ایسے حالات میں بھی ہم نے اردو ادب کو کچھ نہ بچھڑا ضرور ہے۔ ان دس برسوں میں ہم نے ۱۵۵ مقالے، ۱۰۰ افسانے، ۲۱ ڈرامے، ۶ ناول، ۴۴ نظمیں اور ۱۳۴۴ غزلیں دی ہیں۔ پریشیر ایسے ادیبوں کی تخلیقات ہیں جو اپنے دور کے فائدہ اور ادیب ہیں، جن کا نام مٹے گا نہ کام۔

محمد طفیل

۱۔ حالات جیسے ہیں ان میں بھی یہ جھڑکتا رہا کہ میں اپنی طرف سے کوشش کروں گا کہ آئندہ ہر سچے گوہر دوسرے مینے پوری باتانہی کے ساتھ پیش کرنا نہ چاہوں۔ ۲۔ مجرعی طور پر ہم نے اب تک ۱۲۴۶ صفحات پیش کئے ہیں۔

نتوش میں شائع ہونے والی تخلیقات کا خاکہ

(۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۸ء تک)

زمانہ ادارت: اصفیہ قاسمی، لاہور، مسرور

نمبر شمارہ	شمارہ نمبر	صفحات	اٹلے	ڈرامے	نادرث	نظریں	غزلیں	مکالمے	مجموعہ شعریہ
۱	۱	۵	۷			۶	۹	۲۷	۸۲
۲	۲	۸	۴			۷	۶	۲۵	۸۰
۳	۳	۱۰	۵	۱		۹	۷	۳۲	۱۰۲
۴	۴ (آئندہ نمبر)	۱۱	۷	۱		۱۲	۱۳	۳۵	۲۶۲
۵	۵	۱۷	۸	۱		۱۲	۹	۲۹	۱۹۸
۶	۶	۷	۵			۱۲	۸	۳۲	۱۲۰
۷	۷ (آئندہ نمبر)	۱۲	۷			۱۲	۹	۳۲	۱۵۲
۸	۸ (آئندہ نمبر)	۱۰	۱۰			۲۲	۲۰	۶۲	۲۳۰
۹	۹	۳	۵			۸	۷	۲۲	۸۰
۱۰	۱۰	۴	۴			۹	۶	۲۳	۷۳
	مجموعہ	۹۰	۶۰	۳		۱۱۲	۹۳	۳۶۱	۱۳۹۲

زمانہ ادارت: سید رفیع عظیم

۱۱	۱۱ (خاص نمبر)	۱۱	۱۲			۱۰	۱۷	۵۰	۲۰۰
۱۲	۱۳	۲	۴			۵	۱۲	۲۷	۷۲
۱۳	۱۴	۶	۵			۴	۱۲	۲۷	۷۲
۱۴	۱۵ (خاص نمبر)	۱۸	۱۲			۱۰	۳۳	۷۲	۲۳۲
۱۵	۱۶ (خاص نمبر)	۳	۴	۱	۴			۱۰	۲۸۸
	مجموعہ	۲۲	۳۵	۱	۴	۲۹	۷۷	۱۸۸	۸۷۶

زمانہ ادارت: محمد طفیل

۱۶	۲۰۱۹	۱۳	۹	۱		۱۵	۲۲	۶۱	۲۳۲
۱۷	۲۲۲۱	۱۵	۱۲			۱۶	۳۸	۸۱	۲۶۲

نمبر شمار	شماره نمبر	مضامین	افسانے	ڈرامے	ناولٹ	تفہیم	غزلیں	نظم و شعر	تقدیر و حقائق طب شدہ
۱۸	۲۳، ۲۴	۹	۹		۱	۱۲	۲۶	۵۷	۲۴۰
۱۹	۲۵، ۲۶ (افسانہ نمبر)	۲	۳۸					۲۰	۴۰۰
۲۰	۲۸، ۲۷	۱۱	۹			۱۹	۲۰	۵۹	۲۴۰
۲۱	۲۹، ۳۰ (بچ سال نمبر)	۱۶	۱۵	۱		۲۰	۲۵	۷۷	۴۰۸
۲۲	۳۱، ۳۲	۱۰	۱۰	۱		۶	۲۰	۴۷	۴۰۸
۲۳	۳۳، ۳۴	۱۱	۷	۱		۵	۱۴	۳۸	۴۰۸
۲۴	۳۵، ۳۶	۱۳	۱۱			۱۱	۱۷	۵۲	۲۴۸
۲۵	۳۷، ۳۸ (افسانہ نمبر)	۱	۴۰					۴۱	۵۰۶
۲۶	۳۹، ۴۰	۸	۱۰			۱۲	۱۶	۴۶	۲۱۶
۲۷	۴۱، ۴۲ (غزل نمبر)						۸۱۵	۸۱۵	۴۸۰
۲۸	۴۳، ۴۴ (مجید غزل نمبر)	۵	۷	۲				۱۴	۲۵۶
۲۹	۴۵، ۴۶	۷	۸	۴		۸	۱۶	۴۳	۲۶۴
۳۰	۴۷، ۴۸ (تخصیصات نمبر)	۸۶							۷۰۰
۳۱	۴۹، ۵۰ (منظر نمبر)	۱۵	۳۰					۳۵	۳۸۴
۳۲	۵۱، ۵۲	۵	۱۰	۱	۱	۹	۱۶	۴۲	۲۴۸
۳۳	۵۳، ۵۴ (افسانہ نمبر)	۵	۱۱۰					۱۱۵	۱۰۹۰
۳۴	۵۵، ۵۶	۹	۸			۱۱	۱۷	۴۵	۴۰۸
۳۵	۵۷، ۵۸	۱۰	۷	۲		۱۲	۲۱	۵۲	۲۴۴
۳۶	۵۹، ۶۰ (تخصیصات نمبر)	۸۸						۸۸	۸۱۴
۳۷	۶۱، ۶۲ (اسانہ نمبر)	۲۱	۱۶			۱۴	۲۹	۸۰	۳۸۴
۳۸	۶۳، ۶۴	۹	۱۱	۲		۱۴	۳۲	۶۸	۳۱۲
۳۹	۶۵، ۶۶ (کتاب نمبر)	۴	۱۲، ۱۳ خطوط					۱۲۱۷	۱۰۴۸
۴۰	۶۷، ۶۸ (دہ سال نمبر)	۱۶	۱۶ (افسانہ)	۲		۱۹	۲۲	۷۲	۴۵۶
	نیزان	۳۸۵	۱۲۱۳ ۲۹۵ ۱۲۱۳	۱۷	۲	۲۰۳	۱۱۶۶	۲۱۶۸	۱۰۰۰۶

ان تمام چیزوں کا انتخاب ادب علیہ کے نام سے اگلی پیش کیا جائے گا



ہاجرہ مسرور (مدیر نقوش)

زمانہ ادارت: مارچ ۱۹۳۸ سے دسمبر ۱۹۳۹ تک



احمد ندیم قاسمی (مدیر نقوش)

زمانہ ادارت: مارچ ۱۹۳۸ء سے دسمبر ۱۹۳۹ء تک



سید وقار عظیم (مدیر نقوش)

زمانہ ادارت: یکم مئی ۱۹۵۰ سے مارچ ۱۹۵۱ تک



(مدیر نقوش)

زمانه ادارت: اپریل ۱۹۵۱ء تا حال

کلو کی ماں

عصمت پختائی

جوتو باکے چائے کا ہوا دھوم دھماکے سے سل رہا تھا۔ چچی بی اور ماں جی میں دھواں دھار بکھٹ ہو رہی تھی۔ چچی بی مہر
تھیں کہ عیال پرانی کا۔ یہ لگی۔ نئے جشن کی رو سے نبت کے اوپر تھے، منہ بولی بیل اور گنگا جی کو کون خوب کھدے گی۔ ماں جی ہنسی تھیں۔
"کرن مرنی لفظی دو گھڑی میں بٹ کر سٹی ہو جاوے سے چچا برسوں جی رہو سے ہے۔"
"تعا اپنے ہیروز سے دور رہتے تھے ہیروں کے سنگ کوٹ پیس کھیل رہی تھیں، جی ان کا نبت اور گنگا جی لکھا ہوا
تھا۔ وہ ان دیدے کا پانی ڈھلی کنواڑوں میں سے نہ تھیں جو کھدے۔ یوں پیچ کر اپنا بھیڑی رہتی ہیں۔ کبھی ان سے کچھ ٹکرا کر اپنا ہونا تو چچی بی کہتیں
"ججی بیٹے زور میرے کرتے پھل کے پھول ٹانگ دو۔" بچا بچا جانیں مگر پھول ٹانگ دیتیں سب کے سامنے نہیں اٹک
دروالان بچا کر چچی بی نے میسٹی کر پ کے روپہ پڑ چچی کی نبت کے آس پاس اسٹینڈی بیل اور گنگا جی کرن جاکر پوچھا،
"کیوں تو کیا لگتا ہے؟"

بچا شرم سے کنارہ ہو گئیں اور دو کھلا ہٹ میں اپنے اڑی کے آکر پتہ تپ مار دیا۔ ماں جی نے کہا "سے ہے دھن خدا
خیر کرے۔ نہائی نو جانو مت ماری گئی ہے۔ اسے وہ بچاری کیا ہو لے گی۔"
"لو کبھی چچی نہ کا ماننا پڑا چچی بی تھیں بھی تو فیشن ایل۔ پوٹوں کے بال کا فیشن وہ اپنے میکے سے لائیں جو سارے محلے
میں دبا کر تھیں۔ کاشغاری سینہ جھٹک پوتی تھیں۔ سرخ رنگ کا کاغذ جس میں زور بند کر آئے ہمیشہ ان کی پاندائی کی ڈیا میں اٹھا
رہتا۔ سب کی آنکھ کچا کے پان کھاتے وقت ہونٹوں پر کاغذ لٹوک سے تر کر کے گھسٹا مار لیتیں اور ان کے حسابوں پ شک لگ
جاتی۔ کرن کے حق میں فیصلہ ہونے کے بعد جوڑا سے لگا۔ چندھی تپانے ترنگ میں اگر اپنی مرزوقی ٹم مری آواز میں بھرے گانے
شروع کر دے۔ ایک دم جیسے سب کے دلوں میں تھنایاں نہ آتھیں۔ شادیوں کا موسم سا ٹوٹ پڑا، جوڑے پ جوڑے لگے جانے
لگے۔ ریمو تیار کی رضیہ بی سے خدیجہ بی کی پتومیاں سے خدیجہ بی کی صفوری سے ٹور ہادی جانے لگی۔

دنوں کس سے بیاہ کرے گا رے؟ مذاق میں چچی بی نے جوڑے پوچھا۔
"دو برس کے چھپوٹے ماں کی گود میں چل کر فیصلہ کیا اور سب ہنس پڑے۔ بات چلتی ہی گئی یہاں تک کہ نروانی
بچا کے ہاتھ کے یا لڑکی کا بھی جوڑا لگا دیا گیا۔ کلو کی ماں دلیز پڑی تھی، دنیا کی لڑکی کوٹ رہی تھیں ترنگیں آکر بویں۔ اسے رے

کھوے تو کس سے یاد کرے گا؟

”چھابہ بی بی سے۔“ پانچ برس کے کھوے نے کیا گالوں والی نوشتہ بی بی کی طرف پیار سے دیکھ کر کہا اور چھابہ بی بی کھسکا کر ہنس پڑیں۔ سب ہی ہنس پڑے گئے تھے بی بی کا شہابی رنگ تنہا کر قہری ہو گیا۔ اٹھا جاتی تھانہ کھوے کے ناک منہ اور سر پر جڑیں۔ ہنسی میں کھنسی ہو گئی۔ تاش کے پتے پھینک چکا ایک عجب بھار دے ہوئے چھب کو کو بیٹھے پر ٹھک کے چھٹکے لگیں۔ اماں جی نے بسدی ہنسی چھابہ کو گود میں سمیٹ دیا۔ کھوے کی ناک سے جیتے جیتے خون کی ندی بہنے لگی۔ کھوے کی ماں چھاتی پیٹ پیٹ کر دھاڑی۔

”ماں سے میرے پوت کو مار ڈالا۔ ماں سے میرا بچہ باپ کا بچہ۔“
”کھوے کا بچہ خیرات کے کھوے پر چنے والا اور اس کے بیچن۔ موری کا کیتھ اور داغ اسماں پر۔ چچی بی کا پٹھان خون کھول کر لالہ عابن گیا۔“ میرا مزے کو روٹیاں لگی ہیں۔“

”سے ہے وہن سید بچہ ہے۔“ اماں جی نے سر پیٹ دیا۔ ”اس کی بساط ہی کیا تم کا ہے کو اپنی عاقبت سنو اور۔“
”چھ ہے میں چڑے سید بچہ اور بھاڑیں جاتے سیدانی۔ میری بچی کی طرف اٹکھا اٹھا کے دیکھا تو دیدے نکال لوں گی۔“
اماں جی روکتی رہیں پر چچی بی پھر چلی گئیں۔ کھوے کی ماں نے اوپر سے دو دھوکے کھوے کی چٹھ پر اور جھٹے اداس کی سانت سینٹ کو کو سننے لگی۔
”اے بچے دھاتی گھڑی کی آوے۔ باوا کو کھا گیا اب جم حل کے سر چھپنے کی جگہ تھی سو بھی ملتا میٹ کر کے دم لے گا۔“
خدا کی فراد نامہ اور وہ اسے سمیٹتی ہوئی باورچی خانہ میں لے گئیں۔

کھوے کی ماں ویسے ہماری دودھ کی خالہ گئی تھیں۔ چڑھ سوں کو خالہ کہہ دیتے پر انہیں خالہ کہتے عاری آتی۔ امتیازی نزنہ کہتے پر کھوے کی ماں خرد کہتے۔ گرتے گرتے ان کی پوزیشن نوکر میں ہی جی رہی ہو گئی تھی۔ وہ جہاں بھی جانتیں دو چار دن کی جھانداری کے بعد لوگ سنبھال دیتیں۔ بیاں لام پر گئے سو نہ جانے کس کی گولی کھا کر ڈھیر ہو گئے۔ امتیازی خالہ کو کسی لال منہ والے سے پیر بھی نہ تھا، پھر نہ جانے کس اللہ کے بندے نے ان کی ٹانگ اٹھا ڈی۔

”خواد کا کوئی ذکر نہیں بھلا اپنے رشتہ داروں کو تو خواہ دے کر کون ذیل کر سکتا ہے۔ ہاں عید بقرعید پر آپا سلام اور عید بھائی سلام کے صلے میں اٹھنی اماں جی سے اور روپیہ اباجی سے ضرور ملتا تھا اور دوسرے نوکروں کی طرف بیگم صاحبہ نہیں کہنا پڑتا تھا بلکہ ”آپا“ اور ”دہ لہا بھائی“ کہنے کا فخر حاصل تھا۔“

کھوے کی ماں جڑیوں تیرے پیر سے در پہا تھا رگڑتی تھیں اس کی لمبی ایک وجہ تھی وہ چاہتی تھیں ان کا کھو پڑھ کھڑے کسی ذلیل بڑے جاتے اور وہ راج جودہ میاں کے دم سے نہ کر سکیں کھوے کے دم سے نصیب ہو۔ اتنے بچے چرتے ہیں ایک کھوے کی پڑھ جاتے گا مگر کھوے کے سپوہنراؤں ڈیوٹیاں تھیں۔ چچی بی کی کردہانی، دہ پر کو ہر کے، گھوٹے میں رسی جیسا کر کھینچنا، گھبے پانی پلانا، ایک دم سا سے گھر کو ہی پیس لگ جاتی۔ کھوے کو ایک منٹ پانی گھور کھوے کے ڈھونڈنا۔ چھب اور چھاب کے ساتھ کھینچنا، ہزار بار چھبنا، گرتے تو اٹھنا، چھابہ بی کی گڑیا کو ایک منٹ میں چھینیں بار دہ پڑنا، ہنترانی سے پڑے دھوانے کے لئے پانی ڈالنا، اتنا وقت ہی کہاں ملتا تھا تو کھوے کو علم و ادب کی طرف رجوع کرتا۔ ویسے مودی عاصبت منٹ کا تو چڑھانے کے قابل بھی نہ تھے۔ کھوے کے پڑے بھی تو اس قابل

رہتے تھے کہ وہ سب بچوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھ سکے۔

ہمدردی سے ماں باورچی تھا اس نے ماں گہری سے نوکڑی کی ماں کو نجاست ملی پہلی تھی۔ مگر گیہوں پھینکا، دالیں بنینا، مصالحے کوٹنا، بچوں کو نہلانا، دھلانا، جسٹن لگانا، کسی کے بال بچہ ہونو، راتوں کو زچہ کے سرمانے بھاگنا کہ کہیں جی حرا غور مال کی مساند سے گی چلے آئے اور بچہ کر جاکے نہ لکھ دے۔

کلوینہ جینہ کا گردیں ہوگا کہ مساندوں آگئی۔ نہ میت اٹھی نہ جنازہ آیا نہ زمرت بنی، بس ایک نار نے جوڑیاں اٹھادی کر دیں۔ اٹنی کی جوڑیوں اور دو پیسہ جینہ کے گلابی فیوزی رنگ سے بچھا چھوٹ گیا۔ جہاں بچہ کس کو بھاوے۔ جہاں گئیں نکلا پڑا۔ لڑکھئی چاکلی ہمارے ہاں آکر دو یا تھو نوکڑی مساند بازی نے ہیرا اکھاڑ دئے۔ دو چار پیغام بھی آئے خود شوقین مزاج چھوٹے چپانے کو صفا کرنے کی کوشش کی مگر نوکڑی ماں نے ٹپٹے پر اٹھنا نہ دھرنے دیا۔

”نہریاں بیراوت جوان ہوگا تو کسی کسی کو عمدہ دکھائے گا دیتا ہے نصم کر لیا۔“ ویسے وہ چپا کی شادیوں کی دست سے بھی وقت نہیں۔ بیٹنیا بیوی بیٹنیا لالہ بھائی تینوں پر باطن، اس پر دھوین میراٹن اور بھنگن کا نزلہ ہوا۔ غرض میاں نے کوئی ”بن“ یا ”تن“ نہ چھوڑی اور جب ان کی بیویوں میں جوتم ہزار بلستی وہ ایک نئی پھوٹتی لاکر چھوڑ دیتے۔ ان کے عقد کے دالان میں بالکل نیا تھا۔ کھلا ہوا تھا۔ نوکڑی ماں میں دم درو دھبی نہیں تھا۔ پچیس برس کی عمر میں کھوٹا بن ہو کر رہ گئی تھیں۔ صورت پر کھیاں بھنگتی تھیں۔ اذلی مذاہر پر سنا تھا۔ آئے دن پونٹے کھیا پر لحاف اوڑھے جوڑی ہمارے کشتی لڑا کرتیں۔ ویسے کوئی کام کی چیز کو کا بے کو بیا ہے۔ غشت کی لوگرائی کسے جڑی گنتی ہے۔

اسی شام انہوں نے بخار میں بیٹے کو کوئندھے سے لگایا اور پڑوس میں نواب مختار کے شاگرد پیشے میں جا پڑیں۔ نواب صاحب کا بھراڑا لگ کر تھا۔ چڑھے لکھے فیشن ڈیل لڑکے، لڑکیاں، ہوتیں، کوٹھی کے شاندار احاطے میں آئے دن نہراٹیاں، ہتیں اور اسی کوٹھی کے ایک گنم سے کہنے میں نواب صاحب پڑے زندگی کی آخری سانسیں گن رہے تھے۔ دو سال سے ان کی اب تب ہوسہ تھی۔ مگر جانا اللہ میاں سے پٹہ کھانے لائے تھے۔ اچھے بھلے جوان لڑکھ جانیں پر بڑھاس سے مس ہو رہے۔ ایک نو دنیا بھری بیماریاں جن میں پرانی پیش اور گھٹیا پیش پیش، اوپر سے بڑھے کا داغ تھا کہ ساقوں آسمان پر منہ پر منہ مٹھا کوئی نوکر آٹھ دن سے زیادہ نہ ٹھہرتا۔ نوکڑی ماں کے بھانوں ان کا نوکر بھاگا ہوا تھا لہذا سات روپیہ مہینہ بھانا اور سال میں دو جوڑے سوسے کے پڑوس بردہ نواب صاحب کی زس کے طور پر رکھ لی گئیں۔ ہمارے خاندان کی تواناک کٹ گئی۔ نواب صاحب کے اس پہلے ہی مین دین بن تھا۔ وہ اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتے تھے۔ اب تو اور بھی تن گئی۔

نہ جانے نوکڑی ماں کی بیمار داری نے رنگ دکھایا یا بڑھا خدا باندھ رہا تھا، بجائے سانسوں کی ڈور ٹوٹنے کے اور مضبوط ہو گئی۔ بڑھاپہ مزاج کا تنہیکیدار تھا، نیچا دی سر جھکا کر اس کی گایاں کو سننے سنا کرتیں۔ کوٹھی میں قہقہے کو بجا کرتے اور وہ میٹھی بڑھے لگتے میٹھا کرتیں۔

اور پھر بڑے میاں کی گایوں میں ہی آنے لگی۔ گلاس رکابی مار پھینکنے کی عادت میں بھی کی آگئی کبھی کبھی رنگ میں آکر سرمانے سے اکتی نکال کر نوکڑی بیٹے۔ کیوں بے کبالے گا اکتی کا؟ وہ اس سے مذاق میں پوچھتے۔

”جی روشنائی!“

”روشنائی؟ اے گناہ گار کیا ہے۔ گناہ گار۔ اچھا!“

”جی اچھا!“ کلمہ سہمی آواز میں نکلا۔

ایک دن کلو کی ماں نے مزدور دھلا کو سدا بچی اٹھائی تو بڑے میاں بڑی نرم آواز میں بولے،
”کلو کی ماں تم میری پوتیوں کے برابر ہو پرنا محرم سے یہ گوشت کراتے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں گناہ کر رہا ہوں باب
بڑھا پے میں مرتے وقت عاقبت جواب گونا گویا میں جانتا۔ اگر تو مناسب سمجھو تو کاج کرو۔“

کلو کی ماں کے ہاتھ سے سدا بچی چھوٹے چھوٹے پی۔ کوئی جواب نہ دیا اور اپنی کڑھڑی میں چلی گئیں اور دینک بے درجہ
بیٹھی رہیں۔ پھر ایک دم جی بھر آیا اور غصہ کھڑا نکلا۔ ہاتھ مارتے مارتے یہ قسم لے کر کھڑکی کی سزا دی۔

”نام کو جب وہ بیٹھیں لے کر آئیں تو بڑے میاں کچھ کے سہارے بیٹھے تھے۔

”مجھے حاجت نہیں ابھی کیم آیا تھا اس نے فراغت کرا دی۔“ انہوں نے ذرا کھڑکی آواز میں کہا اور کلو کی ماں کا غصہ
ختم ہو گیا۔ پامولاب اور کھنٹی پھر حیاں باقی رہ گئی ہیں۔ سر نیچا لیا اور وہ دروازے سے نکل گئیں۔

”دوسرے کی دو کھنٹیں ذرا برف لگا کر لے آؤ۔“ بڑے میاں اپنی روکھی کھڑکی آواز میں بولے۔ ”انسو چھپک کر کلو کی
ماں سر دے کی قاشیں لے آئیں۔ ایک عجیب سی نما روشنی پکائی ہوئی تھی۔ صرف بڑے میاں کی ڈھیلی بیٹی کی چڑچڑ سنائی دے رہی
تھی۔ بڑے میاں کچھ نام کچھ جھینے سے سردے کے قتلے پکھتے رہے۔ کلو کی ماں کی گناہیں بھی بھکی ہوئی تھیں۔

”اسے میں جی کے نیچے سے کلو کی آنکھیں جکھیں۔ ماں نے اشارے سے بھگانا چاہا مگر بڑے میاں بولے:

”آئے دو نیچے کو۔ کلو بابا آیا، کھرا ہٹ چھپانے کو بلی ایک پیر پر اور کبھی دوسرے پیر پر ڈنگا نارا۔“

”کچھ پڑھنا وڈھا جی سب یا اس ٹنڈے بجاتا ہے۔ پاس بنا کر دھکوسے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ کلو کی ماں جب
ان کی بیٹی دھ کر لائیں تو وہ بڑے میاں کو چچکا پھاڑا سنار لانا اور وہ آنکھیں بند کئے اور گھڑ رہے تھے۔ ماں کے اشارے پر کلو باہر جانے
لگا تو بڑے میاں غور آئے:

”ہم سو نہیں۔ سہ کیم اب ہیں؟“

”کلیم الدین! بسے بڑے آہستہ کلو کی ماں کی آنکھوں میں بہا آئے۔ کلیم جین سے ہو گیا۔ بس کلو کا باپ یوں کلیم الدین کھانٹ
نٹا۔ کلیم الدین کو پیار اس کے آخر خط میں بھی تھا۔ پر اب نودہ دنیا میں کلو ہی بن کر رہ گیا تھا اور وہ اس گناہ سے کلو کی ماں: مینہ پیر کر
جب وہ حالی رکابی اٹھانے لگیں تو پھر گریست۔

”ہم پاڑہ سن رہے ہیں۔ کھیں پاچی کو کچھ یاد دہی ہے کہ نہیں۔ ماں بھی تو چھوڑتے؟“

”دیا لیں!“ کلو نے سہمی ہوئی آواز میں کہا اور کلو کی ماں کا دل پھیل کر آنکھوں کے راستہ بہنے لگا۔

بڑے میاں نے پھر کاج کی بات نہیں چھیڑی مگر کلو سے ان کی دوستی یاد دلانے کی حد کو پہنچ گئی۔ ”آہستہ آہستہ وہ ان کے
بستر پر بیٹھے لگا۔ دونوں دو تیرہ کیلئے تو بڑے میاں خوب۔ بے ایمانی کرنے اور کلو ان سے جھگڑاتا۔ ان کے بستر پر بیٹھنے کے لئے کلو کو پکڑے

جو سات پہننا پڑتے۔ ویسے اب اسے کام کاج نہیں کرنا پڑتا تھا اس لیے اتنا میلا بھی نہ بہتا تھا۔ ایک دن تاش کہتے کہتے
 "یکدم اے" چودہ پنجے؟
 "اکیاسی!"

"ایں! بڑے میاں خٹھے" کیا کہا اکیاسی؟ کریم خاں۔ اس آؤ کے پٹھے مولوی کی داڑھی پکڑ کر کہانے سامنے ماحر کر دے۔
 جب مولوی صاحب آئے تو بڑے میاں بنگارے۔

"بھئیے مولوی صاحب! ہاں بھئی کلیم الدین چودہ پنجے؟"
 "اکیاسی!" مگر نے سری ہونی آواز میں کہا۔

"ننا اپنے مولوی صاحب! چودہ پنجے اکیاسی! بھئیے کر آپ اپنا سر پڑھاتے ہیں؟"

بڑے میاں نے مولوی صاحب کی گھنٹہ بھر ٹانگ بٹھکی چکر لوگ مال کی چار گھنٹے جہاں سولی پر کر دی اور اس دن مولوی صاحب
 برآمدے میں بیٹھ کر ٹوکرو کو سبق دینے لگے۔ تنگ سوار ہو جاتی تو بڑے میاں مولوی صاحب اور کلہو دوڑوں کا دھو بی گھات کر دیتے۔
 صاف ستھرے پوتوں نے اس دن کو کہاں اتنی فرصت تھی جو اپنی زسری اور گنڈ گارڈن سے پرانی چپش میں شرتے ہوئے
 دامیاں کے پاس آتے کبھی کبھی دن گزر جاتے کوئی پلٹ کر نہ پڑھتا۔ لوگ منتظر تھے کب بڑے میاں سری اور لکھ کا دھوم دھام
 سے پالیسویں ہو۔ پانچا جھکا کھڑے بڑے میاں کی سنان بڑھی زندگی میں تروتازہ بھول کی طرح کل اٹھا، دو پیار کے ترستے ہوئے ایک
 چھتہ بند اور جہاں سے ایک دوسرے پر ماشت ہو گئے گھنٹوں دوڑوں میں ایسے کل لے کر باقیں جوتیں بیسے وہ ہم سن ہوں۔
 "ابے کلیم خاختہ نے دانہ کھایا؟"

"نہیں تھا بھئی چاول دیسے کے ویسے بڑے ہیں۔"

"اماں گاؤ دی ہر زسے۔ خاختہ چاول پر نہ نہیں ڈالے گی اسے کو دوں دو" اور دوڑوں سر چڑ کر خاختہ کو کو دوں کھلاتے

وہ ایک دانہ کھا لیتی تو بڑے میاں کا چیلو کی خون بڑھ جاتا۔

اھ ایک دن بڑے میاں اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب کلوی مال نے انہیں لائھی کے سہارے دوسرے ہاتھ سے ٹوکرا کاندھا پڑے
 صحن میں کیا ریبوں کے پاس دیکھا تو کھجور میں گولی سی گئی۔

کڑھی میں ہم چھٹ پڑا جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ رات کو دامیاں نے کلوی مال سے تاج چھو لیا۔ بیس ہزار مہر نقد بند
 میں وہ نہروالی کوٹھی جن کا ڈیڑھ سو روپہہ مہینہ کرایا آتا تھا۔

"میں نے کبھی تھی وہ ایک ترازہ ہے۔" چچی بی نے کہا۔ حالانکہ پیش گوئی انہوں نے اسی دم ٹھہری تھی۔

ہفتوں ٹوکری مال اور دامیاں کے چوچے کے والے تنگ مرج ٹکا کرتے رہے۔ ایک شکر سے کم زجران نے

نران پر نظم تک کہہ ڈالی۔ خاندان دواں کی لے سے تنگ اگر بڑے میاں نے اپنی طرف کے دروازے میں اینٹیں جڑوا دیں۔
 سب کی محبت پھر پھر کے جاگ اٹھی اور لاوارث ہڈ حساب کا چیتا بن گیا۔ مگر مندی بڑھے کے نہ لگنا مناسب نہ سمجھا گئیں مگر
 کی مال کے جاو دیں اگر بھی سہی جاؤ ادھی زورے والے اور مفت کے عیش میں چکارا پڑ جائے۔

نکاح کی رات جب رنج حاجت کے بعد بستی دھڑکے کلاس میں ڈال کر سر ہانے رکھنے گئیں تو وہ اور کلو دو مصوم بچوں کی طرح
گلے میں اچھلے بے خبر ہو رہے تھے۔ چھروانی درست کر کے کلو کی ماں برائے میں اپنی مخصوص پیکٹری پر لیٹیں تو ایسا معلوم ہوا جیسے
وہ ایک چھتیا رنگ کی چھاؤں میں بیٹھی ہیں۔ بے اعتیاد کانوں میں اپنی بارات کے تماشے ترترانے لگے۔ انار پھل پیاں جھوٹ کر مدغ میں
جگنوؤں کی طرح پھیل گئیں۔ وہ پانچہ چوتھی بری، ایک ایک کر کے بہن کی پگڈنڈی پر گزرنے لگیں۔ عمر ہی کیا تھی۔ جیم بھی تو کم سن ہی تھا
مندی سے لال ہاتھ کسی دن یا در بستر سے چھپائے پھرا تھا اور پھر کھر کی اندھیری کو ٹھیلوں اور سنان چھتوں پر وہ جوان ہنسے پھر کلو
نے ان کو نوں کھنڈوں کا بھانڈا چھڑو یا بگوبنتے ہی دنیا بھر لگئی۔
کلو کی ماں کا کلیہ پھینے لگا۔ مرنے والے کی جوان چوڑی چلی چھاتی سانس روکنے لگی۔ نکلے اسے مسافر کی طرح کلو کی ماں نے
اس غم میں بیٹھی چھاتی پر ماتھا لگا دیا جو سنگ مرمر کی طرح سرد اور بے جان تھی۔ ایک انجانی گولی اس چھاتی کو چھپتی ہوئی مصوم کلو اور
بے نصیب ماں کے وجود کو پاش پاش کر گئی تھی۔

پریتو

کرشن چندر

جب وہ گاڑی کا دروازہ کھل کر اڑے کے اندر آیا تو اس کے چلنے کے انداز سے میں نے محسوس کیا کہ فوج میں ملازم، وہ چکا ہے اس کی شخصیت بڑی پرہیزگار قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا رنگ سرخ و سپید براق نورانی وارمی۔ اس نے ہوائی سرخ کے رنگ کا اوٹو کسٹ پہن رکھا تھا اور نیلے کے درمیان روشنی میں اس کی کڑی کی تہوں میں سے ابرق کے ٹوٹے جو اہر ریزوں کی طرح چمک اٹھتے تھے۔ وہ یہ دھا چلتا ہوا منہ دونوں دم اٹھاتا ہوا ایسے قریب آکر کاجھک کر اس نے قریب کی سیٹ کا نمبر پڑھا اور اطمینان کی سانس لے کر سیٹ پر دروازہ ہو گیا سیٹ اٹکے دروازے سے نیچے گر کر گئی اس نے مزید اطمینان کی سانس لی اور میری طرف دیکھ کر بولا: ”یہ پیچھے کو بیٹھنے والی کلاس رشتیت بہت عمدہ ہیں!“ میں نے اپنا جلتا ہوا اسکرٹ جسے میں نے ابھی ابھی سلکایا تھا جلد ہی سے خاکہ لکھ میں بچھا دیا۔ اور حاکم میری طرف دیکھ کر نکلا آیا اور اس نے کہا: شکریہ! مجھے تمہارا دھولان واقعی بہت برا معلوم ہوتا ہے۔

مجھے اس کے رات، جب وہ سکا آیا تو بہت اچھے معلوم ہوئے۔ یہ عمدہ سپید اور مضبوط دانت بڑے بڑے اور ہم سطح۔ اس بڑے فوجی رشتہ کار ستر برس سے کم نہ ہوگی، لیکن اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اب بھی جوانی کی چمک اور اس کا بکس پایا جاتا تھا اس عمر میں بھی وہ غیر معمولی طور پر صحت مند دکھائی دیتا تھا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جوانی میں تو وہ بے حد حسین اور دلآویز شخصیت کا مالک ہو گا۔ اس وقت اس کے چہرے پر مجھے جو چیز کھل رہی تھی وہ متعدد زخموں کے نشان تھے وائیں، ایس اس کے رخساروں پر تین چار لائے لائے زخموں کے نشان دکھائے تھے۔ وائیں رخسار پر تو زخموں نے ایک صلیب سی بنا ڈالی تھی۔ اور بائیں رخسار پر یہ زخم آگ بڑی میں دی کا سا نشان بناتے تھے اور جب اس نے اپنی نائی ٹھیک کرنے کے لیے مات اور پیکے تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں ہلکی کی پشت پر بھی کے ایسے چھوٹے چھوٹے سپردی نشان ہیں جیسے کسی نے تیز دھار کے چاقو سے ان کو آکر کاٹ دیا تھا۔

جنگ! میں نے اپنے دل میں سوچا۔ جاتے پہلے جنگ عظیم کے محاذ پر اسے یہ حادثہ پیش آیا ہو گا۔ وہ تو خیریت رہی کہ خوبتر اور وجہ الزام کی ہندیا ناگ نہیں گئی ورنہ کتنا برا معلوم ہوتا یہ آدمی!

مجھے اس معاملہ پر زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ رشتہ سالانہ کار کے پیرے نے آکر کہا کہ اب آپ لوگ اے کھانا کھا میں ہم لوگ دس بجے ریلوے والی بند کر دیتے ہیں۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ باڑھا رشتہ کار کے ساتھ اٹھ گیا۔

۔۔۔ میں اٹھ بیٹھے کھانے کا کھا کر مپلا تھا اگر اس وقت پھر جو کہ عمر میں کر رہا ہوں بڑا کھانے کا ہنس کر مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں اس بیٹے میں کھانا کھا رہا ہوں کہ مجھے جو کہ زخمی! میں نے جواب دیا۔

میں نے ان کا نام بار میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں بیروں کے سوا کوئی اور نہ تھا، صرت ایک کونے کی میز پر ایک زوجہ ان بیڑا لانی بی بی کا تھا اور کھڑکی سے باہر دیکھ کر پلن ماسی کے ہانڈ کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کا ہات مو کے ہات میں تھا جسے وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں سے ابد نہ دینا تھا۔ ہات کے دہانے میں لڑکی کے چہرے پر ایک گھناؤنا مسکراہٹ کھل اٹھی اور مجھے ایسا غم میں مبتلا کر دے کہ ہات میں کوئی سوج (swollen) ہے کہ جسے بار بار دہانے سے مسکراہٹ بھلی کے قے کی طرح روشن ہوا تھی۔ لڑکی کے بال خوشنطرت سے تھے ان کے تھے اور وہ بڑی دلہا صورت والی۔ سوہنی اور اداں والی لڑکی تھی اور شکل و صورت سے ایک ایسی ہندوستانی لڑکی معلوم ہوتی تھی جس میں بونہی خون کا بھی دخل نہ ہو۔ لڑکا نالین ہندوستانی تھا، ساڑھے رنگ کا سڑھا تھا۔ چھوٹا لیکن مضبوط اور کھٹا ہوا گھنے چمکیلے بال اور چوڑے چوڑے جڑوں پر گھٹے ہوئے شہر کی نیلا مہٹ تھی۔ اس کے سر کی جماعت بھی بالکل تازہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ گنج ہی بال کھرا کر آیا ہے اس کے کپڑے بے بدصاف تھوڑے تھے اور اس کے ریشہ میں سے زندگی کی صحت مند آرزو میں پھٹ رہی تھیں لڑکی کا ایک ہات میں نے اپنے ہات میں سے رکھا تھا اور بار بار وہ اسے اس طرح مارتا تھا جس طرح گریبا وہ اس میں برقی رو جسے کی کاشت کر رہا ہو۔ دوسرے ہات سے وہ اس کی نلی ساڑھی کا پلو برابر کے جا رہا تھا اور اس کی بے مدیاہ چھٹی اور چمکیلی آنکھیں لڑکی کو اس طرح دیکھتی تھیں جیسے وہ لڑکی کو اپنی نہ ہو جس کی ایک پیٹ ہو۔ محنت میں صحت کو کس قدر دخل ہے "میں نے اپنے زرد رخساروں کو آہستہ سے چھنچھاتے ہوئے کہا

جواب میں بڑے سے لکھنے لکھ دیا۔ گھر کو اب کھانا ہم دونوں کے سامنے تھا اور وہ مکمل انہماک سے کھانے کا بازو پھینے میں مصروف تھا۔ ہمارے کھانے کے دوران میں ہی وہ جڑا لانی بی بی کو ادھر کی ادھر کے چلا گیا۔ چلتے چلتے وہ گھٹا مسکراہٹ پھر لڑکی کے لبوں تک آئی اور مجھے اس لڑکی کی وہ گھٹا مسکراہٹ اس کے شہم کی اداسی مدہاند آئی جب وہ لڑکی کے طرف دیکھتی تھی کتنی جاہت اور سپردگی تھی اس کی نگاہ میں کبھی بھی تو عورت ایک نظر میں سب کچھ دے ڈالتی تھی اور پھر ایک مانی برقی کی طرح مصدوم کھڑکی کی کھڑکی دیکھتی رہ جاتی ہے۔ اس میں وقت وہ سب کچھ یاد ہی بھی معلوم ہوتی ہے۔ مسکراتے کے بعد کچھ اس طرح کی نگاہ سے اس لڑکی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا تھا اور پھر غصہ کر اس بات کو کہ لیا تھا اور زوجہ ان اس کی کمر میں ہات ڈال کر اسے دیکھ کر یوں ہی سے گیا تھا اور ان کے جانے کے بعد ریستوران کا دھڑ بھی سوئی سوئی مسمی دکھائی دینے لگی اس کھڑکی میں شکا جہا چاند مجھے ایسا غم میں بہا دیا صرف انہیں کے لیے شکا لایا گیا تھا۔ میں نے ہات بڑھا کر کھڑکی پر پردہ ڈال دیا۔

اڑھا رکھ میری حرکت پر مسکرایا۔ گرجا موشی سے کھانا کھا رہا۔ کھانا کھانے کے بعد بڑے سے کچھ نے کافی شکائی اور میں ملگرت پینے کے لیے بہرہ دینی بی بی میں آگئی۔ دینی بی بی کے ایک کونے میں وہ زوجہ ان اس لڑکی کو جو ہم رہا تھا۔ اور ہانڈ لڑکی کے چہرے پر تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

لڑکی نے حیران ہو کر پوچھا: یہ آنسو کیسے؟

جو نہیں روشنی لڑکی اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے والی اور پھر کھٹکھا کر مہنس پٹی اور اس کے چہرے پر وہ دلا دیز شہم

موت میں ڈوبا ہوا گھنٹا ششم !
 لاکھنے چھڑا سے ایک بار پھوٹا ۔

لاکھنے کے شانے کا پیسے ۔ اُس نے ٹھٹھکے کہا ۔ چنڈو اور لنگ اندھ چلیں یہاں سر دی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اُس نے خاموشی سے اپنی
 لاکھنے سے میری طرف اشارہ کیا ۔ میں جو دوسری کھڑکی میں کھڑا تھا ہر باہر پر نہیں کے چاند کو دیکھ رہا تھا لاکھنے نے میری طرف اس طرح دیکھا
 کیا مجھے بھی جھرا جھرا دکھ دے گا پھر اُس نے اُس سے کہم کہم کر لاکھنے کی کمر میں بات ڈالا اور اُس سے دیکھی بول بے نکال کر اندر ڈبے میں لے گیا ۔
 ٹھٹھکی دیر کے بعد اُس کا کھجور بھی کافی پی کر بیٹور ان کا رستے نکلا میں نے بھی اتنے میں اپنا سگڑٹھم کر لیا تھا ۔ ہم دونوں واپس
 اپنے دے میں آکر اپنی بیٹوں پر دراندہ ہو گئے ۔

تھٹھکی دیر کے بعد گاڑو ڈبے میں آیا ۔ اُس نے سب قیام بھادیں لیکن ڈبے کے باہر چاندنی مکمل طور پر کھل اٹھی تھی ۔ اور اُس کی پسیدہ
 دھرم دھرمی میں گاڑو کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے کا خوش اور ستے ہوئے دکھائی دیتے تھے ۔

میں نے کہا مجھے اس چاندنی میں عین نہیں آتی ۔ کھڑکی کا پردہ سر کا دوں !
 نذا اٹھو ۔ اور اُسے رکھنے بہت سی وجہیں ہو ہیں ۔ بعد پر سوز آواز میں کہا : یہ تو کم کی رات بہت جیسا کہ بہت خوبصورت
 بھی ہے مجھے اس سے ڈرنا ہے کہ میں اسے دیکھنا بھی چاہتا ہوں ۔ کچھ دیر اور اس چاند کو دیکھ لوں ! چنڈو کو تو جوان لوگ دیکھتے ہیں ،
 ہمارے تھمارے دیکھنے کی چیز نہیں ہیں ۔ اُس نے اندر دھڑکے ساتھ کہا ۔ اور اُس کا دایاں رخسار چاندنی میں تھا ۔ اور سبب
 کا نشان بہت گہرا دکھائی دے رہا تھا ۔ بائیں رخسار کی وہی تاریکی میں گم تھی ۔

میں نے کہا ۔ تھمارے رخساروں کے یہ زخم کی قیامت نے جنگ میں حاصل کیے ہیں ؛ جنگ ؛ جنگ ؛ اور اُسے سروا نے
 میری طرف دیکھ کر اپنے آپ میں گم ہو گئے ہوئے کہا ۔

ہاں ؛ جنگ ہی تو تھی ۔ وہ لوگ کراہتے ہوئے بولا

کوئی سی جنگ ؛ پہلی جنگ عظیم ؛ اُس سے پہلے کی کوئی جنگ ؛ میں نے پوچھا ۔
 میں تو کبھی فوج میں نہیں رہا اور اُسے رکھنے اُس سے کہا ۔ میرا تیس بے بنیاد ثابت ہوا اس لیے میری دلچسپی بڑھ گئی ۔ میں نے
 پوچھا پھر یہ زخم کیسے ؟

اور اُسے رکھنے اور اُسے دیکھ ۔ چاند اپنی جگہ تھا کھڑکی اپنی جگہ تھی ۔ مہاسبہ ڈبے میں خالی خالی ہی تھے ۔ مگر جہاں تھے
 وہیں مجھے دیکھ اپنی اپنی آدمیوں پر دوا دوا کر رہے تھے ۔ ہمارے آگے پانچ چھ سینچھڑا کر آخر میں تاریکی کرنے میں وہ لاکھ اور
 لاکھ اپنی اپنی کرسیوں پر دیکھے ہوئے تھے ۔ لاکھ کا سر ڈکے کے شانے پر تھا اور ڈکے کا باند ڈکے کے شانے پر رکھیں دونوں کی بندھیں
 بڑھے کونے چھڑے پوچھا ۔ یہ قدر ضرور سونو گے ؛ اگر ہمیں نیند نہ آوے گی ہو سنا دو ۔

نیند تو مجھے اس چاندنی میں کبھی نہیں آئے گی ؛ اور اُسے سروا نے بڑے گداز لکھ میں کہا ۔ پھر اُس نے اس طرح سے کہا جیسے وہ قصد
 کرنے کے لیے تھا ۔ پوچھا ہو اُس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا ۔ اچھا اس کو تم سے کیا کھلی اجنبی ہو اس لیے تمہیں نا دینے میں کوئی ہرج
 نہیں ۔ گاڑی کی کھڑکیوں میں دوسرے شیشے لگے ہوئے تھے ۔ جن کی وجہ سے گاڑی کی چھک چھک بڑے میٹھے میٹھے دھرم غنڈگی سے گزرتی

میں ہذا کافی معلوم ہوتی تھی اور گاڑی کے دو دروازے پھیل ہوئی سفید چاندنی میں بیاہ و زخمت اپنی شاخوں کو سمیٹتے ہوئے، سر جھکائے ہوئے گناہ کار مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔

مرد واد نے کہنے میں سوئے ہوئے سر اٹھے اور جان کی طرت اشارہ کر کے کہا۔ جوانی میں بھی اسی طرح تھا بے فکر اور لا پرواہ، وہ خود کہ مزید اب بگنبد، سنگھ، وضع حاصل ان کا نمبر دار تھا اور اس کے علاوہ چیک نمبر ۳۲ بھی اُسے کا پر راہ جاری ملکیت میں تھا، گھر میں کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی۔ اگر ہانپنے بھی نہ بی اسے پاس کر لیا تھا۔ لیکن مجھے شروع ہی سے کھیتوں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ رقم کی بھانتیں سب سے ہاتھ و پائی چلانے میں مشتاق تھے۔ جانے میں نے بی اسے کیسے کر لیا۔ میرے باپ کی آرزو تھی کہ میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں، اگریٹل نہیں ہو مجھے کھیتوں کی زندگی ہی پسند تھی۔ بھوری بھوری مٹی کی سونڈھی مہک، شبنم میں ڈوبے ہوئے سسے بھرے سچڑے کا بوٹ، دور و دور ایں کے نیلے پر پانی بھرتی ہوئی ناریوں کی قطار اور میری سنہری گھوڑی کی ڈنگی چال۔ کچے راستوں پر ہلکے ہلکے دھول جگاتی ہوئی۔۔۔۔۔ آہ!

میں نے کہا تم اپنے شباب میں بچہ حسین رہو گے۔ عورتیں تم پر بہت مرقی ہوں گی۔
 روٹے سے سکھنے خیز مسکراہٹ کا ایسا تار مجھے کچھ یاد نہیں کہ کسی نے مجھ سے محبت کی جو۔ ماں میں نے ہندو ایک ڈنگی سے محبت کی تھی۔
 کون تھی وہ؟

میری بیوی تھی!

بیوی؟

جب میں بی اسے پاس کے گاؤں والی آیا تو میرے ہانپنے چک جمبریاں کے نمبر دار کی لڑکی پر تیر سے میرا بیاہ کر دیا۔ پر تیر بڑی خوبصورت لڑکی تھی لائسی اور ہانکی گوری اور نہری پٹیلیں اور نرم جیسے کواگندل مٹی میں تو اس کی آنکھوں پر مڑتا تھا۔
 کموں اسی آنکھوں میں کیا بات تھی؟ میں نے پوچھا

بظاہر تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑی بڑی حقین اور کالی سیاہ، گراہی تو بہت سی عورتوں کی آنکھیں ہوتی ہیں، پھر تیری تھی! کہہ نہیں سکتا، اُن آنکھوں کا رنگ، نہیں نہیں رنگ نہیں، اُن آنکھوں کا لہو کچھ عجیب سا تھی۔
 وہ آنکھیں رلتی تھیں؟

رلتی تو نہیں تھیں، لیکن رونا چاہتی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہیں گی۔ مگر وہ مجھ سے کچھ نہ کہیں۔ ہر وقت پسینے سے دیکھتی رہتیں۔ کبھی ایسی آنکھیں تم نے دیکھی ہیں جو ہمیشہ پینا سا دیکھا کریں!

جوانی میں کبھی آنکھیں پسینے دیکھتی ہیں میں نے کہا، ماں! لیکن پسینے پر ایک کے الگ الگ جوتے ہیں!
 بڑھنے سے بہت سے کہاں، تو اپنی پر تیر پر مڑتا تھا کہ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ اس لیے ہو کہ میری زندگی میں اُس سے پہلے کوئی عورت نہ آئی تھی۔
 اُس سے پہلے نہ اُس کے بعد۔۔۔۔۔

پر تیر تم نے نہیں دیکھی، وہ دریاؤں دیکھے، وہ تو ایسی عورت تھی جس سے اُس کے بیوی ہونے کے بعد بھی اُس سے عشق کیا جاسکتا تھا اور پھر ماں ہی ہر اوج میں گاؤں پہنچا اور میں نے فوج میں بھرتی ہوئے سے کہاں بننے کو ترجیح دی تو میرے ہانپنے ذرا میرا بیاہ کر دیا اور مجھے کھیت لہا۔ کام کرنے کو لگا دیا۔ حالانکہ اسے اس بات میں بڑی مایوسی ہوئی ہوگی۔ مگر میں تو بہت خوش تھا تم جانتے ہو اگر میں فوج میں ہوتا تو کیسے اپنی پر تیر سے محبت کر سکتا تھا۔ اب یہاں تو فوجیوں کی کسی نہ کسی ڈائی میں اٹلی میں منہ افس میں یا۔

میرٹھا یاد تہ خیر میں کہیں نہ کہیں ان لوگوں نے میری جان لے لی ہوتی حالانکہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ ہوا وہ اچھا ہوا یا برا ہوا
یہ ایک وہ چپ ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔

بہت دیر کے بعد وہ بلا قصد مختصر کر میں اپنی پر تیر کو بہت چاہتا تھا اور وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی۔ اور ہم کبھی ایک دن
کے لیے بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے تھے۔ لیکن ہماری شادی کے چھ ماہ بعد کیا ہوا کہ میں میرا سر اس پر اپنے کاؤں میں تخت بیاڑ
پڑا اور پر تیر کو اپنے پیچھے جانا پڑا، اُس کا باپ بیاد تھا اس لیے میں بھی اُسے کیسے روک سکتا تھا۔ چنانچہ ہر تیر چلی گئی۔ لیکن اُس کے
جہنے کے بعد میرا دل اپنے گھر میں، کچھتوں میں، اپنی گھر ساری میں کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ تین دن تو میں نے جیسے نیسے کر کے کاٹے
لیکن پورے دن میں نے اپنی گھڑی پر زین کسی اور سر پٹ ہر لیا۔ اپنی سسرال کے گھر چک جھراں ہائے کاؤں سے تیس کر س پر واقع
ہے۔ لیکن میری گھڑی بڑی تیز رفتار ہے میں شام ہوتے ہوتے چک جھراں پہنچ گیا۔ وہاں ہمارے معلوم ہوا کہ میرے سسر کی حالت پہلے
سے بہت بہتر ہے بلکہ میں نے اُسے خاصہ پیشاش پیشاش پایا۔ ماس اور سسر دو دن مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور جب انہیں یہ
معلوم ہوا کہ داماد اپنے سسر کی محبت پر چھنے چلا آیا ہے تود میری سعادت مندی پر بہت خوش ہوئے۔ دن بھر تیس کر س کا سفر گئے
سے میں بہت خشک لگتا تھا۔ اس گھڑی کھانا کھا کے میں سر گیا مجھے معلوم تھا کہ اب جو روڈ نکلا چھر جمع ہی اُٹھوں گا۔ میں نے پر تیر سے
سے کہا۔ مجھے صبر و شہاد دینا میں گھڑی پر سوار ہو کر جمع سیر کر جاؤں گا۔ کہیں ایسا ہو کہ وہاں چڑھے تک ستر ہی رہوں۔
لیکن ہوا کہ اُس رات تیسرے پسہ ہی میں میری آنکھ کھل گئی اور میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ میری بیوی میرے
بستر پر نہیں ہے۔ قند کمرے کے آخری سرے پر دروازے کے ہلکے سے کھٹنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ اور ایک سایہ سادہ دروازے
کے باہر گزرا ہوا معلوم ہوا میں آنکھیں مل کر اُٹھ بیٹھا۔ داکٹر ویریکا ماجرا ہے؟ سوچ سوچ کر میں اُجمٹہ سے اپنے بستر سے اُٹھا۔
کرپان کو تنکے کے نیچے سے نکالی کر پہنا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر ہر لیا۔

باہر ایسی ہی چاندنی رات تھی۔ بڑی خوبصورت خوش بوئی والی چاندنی رات تھی۔ سسر اور شیشم کی شاخوں میں چھپے ہوئے
گوشتوں میں کبھی کبھی چوایا غنودگی میں چوکی چوکی کریتیں گرائیں گے چپے فوراً اپنی مضبوطی سے چھوٹ کر انہیں اپنی گردیں دبا لیٹنے کیلئے
پارل شیشم میں بیٹھا۔ چپے تھے اور میرے چاند طرف سرسوں کی ہری ہری کوئلیں لہرا رہی تھیں اور کھیتوں میں گزرتا ہوا اپنی پر تیر کے
نائب میں جا رہا تھا۔

پہلے میں نے سوچا کہ کھیتوں میں ضروری حوائج سے فارغ ہونے جا رہی ہے لیکن جب اُس نے ایک کھیت کو پار کر لیا۔
دوسرے کھیت کو پار کر لیا۔ تیسرے کھیت کی ڈھلان سے گھوم نیچے کے شیشم نالے کو پار کر کے ٹیلوں کے نیچے غائب ہو گئی تو مجھے
بہت عجیب طرح کی تشویش حیرت اور کوفت سی ہونے لگی دل کو دھچکا ماسکا اور اب میں جوے جوے بہت ہی احتیاط سے اُس کے نقاب
پہنچنے لگا۔ تاکہ اُس سے پر نہ چلے کہ کوئی اُس کے نقاب میں ہے تیسرے کھیت کی ڈھلان سے اُتر کر اُسے کو پار کیا۔ پھر احتیاط
سے ٹیلوں کے نیچے سے گھوم کر میں نے اُسے کو نظر دڈانی۔
ساتنے پھر سسر کی کھیت تھے۔ کھیتوں کے بیچ میں ایک کنواں تھا۔ کنوئیں کے قریب پیروں کا سائے دار جھاڑ تھا۔

بھڑکے نزدیک ایک پلنگ بھی تھا۔ پلنگ کے قریب ایک چمڑے کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔

اور میری بیوی اس پلنگ پر ایک ماٹ کے ساتھ سو رہی تھی۔ میری پر تو میری بیوی اس سے بہت پیار کر رہی تھی۔ وہ بار بار اس کی آنکھیں چومتی اور اس کے رخسار اور کٹنی شدت تھی اس پیار میں۔ میری آنکھوں میں خون اترنے لگا۔ گریہ چپکا بیروں کے جھاڑ کے پیچھے کھڑا ان لوگوں کو سارے ہرے دیکھتا۔ اہاں ہاں! اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔

پھر عرصے کے بعد جاٹ نے میری بیوی سے کہا۔ پر تو! مجھے میاں ملی ہے۔ اندر سے پانی لائے!

پر تو نے اپنا سر اس کے سینے سے ٹکایا اور بولی بچنے! تیری پیاس کی اچھی تک نہیں لگھی؟

پھر جواب میں مرث کھڑا اس نے میری بیوی کے ہونٹ چوم لیے۔ پر تو آہستہ سے پلنگ سے اٹھی اور آدھ کھلے دروازے سے ناچتے مکان کے اندر گئی۔ پھر آدھ سے نہایت کڑے اشتیاق سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ میری بیوی بالکل گئی تھی۔ پلنگ میں نے کہاں نکالی اور اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر سرکڑا پڑھایا اور پھر اپنی پوری طاقت سے پچھنے پر پردہ کیا۔ پچھنے کے منہ سے۔ ”جٹ“ کی ایک جلی سی آواز نکلی۔ دوڑے لکھے میں اس کا سر قلم ہو گیا۔ پھر میں بیروں کے جھاڑ کے پیچھے سے کھیتوں میں غائب ہو گیا۔ نیلوں کے پیچھے سے نالے کو عبور کر کے سرسوں کے کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے میں نے چند نلوں کے پیچھے دوک کر اپنی کہاں کو مٹی سے اچھی طرح صاف کیا اور جب وہ بالکل صاف شدت ہو کر اٹھنے کی طرح چمکنے لگی تو اسے میان میں رکھ کر کھسکے اور اٹھ گیا اور کپڑے کے اندر آکر پھر اپنے بستر پر ہو گیا۔

کوئی آدھ پون گھنٹے کے بعد پر تو میرے گھر میں دھیرے سے داخل ہوئی، میں جاگ رہا تھا۔ لیکن میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور بے بسی سانس لینے لگا۔ پر تو نے دروازہ کھول کر پہلے تو مجھے غور سے دیکھا پھر اس نے آہستہ سے میرے تکیے کے پیچھے سے کہاں نکالی اور اسے کھول کر دیکھا اور جب اسے بالکل صاف پایا۔ تو گویا اس کے دل کا شہ درد ہو گیا اور وہ میری بغل میں آکر لیٹ گئی۔ چپ چاپ تھرکی سل! بڑا حاسک چپ ہو گیا۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد میں نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ پھر کیا ہوا۔

کچھ نہیں ہوا! اس کا باپ چونکہ صحت یاب ہو چکا تھا اس لیے میں پر تو کو لے کر دوسرے دن ہی اپنے گاؤں چلا آیا اور ہم دونوں ہنسی خوشی لکھے رہنے لگے۔

دن بیتے، مہینے بیتے، سال بیتے، میں نے کبھی اس بات کا اسی تذکرہ نہیں کیا۔ پر تو نے کبھی کسی بات سے مجھ پر یہ غائب ہونے دیا کہ اسے کسی ات کا بھی شہد ہوا تھا یا اسے کسی بات کا کوئی غم تھا۔ ہاں ایک بات میں نے ضرور دیکھی۔ اس واقع کے بعد وہ پھر کبھی اپنی نیکی نہیں گئی۔ میرے کہنے پر یا اپنے آپ کے اصرار پر بھی نہیں گئی، ہر تے ہوتے میں ہی اس واقع کو بھولی سا لیا۔ کیونکہ اب میرے بچے ہو گئے تھے میرے اور پر تو کے بچے، دوڑکے اور ایک ٹوکی بڑے خوبصورت بچے تھے۔ ہمارے پرتاپ اور دیپ اور ہر نام کو بڑھتے بڑھتے بچے بھی بڑے ہو گئے اور کوکل جانے لگے، کوکل سے کالج میں جانے لگے تو ہمارے ہاں تیسرا لڑکا پیدا ہوا۔ ہر برس اس کے اب ہمارے گھس۔ میں شادمانی اور سرت تھی۔ آرام دکن خوشی اور یقین، انگریز دفاتر اور مخالفت جو اچھے گھروں کی مثال بنتی ہے!

ایک روز میں شام کے وقت کھیتوں سے واپس آگئے گھسے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ پرتاپ اور دیپ کا بچہ سے واپس آگئے تھے۔
 گری کی چشیاں گزارنے کے لیے۔ ہر نام ایک کونے میں کھینچا ہوا تھا۔ ہر نام اسات سال کا ہر جن گڑی کے گھڑے کو چلائے کی
 کرکٹ کر رہا تھا۔ پرتاپ کے نیچے ایک کونے میں چوٹے میں گئی کی روٹیاں سینک۔ ہر نام تھی، انڈی میں سرسوں کا ساگ اُبل رہا تھا۔
 اور اُس کی کٹ کھی خوشبو مری جھوک اور بھی بے چین کر رہی تھی میں نے جلدی سے کپاں کھل کر انگ کھدی۔ اور بات مزدور
 کر پرتاپ کے سامنے موندھا بچا کر بیٹھ گیا اور باکل پکوں کی طرح بے چین ہو کر اُس سے کھانا مانگنے لگا۔

پرتاپ جلدی سے کھانا منے !
 پرتاپ نے سب سے پہلے میرے لیے کھانا پر دیا۔ پرتاپ کے لیے، پرتاپ کے لیے، پرتاپ کے لیے، پرتاپ کے لیے۔ سب پھرنا
 ہر جن نے بل کر کھانا میں تو اُس کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔
 میں نے پرتاپ سے کہا تو بھی بیٹھ جاؤ !
 میں بیٹھ جاؤں گی تو میں کھانا کون کھلاؤں گا؟ پرتاپ نے ذرا ناگ بیٹھ کر کہا۔
 اس وقت چوٹے کی روشنی میں اُس کے رُخسہ اُتار تھے تھے اور اُلجھی ہوئی زلف ماتھے پر اتر آتی تھی۔ مجھے وہ اس وقت
 بہت اچھی لگ رہی تھی۔

ماں! مجھے سرسوں کا ساگ اور دے دے۔ دیپ نے اپنی تھالی بڑھاتے ہوئے کہا۔
 پرتاپ نے انڈی میں سے ساگ کی ڈھچھی بھر کر اُسے دیپ کی تھالی میں انڈیل دیا۔
 میں نے کہا، سرسوں کی ماں! تھوڑا سا اچھا اگر اس وقت کہیں سے لی جائے تو کھانے کا مزہ اڑنا ہو جائے۔
 اچھا تو اندر کوٹھڑی میں ہے! پرتاپ نے ٹوک ٹوک کر کہا۔
 تو کیا ہوا، اندر سے جا کے لائے۔

پرتاپ سہم کر بولی اُکھلی کیسے جاؤں؟ اندر تو بڑا اندھیرا ہے مجھے ڈر لگتا ہے۔
 ڈر لگتا ہے؟ کیا کیسے مڑے بے اختیار نکلا۔ اس وقت سب کھانا منے اندر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے لیکن اُس
 بات کو کھیتوں کو پار کر کے اُکھلی جانے میں ڈر نہیں لگتا تھا۔ یہ ایک ایک میں نے تنگ کر کھانا جانے کیسے کہہ دیا۔ اتنے سالوں تک جس بات
 کو کبھی نہ کہا تھا کیسے وہ بات میں ایک لمحہ نہیں کرتے اتنے سالوں کے بعد ایک بونٹوں پر اُکھلی۔
 پرتاپ نے بیٹھے بیٹھے میں ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا۔ دوسرے لمحے میں مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کپاں لینے میرے سر
 پر غریبی سے پھر ایک بجلی سی تڑپی اور میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے دھڑک دیا اور اٹھائے۔

ایک بار دوبارہ، اتنی بار کہ بیان میرے رُخسہ روں کو کاٹی ہوئی ملی گئی۔ میں نے اپنے چاؤ کے پیسے اپنے ہاتھوں سے
 اُسے روکا چاہا اور جیتا۔ پرتاپ پر غریبی سے ایک جا۔ گو پرتاپ ایک بھونکی شہنشاہ کی طرح چھ پر واد کرتی رہی۔ آخر غصہ میں بھر گئی نے آپ بھٹک
 میں کہان اٹھا کر اُس کے ہاتھ سے چھین لی۔ اور دونوں ہاتھوں سے کپاں کر اٹھا کر اور اپنے جسم اُردو ج کی گوری جگت سے پرتاپ
 میں پھر پرتاپ داندہ دیا۔ پرتاپ کی گوری کٹ کر ہر جن کے گھسے سے کے قدوں میں جا کر ہی اور دلوں کے ٹھٹھک کر مسیہ کی تھالی میں اندھ

ہو گئی اس اُس کے سیاہ بال کل کر میسے سامنے بکھر گئے:

بڑھا سکہ چپ ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔ کھڑکی میں چاند بھی ایک وحشت ناک بھرت کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ گاڑی کے مسافروں کے ہر سہکے پیدا
اور سستے ہوئے تھے جیسے وہ چہرے نہ ہوں۔ ہر دہریوں کے خول ہوں۔ گاڑی کھیتوں میں سے گزرتی ہوئی نا معلوم منزل کی طرف بڑھتی
تھی۔ چلی جا رہی تھی۔ آمد چاند۔ مجبور اور بے کس نہ تھا اور کیلا کھڑکی میں کھڑا تھا۔

بہت دیر کی خاموشی کے بعد بڑھے سکہ نے دیگر بچے میں کہا۔

عورت کبھی نہیں بھولتی! وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسے ایک ڈولی میں سوار کر کے، ایک چنگ
پر لٹا کر۔ چار بچے پیدا کر کے اُس کے دل کا پندا اُس سے چھین سکتے ہیں۔ وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے۔
عورت کبھی نہیں بھولتی!

بڑھا سکہ خاموش ہو گیا۔ اُس نے اپنے رُخدار کی صلیب پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا اور خاموش ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا
جیسے وہ صلیب بہت گہری اُس کے دل کے اندر دوپ چکی ہے!

گاڑی میں اس قدر شائتا تھا کہ مجھے اپنی سانس نہ گنتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے منہ کھول دو تو جیسے جیسے سانس اندر کو لیے
پھر اچانک میری نظر کو نے میں سوتے ہوئے جوڑے پر پڑی۔ لڑکی کا مات اچھی تک لڑکے کے ہاتھ میں تھا اور لڑکے کا بازو اچھی
تک لڑکی کے شانے پر تھا اور دونوں کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں سو رہے تھے۔ یہ ایک لڑکی نے لڑکے کے کتے سے سر اٹھایا آہستہ
سے اپنا مات لڑکے کے پیچھے سے نکالا اور لڑکے کی طرف دیکھا اور جب اُسے اطمینان ہو گیا کہ لڑکا گہری نیند سو رہا ہے۔ لڑکی نے زبوان
کا بازو اپنے شانے سے الگ کیا اور اُس سے منہ پھر کر چاند کی طرف دیکھا پھر اپنی دستر آئینز نگاہ سے دیکھا جو اُس کی گائنا رسکراہٹ کی
ہر قدم پر تکذیب کرتی تھی میں بالکل چھو پچکا رہ گیا یا ایک تیس کے ذہن میں ایک کو پان ہی لہلہاتی محسوس ہوئی اور میں نے ڈر کر آنکھیں بھی
کر لیں۔

دوسرے لمبے میں جب میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو لڑکی نے اپنی کھڑکی پر پردہ گرایا تھا اُس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ گر
میں اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ رد رہی ہے۔

247

حیات لوتیہ

لے

انگشت شہادت کو آسمان کی طرف اٹھا کر اسے تکی داروں میں ٹھکرتے ہوئے وہ بولی: "میرے بھائی! آج موت کا گولا اڑا دے گی، بی بی! میں میرے دلوں پر اب سرج بھی نہیں چمکے گا، میری مٹی پٹی سیلی۔ اتنے ڈراؤنے اندھیرے میں تو فرشتے بھی رو دیں گی بی بی اور تو بے کرمیک صبح بھی نہیں مارتی، میاں جی کا جنازہ اٹھ گیا تو اب اپنی حسرت پر ہی دولے"

میں ہر جو کچھ میں بھانگاں بی بی نے آہستہ سے کہا۔ اور یہاں سے وہاں تک عورتیں بڑکی کو رو دیں کہ ان کی گردنوں میں دیکھے ہوئے نہ پھٹے ہوئے بھانگے جن کے کانوں میں بی بی کی آواز نہ پہنچ سکی وہ اپنے اس پاس سے رونے کی وجہ پوچھ کر رو دیں جتنی کہ یہ تکی اٹھا کر بھانگے سے ہلک پھل گئی۔ وہ بچے جو جانے کے لیے بچے بچے تھے، ماتم کی یہ گوج سن کر بھاگتے ہوئے آئے اور ان میں بھانگے ملے، جو بچہ رانے سے ہم کراؤں کے پاس ٹھنے ٹھنے تھے، اٹھے، اور کرٹھے کے دروازے سے نکل کر بی بی کو گھورنے لگے، بی بی کا چہرہ مرن تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا خالی پن تھا جیسے کوئی ابھی سے کچھ نکال کر گیا ہے۔ اس کے ہرٹ مٹی ہو رہے تھے۔ اور اس کی کلائی کے ایک زخم پر ایک تھی بار بار اکر بیٹھ جاتی تھی۔ جب حافظہ جی نے یکایک بلند آواز سے گواہات پڑھ کر میاں جی کے دم توڑنے کا اعلان کیا تھا تو کٹھنے کی ہڈی پر بھی ہر بی بی نے اپنی ناک کی گیل نوچ کر چھینک دی تھی اور جھپٹ جھپٹ سے اپنی چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں۔ اور جب اُدھر میاں جی کا ڈاٹھا بندھ رہا تھا تو لاہر عورتیں سوئی کی دوس سے بی بی کی کلائی میں سے کچھ کا ایک ٹکڑا نکال رہی تھیں۔

بی بی کو پچاس برس کی عمر میں بھی چوڑیاں پہننے کا شوق تھا۔ میاں جی کو ساٹھ برس کی عمر میں بھی بی بی کی کلائیوں میں چوڑیاں دیکھنے کا شوق تھا۔ سفید کلائی پر ویسے بھی ہر رنگ کی چوڑی سج جاتی ہے مگر میاں جی چوڑیوں کے انتخاب کے معاملے میں بی بی کا ہاتھ لیتے ایسے رنگوں کی چوڑیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے تھے کہ آج تک وہ رنگ نہ دیکھے تھے نہ سنے تھے۔ بلکہ بار بار انہوں نے بی بی سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جی جانتا ہے تمہارے جسم پر چوڑیاں چڑھا دوں۔

میاں جی کو ختم ختم کی پٹیں سج کرنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ اسی لئے گولی، چوکر، ٹکونی اور کنگنوں والی پٹیلوں کا انبار ان کے ہاں جمع ہو گیا تھا۔ اور وہ پٹیں آرائیں بہت عزیز تھیں جو وہ لوٹا سے لانے لگے تھے۔ ان دنوں وہ فوج میں عہدہ رکھ کر تھے۔ کوئی چینی پھیری والا پٹیں بیچتا تھا تا تھا۔ اس پٹیں کے وسط میں جھبکے جھبکے جسم کی ایک چینی ٹکڑی کی تصویر تھی جو انگریز کی بیلوں کے حاشے میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میاں جی کہتے تھے کہ جب انہوں نے یہ تصویر دیکھی تو ان کے سامنے بی بی کی صورت گھٹم گئی۔ سو انہوں نے چینی کو منہ مانگے دام دے کر یہ پٹیں خرید لی تھی اور جب چھٹی پر آئے تھے تو کچھ میں سے یہ پٹیں نکال کر بی بی سے کہا تھا: "جس طرح یہ کسانوں کے چروں جھڑوں کی جان طوطی میں جرتی ہے اس طرح تمہارے اس چمن کی جان اس پٹ میں ہے۔ اس لیے کہ پٹ میں ختم ہو"

بی بی نے یہ پٹ برسوں تک اپنے کیبے سے لگا رکھی تھی۔ دم توڑنے سے ذرا دیر پہلے میاں جی نے ذرا ماش کی بھی کمانیں دواوا المسک اسی پٹ میں رکھ کر کھلائی جاتے۔ اب بھی وہ پٹ کو کٹھنے کے اندر ایک الماری میں رکھی تھی اور بی بی بار بار اس کی طرف یوں دیکھ لیتی تھی جیسے ابھی پتوں کی طرح لبک لبک کر دینے لگے گی۔ مگر نہ جانے کیا ایک مین رتھے پر اسے دفن کیا ہو چکا تھا۔

مفتا تو اس کا ایک ہتھیار تھا۔ وہ تو میان جی کی ایسی باتوں پر بھی مدد کی تھی کہ آج کے سال میں کلی والا انہیں ہے اور اسے دتا دیکھ کر میان جی کو جتن دل سے افرات فرماتا تھا کہ انہوں کے شاہی ہار چیریں کو بھی اس منہ سے کاساں تیار کرنے کا نسخہ معلوم نہ تھا۔ لاکھ کی کوئی اور اور بھی تھیں اس لیے دونوں بھی خود ہی بچے بن جاتے تھے۔ خوب خوب روٹتے اور روتے تھے۔ "تم مجھ سے دلیا پیار نہیں کرتیں میاں جی کہ انہوں" یہاں جی کہتے۔ ادنیٰ فی اپنی کنپٹیوں کی سفیدی کے اور جو چل ماتی کہیاں جی نے اس کے ایمان پر حملہ کیا ہے۔ اور آج یہاں جی اس گھر میں سب سے میوہ کے لیے اٹھ گئے تھے۔ اب وہ شام کی نماز پڑھ کر واپس آنے والے یہاں جی کے تدریس کی چاب کبھی نہیں سن سکے گی۔ اب بھی یوں نہیں ہو گا کہ آدمی رات کو اس کی آنکھ کھلے تو اس کا سہ میاں جی کے زانو پر رکھا ہوا دریا جی اس کے ہونٹوں کے خطوط پر اپنی ایک انگلی کی پور پھیر رہے ہوں۔ اب کچھ بھی تو نہیں ہو گا کچھ بھی تو نہیں ہو گا۔ بی بی یہ سب کچھ سوچ رہی تھی مگر اسے ان سوچوں پر بھی تور و نا نہیں آ رہا تھا۔

اگر اس کے آنسوؤں کا رونا یکا یک خشک ہو گیا تھا تو جب بھی کم سے کم دنیا داری کے لیے تو اس کا رونا ضروری تھا۔ میان جی کی دودنزدیک کی رشتہ داریں جہاں جہاں روٹی پھٹی آئیں اور بی بی کو گلے سے لٹا کر لیے ایسے بیان کئے کہ دشمنوں کے لیے بھی چل جاتی تھیں جب وہ بی بی سے الگ ہوئیں اور اس کی آنکھوں میں مچھلی مار ڈالتی دیکھی تو بعض حیران رہ گئیں۔ بعضوں نے نفرت سے منہ پھیر دیا اور بعضوں نے چپکے سے دھڑکے کے کان میں کہا۔ "دنیا میں یہ پہلی بوری ہے جو اپنے میاں کی موت پر خوش ہوتی ہے۔" پھر یہ سرگوشیاں جہاں جی دودنزدیک چل گئیں۔ یہاں سے وہاں تک حرم میں رونے کے بجائے باکری اور ٹھوڑیوں پر انگلیاں رکھ کر کھسکھس کرنے لگیں۔ دروازے سے منہ کر کے بی بی سے بچے بھی بی بی سے باہر ہو کر اندر کوٹھے میں کھینٹے گئے۔ اس حرم میں ایک ہی روٹی گئی۔

رنا کر کشش سے نہیں آتا۔ یہ تو عبت کی طرح بڑی بے سمتہ چیز ہے۔ مگر بی بی رونے کی کر کشش میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے پچھلے تیس برسوں کا ایک ایک واقعہ یاد کر ڈالا۔ کئی باہر سے محسوس کیا کہ برسات کی رات ہے۔ بھت پر بوندیں پڑ رہی ہیں۔ ہا دل کہیں دودر جیسے زندہ میں گرج رہا ہے۔ کوٹھے میں بی بی کی روشنی والا دیا جل رہا ہے۔ میان جی کا سر اس کے بالوں میں ڈوب گیا ہے اور اس کے ہونٹوں کو باہر جی کے سینے کے بالی پھیر رہے ہیں۔ ان یادوں نے اسے جیسے دودنزدیک حرم سے پکڑ کر چھپکا ڈالا مگر ان کی آنکھوں میں اسی طرح ریت کھینکتی رہی۔

تھا ہر بی بی نے اس جگہ کو گھورا جہاں میان جی کی میت جنازا اٹھنے تک پڑی رہی تھی۔ وہ ان پر پھاڑیں کھا کھا کر لگی تھی۔ مگر لگ پھاڑوں کو نہیں دیکھتے۔ آنسوؤں کو دیکھتے ہیں۔ ایسے عورتوں پر تو بعض حیران بھی پھاڑیں کھا کر جاتے ہیں۔ انسان کی سپان زانہ ہے۔ انسان روتے نہیں تو کوئی کیسے مانے کہ اس کا دل دکھا ہے۔

بہنوں کے ایک ایک چپے سے بی بی کی زندگی کے کتنے واقعات چٹے ہوئے تھے۔ ان دیواروں اور حوائث منڈیروں پر تاج کتنی کمائیاں اڑاتی تھیں۔ بی بی نے رونے کی خاطر ایک ایک چیز کو گھورا۔ اس کی نظری منڈیروں، دیواروں اور دروازے کے گھونٹنی ہوئی کوٹھے کے اندر داخل ہو گئیں۔

یہ ایک مدہ ثرپ کا گھر تھا۔ دروازے کی طرف ایک مستم بڑھایا اور پھر ایک بلند چیم کے ساتھ بیٹنے پر نہایت ندر کا دوتہر ملا کر وہاں پھر مگر گئی۔

جھانکاں اُٹھ کر اس کی طرف پہلی اور پھر اُنکی نے پرے سے تک تمام عورتیں اٹھ چلی گئیں۔
 ”کیا ہوا؟ کسی نے پوچھا۔“

اور جھانکاں نے جیسے ایک شرہ سناتے ہوئے کہا: ”بی بی رو رہی ہے۔“

چند عورتوں نے اُٹھتی اور سسکتی ہوئی بی بی کا جھیکا ہوا چہرہ اٹھا کر دوسری عورتوں کو دکھایا اور سنت بھیراں ہلکے لڑکیں تھیں۔
 تو زاد زار رو رہی ہے بے چاری“

پھر اندر کھٹے میں کسی عورت نے ایک بچے کے زور کا ہاتھ مارا اور اس سے بازو سے گھسیٹی ہوئی، وہ ہلیر پڑا کر پکڑی۔
 ”ہمارو نے بی بی کی پیٹ کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔“

لوٹے پل

علی عباس حسینی

ہر مرد و عورت کی زندگی درختوں پر جان دیتے تھے۔ لوگ کہتے کہ وہ انہیں اپنی اولاد سے زیادہ چاہتے تھے۔ ان کے لیے دو بیٹے تھے بلکہ ان کے بزرگوں کی مدد میں تھیں، ابد تھے بھی وہ درخت خاندانی۔ اہلی کا پیرا ان کے دادا نے لگایا تھا۔ نیم کا درخت ان کے پتا چلنے اور نام کا حوالہ خود انھوں نے جوشن کی پیدائش کے دن اپنے استمن سے لکھ کر صحن میں بھجایا تھا۔ تیز و دھڑلے کے پھولوں کا ڈالہ بھی روایتی تھا۔ اہلی کی ترشی بڑے بڑوں کے دانت کھٹے کر دیتی تھی۔ نگر لیاں اپنے کڑے پن میں چاٹتے نہایت کرات کر دیتی تھیں۔ اور نام کی کھاس کے سامنے لیو کا اچاد بھی اپنی چھتا تھا۔ چھر بھی اور دادا ان درختوں پر نہ تھا، ہاں چھر کہتے تھے۔ ہر روز صبح سویرے جب وہ اسٹان ان کے سورج دیکھتا کہ "جل چلے" ان درختوں کے قاتلوں میں بھی پانی دیتے۔ سورج کی پوجا نافہ جوتی اور نہ درختوں کی دیکھ لالی۔

دو ٹھاکر کا بالا، وہ کسی کو ان درختوں پر چڑھنے نہ دیتے۔ ان کی ایک ہی پھونے نہ دیتے۔ درخت ان کے دخت سے دستیاب نہ کر سکتی تھیں۔ بزرگ نیم کو فتنہ دیتے۔ "کر کے زخموں پر کیاں بنا کر کہنے کو کہیں۔ یہ ہر دم داد کے پڑے نہ حاصل کیا جاسکتا تھا۔ اہلی کی ایک چھٹی کا نام کی گیری پر ڈھیلا مانا خود ان پر لنگ ساری کے برابر تھا۔ نگر لیاں زمین پر پڑی سڑتی رہیں لیکن جب تک داد کا حکم نہ ہو کہلی چاروں ہی سے مل گائے اور اپنی اذہمیری بھونپڑی میں دیا جلائے کی غرض سے انہیں بھولنے کی ہمت نہ کر سکتی تھی۔ پھر جب اہلی اپنے ملتی اور نام کے چل پر سے دس پر اٹھتے اور داد خود ان درختوں پر چڑھتے اور اپنے ہاتھ سے ان کے چل خیلوں اور مالیر میں تیز کر زمین پر ڈھیر لگاتے تھے۔ اس وقت جوڑے کے سلسلے کے اور دیکھیں کہ اجازت تھی کہ وہ داد کا اس کام میں ہاتھ بٹائیں۔ جب درختوں کی ایک ایک پودے لگاتا دیا جاتا تو پھولوں کا پورا ڈھیر گاؤں بھر میں بانٹا جاتا۔ اگر کسی گھر کا خاندان بچہ نہ موجود ہوتا تو اور داد ان درختوں کے چل وہاں خود پہنچا دیتے۔ پودے گاؤں میں سوائے گلن مٹھ کے کوئی گھر نہ پہنچا جہاں اور داد کے کھٹے اسم کی کھاس بڑھانے کا شیریں اور من ادا کر دیتے تھے۔

یہی جگہ جوتہ وہ اس کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ گلن مٹھ سے یہ جگہ اس کی لڑکی لیا کی ہر عمر تھی، ٹیک وہ تاریخ تو نہیں بتائی جا سکتی لیکن ۱۹۴۲ء کی فوج میں یہ لیا نے پہلی بار گاؤں کی رضا میں انھیں جھپکا لی تھیں اور کے ہاں کے ہاں کر کے فریاد کی تھی اور مارچ کا مہینہ تھا۔ طرح جوان بھی نہیں پڑا تھا۔ کر گاؤں میں چپک کی وہاں چلی تھی۔ جہاں میں کے قریب کچھ اور جوان "سٹوڈنٹس" ہوئے وہاں بھی لیا نے باپ کو بھی ملاتا ہی سے نہیں۔ "ڈر واد" گاؤں بھر کے زمینداروں کی دیکھ بھال کرتے رہتے تھے، ان کے دفعتی لڑکے جوشن اور ہندو شہر میں تھے، بیوی پہلے ہی ہر مل تھیں، انہیں اپنی کوئی فکر نہ تھی۔ ان کو ایک بار بڑی چپک بھول چکی تھی۔ وہ ٹڈی سے سب کی "بیوا" کرتے رہے۔ گلن مٹھ گر گیا تو انہوں نے اس کی بیوہ کو خاص طور پر سہارا دیا۔ کچھ دنوں بعد وہ اس کے گھر گئے۔ مہینے کی چیزیں پہنچاتے رہے پھر اس نے انہیں

کے گھر کا شروع کیا۔ اور "درونی کھر" کا کام سنبھال لیا۔

دونوں ایک ہی ذات کے فرد تھے، مگر بد بلسوں کے تھے۔ جبر میں ڈاؤن تھا۔ یہ تقریباً چالیس سال کے "گرگ واپس" ویدہ" اور وہ صرف تیرہ سال تھے۔ دیکھ کر لگے۔ دادا کی صورت میں کوئی کشش نہ تھی۔ سارے پانچ فٹ کا تھا۔ رنگ خالص تانبے جیسا۔ پھر چپکے پردہ کشی میں نے اپنے سے بڑے عمو والی کو بھی دادا بنا دیا تھا۔ اُدھر لاکھ بچی بڑے ہی چرمی جوان تھے۔ اور جوانی خود ہی جتن ہے جب دستور گاؤں کی بڑی بڑی بیویوں نے ایک دوسرے کے گاؤں میں گزری کیلی باقی کتنا شروع کیا۔ اور دادا کے ایک ہمن نے خود ان کے منہ پر ایک گرم گرم نفرت لگا۔ اُدھر دادا اچھلا کے اُسے "تم لوگ کتنے بڑے ہووے تو میری پُتری...." "گر وہ پُتری کے آگے کچھ نہ کہہ سکے جیسے کسی نے ان کی زبان پکڑ لی ہو۔ جیسے ات حق میں انگ کر رہ گئی ہو۔ اور اسی سکوت نے مجھ کو اور ان کے تعلقات میں ایک گہرائی پیدا کر دی۔ ایک مضبوط لڑکائی بڑھا دی۔ اس لیے کہ قانونِ نفرت ہے کہ جب مختلف جنسوں کی دو آدمیاں حقیقتی برابر چپ ساڑھے عقی رشتی میں تو ان کی لگائی دن چرچ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ جو محل میں دلی ہوئی لگ کی طرح محبت بھی ملگنی ہی رہتی ہے۔ یہاں بھی محبت و ماحبت مند کے رشتے میں لگاؤ کی گرہ پڑ گئی۔

پھر عجمی لڑکیوں تک ذاتی تھی۔ اور معاملات کو گرگ کی حالت ہی میں تھے کہ منہ پر اور جوش اپنے اپنے اہتمام و یکو واپس آ گئے۔ منہ پر کوئی پندہ برس کا تھا، اچکے نواس کے دوسریں میں پہنچا تھا۔ اس نے اپنی پرانی "عجمی" جن بھوکہ روئی گھر کی ماگن پاپا اند جس کے ہاتھ میں ڈوٹی اُس کا سب کُتی سے زیادہ دلچسپی لی۔ مگر جوش جو ان تھا الکیس میں قدم رکھ چکا تھا۔ بی۔ اے کے آخری سال میں تھا۔ یونیورسٹی میں دینی کا کورس کر رہا تھا۔ سترہ برس کی بڑہ اور اس میں جنسی کارشتہ تھا، دونوں جلد ہی ایک دوسرے سے ٹکڑے ہو گئے۔ بے لگنی سے باتیں جو نہ ٹھیک اگر سے نفرت، رومان سے زیادہ دلچسپ موضوع تھا۔ دلی پتہ "کافر و جنس سے زیادہ خون میں گرمی پیدا کرتا تھا وہ گاؤں کے ہر جوان مرد و عورت کو اچھ چکے چکے سازشیں کرنے لگے۔ اکیس بنانے لگے۔ مگر ایک امر دادا نے ان کو کھٹکاتے ہنستے دیکھ کر ادا کر دیا تھا۔ وہ جنس ہے تھے کسی اور دوسرے یہ کچھ کچھ اور سب جوش تو ان کو لال بہرہ دیتے ہی کھسک گیا۔ مگر جگہ ہو روئی کھر بھی کھر رہی۔ دادا نے دوسرے قدم لکھ کر اس کو اتنی صلوٰتی میں لائیں کہ وہ جل جہنم کر کہاں ہو گئی۔ اس نے چھٹ کر لڑکائی کاٹنے والا حافہ اٹھایا۔ جب وہ اس کے تیرہ سے کچھ بڑا کر، کچھ بڑا کر روئی کھر سے باہر نکلنے لگے تو جلی ہو رہا اس دلی مڈا پر چاؤ اس زور سے کھینچ مارا کہ وہ دیوار میں لٹھف مٹا یا اور اسی کی طرح کا پینے لگا۔ دادا نے کچھ اور سہم کر اس کو دیکھا اور ان کی چال میں کچھ اور تیزی آگئی مگر جلی ہوئی اس کی اس سے تسکین نہ ہوئی۔ وہ جو طے پر کچی کی فانڈیاں جھڑ چھاڑ، لیا کہ وہیں اٹھا روتی، بلبلائی کھر مل دی۔ اس دن کا دن اور آج کا دن کہ امر دادا نے کچھ عہد کے اس کی صورت دیکھی تھی۔ انہیں برابر ہی عروس ہوتا تھا کہ چاؤ دیوار کی جگہ ان کے پیلنے میں ترازو ہے۔

مرن ایک اور دونوں کا اُنسا سنا ہوا اور وہ بھی اس طرح کے حادثے کے سلسلے میں جہاں نے ان کے دل کو ہمیشہ کے لیے اس کی عداوت اور نفرت سے بھر دیا۔ اسی ۱۹۴۲ء کی اگست میں جب ان کے منہ قیام ملاح ہوا، غازی نور، انٹیکسم گدہ کے (جو انور علی انگریزی حکومت کے خلاف غم و غصہ کا اہر دہ رہی تھی) اور ماور وٹن کے دیوانے لکھنوں اور جلیوں سے بند وٹن اور تین گزنی کا مقابلہ کرنے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، امر دادا کو ایک کالی اذھیسی رات میں خبر ملی کہ گاؤں وہ نے سچ کاٹھ کالی کوٹنے ٹاٹے میں یہ بلی رچھو دی ہے۔ پھر سرج کا پات بہت چڑو نہ تھا لیکن ٹکڑ کی انٹیکس وٹن کے بلے کے تھکے پیر وہ ہیں پاپا۔ اب ان کا عزم ہو رہا تھا۔ شہر سے جو اس پاس کے گاؤں کو

شک جاتی تھی وہ اس کی ہڈی سے ہرگز گزرتی تھی۔ اس لئے اگرچہ فوڈریا حکومت کے آدمی اس پار والے ہیں گاؤں تک آسانی سے پہنچ سکتے تھے۔ انگریزوں سے آزادی چھیننے والے سرداروں نے اسی لئے اس رشتے کو شکست دینے کی کوشش کی۔ چندی دہائیوں کی آزادی تھی، مگر انہیں غریبہ حالت میں بددھرموں کے لئے راستہ تو کھل جائے گا۔ منزل کی ایک جھلک تو دکھائی دے گی۔ جانوں کی بھینٹ چڑھا کر ہی آزادی کی دیوی کے روضے پر گتے ہیں۔

امرا دارا کو یہ طاقی بھڑائی مانی باتیں پسند نہ تھیں سب جانتے تھے کہ وہ اہنساکے بھاری ہیں۔ وہ گاندھی جی کے چیلے ہیں اس لئے کسی نے اس کو اس سازش کی کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ وہ تو اتفاقاً انہیں اس وقت پتہ چل گیا جب سب کی طرف جا چکے تھے اور وہ نہ تو ان کو اکٹھا کر سکتے تھے نہ بچھا بچھا سکتے تھے۔ مینڈر دیا تھا، کالی اندھیری رات تھی گاؤں میں عجیب طرح کا سناٹا تھا اور فضا اس طرح بوجھل تھی جیسے کہ وہ کسی کا دم کر رہی ہو۔ دارا اپنی بے بسی محسوس کر کے اپنے دکان میں ٹھلنے لگے۔ اُسے ان سرداروں نے کیلئے فونی کی۔ اتنی جاہر حکومت سے کہیں اس طرح ڈرا جاتا ہے۔ سوائے خون خرابے کے اور کیا باندھ آئے گا؟ اس پریشانی میں بس اتنا اطمینان تھا کہ خود ان کے دونوں بیٹے بمبوشن اور منوہر شہر میں تھے۔ وہ اس ہندیا میں شریک نہ تھے۔ گاؤں والوں پر چارٹ آئے گی اس سے وہ یقینی بچے رہیں گے۔ انہوں نے جھک کر لاشیں اٹھائی۔ اس کی تو بڑھاکا پانی کا اندازہ کیا۔ تاریکی کے میں منظر میں گناہرا سردار دھار پانی روشنی میں ایسا معلوم ہوا جیسے پتھر کی نائش بادے کا جابہ انداز سے لئے کھڑے ہیں۔ ان کا دل عجیب طرح کے خوف سے دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر لاشیں تپائی پر رکھ دی اور پھر جلدی جلدی ٹھٹھنے لگے۔ دھڑا بارش کی آواز میں ملی جلی گومیوں کی ٹوٹ پڑ اور زنجیروں اور مرنے والوں کی جھینس سنائی دیں۔ دارا ٹھٹھک کر کھڑے ہوئے۔ ان کا دل تپیر چلنے لگا، انہوں نے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا: "اے جان بڑا ہے وہاں پولیس یا فوج پہلے سے پہنچی ہو تھی مگر نہ جانے کتنوں کی جان گئی" کتنے گھبراہٹ ہوئے "انہوں نے جلدی جلدی دھڑکی کے پھندے کو گھر میں کس کر لپیٹنا شروع کیا۔

ایک لاکھ میں لاکھیں، ایک میں چھتری لے کر وہ صحن میں اترے ہی تھے کہ کسی دھڑکنے والے کی چاپ سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی نے آم کے تنے سے ہلکا کر کہا: "دارا! دارا! بمبوشن کے سینے پر گولی لگی ہے" وہ جھکن ہو کر گھر میں دم توڑ رہا ہے۔ اور کھنے والا روٹا ہوا نہ میرے میں خائب ہو گیا۔

امرا دارا کے لاکھ سے لاکھیں گر چڑی اور چھتری ملی۔ وہ بیباختہ چلتے ہوئے چپکے۔ دو ایک جگہ پھسلے اور گرے لمبی، لیکن ان کے پاؤں کے نیچے کی زمین بمبوشن کی سنائی دیتی تھی۔ انہیں کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ وہ دیوٹی گرتے پڑتے ہوئے اس جگہ پہنچے۔ اندر والی کوٹھڑی میں جہاں جس کا ایک دیبا چل رہا تھا، ان کا بھوشن ہو میں منت پرت ایک پلنگ پر بے سندھ چڑھا اور بی پر سر کے من پر سبک رہی تھی۔ اہنساکے بھاری امرواں کی آنکھوں میں خون اتر آیا، انہوں نے بے تصور جھکن ہو کر زور سے لالت ماری، ڈانٹن، لکھا دیا نہ تو نے میرے بمبوشن کو! وہ دھڑا سے اوپر بیٹھے کی گردن اٹھا نگلیں میں باہیں ڈال کر اسے گھراٹھا لائے۔

بھوشن نے ان کی گردن میں تڑپ تڑپ کر کوٹھڑی دیو میں جان دے دی۔ وہ اسے زمین پر ڈال کر مات بھر اس کے سر پر مات بنے بیٹھے رہے۔ صبح کو اٹھ کر انہوں نے سردار کے ساتھ ساتھ اپنے دونوں بھائی چڑھایا اور پھر اگر آزادی وطن پر بھینٹ چڑھنے والے بیٹے کے پاس بیٹھ گئے۔ دن چڑھے پولیس آئی، بھوشن کی لاش کے ساتھ ساتھ انہیں بھی شہر لے گئی۔ ساری جاہلاد، مویشی، کھیت، کھلیاں سب کچھ ضبط کر لیا گیا اور بوڑھے باپ کو باغی بیٹے کو مرتے وقت پناہ دینے کی مزا میں سات برس کی قید محنت کا حکم ملا۔ جب پانچ برس بعد ملک کو آزادی ملی

اور دادا کو قومی حکومت نے آزاد کیا تو منہ پر نے جواب نوکر ہرگز شہر میں رہنے لگا تھا، اپنے ساتھ قیام پر ان سے اصرار کیا۔ مگر امر دادا بیٹے کی بات مٹھتے یا اپنے درختوں کی کپڑا وہ اٹھاتا تھا اور تین تین ارادہ کی یادگار بھی، باپ کی جلی اور خود ان کے بھٹوں کی جلی۔

وہ گاؤں آئے اور وہی ٹپل پر سے ہرگز آئے جس کے توڑنے کے لئے بھوشن نے جان دے دی تھی۔ اس پر نظر پڑتھی ان کی کھجی چاہنے لگا کراش یہ ٹپل اپنے آپ ٹوٹ جاتا اور کھجی نہ بنتا۔ اسی طرح نہ بنتا جس طرح ان کا بنانا گھر اس کے کارن بڑا کر پھر نہ بنا، وہ کچھ درد سے کچھ مٹھتے سے کھینچتے ہوئے گاؤں میں داخل ہوئے اور اپنے گاؤں کے سرے ہی پر دکھائی دیا وہی خوش مکان، لیکن ہو گا گھر اور ان کا جی چاہنے لگا کہ کاش یہ مکان گر گیا ہوتا، ڈھک گیا ہوتا اکاش لیکن ہو اپنے مریاں ہی کے ساتھ مریاں ہوتی کہ اس نے اسی شام کو بھوشن اور اس کے ساتھیوں کو ٹپل توڑنے سے پہلے اپنے مریاں بیٹھ کر سازش کرنے کا موقع نہ دیا ہوتا۔

اور اسی صبح میں پورے دس برس گزر گئے اور آج اسی اگست کے چھپنے میں جب سارا گاؤں سات دن کی مسلسل بارش سے تباہ ہو رہا تھا، انہوں نے پہلی دفعہ خوشخبری سنی۔ ندی کی بازو نے کانٹہ کا ٹپل توڑ دیا۔ دادا نے خبر دیئے دے رام کو مزہ خوش سے بولھکا کہ دیکھا اور پوچھا "ارے بھائی" اور اس کے سر پر کھجی بھرے پردہ اپنے والان سے پرستے ہوئے پانی میں صحن کی کچھ میں بھانڈا پڑے۔ وہ آسمان کی طرف دیکھ کر "تیری سیلا ہے بھگوان" پھر دفعہ انہوں نے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دی، پھر وہ ایک بار کی اچھل کر کھڑے ہو گئے اور تیری سیلا ہے بھگوان، تیری سیلا ہے بھگوان! "کہہ کر آگن میں ناچنے لگے۔ والان میں کھڑا رامو گھبرا ہوا مسند کھولے انہیں دیکھتا رہا۔ اس کی کھجی میں نہ آتا تھا کہ دادا کو کیا ہو گیا ہے، کس بیماری کا، درد پڑا ہے۔ سات دن سے پانی ایک منٹ کے لئے نہ نکلتا تھا گاؤں کے آدے سے زیادہ گھر گر گئے تھے، نہ جلائے کے لئے کھڑی رہ گئی تھی، نہ کھانے کو چاول، نہ ستونہ، نہ آٹا، نہ دالیں نہ زکریاں، ہر ایک کا حال تباہ تھا۔ دن تو کسی طرح کاٹ لیا جاتا تھا لیکن راتیں جد سے زیادہ ڈرنا تو بن گئی تھیں۔ مٹی کا تیل کب کا ختم ہو چکا تھا، لالٹین جلائی نہ جا سکتی تھی۔ سڑیوں اور ٹنگیوں سے جلنے والے درخت لہجے پڑتے تھے۔ سانپ، کچھو، کھجور سے ہر طرف بیٹھے پھرتے تھے، ناز حیرے میں انہی کا راج تھا۔ ایسے میں سکھ پڑھنے والے کہ گیا تھا۔ لے دے کے ہی اسرا تھا کہ ضلع کے حکام جلد سے جلد مدد بھیجیں گے۔ ٹرک پر لا کر سارا سامان جلد سے جلد پہنچائیں گے۔ مگر اب تو ٹپل ٹوٹ گیا تھا۔ اب گاڑیاں کیسے آئیں گی، آمد کیسے پہنچے گی۔ اب تو گاؤں کی تباہی یقینی ہو گئی تھی۔ اب تو گویا بربادی پر فہر لگ گئی تھی اور دادا ہیں کہ نہیں رہے ہیں، خوشی سے ناچ رہے ہیں، جیسے گاؤں کی تباہی اور بربادی ان کی دلی مراد تھی جو برائی ہے۔

رامو اٹک اٹک کر کہنے لگا: "کیا کرتے ہو دادا، کیا کرتے ہو؟ گاؤں میں کہیں سوکھی کھڑی نہیں بٹھی بھری کے یہاں آنا چاہا لیکن لالٹین جلائے کے لئے توڑ بھرتی نہیں، شہر سے یہ سب سامان لانے لکھو گیا تھا، پر اب تو ٹپل ہی ٹوٹ گیا۔"

اور دادا نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ رامو نے صحن میں بھانڈا کر انہیں پکڑنے کی کوشش کی۔ اسے غصہ آنے لگا تھا، وہ چیخا "چپ رہو دادا انہیں بٹھتے نہ نہیں آتی۔ ہم سب کی تویہ حالت ہے اور کل گاؤں میں برات آ رہی ہے۔"

دادا نے "ک کہہ پوچھا" کیسی برات؟ کس کی برات؟

"بھائی کی۔"

"بھائی کون؟"

رامو نے ہر دہانہ لہجے میں کہہ کر: "آج صبح لیکن کی پڑا۔ آج صبح لیکن ہو مرتے مرتے پچی، اس کو پورا مکان بیٹھ گیا۔ وہ وہ تو"

ہمارے گھر میں جہاں

امداد اور داد کے مسی دنگ کچھ گال ہوا سے چراغ کی نو کو گھیرا بنا کر بچا ہوا بیٹیوں کی طرح لال ہو گئے اور ماں کے منہ سے
 جھپٹے ہوئے انار جیسی آواز نکلنے لگی۔ تہہ تہہ تہہ تہہ تہہ اور وہ پھر کھڑا اور پانی میں نہ چنے پھرنے اور تیری بیبا ہے بھگوان اتنی جھپٹ
 بھگوان کی رٹ لگانے لگی۔ ان کی یہ آتش بازی اسی طرح چھوٹ رہی تھی کہ دفعتاً کالے بادلوں نے بھی اپنی فتنابی داعی اور ایک تڑانے کے
 ساتھ اعلیٰ پر اس نہد کی بجلی گری کہ راما اور دادا اس نہد کے بل گرتے گرتے بچے لنگر اعلیٰ کی ایک بوٹی ٹوکھی ہوئی شاخ چرچر کر زمین پر آ رہی اور
 دادا اپنے میری اعلیٰ کہہ کر اُدھر لپکے بگڑے راما نے جھپٹ کر انہیں کھڑا کیا۔ وہ چھوڑو، چھوڑو! اسے میری اعلیٰ جلی جاتی ہے۔ کہہ کر برابر
 واپس گئے رہے مگر اس نے نہ چھوڑا۔ اعلیٰ میں تھیں ناگ لگ جاتی مگر تیز گتے ہوتے پانی نے اسے بڑھنے نہ دیا۔ وہ ٹھوڑی ہی دیر میں ٹھنچ
 کر کے ٹھک گئی۔ امداد کا اُبل بھی بیٹھ گیا۔ راما نے لاقہ ڈھیلے کرتے ہوئے کہا: سچ کہتے ہو دادا! بھگوان کی لیا۔ اس نے بدحواسی پٹری کے بیاد
 کے لئے ٹوکھی کھڑی کھد، دھو، توڑ کر بیچ دی!

امدادا نے پھنگاری ماری۔ میں کھڑی کوڑی نہیں دوں گا اس پاکھندی کی پٹری کے لئے۔ راما کو کہنے ہی والا تھا کہ گاؤں کے
 کئی گھروں سے لوگ، کیا ہوا، کیا ہوا دادا! چہیتے ہوئے نکل پڑے۔ بجلی کی چمک پڑانے کی آواز اور دادا کی تیخ سے سب کو تین اُگیا
 تھا کہ دادا ہی پر بجلی گری۔ جو لوگ اس طرح دوڑ کر ان کی خیر سٹالینے آئے تھے انہی میں جگن بہر بھی تھی۔ اس پر نظر پڑنے ہی دادا پر گویا ایک
 اور بجلی گری، وہ سارے جسم سے زخمی کبوتر کی طرح کانپنے اور انہوں نے اُدھر سے منہ پھیر لیا۔ ویسے ہی بجلی کی طرف سے "راما بھیا! راما بھیا!"
 سکھدیر کے پکارنے کی آواز سنائی دی۔ امداد راما "کیا ہے سکھدیر؟ کیا ہے آتے ہیں! آتے ہیں! چمچا اُدھر لپکا۔
 چند ہی منٹ میں وہ سکھدیر کے ساتھ بیٹا۔ اکس برس کا سکھدیر اس وقت صرف ایک چانگھیا پسینے تھا اور ایک ہاتھ میں کھادی
 لئے وہ دونوں کانپ رہا تھا جیسے وہ بہت دُور سے دوڑنا چلا آ رہا ہے۔ اس نے دادا سے جلدی جلدی کہنا شروع کیا: دادا! دادا! روٹنی
 تباہ چاہئیں دادا، دو تباہ! سہرے ٹک پر لد اسب سامان اس پار کھڑا ہے۔ پل جاوہ زیادہ، زیادہ نہیں ٹوٹا ہے۔ بس دو تباہ مل جائے
 سب کام بن جائے۔ آدمی بھی آئے ہیں، لوہا، سینٹ، اوجار، اوزار، بھی۔ بس دو تباہ کا انتظام، کرو دادا! دو تباہ کا!"

امدادا نے زنج ہو کر کہا: تو ہم کیا کریں بھیا؟ تباہ کہاں سے آئے؟
 راما جان پھیل گیا۔ اس نے تازہ جیسے لمبے آم کے پیر کی طرف اُٹکی اُٹھا دی۔
 امداد ابھیر گئے: کیا کہا؟ کیا کہا؟ تمہارا مطلب ہے ہم اپنے بھوشن کا پٹھان دیں۔ بھوشن کا آم! یہ کبھی نہ ہوگا۔ کبھی نہیں!
 "کبھی نہیں!" اور لپک کر اس کے تنے کو انہوں نے اپنے جسم سے اس طرح چھپا لینے کی کوشش کی جس طرح مرغی اپنے چوزوں کو کسی وقت
 سے پھانے کے لئے اپنے پروں سے ڈھک لیتی ہے۔

کئی فریادی آوازیں ایک ساتھ کئی ٹکڑوں سے نکلیں۔

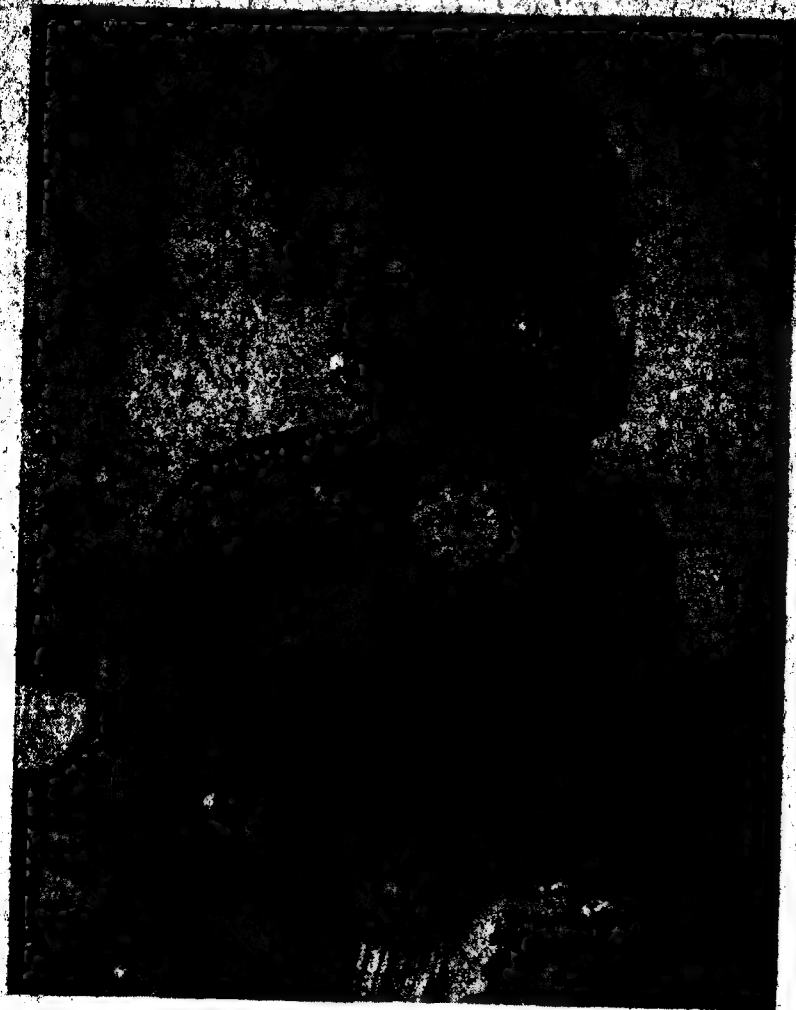
سکھدیر بچیا: مگر دادا پل!

راما نے فریاد کی: اوسے گاؤں؟

اور جگن بہر سسکی: بیا کی بات؟

امرواد کو نہ اس وقت کچھ دکھائی دیتا تھا نہ سنائی دیتا تھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں، ہلنتے ان میں گزرے ہوئے تیس برسوں کی تصویریں گھوم رہی تھیں۔ وہ بھوشن کی پیدائش کا دن وہ ان کا خوش خوش اپنے ہاتھوں سے مولے کاٹنا، وہ بھوشن کا اسکرول کا کچ سے پٹ پٹ کر گھمنا اور وہ اسی ٹیل کے توڑنے کے لئے گولی کھا کر جگن ہو کے گھر میں خون میں نہایا ہوا چڑا ہونا اور وہ ان کا اپنے محل کو گور میں اٹھا کر اپنے مکان کی طرف چلنا۔ ایسا جان پڑتا تھا جیسے پاؤں من من بھر کے ہر گئے تھے، اٹھائے نہ اٹھتے تھے اور انہیں دفعۃً محسوس ہوا جیسے اس وقت لمبی زمین اسی طرح ان کے پاؤں تھا سہ ہے اور انہوں نے کچھ تعجب سے نیچے کی طرف دیکھا۔ جگن بہان کی ٹانگوں میں باہیں ڈالے ان کے قدموں پر سر جھکاتے تھے۔ وہ جسم بھر سے کانپنے لگے۔ ان کا ایک ہاتھ خود بخود اس کی آبروی چوٹی، ٹانگہ کی طرف بڑھ گیا۔ انہوں نے بیروہ کے سر کو تھپتھپایا، اس کی باہوں کو اپنی ٹانگوں سے نرمی سے الٹ کیا اور کھڑکی کی طرف بڑھ کر بولے:

”اچھا! اچھا! لاؤ کھانا اور وہ خود ہی ام کے تنے کو کاٹنے لگے۔ ان کے تیز چلنے ہوئے ہاتھوں کی مضبوط گرفت ان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک اور ان کے چہرے پر دھڑکتا ہوا رنگ صاف صاف بتاتے تھے کہ دونوں ٹوٹے ٹپوں کی صحت اب ایک یقینی بات ہے۔



قوة العين حيدر



قرة العين حيدر

کتابخانه جامع مسجد

رپورتاژ

ستمبر کا چاند

نرگس حسین حید

اور ٹونگت نے کہا
مجھے اب تک وہ زمانہ یاد ہے
جب مورتوں نے ان باتوں کے لیے
تاریخ کے صفحات خالی چھوڑ دیے تھے
جنہیں وہ نہ جانتے تھے
خوبانی کے شگوفے ہواؤں کے ساتھ
مشرق سے مغرب کی طرف اُڑ رہے تھے
اور میں ان کو گرنے سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں

ایڈراپاؤنڈ (تیرھواں کنٹیو)

سین نے ایک روز ایک لڑکی کو دیکھا
 جو ایک چٹان پر لگی ہوئی گھاس پر جھکی رو رہی تھی
 خزان کی ایک خاموش شام
 وہ گھاس تنہائی میں چپکے سے رچا گئی تھی
 میں نے کتاب گھاس پر رکھ دی۔

”آنا دُنیا کے مصنفین۔۔۔“ فرامیسی ادیب نے کہنا شروع کیا۔

”ہم نے ملے کیا تھا کہ کم از کم آج کی شام سیاست کی باتیں نہیں کریں گے۔ دیکھیے ادیبوں کا اجتماع ہے اور پڑھنے کی ٹیبلٹ فارم ہوتا
 جا رہا ہے۔“ میں نے اُنکا جواب دیا۔

”پڑھنے کی ٹیبلٹ۔۔۔“ اُنکی جی تو میں نے بہت دیر تک اُن کی تھامی سے جاپانی ناول میں خود جو دیت کی تحریک کے متعلق تباہ خیالات کیا۔ پھر
 دفعتاً وہ رنگ گیا۔ سانس سے چکر سولہ لگیے والا تھا ہوا اُڑا تھا۔ وہ مصروف تھا اور ہر سانسے خاموشی سے ایک کچھ بنایا کرتا۔
 ”اچھا تو پھر اس سرے کو بلاؤ بیٹھ کر اس سے خود جو دیت پڑھ لیں گے۔“ میں نے بشارت سے کہا۔

”آج خاموش رہا۔“

میں اخبارات اٹھتے بیٹھے لگی جن کے اوراق پر کانگریس کی خبریں، تصویریں، ادارے اور تعدادنی نوٹ چھپے تھے۔ ”آج کل یہاں کے
 اخباروں کو اور کوئی کام نہیں سوا اس کے۔۔۔“ میں نے موضوع تبدیل کیا۔ ”واقعی یہ سب اس قدر ناقابلِ تہین ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ
 اس قدر دھوم دھام سے ہماری خاطر میں کریں گے۔ گویا اپنا کوئی قوی تہاد مار رہے ہوں۔ جو سبے شکست خوردہ قومیں کہیں ایسی ہوتی ہیں۔“

”آج کل نے کہا۔“

”قرب کی ایک لاؤنج میں سے مقہور کی آوازیں آرہی تھیں۔ شیشوں کے طبل برآمدے کے سامنے فوارے چل رہے تھے۔ دوامی
 مصنف بید مجنوں کے راستے پر سے گزر گئے۔“

”اسٹین بک بے چارے اب تک کام میں مبتلا اپنے کمرے میں بند پڑے ہیں۔“ آج کل نے اظہارِ خیال کیا۔

”دو کام کام کچھ نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ ٹھکانا نہیں چاہتے، ورنہ یہ جاپانی مارے عقیدت کے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔
 تم کو کچھ اندازہ ہوا انگریزی زبان کے ادیبوں کی مقبولیت کا یہاں کیا عالم ہے۔“

”واقعی ہر پڑھے لکھے جاپانی نے سارا مغربی ادب گھول کر پی رکھا ہے۔ تین تین یورپین زبانیں جانتا ہے مگر انکسار کا یہ عالم
 کہ بس کچھ جا رہے ہیں۔“

”میں اسی لمحے ایک جدید جاپانی ناول نگار سے مراد ہوئے۔ وہ سامنے کھڑے جھک جھک کر کہہ رہے تھے۔“ اگر آپ کو ہمت
 نہ ہو خاتون انوائڈر چلتے لاؤنج میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ اس کے بعد میرے نہایت ادنیٰ تجویز پڑے میں قدم رنجہ فرما کر چلا۔
 ”راستی جب باہر جاتی ہے تو اس کی اسی طرح خاطر میں ہوتی ہوں گی۔“ آج کل بولا۔ ”ہم نے جلدی سے پروگرام کی کتاب پڑھنے لگاؤ۔“

جمیل کے کن سے ملاتے ہوئے چند فرانسیسیوں نے نئی آبادی میں گلخانہ شروع کر دیا۔ ایک جاپانی عامل نے آزاد مغزوں کے مجھے میں قید رکھا تھا۔
فرانس نے سب سے بڑا مذہبی کام جس میں پچاس سے زیادہ خواتین اور حضرات شامل ہیں۔ فرانسیسی مقبوضہ الجزائر سے ایک سلطان عاتق
مادرنیبل ولید ریش بھی شریف لائی ہیں مگر وہ غالباً خود کو سلطان یا عرب کہلاتا ہے۔ نہیں کوئیں اندامیں جو سے تک انہیں فرنگی ہی بھائی۔ اگاری واکس کے
رکھی ہوئے آندرسے شادوں جو تنظیم کے ہیں اتفاقی طور پر بنائے ہیں یہاں ملی صدارت کریں گے۔ مصر سے سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد جعفر شریف لائے ہیں جو مکہ میں
یونیورسٹی کے ریکٹر ہیں۔ انگریزوں کے اسٹیوٹن اسپیڈر، ایکس ولسن، ایکس ولسن اور مشہور ہنگرین شاد مزاج تاجر جارج کلیش کے علاوہ دس باہ اور ایک کھلی
ہیں۔ ان میں سے ایک ہے۔ سائز کریجرنگ کیسبرج کا تاریخی ادیبی ادب کا اسکالر ہے۔ **Wisdom of the East** کے مصنف ہیں۔
کاؤٹیر اور پشتر بھی۔ اسکل ڈانگ کا نگلیو نیو جی میں مشرقی بعد کی تاریخ کا استاد ہے۔ یہ اور امریکی کاؤٹیرنگین کیسبرج میں ہم ماعت تھے۔ ڈونلڈ کین جاپانی
کا مشہور مترجم اور اسکالر ہے اور کولمبیا یونیورسٹی میں جاپانی پڑھتا ہے۔

مشرقی جرمنی کے اول نگار ڈاکٹر آرنسٹ بے لہائی کے دوست ہیں۔ پچھلے دنوں بے لہائی جب مشرقی جرمنی گئے تھے تو انہی کے یہاں ٹھہرے
تھے۔ ان کی پہلی امریکی بی بی ووجہ ستر ایم۔ این۔ رائے ہیں۔ وہ سری لنکا کی بھی امریکی ہیں۔ یہ پچھلے سال ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں دلی گئے تھے۔
مغربی جرمنی کے نامندوں میں ایک بہت بڑے پچھلے پچھلے اور ووجٹ اور شمشق ڈاکٹر ہلٹھ فان گلیسپ شامل ہیں۔ یہ مغربی جرمنی کی تشکیل دینے والے
میں انڈو وائی اور فلسفہ مذہب کے استاد ہیں۔ کاسٹ اور مشرق کے مذہب، اور غیر مسیحی مذہب، ان کی تازہ ترین تصانیف ہیں۔ یہ علامہ اقبال
کے دوست تھے۔

ہندوستان سے ڈاکٹر سری فراس انگلستان میں جو آج کل آندھرا یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد ہیں۔ ترجیا پل کے ٹال اوپ اور فلسفی
بہت بڑے ایم۔ آر جبرائیل جن کے انمول میں مرثیہ ہے اور جو پہلی بار اپنے وطن سے دور اتنے طویل سفر پر آئے ہیں۔ مرثیہ ادیب دنیا کا ایک بڑا
جو شاید یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر رہ چکے ہیں اور آج کل کرناٹک۔ کالج وچھوڑ کر پچھلے ہیں اور انگریزی تنقید کی دو کتابوں کے مصنف ہیں۔ اچھا آباد کے
اسکول آف گوائی کنگو کی ایڈیٹر کے ڈائریکٹر اور اننگز جوشی، بنگال کے مشر رائے، مرثیہ ادیب پر لکھا گیا ہے، مگر کی فرانسیسی شاد دام صوفیہ وادیا جبرائیل
میں پیدا ہوئے۔ نیپال، راک، لندن اور ہیرس کی یونیورسٹیوں میں انہوں نے منسکت پالی اور قدیم فارسی کی تعلیم حاصل کی اور پچھلے تیس سال سے بہت شدید علمی زندگی
ہیں اور بے انتہا خوبصورت۔ ان کے علاوہ مشرقی کلاؤنگریگری ہیں جو کوئی ادا انگریزی کی مصنف ہیں۔ ان کے میان مٹی یونیورسٹی کے ریکٹر ہیں اور یونیورسٹی
یونیورسٹی کو فیلو ہیں۔ اور آباد کے شری و آتاش ہندی کے مشہور ادیب، جن کو ہندوستان کی نیشنل اکیڈمی آف لیٹرز کی کنیت کا اعزاز حاصل ہے اور جو
آج کل انگریزی کے ادبی رسالے واکٹ کے ایڈیٹر ہیں۔

انڈونیشیہ سے علی بجان سلطان نقیر شریف لائے ہیں۔ جدید انڈونیشی ادب کے پیش رو، فلسفی اور حکمتا کی قومی یونیورسٹی کے نائب صدر ہیں۔
ان کے ایک ناول کا نام "بنارن لگت" ہے۔ یعنی "بکھرے ہوئے بادل"۔ ایک نئی انڈونیشی ٹاؤسٹ بھی آئی ہیں جو خود کو خالص انڈونیشی کہلاتا
پسند کرتی ہیں اور بڑی زبردست قوم پرست۔

جنوبی کوریا سے خاتین و حضرات کی ایک کھپ کی کھپ آئی ہے جن کو سیاسی پریگنڈ ہی سے فرصت نہیں۔ ان سب کو خاصا کام
سمجھا جاتا ہے۔

امریکے نے اسٹینجب، ڈوس، سیس، ایڈرائس، جان ہری، ایڈریچھو، آنگ، در چند سال پہلے جاپانی شہزادوں کی زائیں بھی تھیں اور فلسفہ نگار تھیں

کے علاوہ اور بھی بہت سے بڑے دیکھنے والے تھے۔ یہ ایک کئی نمائندگی فرانس کا یہ جو تھوڑا کر رہا ہے جو تھوڑی ہی بہت ہی کتابوں کا مصنف ہونے کے علاوہ
 باؤنیرودا کے ترجمہ کی حیثیت سے بھی مشہور ہے۔ برازیل کا فرانزوا سینٹینا سینٹینا دے مائیک کی کتابیات کا ہندو فیسر ہونے کے ساتھ ساتھ قانون دان بھی ہے
 ان برازیل کے بہترین کھٹک کا ہے۔ اس کتاب کی ادیب معروف ہے۔ انہیں بولتا۔ قوم پرست بھی کیونٹ ادیبوں سے کہتے ہیں۔

ایک گھنٹہ ہے۔ یہ لوگ جو مدخل ادیب کہلاتے ہیں۔ یہ مشرقی یورپ کے لوگ ہیں جو زیادہ تر مذہبی پائیس اور نیکو کار ہیں وہتے ہیں۔
 پائیس مدخل اور نیکو کار جس کی ایک کتاب تھوڑی کے علمی مسئلہ میں مدخل گاندھی کے لئے ہوتے دیا ہے کے ساتھ بھی ہے۔ اس گروپ میں ہنگری
 مدخل مدخل ہوتا ہے۔ اس کے زیادہ مشہور ہے۔ اس کی بی بی مادام تھوڑی جو ایک بارے کے نام سے کہتی ہیں کسی زمانے میں یہی رہی ہوگی۔ چاہیں گے
 پیش ہیں جس کی اس کی بے مدخل صورت تقریبی ہیں۔ یہ بھی ہنگری کے افراد ہیں۔

فرانسیسی بہت زندہ دل ہیں، انگریز بے مدخل صورت۔ انہیں بکسائی کتابوں کی نمائندگی ہے۔ پھر ہے۔ پر ایسا ایک پیش رہتا ہے جسے مدخل
 ہر ہے۔ ایک مرتبہ لکھنے کے لئے لکھنے کی اتنی عادت پڑ گئی ہے کہ گھر کے سوا اسلٹ کا سب بھی بیوی کو نہیں لکھنے دیتا، خود ہی لکھتا ہے۔ بلند
 کا ادیب معلوم ہوتا ہے کسی مسئلہ پر وہیں جاسوی فرانس ایک کتاب کے چلا آ رہا ہے۔ برازیل والا بھی ہے۔ ان میں ایک معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی مدخل اور نیکو کار
 سب عادت سخت ہو کر ہیں۔ ایک لوگ سن ادیب ایک لوگ سن ہیں۔

ایک عظیم الشان اس منزل عمارت میں جو ایک کئی نمائندگی فرانس کا یہ جو تھوڑا کر رہا ہے جو تھوڑی ہی بہت ہی کتابوں کا مصنف ہونے کے علاوہ
 بعد از جنگ دیگر وہیں کی تعداد میں تعمیر کر لی گئی ہیں، ان کی کئی کئی نمائندگی فرانس کا یہ جو تھوڑا کر رہا ہے جو تھوڑی ہی بہت ہی کتابوں کا مصنف ہونے کے علاوہ
 انہوں کی ترتیب پر۔ ان کے نام۔ بنائی گئی ہے۔ چھت میں بھی مرنی نمائندگی فرانس کی طرح لکھتے ہیں۔ چاروں اور ٹیڈن کیمر سے نصب ہیں۔
 ایک دوسرا پر کئی کی بھی چلی ساؤنڈ پر وف بالٹی میں مزاح طے کے اور لڑائی کے بیٹوں لکھتے دیکھتے ہیں۔ ساری کا مدخل والی کا ایک وقت
 نمائندگی اور فرانسیسی اور ہسپانیائی فوری ترجمہ ہوتا چلا رہا ہے۔ اس وقت کو اسل کے سامنے ہنگریں ارباب کا مسئلہ ہے۔ بند کر کے کا اجلاس ہے۔ لوگوں
 پر سخت سنبھل جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہنگری میں پچھلے دنوں لکھنے والوں پر جو اثر پڑا ہے۔ کتنے ہیں ان کی تحقیقات کون کرے اور کس طرح۔ یہ بھی پڑھی ہے۔
 قی کے لئے یہ لکھنے یا مدخل سے کون جائے اور سوال یہ ہے کہ کئی کون ہے۔
 جاز پر دست لکھنا دفعہ میں پیدا ہو گیا۔ مشرقی یورپ کے نمائندہ ہے ہر انگریز نہیں لکھتے اپنے اپنے بیٹوں کو انماک سے فرانسیسی ترجمہ
 کہتے ہیں دعوت ہو گئے۔

موجودہ پالی تیری نے جوش و خروش سے بولنا شروع کیا۔ یہ پچھلے میں سال سے لندن میں رہتے ہیں، پھر دوسرے ہنگریں پالی انگریزوں نے
 کہا۔ ہرے ان کے بہت سے ادیب پاگل ہو گئے ہیں۔ جوں میں بند ہیں۔ ان کو تھوڑا ڈر ہی کیا گیا۔

کیونٹ ایک کھٹک خاوری سے بیٹھے لکھ رہے ہیں۔ پالی توری کی تقریر کے بعد بڑے زور شور کی تائیاں بھیجیں۔ کیونٹ لکھتے ہیں۔
 ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کے نمائندوں نے بھی کئی دوش و خروش کا انداز نہیں کیا۔ ہندوستان نے سب سے پہلے مصالحت کی پیشکش کی ہنگری کے لئے پہلے پڑا
 لینے کے لئے پہلے دیکھا گیا۔

تب صدر اندر سے تانوں نے ایک نہایت شاعرانہ تقریر کی۔

چونکہ یہ ایسے نہیں اور نہ ہیہ در سیاستدانوں کے پلے اپنے ہیں اور شاعروں کا اجتماع ہے لہذا اس خاص سیاسی مباحثے میں بھی خاصتہ دلچسپی اور اشتہادوں کے ہر طرف سے دیکھا جلتے جا رہے ہیں۔
آئندہ کے آثار و احوال نے کون سے اچھا کر پڑائی کیسی سے کہا کہ میں اس وقت نہا ہوں۔ یہ کہہ سارے بازار برست فیصلہ ہے۔ میں کیا کہوں

کہ ہر جاؤں۔
جہاں کر کے فائدے سے چلا کر کہا۔ بنگلی کرلی۔ ای۔ این کی تحفیم سے فوراً محال باہر کیجئے۔ اصل مگر یہ ادیب وہ ہیں جو اس وقت جلاوطن ہیں مگر نہٹ بنگلی کا کہنی دھندہ اسمتے ہی نہیں جس طرح اصل یعنی ادیب قوم پرست یعنی ہیں مگر نہٹ بین مجرم ملک ہے۔
پولینڈ حکیم ترین شاعر رٹھا، انطونی سولٹی کی یہ ہے برابر بیٹا ہے۔ مگر کہہ حروف تہجی کی ترتیب سے پولینڈ اور پاکستان ساتھ ساتھ نہٹیں ملانے والے اصل پاکستان کو جہاں کر دیا کہ برابر بیٹا چاہئے تھا۔ مگر نہٹ اب کیا ہو سکتا ہے۔ آپ حروف تہجی کی ترتیب تھمائی ہوئی کہتے ہیں۔
استے میں کسی دل جلے نے دل کے دوسرے کرنے سے ملال اٹھایا کیا میں کچھ کہتا ہوں حوامی ہیں یہاں کیوں نہیں ہے؟
پھر چنگا کر شروع ہوا۔

ہندوستان کی مارا م وادیا نے دوبارہ صلہ معافی کرنا چاہی۔

دوسری طرف بنگرین جلاوطن سے ملے جا رہے تھے۔ میں کہتا ہوں ادیبوں کو جہاں لیجنا غلط ہے۔ وہ گرے۔

وہ ادیبوں کو برین واش کرنے کی کوشش کرنا بھی غلط ہے۔ کسی اور گڑبڑ سے دل نے چپکے سے کہا۔

یہ سے باہر بیٹھے ہوئے پوتش فائدے آنکھوں پر ڈالو دیکھ بیٹھے رہے۔

انطونی سولٹی کی پہلو میں بیٹھا ہوا دوسرا دوش ازب۔ ارچہ باغداد سے رہا ہے۔

دل کی ایک اور سمت سے کسی نے کہا شروع کیا۔ یہ کیا باتیں ملک ہے جس میں حوامی چین اس وقت یونین اور شاکی کو کیا ہو رہیں۔

یہ اچھڑیٹوں کا کلب ہے۔

پھر قہہ ہوا ہر ایک فائدے نے اپنے اپنے سامنے کے برے مانیکہ فون اپنی طرف کھینچے۔ انطونی سولٹی کی کہنے پر بنگلی کی سی

سکھا ہٹ ہے۔ جانے یہ کیا سرچ رہے ہیں۔

جب بٹا بٹا کر ہم ہوتی تو سب سولٹی کی نے بنگلی کے مسکے پر کچھ بولنا ہوا مگر انہیں نے زبردست احتجاج کیا۔ وہ خاموش ہو گئے۔

جنوبی کو کیا والا پھر ملایا۔ بنگرین بی۔ ای۔ این خرم کر دینا چاہئے۔

مصر نے کہا۔ اگر ایسا کیا گیا تو آپ کے لئے یہ حقیقتات کہنے کوں جائے گا کرواں امبول پر کیا نظام برے۔ اس وقت تک تو

کے ادیب اس سفر کے نہ بیٹھے ہیں الا قاضی عظیم سے منسلک ہیں۔

اس سلسلے میں پولینڈ نے جو تجویز پیش کی اس پر بنگرین جلاوطن پھر سے۔ ہونا اور کی صبر نہ فرماؤ غفلت کی۔

آزاد دنیا اور آزادی کا غلط بار بار دہرے اور ابد ابد ابد ابدی سوال بن جاتا ہے۔ کہنے والوں کی آزادی، سیاسی آزادی، انسانی آزادی۔

آزادی کیا ہے۔ میں نے سوچا یہ تو بڑا ابد ابد ابدی سوال بن جاتا ہے۔ کہنے والوں کی آزادی، سیاسی آزادی، انسانی آزادی۔

دوسری طرف کے کہنے والے آزادی ہیں۔ جنوبی کو کیا والے نے کوئی کر کہا۔

”جی تو بہت سی اسی ہدیہ پیش کرتے رہتے ہیں۔“ ان جیسے دل سے دوسرے سرے سے جواب دیا۔

”آزادی سے کہا یہ تو مقصد ہے۔“ ایک عین ارب سے لے کر شروع کیا۔ ”ہم کس طرح جنگی کے متعلق فیصلہ کر سکتے ہیں۔“ میں نے فوراً
جواب دیا۔ ”اس سے صرف ایک آئی نے اس نے بال برہمن کی طرف اشارہ کر کے کہا، وہاں مکے گود اور پاسکی شہاد کے فرائض انجام
دے دیں۔ ہم جس میں ایک آئی کی گائی پر بھروسہ کریں گے، اگر کسی فرائض اور برہمنی افعال کے تعینات سے وہ یہ طاقت نہیں رکھتا۔“

میں نے جھلک کر دیکھی کہ وہ جتنا کہہ رہا تھا۔ اب ایسا اس کے کرنے کی آئی تھی۔
اب ختمی دیکھی کہ وہ کہتا تھا۔ ”ہنگری میں محض چاروں ملکوں نے ہیں جو کہ بتایا اس سے بالکل متضاد خبریں بھی پڑھا ہوتی ہیں۔“

دوسری طرف سے، یہ نام کے نام سے نے فرائض میں کیا ہم اس کے نام پر نہیں ہیں ہوتے ہیں اور ہم دوسرے نام کے لیے چلتے
ہیں کہ اس کے لیے کہیں۔

اس میں نے دل میں سوچا۔ آزادی کی طرح اس کی اصطلاحات میں یہ ایک اور عجیب و غریب لفظ ہے۔
”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ شام کو میں نے مشرے سے کہا۔ ہم لوگ ایک شاہی محل کے لیے حکیم ہشام اور ان ضیافت میں ایک میز
کے کنارے کھڑے کچی کھانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

”ہمیشہ ہی ہوتا ہے۔“ انہوں نے کہا، ”پچھلے سال دلی میں جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں جی کیسٹ اور فریڈرک فرسٹ کا جھگڑا شروع ہو گیا تھا
اس میں کیسٹ نہیں آئیں۔“

”مجھے یاد تو گنا تھا۔“ میں نے مچھلی کے کانٹے نکالتے ہوئے جواب دیا، ”مگر میں اپنے آپ کو ایسا غار سمجھتی ہوں اور ایسا انداز کا تقاضا یہ
تھا کہ میں پاکستان کی نمائندگی دلی میں نہیں کر سکتی تھی۔“ یہ ایک تیسرا ملک ہے۔“ فریڈرک انداز میں۔

”میں تمہارا مطلب سمجھتا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔ ”مجھے دھماکے میں بنگالی ادبا کی کانفرنس کے لیے بلایا گیا تھا لیکن مجھ میں ملنے
کی بہت نہیں ہوتی۔“

ایک امریکی ادیب نے قریب آکر کھانے پر اٹھا دیا۔ ”میں آپ لوگوں کی باتوں میں غل تو نہیں ہوا۔؟“ اس نے کہا۔
”جہیں تو۔۔۔“ مشرے سے جواب دیا۔ ”ہم لوگ اپنے خاندانی جھگڑے کی باتیں کر رہے تھے۔ جب ایک خاندان میں یہ جھگڑے

احد دوسرے بھائی اپنے آپ کو آئی مکان کا بڑا کر کے ملکہ ہو جائیں تو اب بہت کم ہوتا ہے کہ ان میں دوبارہ اتفاق پیدا ہو سکے۔“
”صمیمیت تک یہ دشمنی جلتی رہتی ہے۔ نفرت تو دل میں جلتی رہتی ہے۔ گھٹکی بھی نہیں۔“ میں نے کہا۔

اس میں ادیب نے دوسری پیٹھا ٹائی اور اٹھتا ہوا دوسرے گروہ کی طرف پھا گیا۔
مشرے سے آئی سی۔ ایس سے ریٹائر ہونے کے بعد شامی کتین میں رہتے ہیں۔

”میری آخری دستک مرشد آباد میں تھی۔“ انہوں نے کہا۔ ”درمیان میں گنگا ہے، دوسرے کنارے پر راجہ شاہی ہے۔ گنگا میں کشتی اگر چننا نہیں
اُڑھ رہی تو پاکستان میں پہنچ جاتی ہے۔“ وہاں خوب انگلٹن ہوئی تھی اور وہ واقعات سن کر انڈیا پاکستان اصطلاح میں سر کے تنازعات کہلاتے ہیں۔ دونوں

طرف سے گولیاں چلتی تھیں اور لوگ مارے جاتے تھے۔ گنگا کے ہندوستانی کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھ تو ران شاہی کی محل لاٹری کی کوٹیاں نظر آتی ہیں جو اب

”خواب کو۔۔۔ میں نے اس سے کہا۔“ خواب کی رہنے دیجئے۔“
 ”تو تو اتنا زانیہ ہے کہ اس کے نہیں مانا جئے۔“

”نہیں۔“

منظم جنگ کتنی ہو۔۔۔ معاش پر مبنی اور اندر کیجئے مگر جرم جان آئیں ایک جہز جاپانی نوجوانوں کے مچ میں گھرے کھڑے تھے۔ ہال کی سہری اور
 روٹی مشعل بھرت اور چودوں پہلی گنت جہاز خانوں میں جھلک رہے تھے۔ باگنی میں آرکسٹراب ایک بہت پرانی زمین بجاوا تھا۔ شاید سچی زمین اس بجاویں
 برصیائے جاپانیوں کے لیے تھی جو جب وہ ایک نوجوان لڑکی تھی اور ایک سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والے خوبصورت جاپانی مصور
 سے شوق کدہ کی لگا کر مصور اس سے اس سے شے تو سے ایک حسین امریکن لڑکی کی جگہ ایک بوڑھی عورت نظر آئے گی، اچھیوں تو ہیں اور فیروں میں جہز
 سیوں کو دلوں میں مضبوط ہے۔ یہ سب شک بالکل ہے۔ شکر ہے۔ مرنے والی ہے۔ جگہ امریکن جڑیا۔۔۔ اور وہ خود جہز تھلا سیک لگائے سفید بالوں
 سر کے سر جہاز پر اسے امداد اس جہز کی انکھوں والا ایک جاپانی بوڑھا جگہ کا یا شاید وہ آگاسا کی میں ختم ہو چکا ہوا اور اس جڑیا کو غلا اطلاع ملی ہو کہ وہ زندہ
 ہے اور اس وقت اسی رحمت میں ہو رہا ہے۔

خوبصورت لڑکیاں اور وہ ہیں امریکن اور جاپانی، خوبصورت خوش وضع نوجوانوں سے لنگھیں مشغول ہیں۔ آرکسٹراب ایک نئی زمین بجا رہا ہے
 روٹی کیسے لگ رہا ہے۔ ایک سیاہ آنکھوں والا جاپانی شاعر ایک حسین اٹالی لڑکی کو ایک نظم سن رہا ہے۔
 ”نہیں۔۔۔ میں نے دیکر جڑیا سے کہا۔“ اس سے کہی نہ ملے گا۔ خواب کو خواب ہی دینے دیجئے۔“

دوسری بیچ کا گھر اس کا کھلا انتہائی اجلاس تھا جو ایک بہت بڑے ہال میں منعقد کیا گیا۔ اس روز ناظرہ سوکھی اور غیر ملکی اور بہن کا مجمع تھا۔ بیچ
 کیسے آگ کا جس مختلف اقوام کے جہتھے، پائیس کے فائدے۔

اوپر پرندہ پر مشرک آگ جاپانی کے سب سے بڑے ناواٹھ نے انتہائی تقریر کی جس کی انہوں نے ایک جہز فنی فنی کے مقولے پر ختم
 کیا۔ بھائی کی یہ بات ہے اتنی دور دور سے دوستی کے لئے آئے ہیں؟

ان کے بعد جاپانی وزیر خارجہ بولے جو مصور ملی ہیں۔ آندے شائع نے ان کو جواب دیا۔ ”بھائی جنگ ہیں ہم میں سے بہت سے
 ایک دوسرے کے دشمن تھے یا دوست تھے۔ جنگ کی قربانی ہمارا مشترک ماضی ہیں اور ان کے سامنے بھگے ہوئے سب ہیں کہ ہمارا مستقبل کیا ہوگا۔
 جنگ کے بعد بہت سے جاپانی نوجوانوں کو وار پیرنل کی طرف سے نوازے موت ملی تھی۔ مرنے سے پہلے ان لوگوں نے جو خط لکھے ان میں سے ایک
 ہیں شاعر نوجوان نے ان کو صرف آنا کھا تھا،

”میں نے فقط مل کاغذ پر لکھا ہے اور میں اسے دیکھ رہا ہوں۔“

یہ میں مارا ڈکا جو مرنے کے لئے جا رہا تھا انسانیت کے اس پورے ڈرائے کو اس نے اس مختصر سے جملے میں قلمبند کر دیا۔
 دنیا کے انہی۔ کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم بیس سالہ لڑکیوں کو موت کے سامنے سے آزاد ہو کر زندگی کی روشنی میں ملکی کا نظارہ کرنے

کا موقع دیں۔۔۔“

”تایوں کے شر میں باوام صرف وہاں نیلی مادی پہنے بڑے دھارے پہنی ہوئی ماسٹائیں۔ ہاتھ اٹھا کر سنا کر کیا اور اونچی، پراعتلا اور صاف

میں نے کہا تھا کہ

”جی روٹی اور تاشی کو کشتی آپ لوگوں کے ساتھ ہے۔ میں ہندوستان کے عوام اور ہندوستان کے ایروں کا حکم کے تحت کے دل سے بچے شروع کے ملک میں آئی ہوں۔ مجھ پر ہندوستان کے نائب صدر کا کھڑا رکھنا اور کشتی میں داخلہ لینا ہی۔ ای۔ ای۔ ای کے نائب صدر میں ہندوستان کی تاریخی اجتماع میں شریک نہ ہونے کے چوٹی کی ایک ایشیائی ملک میں مختص ہونا ہے۔ اس کا کھڑا رکھنا کشتی نے کہا ہے: ”میں کا کھڑا دنیا کی تاریخ کے ایک بے حد تک کوڑ چھوڑ رہی ہے۔ ہمارے سامنے قومی مسئلہ ہے کہ ہم مشرق اور مغرب کے درمیان راہری اور باہم عزت کی بنیاد پر نیا رشتہ استوار کریں۔ ہمارے سامنے قومی مسئلہ ہے کہ ہم ہرگز ہرگز کسی حالت میں دنیا میں جنگ نہ چھڑنے دیں۔“

اب جان آجین بک آئے اور ایسا لگا جیسے سوتے سوتے جاگے ہیں اور انہوں نے انہیں کی سی آواز میں کہا: ”دو خاتین و حضرات۔ میں بے حد خوش ہوں اور بے حد میری عزت افزائی ہوئی۔ لیکن یہاں میں بالکل بھوکھا کھڑا ہوں۔ مجھے آج صبح تک نہ معلوم تھا کہ مجھے ملی ہوئی ہوگا۔ میں بہت مختصر تقریر کروں گا۔ میرا اس کانگریس سے بہت قریبی تعلق ہے۔ یہ ایشیا میں پہلی کانگریس ہے اور اہمیت یہ ہے کہ میری ملی ہوئی پہلی کانگریس ہے۔“

جب میں نیرادرک سے چل رہا تھا تو ایک دوست نے کہا تھا: ”فکر نہ کرنا۔ بس سنتے رہنا۔“ میں جاپان کی بک کا ٹیگڈا ہوں۔ یہاں اگر مجھے معلوم ہوا کہ صرف منہ ہی کافی نہیں خورے سنا ضروری ہے۔ اب میں بیٹھ کر خورے سنوں گا۔“ اور وہ واپس جا کر بیٹھ گئے۔

محدود ری اسٹین بک نے۔ یہ کیا حرکت تھی۔“

”مستوفی تھا اچھا ناسا۔“

”مقام ملایا کی تقریر کمال کی تھی۔“

”مبارک ہو مسٹر جی! آپ کے دفعہ کی ایڈ نے بہترین تقریر کی۔“

”مگر بھئی اسٹین بک۔“

لوگ ڈال سے باہر نکلا شروع ہوئے۔

مقام آیا کو لوگوں نے گھیر لیا۔ سرنیڈت کا سا اشکل چاندی کے ایسے بال بے مدد و بصورت۔ آج سے پندرہ سال قبل کس قیامت کی حسین رہی ہوگی۔

”یہ انڈیا ہمیشہ اس طرح کے اسٹین بک ہے۔“ ایک پاکستانی مال کے باہر لڑی میں چننا کرکٹ سے کمر ہے تھے۔ ”کیا ساری دنیا کی کھوکھلیاں انہی ہی نے لے رکھا ہے۔“ اس اور تندیب اور غنا اور جھکا۔ ”انڈیا نے بہت پر نکالے ہیں اور کچھ لینا بہت جلد منہ کے بل گروے گا۔“

”ہم لوگوں نے ملی ان کی تقریر کو پسند نہیں کیا ہے۔“ امریکن نے کہا۔

”جی ہاں! تو میری دیکھ رات۔ آپ لوگ سب جنس سے تھے۔“

ابو الغصہ راجہ جو پاکستان کے اس وقت کے وزیر تجارت تھے، بنگالی کے صفائی اور نظریاتی کارکنان سے اس کانفرنس میں آنے والے تھے مگر کراچی سے روانہ ہونے سے ایک روز قبل مرکزی حکومت میں کرائس ایجنٹ لہذا انہوں نے سفر ختم کر دیا۔ ان کی جگہ پاکستان کے فیڈرل گورنمنٹ کے ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے کانفرنس میں شامل ہوئے۔

وہ پہلا شخص تھا جس نے کہا کہ پاکستان کی صنعتی ترقی اور دولت کا منظر تھا۔

چنانچہ وہاں میں میری ایک بیزر ایک مغربی پاکستان کے صاحبزادے تھے۔ ایک جاپانی نے جو برابر کی کرسی پر بیٹھا تھا ان سے کہا کہ میں اس قدر خوش قسمت ہوں کہ ٹیکس سے ملاقات کا شرف حاصل کر چکا ہوں، وہ صاحبزادے جاپان آئے تھے۔

پاکستانی مہمان اس بات کا کافی جواب نہ دیا۔ جاپانی نے گھبرا کر ان کو دیکھا اور پھر خود بھی چپکے چپکے شاید اسے احساس ہوا کہ اس نے غلط بات کہہ دی ہے۔ اس کے برابر میں دوسری طرف مشرقی پاکستان کے ایک اریب بیٹھے تھے اور شاید اب تک وہ دونوں ٹیکویری کی باتیں کر رہے تھے مشرقی پاکستان کے اریب بھی، پھر بنگالی کی اندر خواہ وہ پاکستانی ہو یا ہندوستانی ٹیکویر کے پرستار تھے مغربی پاکستان کے مہمان کی معنی خیز خاموشی پر وہ بھی ہنس برنگے۔ چند لمحوں بعد مثال میں بیٹھے ہوئے ایک یورپین نے دوسرا موضوع چھیڑ کر بحث کو سنبھالا۔

میں نے مغربی پاکستان کے ان مہمان سے آہستہ سے کہا: ”ٹیکویر کے مسئلے پر آپ کی کیا رائے ہے؟“

”جی۔۔۔۔۔“

”میرا مطلب یہ ہے کہ ٹیکویر بنگالی کا عظیم ترین شاعر ہے اور بنگالی پاکستان کی ایک سرکاری زبان ہے تو اس وجہ سے ٹیکویر بھی پاکستانی شاعر ہوا؟“

”میری نگاہ میں نہیں لگتا آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“

”دیکھئے میں عرض کروں۔ میں نے غلامی کیا۔۔۔۔۔“ آپ مذلا اسلام کو بڑا زبردست پاکستانی شاعر مانتے ہیں جس غریب کو پاکستان کے

وجود کی بھی خبر نہیں اور وہ لکھتے ہیں بڑا زندگی کے دن پرے کر رہے تو پھر ٹیکویر کو آپ پاکستان کا شاعر کیوں نہیں مانتے جبکہ آپ کو مشرقی پاکستان کے ہر گھر میں قائم اسلام کی تصویر کے ساتھ ساتھ رابندر ناتھ ٹیکویر کی تصویر بھی دیواروں پر آویزاں نظر آتی ہے مطلب یہ کہ اس بے چارے جاپانی نے اسے اخلاق کے ٹیکویر کے متعلق آپ سے بات کی تو آپ خاموش برنگے اور وہ بے حد کھینچا ہوا۔ سوال یہ ہے کہ ٹیکویر کی تقسیم کے بعد ٹیکویر اور اقبال جیسی عظیم بین الاقوامی ہیرو کو کس طرح تقسیم کیا جائے۔“

انہوں نے اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ میں ناچار پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”کل ہیست نیلادہ جگہ گھڑا اردا ہنگری کے معاملے پر۔“ میرے بائیں طرف بیٹھا ہوا کوئی کہہ رہا تھا۔

”میرا خیال ہے اب ہم لوگ ذرا ٹیکویر کی طرف بھی توجہ کر لیں تو بہتر رہے گا۔“ میں نے کہا، چون تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ کانگریس ادبی مسائل

پر تبادلہ خیالات کرنے کی غرض سے بلائی گئی تھی۔

تیسرے روز کو کو ساتھی ہاں میں پھر ایک ٹیکویر کو نسل کا جنس سنسن تھا۔ اس میں ہنگری کے مسئلے پر مزید گفتگو رہا۔

لیکن اب لوگوں کا گھنچاؤ کم ہوتا جا رہا ہے۔ اب وہ اس سارے مسئلے سے غلط طور پر ہے جی۔۔۔۔۔ جی جی جان بھوجان کے بھابھ روز تھوں

گھر جتنے جا رہے ہیں انسانی دشمنے اتمار ہو رہے ہیں۔ یہ سب لوگ ایک ہی پاسہ وہ آٹس لینڈ کے ہیں چاہے وہیت نام کے ہیں کے جنات ایک سے ہیں ایک سے روکل۔ ان کو سیدھی آئیڈیالوجی کے تحت جدا کر دو مگر یہ سب انسان ہیں گے اور جو ان کا یہ حقیقی ایک بار باور چاہے گھر وہیت سے بڑا غم ہے۔ دیکھو اپنے **unguarded** کلمات میں اسرائیل کے یہودی نے مصری عوب کے کسی لطیفے پر ہنس کر دلا دی ہے۔ بنیادی کا یہ پہلی ہنس کے ساتھ مل کر کسی بات پر قہر ڈال رہے بغیر بنگال کے نمائندہ سے نے مشرقی پاکستان کے نمائندہ کے ساتھ بنگالی ہل ہل کباتی سب کا ہتھیار کو بیا ہے۔ شام کو ہم سب ترکی سے باہر ایک پرستان کے ایسے باغ میں مصرانے کے لئے جاتے ہیں۔ میان بڑے پرکڑی کے ٹی ڈوس میں کاغذی تھیں۔ روشن ہیں۔ پاش کے دشمن کے پیچھے سے وہ مٹی کا پانڈ طرح ہو رہا ہے جس کی روشنی میں باغ کے پھول کھل کر رہے ہیں۔ ہنر سے پگھلیوں کی طرح آگے ہوتی گیتیا حزیں صانوں کی تو اس کر رہی ہیں۔ سامنے ان کا ایک اور گروہ اپنے کلاسیکل قص رکھا رہا ہے (جسے محمد عمری اور بے جان ہیں) ٹی ڈوس کی سرسبز پہاڑی ساندوں کا اگر شرافت بے عمری کو سستی بجا رہا ہے۔

ایک بے حد خوش شکل جرن کیتھولک فادر جو یہاں کسی ریورسٹی میں ادبیات کا استاد ہے (روٹکیر میں) ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰

جی ہوتی۔ سوخنے لگی مٹی کی کھیتیاں جانے کے لئے اترتی سے نکلتے۔

صبح — دیکھ اپنے کام پر جا رہا ہے۔ یہ نہ ریشیاں، نہ خاتراؤں کا رخانے جاگ اٹھے ہیں۔ ہر س کے دو دھندوں کے نیچے کھڑی ہے صاف ساٹھ
نیچا، مہم میں ہوا پانی کی کڑکڑاہٹیں جھک جھک کر ڈالیں۔ یہاں کا استقبال کر رہی ہیں۔ شہنشاہی چٹائی سرگودھ پر جن کے دونوں طرف
داروغہ منت بھی، ٹھیک کا سمندر، شاہیں مدد رہا ہے۔ چار ماہوں پر، ٹھیک کے عادات سے مارے جانے والی کے اور دو شہر کرک کے اسکو
داروغہ پر جہتے جا رہے ہیں۔ — اس وقت تک پندھارے گئے، ستائیس زخمی ہوئے۔ بائیس مارے گئے، اب پاس زخمی ہوئے تیس مارے گئے۔
زندگی کے اس جنگ سے بے نیاز، اپرل حملات کے گرداگرد خندق میں مہاجر ہنس گرنے والے شہر کو کون سے پانی کی تیلی فون پر تیر رہے
ہیں۔ اس قدر میں منظر ہے جو دنیا کے کوئی شہر میں نہ ملے گا۔

شہر کے وسط میں شاہی محلات ہیں جن کے چاروں اور کیسیل کی دست میں پائوں کے جھنڈ پھیلے ہیں۔ ان باغوں کو خضیل نے گھیر رکھا ہے اور
خضیل کے گرداگرد بے حد جھڑپاں ہیں اس فیٹ گری خندق ہے جس کے کناروں پر یہ جھنڈ جھکے ہوئے ہیں۔
اس خندق کے چاروں اور ڈکھیرا باد ہے۔

محل کے صدر دروازے کے پل پر کھڑے ہو کر دیکھتے تو پارک کے آدھروہ عمارت نظر آتی ہے جہاں تک آتھرا تھا۔
راج ہنس ناہار کے ابھی بچپانوں سے بے نیاز پانی پر تیر رہے ہیں۔ دوسری خندق کے کنارے کنارے چڑے ابھی پہلے گزرتے چڑے
ان راج ہنسوں کو دیکھتے ہیں۔

مغربی ادیب، ابن جلدی تہذیب وضع کی مہموں کے آرام دہ گریوں پر بیٹھے ان کے درمیان میں سے جھانکتے ہوئے، جن کے گھوڑوں میں بھول جے
یہ تھوڑے دیر کی علامت یہ خندق اور شاہی باغات کے ٹھکانوں پر کھڑے پائوں کے درختوں اور سانچے کے پتوں کو لیکر کر جانے کیا سمجھ رہے ہیں۔
بیس اگے پیچھے مٹی کی کھیتیاں پھلتی ہیں۔ مٹی کی پارش شروع ہو چکی ہے۔ فل بوٹ اور برساتیوں میں جیس، ٹوکیو کے شہری، انگریزوں کی سی
غیرہ شہر کی بنائے ہوئے ہوئے گھر رہے ہیں۔ ساتویں فلور کے ایک کمرے میں قیام جا پانی پھونکنے کے ٹوٹوں کی نمائش کی جا رہی ہے۔ جگہ جگہ دیواروں
میں لگے ہوئے ڈاڈا پیکر سے یورپین نابالوں کی مختلف نام نہان منٹ کے عمارت رہے ہیں۔ کوکرائی ال کے اوپر توکی میں سب معمول باتوں کی بھینسا بہت شروع ہو گئی
ہے۔ پریس والوں کے گردہ اور اچھڑاؤ دیوہیتے پھر رہے ہیں۔ ایک کاؤنٹر پر قہہ تیار ہو رہا ہے۔ منہ میں ال کے باہر توکی ہل میں سے اپنے اپنے نام آتے ہوئے
خفیات اور اچھڑاؤ پھر نکال نکال کر دیکر رہے ہیں۔ یہ مغربی مائٹرز جو پچھلے دو سو سال سے دنیا کی تہذیب کے ممبر رہنے ہوئے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان کو معلوم
ہو کہ ان کا زمانہ زہنت ہے۔

یہ مشرقی اقوام کے عروج کا زمانہ ہے۔

چاروں اور بے حد دلچسپ گفتگو ہو رہی ہے۔

نزدیک شرم سے پانی پانی ہے اور اپنے ماضی کے جواں کا کنارہ دارا کے کی خاطر پیشا پزیر غصہ پھٹنے کی کرشمش کر رہا ہے۔ بارہا تلو تلے انگلی
ہائے اس دنیا کے نگار سے میں معروف ہے۔ ٹیلی وژن ایشین، ہینے، انڈیا اور انڈونیشیا، تھیر، فلم، ٹیوی، ڈراما، اسٹو، اداکار، مصور، ادیب، سیاست دان
ہندوں، کھ رہا، یورپ، ریشیاں کے پروفیسر — یہ کیسے عجیب و غریب لوگ ہیں۔ یہ کن ان کو کئی نسل ہے کہاں سے آئی ہے، ایشیائی ماضی میں
اس کی داستان کا پتہ باب کس سے شروع ہوتا ہے —

ہلی کے دیہیوں کے باہر بارش شروع ہو گئی ہے۔ رفتہ رفتہ دھند بڑھتی جا رہی ہے۔ سنہرا کمرہ آسمان پر سے اتر رہا ہے۔ وہ در ملک عمارتیں پہنچا گیا ہے۔ باغوں پر برس رہا ہے۔ لاونچ کے ایک کونے میں اٹلی کا ایک کیتھک دانشور نما مرش بیٹھا ہے۔ اس کی روح اس دھند کے کوہر کی گلیں پا گئی ہے، پتہ نہیں کہ کس کو یہ حق ہے کہ دوسرے کے گلیان کے متعلق فیصلہ کریں۔

پہاڑیوں پر چوہا بانیسری بکاتا اپنے گھر کی اور ہمارا ہے۔ باغوں میں سائیں کے پھاگلوں کے نیچے سے رکیں پھول اٹھائے گزر رہی ہیں۔ شہر میں جہاں روشن کر دے گئے ہیں۔ دھند بڑھتی جا رہی ہے۔

اب سب چیزیں دھند کے میں ڈوب گئیں۔ سورہ ریوی کے سینے پر دو بڑے گھل اسی الوہی کو سے میں چھپ گیا۔ خندق کا نیگیں ہانی آسمان کی سیال روشنی سے جلا۔ اب زمین اور آسمان ایک ہی۔ و جرد اس روشن خاص میں لگایا۔ (یہ تین نشانہ کا احساس ہے) وقت کا شکر کا ہن اپنی قدیل سے راستے پر چپکے کی اور چلا۔ قدیل کی کو بچی کر کے اسے تیز ہواؤں کے تھیروں سے بچاتا پہاڑی پر چڑھا اور بانس اور پاش کے تالیک جھگڑیں میں لگا گیا۔

جھگی میں بڑے بڑے سرخ رنگ کے چھوٹے چھوٹے تنوں سے جن کی کو کپڑوں میں چوران جل رہے تھے۔ جنگل کے چاروں طرف ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ تھا اور خاص وسعت کا احساس۔

شکر کا ہن نے قدیل اپنی کر کے کہا۔

ابتدا میں آسمان اور زمین ایک تھے اور ماضی انتشار تھا۔ اس انتشار میں سے لطیف تھہر اوپر اٹھا اور آسمان بنا۔ نفوس تھہر نیچے گرا اور زمین کی تشکیل ہوئی۔ ان دونوں کے درمیان سے مٹا ایک شے برآمد ہوئی۔ جو خدا تھا۔

پھر چار دیوتا اور پیدا ہوئے اور انہوں نے سات مزید دیوتاؤں کو جنم دیا۔ ان کی آخری اولاد آزاگی دینا کا اور آزانامی دیوی تھے۔ آزاگی اور آزانامی کی اولاد ————— جاپان ہے۔

جاپان دیوتاؤں کے حکم سے پیدا ہوا۔ مسندوں پر بیٹا ہوا ملک۔ آزاگی اور آزانامی انسانی طرح کی مخلوق بن گئے تھے۔ انہوں نے دیوتاؤں کا پوجا ہوا میرے براہ راست کا نیز دھند میں ڈوبا اور مسند کا جھاگ جھاس کی نوک پر لگا اس کے گرنے سے یا تا کوئے آٹھ جزیروں کی تخلیق ہوئی۔ اس کے جانا آزاگی دینا اور آزانامی دیوی کے جہاں جاپانی نسل پیدا ہوئی۔

آزاگی اور آزانامی کی پہلی اولاد مسند دیوی اور چاند دیوتا تھے۔ ان دونوں کے یہاں دو مارے دیوتا پیدا ہوئے ہرکاتات پر سکوائ کر تے ہیں۔ آگنی دیوی کو جنم دیتے وقت ربی آزانامی گر گئی اور اس کا آسمانی شہر فروغ تھنے کے عالم میں اس کے عجیب عجیب حرکت کی دنیا تک جا پہنچا۔ لیکن آزانامی اب پاقل کی دیوی ہو گئی تھی۔ دینا واپس لوٹا اور سورج کے محل میں رہنے لگا۔ اس وقت زمین اور آسمان قریب قریب تھے۔ جب زمین آسمان سے دور چلی گئی تو سورج دیوی نے اپنے پوتے کو تیز کر جاپان کا پہلا شہنشاہ بنا کر دنیا میں بھیجا۔

جاپانی دیوتاؤں کی اولاد ہیں۔ جاپانی کا شہنشاہ مسند دیوی کا بیٹا ہے۔ یہ جزیرے متحد ہیں۔ ہماری قوم متحد ہے۔ ہلکے آباؤ جد ابھی ہیں۔ کاہن قدیل میت اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

اور شاعرانہ انداز میں صحت نے اپنی رنگوں کے دھاش کی تکنیک کو رنگوں اکمل میں مانج گیا، عبدالرحمن چشتی بھی بنگال، اکمل کے شاگرد تھے،
تو اس کے شاگرد باد میں شاہجہاں کا اجتماع ہوا۔ خود شمشاد شامی کو کہتے تھے۔ سترہویں صدی کے ایک شمشاد کے شاگرد ہیں:

فولن نہ کہیں پڑتی ایش مات کے سے
پٹائی کے چمت مائے فارسی تیر پڑوں میں سے عشق
سوئے ہوئے کس افس کی آئینہ دل کو بگھونٹے ٹال رہی ہے
اسی شمشاد کی بیٹی کی نظم ہے:

موج بہار گزرتی چکا
لاگو کی پھرتی بھولوں پر
نئے دھڑلے ہوئے پکڑے
سفید بادلوں کی طرح پھیلے ہیں
ایک اور شمشاد نے کہا:

ہزاروں جھڑپڑوں میں سے دھواں
بل کھاتا اٹھ رہا ہے
سند پر سفید مرغابیاں اڑتی ہیں
دھان کے کھیتوں کی سرزمین! جس کے لئے ہم جیتے اور مرتے ہیں
یا اٹھو۔ متبرک ملک۔!!

اسی صدی میں شہزادی فرکا آئے کہا:

نرم سوا میں سے بہار برآمد ہوئی
پرنسوں کی چمک سے جگمگ اٹھ اٹھے
ان گئے کھنڈ میں سے گزنا آسمان نہیں
جہاں گھڑ پڑیوں پر کھیلوں کے انبار لگے ہیں
لیکن پت جھڑکے جیسے ہیں
زیں ان وادیوں میں ٹھون پتے پتے ہیں
یہ سب لئے خزاں کی پہاڑیاں کافی ہیں!

ایک اور شاعر نے کہا:

خزاں پتوں پر چلتے ہوئے
ہیں اکیلے ہرن کی پکار رہا ہیں
پت جھڑکا دم کرتا آواہ اس ہے!

اسٹوری صبری کے اور جس مدار اسطاعت کہ تیرا میں منتقل ہو گیا۔ اب ادب کا پیشہ در شروع ہمارا چار سو سال تک قائم رہا۔ یہ نانا نانی
میں وہ مشیت کا تھا۔ وہ بار میں ایک شدید مصروف اور رنگت تہذیب پر وہاں چھ رہی تھی۔ باضابطہ مگر شاعری کا کام کیا جا چکا تھا۔ شاعر ہوتے تھے۔
اور اور شہزادوں اور بیگمات سب شاعری کرتی تھیں۔ سبھی زبان اور ادب کو اب بھی وقت حاصل تھی۔ بدعت کے زیر اثر دنیا کے فانی ہونے کا احساس
شدید تر ہو چکا تھا۔ سوسائٹی میں خواتین کی اہمیت خود ان کا اعلیٰ درجہ اس حد کی خصوصیت ہے۔ اس زمانے کا سب سے بڑا شاہکار چار ہزار صفحات کا ایک ناول
"گنجی کی کہانی" ہے جو تیس کے لگ بھگ خواتین کی ایک خاندان کی ایک خاتون نے تصنیف کیا۔ اس ناول کو جاپانی ادب میں وہی اہمیت حاصل ہے جو انگریزی
میں سٹیکن کے آریٹیا اور فیوٹنگ کے ناولوں کی ہے۔ اس حد میں اور بہت سی خواتین نے ناول لکھے جو کچھ تک ایسی دیکھی سے پڑھ سکتے ہیں۔

اس حد کی شاعری نے بھی اپنی قدیم قومی روایات برقرار رکھیں۔

بطعین گھر کی طرف پرواز کر رہی ہیں

خوش کے چاند کی روشنی میں ان کے پر چلتے ہیں

جہاں پر اکیلے کوئل چلا رہی تھی

میں بھی کیلا تھا۔

میں نے اس کی آواز کی طرف نظر اٹھائی

گولھے صبح کے پیکے چاند کے وہ

اور کچھ نظر نہ آیا

جب میں اپنے گھر کو خود اس خط کہہ کر چلا جاؤں

اور میرا گھر منساں پٹارہ جائے

میرے چہرے کے قریب آگے ہوئے آگے چہ کے درخت !

ہمارے موسم میں اپنی گلیاں کھانا نہ بھولنا۔

اور سرور تھقے لگاتی، موسم گل کی بیکان دھوپ !

اتنی بے صبری سے میری کے شگفتے کیل گز رہی ہے ؟

پیارے پہاڑی چوٹی کے درخت

آؤ ہم تم دونوں خوش ہو گئیں

کیونکہ ہمارا اور کوئی مددست نہیں ہے

میرے بھائی !

ہاں صریحاً سے لے کر محسوس صریح تک۔ جاپان مستقل خاندان کی حکومت کا تصور۔ جاپانی ادب سیاسی انتشار سے پناہ لے کر علم و ادب خانقاہوں میں جا چکا۔
 انسانی کونٹنگ گمراہ کر گیا۔ نواں تیرہویں ایوانِ افق سے غائب ہو گئیں۔ ادب میں سیاسی اور جنگجو عناصر آ گئے۔ تاریخ پر کتابیں لکھی گئیں۔ اسی زمانے میں جاپان کا شہر
 توتھامار پیدا ہوا جس کی بنیاد ہم صحت انگیزان **Miracle And Morality Plays** کی طرح مذہبی لقی شہنشاہِ مہندریل کا ڈانس ڈراما
 اس کا پس منظر تھا جس میں دیوتا سبیاں جھول درغیر کی کسروں پر پناہ پتی تھیں راجہ کی اسی طرح ناپتی ہیں، سینکڑوں توتھامارے کھسے گئے شہنشاہ راجہ جاگیر دار
 ساجھنے ان کی سرپرستی کی۔ ان ڈراموں کا ہیرو عموماً ایک راہب ہوتا تھا۔ پھر اس میں مزاحیہ عنصر بھی شامل کر دیا گیا۔ آج تک توتھامار جاپان میں وہی تعظیم کا مال ہے۔
 توتھامارے کی شاعری کا ایک نمونہ ہے:

چاروں ہمندریل پر ہمیں ماکت ہیں
 دنیا پر سکون طاری ہے
 وقت کی ہوائیں آہستہ آہستہ چلتی ہیں
 ایسے زمانے میں وہ منور بھی بابرک ہیں
 جو اکٹھے پورٹسے ہوتے ہیں
 ہم خوش قسمت ہیں جو اپنے قابلِ قدر آقا کے اس حمد میں پیدا ہوئے
 محرومِ رب ہے
 اور کہہ منور کے درختوں پر گدھا ہے
 سدا بہار درخت
 وقت کے خاتم کی علامت بنے کھڑے ہیں
 درخت جو اکٹھے پورٹسے ہوتے ہیں

سنہ ۱۸۶۵ء تک فیوڈل ادب کا نازا ہے۔ تو کوگاوا شونگ ناٹماں کے دورِ حکومت میں ملک میں اس پھیلا اور تہذیبی اداروں کو برباد
 فروغ حاصل ہوا۔ جیو کائیکس اور کنیو شس کا فلسفہ ایک بار پھر سے رائج ہوا۔ یہ وہ موجودہ فکر کا نیا شرک کا نیا شاہان و شہزاد اور تہذیبی سرگرمیوں
 میں کچھ لڑکے شاہی دارالسلطنت سے بازی لے گیا۔ بدھ مت کا اثر کم ہوا گیا اور قدیم شہنشاہِ بدھ کے زبائر شہنشاہِ قومی شہنشاہِ آگے بڑھی۔ ادب کو بہت زیادہ ترقی
 حاصل ہوئی۔ ہر صریح پر ان گنت کتابیں لکھی جانے لگیں۔ قدیم چین کے یائٹ اور پنگ کا فلسفہ جو ہندو اہلیات کے پرہیز اور شہنشاہ کے نظریے کی مانند ہے، یہاں
 بھی بے حد مقبول ہو گیا۔ یائٹ ثابت، مذکر اور متحرک ہے۔ بین منشی، نرٹ اور غیر متحرک ہے۔ یہ قدرت کی مدد تھیں، جیو کی کاروائی سے دنیا کی تشکیل ہوئی ہے۔ اس
 فلسفے کے سرشِ اخلاقیات اس شرکِ سماج کے لئے بے حد کامیاب ثابت ہوئے جس میں فرض کو بڑی زبردست اہمیت حاصل تھی۔ نئے طبقے کے انسانوں کا فرض تھا
 کہ اپنے طبقے کے انسانوں کی امانت کریں۔ اور اپنی طاقت صرف متفق کا ملک تھا، خالق نئے طبقے کو سوئپ مٹے گئے تھے۔ اس زمانے کے ادب کا ہیرو
 سمرٹائی ہے۔ سمرٹائی سماج کا آئینہٴ انسان تھا۔ بات بات پر طعنے والا، اہلی نامان، آن بچان مینے والا بالاکسمرٹا۔ اسی فیوڈل حمد میں عورت
 تقریباً پردے میں بٹھادی گئی۔ طوائف یا گیشا کا عروج ہوا۔ وہی مادل کی ہیروئن بنی۔

اب یہ وہاں اور اسکا میں چھاپے خانے کھل گئے تھے۔ سماج میں سب سے اونچا درجہ سمرٹائی کو حاصل تھا اس کے بعد کارگیروں، کسانوں

اور تاجروں کی باری ہوتی تھی یہ گرو جاپان کے جہاد میں آئیں تھے۔
فیروز علی صاحب دکن کا جہاد تھا۔ وہ اب بھی شہر میں تھا لیکن پہلے غیر مذہبی تھی پھر مذہبی کی بنیاد پر سولہویں صدی میں ایک دور آج نے شمالی و جنوبی ہند کی
مذہبی سے بھاگ کر آج کل تھی اور اب گرو جاپان کا جہاد تھا۔ یہی تھی کچھ عرصے بعد ان کی ایک منزل سے کرید و پل آئی اور ان کی تیسرا کام کیا۔
وہ اور ان کی کے جہاد کا تیسرا جہاد تھا اس ملک میں کئی صدیوں سے شہر ہے۔
فیروز علی صاحب کی شادی۔

یہ راز وہ پہانتا تالاب
لو اس میں ایک مینڈک کو برا
ذرا یا پانی کی جھبہ روتو سنو!

اگر فی سیرت کی ادبی روح کو دیکھنا چاہتے ہو
تو پہاڑی چیری کے شگوفے پر نظر ڈالو

دنیا جس میں سے ہم گذرتے ہیں
بارش کی پھوار سے بچنے کے لئے ایک ماہبان ہے
اور میر — خدا حافظ!

سڑک کے کنارے ایک پھول کھلتا تھا
گدھا آیا اور اس کو چب گیا

میرے پتنگ کے قریب کوئی چراغ نہیں
 سوائے میری کھڑکی کے چاند کے

دوستو تجھ سے دعا ہے کہ

پائٹن کی شناخت اور آدمی رات کی بارش میں سے جھانکتا
جیاند آہستہ آہستہ گرا رہا ہے !

گو دنیا محض ایک شہنشاہ کے قہر کی مانند ہے
مگر جاری رہی دنیا تو ہے —

بے چارہ کچھ مٹی سی تھیم
اُمیرے ساتھ کھیل

ہدیہ جاپانی ادب کا ناز ۱۸۶۹ء سے شروع ہوتا ہے۔ شرکی حکومت کے زوال، مغربی اقوام کی آمد اور شہنشاہیت کی تجدید کے ساتھ ساتھ جاپانی
نے نئے زمانے میں قدم رکھا۔ اب تک ملک کے سارے دروازے غیر اقام کے لئے مفتی سے بند تھے۔ کچھ صدیوں میں لڑکھاتہ بڑوں نے آمد و رفت شروع
کی تھی، کچھ تک مشنری یہاں پہنچے تھے مگر ان سب کو نکال باہر کیا گیا تھا۔ جاپان مکمل طور پر باقی دنیا سے الگ ٹھکانہ اپنی کائنات میں بند مٹھا تھا۔ ۱۸۶۹ء میں بیو میں
نیا شاہی دارما سلطنت قائم ہوا جس کا نام ٹوکیو رکھا گیا۔ اب دھنیا یورپ کی تہذیب، یورپ کی ادبیات کے مطالعے نے زور پکڑا۔ شہنشاہ نے ایک دستور جاری اور
ایک پارلیمنٹ قائم کرنے کا وعدہ کیا۔ تقریباً سارے اہم روحانی اور انگریزی ادب کا جاپانی میں ترجمہ کر ڈالا گیا۔ جاپانی ادیب مصلح قوم بنے۔ جاپانی زبان، جو
ایک ہزار سال سے چینی نیلاات کی ترجمانی کر رہی تھی اسی آسانی سے مغرب کی ترجمانی میں مصروف ہو گئی۔
لیکن آج کی شاعری میں بھی ایک ہزار سال قبل کی آواز باریکشت سنائی دے رہی ہے :

اب میں لیٹ کر خواب دکھوں گا
اور بادشہ کی آواز
اور جیتے کون کا شہر مجھے لہریاں دے گا

میرے اوپر ہنساکرو —
مجھے کنویں کا پینڈل کدو —
لیکن میرے کنویں کی منڈیر پہ پھول جھلکے ہیں
اور چاند اس کے پانی میں تیرتا ہے !

فردا سوز و غمی کا گیت تو سنو
اگر شہنشاہ کا سکتی تو اس کی آواز ایسی ہی ہوتی
ہاں امیر اسکان پھانا ہے
اس کی چھت پر پروے لگ چکے ہیں
لیکن سوز و غمی کی آواز تو کبھی بڑھی نہ چلی
میرے بچپن کا گھر مل چکا

لیکن جیگروں کی صائنڈی دی
 ہیرانیال ہے نہ پانے اچھے دون کی یادیں
 گانے کی کوشش کر رہے ہیں!

جید ہاپانی ادب بے حد نئی دانت ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں کتابیں اور رسالے چھپتے ہیں۔ ہر نوجوان قوم کی طرح ان کا ادب بھی معاشرے میں بے اندازہ
 ہوت کا ملک ہے۔ وہ بھوکا نہیں مرنے والا۔ نوجوانوں کی نابینائی میں بے ہوش ڈھایا جاتا ہے۔ جاپانی کے بڑے ایکٹر اور بڑے مصنف اپنی قوم کے لئے ہیرو کا درجہ
 رکھتے ہیں۔ یہ قوم ملک کی حریت کرنا جانتی ہے۔
 جاپانی ادب اور آرٹ کو بہت سنجیدگی سے لیتے ہیں، جس طرح وہ ساری زندگی کو بے حد سنجیدگی سے لینے کے قابل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ادبی
 کی بین الاقوامی تنظیم کی یہ انتیسویں سالگرہ کا گیس جوائے کے ملک میں منعقد ہو رہی ہے وہ اس کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔ گویا دنیا کی قیمت کا فیصد یہیں
 ہرنے والا ہے۔

لاہور ایک پر ایک لڑکی کی فیس آواز آئی۔۔۔ ادبی سیشن کے لئے اندر تشریف لے چلتے۔ ہر نئے کان کی پیادیں کو فطر پر رکھیں کا فقا
 اٹھنے، مونی کی ریڑھیاں ان کے بال میں اپنی اپنی نشستوں کی طرف چلے گئے۔ بارش کی پھر ارباب بھی دیر پہن کے شیشوں سے ٹکرا رہی تھی۔ بالکنی میں منجم رکھوں اور
 دیکھیں نے اپنے بیٹھ فون منجھالے۔

نام صدر مہر دور مکرلے کما۔۔۔ یونیورسٹی کی طرف سے میں اس گولی میر کا نفرس کے اراکین کا سواکت کتابوں۔ مغرب کے اسکالر
 قدیم مشرق سے واقف ہیں، انہیں ہم عصر مشرق کے ذہن کا کوئی علم نہیں۔ اہل مشرق مغرب کو بعض ایک خارج اور کو نیل طاقت کی حیثیت سے جانتے ہیں ان کا
 مغرب کے ماضی سے واقفیت نہیں۔ وہ گوٹک آرٹ کے مقابلے میں سرریٹزم کو بہتر طور پر جانتے ہیں۔ علاوہ ازیں سوال یہ ہے کہ مشرق آخر کہاں سے
 شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے اور زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ اورینٹ کا وجود و حقیقت کہیں سے ملتی ہے۔ عربی، ہندی اور چینی رسم الخط ایک سے
 نہیں ہیں۔ تاہم سے کراچی ملک رسم الخط ہے۔ مگر بہ حال، ایک یورپی طرز تحریر نے ساری دنیا کو یکجا کر رکھا ہے۔ یہ سے پاس اورینٹ اور مغرب کے
 اختلافات کی بہت سی مثالیں موجود نہیں ہیں مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اورینٹ میں حقیقی اختلاف موجود ہے۔ مجھے یہ شبہ ہے کہ کہیں مغرب کی مخالفت ہی تو سارے
 مشرق کے اختلاف کی بنیاد کو نہیں۔ علاوہ ازیں مشرق کا اسکالر اپنے ممالک کے ماضی کا پتہ چلانے کے لئے ہیرس لندن اور برلن کا رخ کرتا ہے مشرق کے
 سیاست دان نے نہ صرف مغرب کی یونیورسٹیوں میں بلکہ مغرب کے بندے ہونے جیل خانوں میں اپنی تربیت حاصل کی ہے۔ اب تک یہ راستہ
 ایک دفعہ رہا ہے۔

مصر کے ڈاکٹر محمد حوض نے کہا۔ "مختلف ملکوں کے معتمد، موسیقار اور اقتصادانی ایک دوسرے کے کام سے واقف ہو جاتے ہیں لیکن
 دوسری زبانوں کے ادب کے مسئلے میں کمیونیشن کا معاملہ اٹے آجاتا ہے۔ جیتوں کے سوانا کا عربی یا ہندی میں ترجمہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن ہم
 لکھنے والوں کا فن ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے ایک مترجم کی حاجت ہے۔

بڑی قابل غور بات یہ ہے کہ اہل مغرب نے نہ صرف مشرق کے ادب کو قابل اعتناء سمجھا، سوائڈ مشہور تین کے جنہوں نے اس خزانے کا
 کھرج لگایا اور اس میں جرم رانشر سب سے آگے تھے۔ گوٹے لٹراس نے اپنی عمر کے ساتویں سال میں عربی اور فارسی پڑھی۔ اس نے اپنا دیوان اکیس

کھاجب اس کے وطن میں انتہا پسند اور جگہ تو ہم پستی کی دہرائے جوتا ہوتا تھا۔ اس شاعر نے اپنے آپ کو ہندوستانی اور ایرانی اور عربی تہذیبوں کے دھارے میں بہا کر اس کی شخصیات سے کسی قسم کی دوسرے دوسرے کی نہ ملنے پر کی جھلک نظر نہیں آتی جن کا خطہ عموماً لوگوں کو اس قسم کا اثر قبول کرنے کے سلسلے میں محسوس ہوتا ہے۔

پچھلی صدی کے اواخر میں یورپ کے رابطے سے عرب ممالک میں تغیر اور داخلہ اور متغیرانہ کی تحریک چلی۔ سیاستدان عرب دنیا میں تغیر و انقلاب کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں اس کے باوجود ان تہذیب کی کشش کے ذریعے مشرق اور مغرب میں خطے میں ایک دوسرے کے ہمدردی کیفیت سے قریب تر آ سکے ہیں۔

آندریس تازوں نے کہا۔ ”میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس مسئلے میں ہم سے کوئی بھی اپنی حکومت کے ترجمان کی حیثیت سے نہیں بول رہا ہے۔ بلکہ عرض نے جو کچھ کہا وہ اپنی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا۔ آپ سے درخواست ہے کہ اپنی حکومت کے بجائے اپنے ملک کی طرف توجہ فرمائیں۔“

برطانیہ کے ٹیکس وکس نے کہا۔ ”میں آپ سے ایک ٹاڈ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے مخاطب ہوں۔ قلمی ادب سے باہر جانے کی مجھ میں صلاحیت نہیں۔ لیکن اگر میں صرف کھنے کے فن کی بات کروں تو فوراً آپ سنا دیں کہ کبھی ٹاڈ اس معاشرے کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کر سکتا جس میں وہ زندہ ہے۔“ آخریہ معاشرہ ہی تو وہ مادہ ہے جس کو ٹھیک پیٹ کر اپنے اطمینان کے مطابق ایک شکل میں ڈھالتے ہوئے اس کی ساری زندگی بیت جاتی ہے۔ لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم سیاسی اور عمرانی نظریات پر بحث کریں اور اگر میں نے ایسا کیا بھی تو ان بظاہری ابد کے ساتھ بظاہری ہرگز جن کو میں یہاں نمائندگی کر رہا ہوں اور کسی تصویر کی محنت بہتے بغیر اپنے فوری اور بڑا واسطہ تجربے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

میں نے اب تک صرف پانچ پانچ ممالکوں کے ترجمے پڑھے ہیں اور اگر میرے زبان بڑا ناہن تو میں کہوں کہ انہوں نے مغربی فارم کو اس پوری طرح کیوں قبول کر لیا اور کس نوعیت کی سے قبول کیا۔

اس سلسلے میں چند باتیں کہنا چاہتا ہوں:

ایک کھنے والے کو یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ اس کی اپنی جڑیں اس کے تخیل اور اس کے فن کی اصل بنیاد ہیں۔ یہ جڑیں کاٹ کر وہ بڑا خطرہ منظر کے لئے لگتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر قوم صرف اپنے بچنے کے متعلق ہی کہتے رہتا چلا جائے اگرچہ تیشیں اور سانچے جو ہماری کہانیوں کے پس منظر میں جڑتے ہیں شروع ہی سے ہماری زندگیوں میں داخل ہو چکے ہیں۔ لہذا اس کے بعد ہم اپنا مواد بہت ہی حقیقت و دنیاؤں سے ملے حاصل کرتے رہتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی۔ ایم ڈاکٹر اودہ سرست نام نے ایشیا سے یہ مواد حاصل کیا۔

لیکن چند بنیادی سوال ہیں جن کی حیثیت کھنے والے کے نقطہ نظر سے بین الاقوامی ہے۔ گراں کامل قوی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے۔ وہ بنیادی مسائل میرے نزدیک یہ ہیں۔

ایک انسان کے اندر وقت اور انسانی شخصیت کا باہم رشتہ کیا ہے؟

مختلف شخصیتوں کے وجود کا اظہار کس طرح کیا جاسکتا ہے اور ان کا کس طرح دکھایا جاسکتا ہے؟

ایک انسان کی سماجی اور عینک شخصیت اور اس کی نجی شخصیت ایک ہی ہے۔ اگر نہیں تو کون کن نیاں ابھرے؟

کیا ہر کھنے والے زندہ مواد کو اپنی زبان میں ٹھوس کر اور ان کو بڑا ٹھیک ہے۔ اگر کہ اور ان پر اپنے فیصلے صادر کر کے اسے قتل تو نہیں کر دیتے؟

طرز بیان کیسا ہو؟

دیکھا جائے تو انسانی دنیا اعلیٰ میں محصور ہے، تنہا اور مغرور۔ دوسری طرف وہ آدم کی ساری نسلوں سے غفلت رکھتا ہے۔ کائنات میں ذرے کی حیثیت سے شامل ہے۔ اسی طرح کوئی ایک شعر کوئی ایک جملہ ذات خود ایک سطر ہے جس کے اپنے قوانین ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ سارے ایک ایسے نظام میں شامل ہے جسے ادب کہتے ہیں۔

مشرق اور مغربی ادب کی تفصیل اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن ان دونوں جگہوں میں ادب کی پھر جدید علاقائی تقسیم بھی موجود ہے لہذا ہم مشرق اور مغرب کے ادب کو کس مشترک تہذیب سے جانچیں؟ ہندوستانی چینی اور جاپانی ادبیات میں کون سی مشترک ہے؟ عربی، فارسی، بنگالی، سری لنکی، اعلیٰ اور برہمی ادبیات کی کون سی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر ان کو ایشیائی کہا جاتا ہے؟ کیا امریکن، آسٹریلین، جزیری، افریقی ادب انگریزی لٹریچر کی مانند ہے؟ کیا مشرق و مغرب کی تفصیل انگریز، انڈین، رپا، ہندوستانی کے لئے ہے؟ انگریزی ادب، لٹریچر کو انگریز امریکن، آسٹریلین لٹریچر سے جدا کر دیتی ہے؟ روسی ادب کو مشرقی سمجھا جائے گا یا مغربی؟ کیا اسپانوی ادب پرتگیزی کے لئے ہے؟ نسبت پر بنگالی سے زیادہ نزدیک ہے؟ بالغاؤں دیگر جزائی تہذیب اور اتحادیاشدہ زبان ادبیات کے رشتوں کی نشاندہ کرتی ہے؟ پھر قومیت کا مسئلہ بھی ہے۔ اُردو اور بنگالی ادب اس وقت ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں میں تخلیق کیا جا رہا ہے۔

لیکن اس کی تخلیق کے پیچھے کون سی چیز زیادہ طاقت سے کارفرما ہے۔ ایک مشترک زبان یا ایک مشترک مذہب اور قومیت؟ زندگی میں ظاہری تغیر اور حقیقی مسلسل میں برابر تضاد رہتا ہے۔ ادب اس تضاد کا عکاس ہے۔ وہ کیا ہے جو فنکار کو اس کے مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتی ہے۔ ادب کی آفاقیت وقت اور جزائیاتی حوصلوں سے ماوراء ہے۔ سچ عالمگیر ہے حقیقی ادب میں انسان انسان سے بات کرتا ہے، مشرق مغرب سے، ماضی حال سے یا حال مستقبل سے نہیں۔ اعلیٰ ادب کے سامنے زمان و مکان کی کوئی حیثیت نہیں۔

ظاہری طور پر انسان، اوراد، ممالک، ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ہمارا عبت اور غم اور مروج کا تجربہ ساری دنیا میں یکساں ہے۔ ریاست، اقتصادیات، منظم مذہب اور تضاد فلسفوں نے انسانوں میں اختلاف پیدا کر دیا ہے لیکن بڑا ادب خصوصاً شاعری، بجلی کی نیوٹون لپک کی طرح جی بیکت اس اندھیرے میں راستہ دکھا دیتی ہے۔

Unknown کے مسند رکھنا گلا ہے۔ لامکان کو اپنے مشرقی ادب نے روح کی گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش کی ہے۔

کی سعی کی ہے۔ ریشیوں اور مضمون نے اس ادب کی آبیاری کی ہے۔ اس کے برعکس مغرب کا ادب زیادہ قرحارجی دنیا اور انسان کی جذباتی اور ذہنی تنگی کا عکاس ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مشرق کے میکھ زندگی کے مادی تقاضوں سے بالکل بے نیاز ہیں۔ افلاس اس وقت ایشیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ مغرب کے کھنے والے غنماؤں اور شخصیات اجتماعی مرست کے متعلق کہتے ہیں۔ ہمارے یہاں افلاس سے چھٹکارا ملنے ہی پر مبنی یا اجتماعی مرست حاصل ہو سکتی ہے۔

اس وقت مشرقی اور مغربی ادبیات کا روایتی رول بدل گیا ہے۔ مشرق میں مادیت کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ مغرب کے کھنے والے روایت

کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مشرق کے ادب کی اصل خصوصیات برقرار ہیں۔ یہاں جارج آئیبل کے ”بائورخانے“ کی طرز کی طنز نہیں لکھی جا سکتی۔

مغرب میں جاپانی شاہکار ”بگلا اور غروب آفتاب“ پیدا ہو سکتا ہے۔ ایک بڑی عجیب بات ہے کہ سر جوگلا اور شیکسپیر کی قسم کی ٹیویڈی کی تخلیق سے مشرق نے ہمیشہ انکار کیا۔ ہندوستان میں ایک تو سال کے شیکسپیر پٹھا جا رہا ہے لیکن عوام ذہن پرستوں کے علاوہ ہیٹھ یا ایٹر کے دوست نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ مشرق طبع مروت کا اتھری خاتمہ سمجھنے سے منکر رہا ہے۔

میں نے کہ مصلوب ہونا کوئی شرمیلی نہیں آپ اگر ان کے دوبارہ جی اٹھنے پر یقین رکھتے ہوں۔

تیسری اصل پیر ہے۔

دنیا اٹھی تباہی کے دروازے پر کھڑی ہے اور اس وقت مشرق اور مغرب کے درمیان جو رشتہ قائم ہے وہ محض باناس کے شروفل اور پاریوں کی جھجکا کی حیثیت رکھتا ہے۔
فرانس کے شاں سے جی ڈونے کہا۔

”ایک چینی حکیم ہانگ سین کا مقلد ہے، ہوا، قدرت کی بائسری درختوں اور پانیوں پر سے بہتی ہوئی میرے نئے بہانی ہے۔ اسی طرح ’کاو‘ میرا فلسفہ مختلف زمانوں میں پیدا ہوا کرتا ہے اور اپنی جگہ قائم ہے۔“

۱۹۱۱ء میں میں اپنی مرضی کے خلاف جنگ میں لڑا تھا۔ میرے سارے دوست تم ہر جگہ تھے۔ یورپ خود کشی میں مصروف تھا۔ میرے سامنے صرف تارکی تھی۔ اس وقت میں نے ماہرینہ ناغہ ٹیگور کا وعدہ پیغام سنا جو انہوں نے جاپانی کو دیا تھا۔ ٹیگور کے الفاظ کے ذریعے مشرق کی آواز پہلی بار میرے کان تک پہنچی۔ انہوں نے یورپ کی انسان کشی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایشیا کی نشاۃ ثانیہ کی پیش گوئی کی تھی اور جاپان کو خالی تھالی کے خطرے سے آگاہ کیا تھا۔ قوم پرستی کے مخالف تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے افلاس کے وسیع صحرا پر قسمت خداوندی قائم کرو۔ اور یاد رکھو کہ وہ جو برس ہیں لازمی طور پر ختم نہیں ہوں۔ اور خود ہمیشہ فنا ہوتا ہے۔“

اس وقت ہمیں یہ الفاظ ہمارے اپنے ماضی کی طرف سے آتے معلوم ہوئے۔ ٹیگور کی دعا تھی:

”جہاں روح بغیر خوف کے زندہ ہے اور سراپے اٹھتے ہیں

جہاں علم حقیقی ہے

جہاں دنیا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو کر دیواروں میں محصور نہیں کی گئی ہے

جہاں جند کی ندی ہی ہوئی زورم کی ریت میں نہیں کھوئی ہے

اس آزادی کی جنت میں خداوند! میرے ملک کو بیدار کرو۔“

بڑی بات یہ تھی کہ مشرق نے یہ دعا یورپ والوں کے لئے مانگی تھی۔

یہی دعا میں اپنے ملک کے لئے مانگتا ہوں۔“

• فتح کے بعد تیسرے پہر کو لکھنؤ میں کے اراکین دو گروہوں میں تقسیم ہوئے۔ ایک گروہ وادام صوفیہ مذاہب کی صدارت میں طرز زندگی پر مشرق و مغرب کے اثر پر تبادلہٴ خیالات کے لئے جمع ہوا۔ دوسرا گروہ امریکن ڈراما نگار سائیراٹس کی زیر صدارت سماجیاتی اقدار پر مشرق و مغرب کے اثر پر لکھنؤ کرنے والا تھا۔

طرز زندگی پر تبادلہٴ خیال کرتے ہوئے تعلیم جاپانی ناموسٹ جون سکامی نے کہا۔

”میں ایک جاپانی لیکچر ہوں اور اس سے جبکہ میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں میرے ہرے پر وہ مسکراہٹ ہے جسے جاپانی پلاسٹک لکھتا ہے۔“
• کہا جاتا ہے بہت سے غیر ملکی اس جاپانی تقیم کو غلامی اور کاسرشی کی علامت سمجھتے ہیں۔ غیر ملکیوں کا یہ رویہ اس جذبہٴ عقارت پر مبنی ہے جہاں کے دلوں میں

جاپانیوں کے لئے ہے۔

لیکن اس قسم کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم ایک حوصلہ ورانہ نیک غیر ملکی غلامی کے عالم میں رہے۔ جب ایک جاپانی کسی امد سے ملتا تھا تو اسے فوراً مسکرا کر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس کے دل میں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ یہ مسکراہٹ عادت میں شامل ہوئی اور پھر اس غلامانہ تبسم میں تبدیل ہو گئی۔ میں بھی عادتاً مسکراتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس وقت میری شعوری کوشش یہ ہے کہ میں اس تبسم کے ذریعے آپ لوگوں کے لئے اپنے ہندو غیر ملکی کا اظہار کر کے آپ کا غیر مقدم کر دوں۔

جاپانی تبسم ہنگامہ کے علاوہ امن اور قربانی کا تبسم بھی ہے۔ یہ نسلی اور ملائمت نہ صرف جاپان بلکہ سامنے ایشیائیوں کا شیعہ ہے۔ میرے ملک کی طرح تقریباً سارا ایشیائی تبسم ہلکا اور شاد کا شکار رہا ہے جس کی وجہ سے ایشیائیوں کو ایسا مسکین اور قتل خنڈا پڑا۔ لیکن ایشیائی حکم کی محض ہی ایک وجہ نہیں۔ جیسے کہ کہا ہے کہ ایشیا کے لوگ غفلت کے ساتھ بڑے سکون اور ہم آہنگی سے رہنا جانتے ہیں۔ اہل مغرب غفلت سے لڑتے اور اس کے خلاف جدوجہد کر کے اس پر قابو پانا چاہتے ہیں۔ اسی جدوجہد کے نتیجے میں ان کے یہاں ایک سائنٹیفک کچھ پیدا ہوا اور اس جدوجہد کی عدم موجودگی کی وجہ سے ایشیا سائنس کی رو میں بہت پیچھے رہ گیا۔

فرد کی اہمیت کے جدید مغربی شعور کے بجائے افراد کا مرکز خیال رہے ہیں غفلت کے علاوہ انسانوں کے ساتھ ملکی اور ہم آہنگی سے رہنا ہمارے فلسفے کی بنیاد ہے۔

لوگوں میں آپ نے مشرق اور مغرب کی تہذیبوں کا عجیب و غریب امتزاج دیکھا۔ میں آپ کے سامنے مغربی سوٹ بوٹ پہنے بیٹھا ہوں۔ محمد میرے ہونٹوں پر اچھی لکھی وہ غلامانہ مسکراہٹ ہے۔ ہم نے اپنی جاپانی مسکراہٹ ابھی تک نہیں کھٹی۔

میں آپ سے اور بہت کچھ کہنا گریزی انگریزی بے حد کمزور ہے۔

ہندوستان کے انڈسٹریل رائے نے کہا۔

”ہندو قدامت نے روم کے ساتھ تجارت کی اور یونان سے لڑا۔ لیکن قرون وسطیٰ میں ہندوستان باہر کے ممالک سے کٹ گیا۔ اس نے سب پر روئین مارے یہاں پہلے تاجراد پر حاکم کی حیثیت سے پہنچے تو ہم کو سبے حد حریت ہوئی۔ وہ اپنے نشاۃ ثانیہ کے کھل کانٹے سے لیس ہر کہ جدوجہد کے نقیب کی حیثیت سے آئے تھے۔ ہم اچھی قرون وسطیٰ ہی میں پڑے تھے۔ پہلے مشرق و مغرب کے درمیان جغرافیائی مواصلات کا یہ فاصلہ وقت کا ہو گیا۔ اب ہمارے اور ان کے درمیان غیر متوازن ارتقاء کے تین سو سال مائل تھے۔ سوال یہ تھا کہ ہم اس تین سو سال کے فرق کو کس طرح پُر کریں امدت کی اس ایسٹنگ تک جا پہنچیں جہاں وہ اب موجود تھے۔ مگر وہ سراسر اسیل یہ تھا کہ کہیں اس دو طویل ہم اپنا چھانا راستہ نہ بعدل جائیں اور مغرب کی جس منزل پر پہنچیں تو ہم جو کہ شاید مغرب میں غلط راستے پر چلا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ انیسویں صدی میں راجہ رام مہن داس نے سوچا کہ ہر مغربی چیز مشرق کے لئے بھی نہیں۔

لیکن کوڑن سن ہرنا سب کے لئے اچھا ہے۔ لہذا ہندوستانی نشاۃ ثانیہ مغربی اصلاحات اور اپنے ماضی کے ورثے کو ساتھ لے کر آگے بڑھا۔ ہمارے غلامانی ادب اپنی روایات کو چھوڑے بغیر جدیدوں میں داخل ہوئے۔ بھلائی آزادی خیالی اور فراموشی انقلاب امداد پیشقدم کا مطالعہ ایک وقت کی تبدیلی کا لیکن جدید قوم پرستی کی تحریک کے زیر اثر مغرب کا بالکل مسترد کر دیا گیا۔ یورپ کے خلاف غم و غصے کا جذبہ شدید ہوا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی کے اواخر میں ریڈار مشین کی مخالفت اور ماضی کی تجدید اپنے حوصلہ پر پہنچ گئی۔ اس زمانے میں آرٹ اور ادب میں بڑی اچھی اچھی چیزیں تخلیق کی گئیں لیکن پھر رفتہ رفتہ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ہم اپنے ماضی میں محدود ہو کر کوڑن زمانے سے کٹتے جا رہے ہیں۔ تب راجہ رام مہن داس نے کے سو سال بعد جانا لگائی

نے کیا کہ وہ مغرب کے مخالف نہیں لیکن اس کو رڈن تہذیب کے مخالف ہیں جو مغرب کو گھن کی طرح دکھا رہی ہے اور اس کی ماضیت مشرق کو اپنی ہنساک
روں طاقت سے کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے ہم سے کہا کہ ہم اپنے اندر سترہ اصلا ہنساک تلاش کریں اور اپنے باہر غریبوں، مظلوموں پر نظر فرمائیں۔ ہمارا کام مذمتی قوت
اولیٰ کے کسی جیسائی سینٹ کی مانند رہتے تھے۔ سبائی اور دروہائی تخت کرتے تھے۔ "جمالیاتی" اور "نہی قادی" سے بے نیاز، فطرت، خدا اور عوام کی عزت
نہ وہ اس طرح زندہ رہے جس طرح کھانک کی دنیا میں ادا کی انسان نہیں رہا ہے۔ اپنے اس جادو کے ذریعے وہ کہہ دوں عوام سے جو چاہتے تھے نہ
ہیتے تھے محبت ان کی حامد کی چھڑی تھی۔

ایسی جبر نفاخت کہہ کر سنا تھا؟ یا آپ ان کو ماننے یا ان کو مسترد کر دیجیے۔ ہم سے گاندھی کے راستے کو مسترد کرنا ممکن تھا۔ لیکن ہم جدید یا
مغربی راستے کو بھی ترک نہیں کر سکتے تھے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم جس چیز کو منظور نہیں کر سکتے تھے اسے قبول کر لیں؟ یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ اصل جدید
کا جو چارے نے خود ہی زائل ہو گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہم جدید مغرب سے ایسے ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہم کو اس سے کراہت آئے گی۔
لیکن ہم کو یہ بھی اختیار نہ تھا کہ گاندھی کا راستہ اختیار کر کے ہم کہیں طریقہ رسوائی کی ایک ترقی کو رد کرتے ہوئے پھر قرون وسطیٰ میں تو واپس نہ بھی جا سکیں گے۔
ہندوستان میں اس وقت ایسے خطرناک لوگ موجود ہیں جن کو اپنا اور سب کی قطع پرہا نہیں اور چند ہزاروں سال برس کرنا مصلح اور بہ نیکوں کی طبقاتی برتری کا نظام
واپس لانا چاہتے ہیں لیکن غرض قیمتی سے ہمارے یہاں تہذیبیہ شدید رڈن ان انسان ملی موجود ہیں۔ لیکن یہ مٹوانی انسان بغیر ایک فوج کے اپنا کام نہیں
چلا سکتے اور یہ گاندھی کی ہنساک فیکٹور کا بالکل ٹکڑا ہے۔ گاندھی شکر کے بعد کے آزاد ہندوستان کا سب سے دیکھی انسانی تھا۔ نہ صرف اس لئے کہ ہمارا
گھر تقسیم ہو چکا تھا، بلکہ اس سے جی کہ ہم نے قرون وسطیٰ کی نہ ہنیت والے ان خطرناک لوگوں پر جنہوں نے ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا، تابو ہانے کیلئے
تشدد کا آزادی سے استعمال کرتے ہوئے ہمارا گاندھی کو حوصلہ دیا۔

ہم عدم تشدد کے اصول کے پابند نہیں رہ سکتے لیکن ہم ان کے سکھاتے ہوئے دوسرے اصول حق پرستی پر قائم ہیں۔ حق کے ساتھ مل کر کھوت
کرنا پڑا ہے اور اس کی بنا پر ہم بے حد دیکھی ہیں۔ ہم ان کے بتائے ہوئے راستہ پر پولیو طرح نہیں چل سکتے۔ ہندوستان کو سب سے پہلے اس تیزی سے
جدید بننا ہے کہ محبت پسند عناصر تشدد یا قریب کے ذریعے گھڑی کی شوئی کو مددیں پہنچانے تک واپس نہ پہنچا دیں۔ ہمارے عوام اس قدر بکھرے ہیں کہ ان کو
بڑی آسانی سے نہ ہب کے نام پر بھڑکایا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم کو معلوم ہے کہ ہم زمانہ حال کو اپنا تے ہوئے اپنی دشمن یعنی قرون وسطیٰ کی نہ ہنیت سے توفور
ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے دوست ہمارا گاندھی کے اور ہمارے درمیان کا فاصلہ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ مستقبل
قریب میں تھوار کی طرح محبت نہیں ملے گی۔ شہرول کی جگہ گاؤں اور مرکز کی نظام حکومت کی جگہ لامرکزیت نظر نہیں آئے گی۔ آج ہمارے یہاں کو رڈوں عوام
ووٹ دینے جانتے ہیں اگر بے جبری ہیں انہوں نے متیہ اور اپنا کا سہارا چھوڑ دیا تو ملک ایک اور تباہی کی طرف جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی
ترقی میں ہم نہ بھادہ دیر نہیں لگا سکتے تیز رفتار ترقی ہی انقلاب کا فہم البدل ہے۔

اس وقت ہندوستان کے کھنے والوں کے منہ نے یہ سارے مساکی ہیں۔ دماغوں میں جدیدیت، روایت پرستی اور گاندھین فلسفے کے
درمیان کشمکش جاری ہے اور جب تک ایک محبت اور متیہ پر مبنی محسوس بنیاد کا فیصلہ نہ کر لیا جائے عظیم کارٹ یا شکر کی تلخ بن نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے
کہ مخرجی طور پر اس وقت حالات ان گنت گت ہیں اور سارے چھپ رہے ہیں کوئی غیر معمولی تخلیقات پیش نہیں کی جا رہیں۔ یورپین تہذیب میں روز افزوں آفت
ہو رہا ہے۔ اب مغرب اور رڈن ہم سے کچھ جا رہے ہیں۔ مغرب کو اجنبی نہیں سمجھا جاتا کسی قسم کا احساس کتری یا برتری یا اختلاف اس نفع کے ساتھ شامل
نہیں۔ مغرب کی موجودہ اقتدار ہندوستان میں بھی راج ہیں۔ اپنے سیاسی جھگڑے کے باوجود ہم ان کو منظور کر چکے ہیں۔ ہم میں سے بیشتر کہ انگلستان یا مغرب

کوئی غلام نہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ایک قوم کی حیثیت سے اپنا کام کرنے کے لئے اور اپنے مسائل حل کرنے کے لئے ہمیں تنہا چھوڑ دیا جائے۔
ہم آرٹ اور خیالات کی عالمگیر قوموں میں یقین رکھتے ہیں لیکن ہم اپنی قومی انفرادیت کے بھی قائل ہیں۔ ہندوستانیت کو جدیدیت یا عالمگیریت
کی لڑائی سے نہیں لڑنا چاہیے۔ صدیوں سے ہندوستان کی تشریح کی جا رہی ہے لیکن نسل کے لئے ہندوستان غیر مغربی یا غیر جدید کے مترادف تعلق ہندوستان
میں سب کچھ شامل ہے لیکن اس کی روح مغرب سے ہے۔

ہمارے کھنے والوں کا مستقبل کیا ہے؟ غاناہان کو بہت جلد مؤذن اور گاندھین راستوں میں سے ایک انتخاب کرنا ہوگا اور یہ فیصلہ بڑا تکلیف
ہوگا۔ مغربی لیکچر کے سامنے اس قسم کا کوئی آدیت وہ فیصلہ نہیں ہے۔
بنگالیہ کے کیونسٹ اور سب بڑیاں تو مرنے لگی۔

”آج کی دنیا بے حد متحرک رہ گئی ہے لیکن زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے دنیا کا ادب ابھی تک قومی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ ہر ادب
اپنی مخصوص قوم کے ایمان کی ترجمانی کرتا ہے۔ بائزاک کے ذریعے ہمارے عیسویں صدی کے فرانس کی روح میں اتر جاتے ہیں۔

لیکن اگر ہونا کیا ہے؟ قومی جو صدیوں سے ایک دوسرے کی ہمایہ ہیں (مثال کے طور پر بلغاریہ اور یونان کو ہی لیجئے) ایک دوسرے کے
مصنفین کے ہمارے فرانسیسی مصنفوں کو زیادہ بہتر جانتی ہیں۔ میں نے خود بائزاک کا (الویا) اور فرانس بلغاریہ سے بہت دور ہے!

”مجبوری زبانوں میں کھے جانے والے ادب کی یہ بد قسمتی ہے۔ فن لینڈ اور پنجاب اور بلغاریہ اور ایران کے ادب نے ایک دوسرے کو
کتنا نزدیک کیا ہے؟ آپ کسی چیز کو جانے بغیر اس سے محبت نہیں کر سکتے۔ ادب کے ذریعے آپ ان قوموں کو جان سکتے ہیں اور ان سے محبت کر سکتے ہیں۔
محبت کے بغیر اس کی باہیں کرنا بیکار ہے۔

میں ایک چھوٹی سی قوم بلغاریہ کے ادبی نمائندے کی حیثیت سے آپ لوگوں کو سلام کرتا ہوں تاکہ اس عالمگیر کنسرٹ میں میری آواز بھی
سنائی دے جائے۔“

فرانس کے آرمان بہتر اہل سے کہا۔

”میں اپنے چند پسندیدہ جاپانی اشعار دہراؤں گا:

اگر چاند کے کنارے پر ایک کڑی لگا دو

تو کیسی خوبصورت چمکیا بن جائے

ایک گنتی پنکھڑی

میں نے شاخ کی طرف واپس جاتی دیکھی

یہ تو تیزی تھی! —

وہ دیکھی جو کبھی نہیں آتی!

چمکوں شام میں جلتی ہوئی سمندری گھاس کی مانند

کے اعلیٰ طرز بیان کے ذریعے نہیں کہہ سکتے۔

پرتیڈ کے انٹونی ٹوئو کی نے کہا۔

”جتنا طویل فاصلہ کر کے میں اپنے ملک سے یہاں آ کر ہوں اسی کی مناسبت سے میرے انفرادی ذمہ داری بھی بڑھ گئی ہے۔ میں اپنے آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ کیا یہاں بھی کچھ نہ پڑے ہوئے فخر سے دہرا دینے سے وراثت سے وراثت کے سفر کا مقصد پورا ہو گیا۔ کیا میں یہاں محض اسی لئے آیا تھا۔؟“

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ زندگی تکمیل کے کارناموں کی جس بندی پر پتھر واپاں جا کر معلوم ہو گا کہ یہاں چین کا تیر پہلے ہی سے گھٹا ہوا ہے جو کئی نو سال قبل بھینکا گیا تھا۔ اور ہند کا تیر اور جاپان کا تیر۔

اور جاپان نے اس زمانے میں بھی جیکر ماسٹر کو کوئلہ فروغ کی ناریکی میں ڈبو دیا گیا تھا، ایسی ٹیکنیکریٹیکل برتنی حاصل کی کہ ناراضی روس جیسی زبردست طاقت کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔

ترجمے کی وقت بہت حد تک مشرق اور مغرب کی ادبیات کو قریب لانے میں حاصل رہی ہے۔ خصوصاً شاعری جس کا ترجمہ بہت مشکل ہے۔ طاقتور ہندی یورپین حاکمیں صدیوں سے اہل ایشیا سے واقف ہیں۔ لیکن پرتیڈ جیسے پھر پڑے یورپین ملک بہت سیکندہ ہندو طریقے پر واقف ہو سکے ہیں۔ ہم کو ہندو پچینی اور جاپانی شاعری کے ترجمے انگریزی سے پرش میں کرنا پڑے۔

اس سلسلے میں آپ خود ایک دلچسپ تجربہ کر کے دیکھئے۔ ایک گناہم پرش نظم پر کلب کے برطانوی مترجم نے کہا ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ سنگھین پرنگالی اور جاپانی مترجمیں بھیجا جائے۔ ان ساری زبانوں میں ترجمہ کرنے کے بعد اس کا آخری ترجمہ دوبارہ پرش میں کر کے دیکھئے۔ معلوم ہو گا کہ ہر نو کوئی دوسری نظم ہے۔

ترجمے کی وقت کے علاوہ دوسری چیز تو اس کی ایک دوسری سے مکمل ناواقفیت ہے۔ اس کی ایک معمولی سی مثال میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یورپ میں جب پرنس کوکوفس منفقہ ہوتی تو وہاں میں نے یہ تجویز پیش کی کہ پرنس کوکوفس کے قومی شاعر کی دین کے متعلق ایک کتاب شائع کرنا چاہئے۔ میں نے اس بات پر زور دیا کہ مغرب اس حکیم ترین سلاطین شاعر سے کس حد تک ناواقف ہے۔ ایک مشہور ترین انسائیکلو پیڈیا میں میں نے اس کا نام دیکھ کر حیران شروع کیا۔ Mick کے خانے میں ”کی ٹاؤس“ مرقع تھا لیکن کی ڈیر کا کہیں پتہ نہ تھا۔

ابن الکامی انہیں ختم نہیں ہوتی۔ اپنے وطن واپس پہنچ کر وہ آرماء میں اپنے پرنس پر مشی جابعلوں کو میں نے کی ٹاؤس اور کی ڈیر کا یہ قصہ سنایا۔ ان کو سنسی نہیں آئی۔ نہ اس بات میں کوئی لطیفہ انہیں نظر آیا۔

کیڈن کوکوفس کسی ایک طاہر نے بھی کی ٹاؤس کا نام تک نہیں سنا تھا۔

اس محفل میں جمالیاتی اقدار اور طرز زندگی پر مشرق و مغرب کا باہم اثر زیر بحث ہے۔ میں اس مسئلے کے ایک ایسے ضروری پہلو کا تذکرہ کر رہا ہوں جو میرے ملک کے سنے تیری خاص اور ڈرامائی اہمیت رکھتا ہے۔ میرا اشارہ روسی کیمیزم کے چین پر اور چینی فلسفیانہ روایات کے کیمیزم پر اثر کی طرف ہے۔ اس آئینہ کیمیزم نے بہت سی حاکمات اور دیوانہاں میں گھڑی لٹھیں۔ گذشتہ سالوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ ایک طاقتور دیوانہ اور کیمیزم پرکشش کی ایک قوی کی ذاتی مرضی اور اس کی روح پر زندگی اور شخصی زندگی کا تمام تر انحصار رہتا ہے۔ یہی یقین نہیں کہ وہ عہد و زبہان ہوا نہیں جاسکے گا۔ سوال یہ ہے کہ ہم ان رکشوں سے کس طرح بچیں؟ یہاں پر کیمیزم کا وہ صواب سننے جو انہوں نے اپنے چاروں کے اس سوال پر دیا تھا کہ دیوتاؤں اور کیمیزم

کا رول کیا جونا چاہئے۔

”جہاں تک ہر کسے ہی سے کم سے کم سروکار رکھو۔ پہلے یہ دیکھو کہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ انسانی انصاف اور محبت سے کتنے ہمہ گیر نہیں۔ جب کہ غیر جنس سے پوچھا گیا کہ ان ہم جنسوں کے لئے سب سے پہلے کیا کیا جائے۔“

”انہیں روٹی بتا کر دے۔“

”اوس کے بعد۔۔۔۔۔“

”انہیں تعلیم دو۔۔۔۔۔“

اس حقیقت پرست پروگرام نے اٹھارویں صدی کے یورپ کو متاثر کیا تھا۔ یہ پروگرام اب ایک نئی حقیقت میں تبدیل ہو رہا ہے کیا مطلق انصاف دینا اور رکشش آخر میں ختم رہتے ہیں یا حقیقت پرست، آزاد انسانی خیالات اس بات پر نہ صرف بہت سے چینی اور پوش دانشمندی کی تشویش کا اظہار ہے بلکہ سٹیلٹ پروگرام کی آئیٹیلوگی کا مادہ عارضی بھی اسی پر ہے۔ اس وقت ہم کہنے والوں کو کیا کرنا چاہئے یہ علم معیشت حیوانات کا مسئلہ ہے بلکہ اپنی انسانیت زندگی کے تبدیل شدہ حالات سے مطابقت پیدا کر کے لگائی انسانیت و نابود ہو جائے گی۔“

”Total war“ اور ”Two Faces of Man“ کے مصنف ٹیٹ ماہر نفسیات برلن کوٹ نے کہا۔۔۔۔۔

”ایک عالم مغربی راتس کے مانند سے کی حیثیت سے اگر میں بار بار نفسیات کی اصطلاحات استعمال کروں تو مجھے صاف فرمائیے گا۔ مشرق اور مغرب کے انسان نے تجربہ نفسی کے کونک میں اپنے اندرونی اور بیرونی مسائل سے جس طرح مجھے باخبر کیا میں اس سے آپ کو روشناس کرانا چاہتا ہوں۔“

میں نے دیکھا کہ روسوں کی مختلف خصوصیات انسانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں رکھتیں۔ اس علیحدگی کی اصل وجہ وہ روایتی تصور ہے جو انسانوں نے دوسرے انسانوں پر اپنی طرف سے چھپا رکھا ہے اور اس تصور کی اصلاح کو بہت مشکل پڑتا ہے۔ آج یہ اختلافات بے حد شدید ہو چکے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی یورپ پیچھے کو سرک گیا اور روس، امریکہ اور ایشیا اپنی اپنی ترقی و ترقیوں کے ساتھ ملنے آگئے۔ مغرب اپنے غرور میں مبتلا یہ بھول جاتا ہے کہ وہ دنیا کو اپنے ہی نقطہ نظر سے دیکھنے کا عادی ہے۔

اگر میں اپنے مشرقی ماہر نفسیات دوست سے کہوں کہ وہ مغربی اور مشرقی کے روحانی فرق پر روشنی ڈالے تو وہ میری اس جاننے کی سعی پر کہہ دے گا کہ۔۔۔۔۔ خاموش رہنا سیکھو میرے بھائی اور دھیان میں مصروف ہو کر اپنی اندرونی آواز سنو۔

لیکن کیا تم کو دنیا کے اہم ہنگامی مسائل کا احساس نہیں؟ میں بے صبری سے کہوں گا۔ دیکھو کسی لمحے بھی جنگ چھڑ جائے۔ کوئی ایٹم بم انڈیا پر پڑے، مثال ایسٹ، کیمیزم۔۔۔۔۔

کیا تم نے اپنے اچھے ہونے پر زیادہ فکر سے مسائل کی پرہیزگاری کرنے کے لئے یہ سید سے سادے شغاف پر باطل تعلیق تو نہیں کر کے ہیں۔؟ میرا مشرقی ماہر نفسیات دوست کہے گا۔

اور پھر خاموشی چھ جائے گی۔

ایک ڈاکٹر نے زیادہ بہتر یہ کوئی نہیں جانتا کہ بنیادی طور پر سب انسان ایک ہیں۔ ان کے دل کو ”کالیف“، ”مستری“، ”انسان محبت کرنا ہے“

سکھتا ہوتا ہے، انسان ہوتا ہے۔

جب یہاں پہنچیں، یعنی یہ پاس آیا تو مجھے بھی گھبراہٹ ہی ہوئی۔ مجھے دنیا کی ایک قدیم ترین تہذیب کے نمائندے کا مطالعہ کرنا تھا۔ میں اس سے قہر نہ کرنا۔ مجھے اینتروپولوجسٹ حضرات نے خبردار کر رکھا تھا کہ مشرق بعید کا مطالعہ بہت مشکل کام ہے۔

لیکن اس کے پرہیزگار بھی وہی تھے جو میرے یورپین رفیقوں کے تھے۔ دیکھی پچھلی، محنت مزاح مادیں، جنگ سے متاثر شدہ ملک میں مشکل کی تعلیم، بڑے بھائی سے سدا چھیتی بیوی کی موت۔

ہم اکثر یہ کہہ جاتے ہیں کہ ہم کسی مخصوص نسل یا ملک میں محض اتفاقاً پیدا ہو گئے۔ مگر اسی پیدائش کے لحاظ سے ہمیں اپنی دنیا میں جتنی

کڑا پختی تھی۔

تحقیق کو چلی ساجھی کے اندر اور بے شمار مدد ملی ساجھے موجود ہیں اور جب یہ تعلق کو چل کر وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ان کے ذہنوں کے اندر وہ سامنے تقدمات پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور کیمیکل مشعل اور آوازوں اور الفاظ کے مختلف ہونے کی وجہ سے اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ کچھ نفع صدی کی سیاسی اصطلاحات۔ نسل متوں، زمین، رنگ۔ دراصل غیر شخصی اور سائنٹیفک معانی کے بجائے گہرے جاؤا جذبات کے مظہر ہیں۔

لیکن ہر کچھ گروہ خوف اور شبہ اور تعصب کے پرانے پٹریں تو دیکھ کر مذہبی عقائد اور تمدنی اٹل کے ذریعے اپنے آپ کو کیوں کیٹ کر لیتا ہے۔ مشرقی آثار کیٹ شعوراتی اور الہامی ہے۔ مغرب بالواسطہ ہے۔ تفسیر اور تعبیر تعین کا قائل۔

لیکن بے صبر سائیکولوجسٹ ان سب باتوں کا جواب انسانی طریق عمل کی تکنیکل اصطلاحات کے ذریعے چاہتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ کیمیکل شعور ہمارا بعد اسلام اور ہندو فلسفے کے نفسیاتی محرکات کیا تھے؟ یا یہ کہ حیثیت اسے مختلف کلیساؤں میں کیوں بٹ گئی؟

مشرق اور مغرب میں نفسیاتی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ مغرب پختہ۔ وہیات مشرق سے تعلق رکھتی ہیں اور چند مغرب سے مشرق کا انسان اپنے خاندان اور اپنی کیونٹی سے زیادہ قریب رہتا ہے۔ اس کا بھی تعلق کا مطالعہ مغربی انسان نے اس لحاظ سے نبھا گا نہ ہے۔ یہاں پر تہائی مذہبی مراعات کے ساتھ بدل جاتی ہے لیکن اس مراعات میں بھی مشرقی انسان گروہ کا فرد رہتا ہے۔ گروہ یہاں زندگی کا مرکز ہے۔ یہاں میں مشرقی مذہب کی کھڑ اور مغربی اس میں جرم کی کھڑ کا فرق واضح کرنا چاہتا ہوں۔ انسان کو نمائندہ اپنے کہنے یا اپنے ہم چشموں سے ہو سکتی ہے۔ اس کا گروہ اس کے طریقہ عمل کی بنا پر کے دیتا ہے۔ انسان اسی گروپ میں رہے جاتا ہے۔ ذاتی احساس جرم اور مردمداری کے مغربی تصور کے تحت فرد اور گروہ میں بہت فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں فرد کی کشمکش اس کے گروہ سے نہیں بلکہ خود اس کے اپنے اندر دوئی وجود سے ہے۔ مشرق میں جرم و سزا اگر کم کے غیر شخصی قانون کے ماتحت ہے۔ یہاں گروہ کی ذاتی غیر کے فیصلے کی ضرورت نہیں۔ اس کے برعکس مغربی معاشرے نے فرد پر بے شمار پابندیاں لگا کر دی ہیں۔ وہ غیر ناجی طریق اختیار نہیں کر سکتا۔ احساس جرم سے بچنے کے لئے اسے اپنے شعور سے نفرت اور قریب پسندی کے جذبات کو اس سے نکال دینا پڑا ہے کہ اس کی یا کسی غیر شعور میں کر رہ گئی ہے لیکن موجودہ کیمیکل تکنیک کا مغربی انسان اب مشرق کے گروہ پسند انسان کی طرح روز بروز گروہ کے پٹریں میں شامل ہوتا جا رہا ہے۔

مغرب کے انسان کو اپنی شدید تہائی کی وجہ سے خود کو سکا شمار ہونا پڑا اسی وجہ سے وہ جنہوں اور غیر ملکیوں سے اسے وحشت ہوئی۔ اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو دوسروں سے برتر سمجھنے کی رنگیت دراصل احساس کمتری اور غیر اطمینانی کا چھپانے کا ایک حربہ ہے۔

مشرق تہذیبیں دوسری تہذیبوں اور ممالک کے سلسلے میں ہمیشہ سے بہت مہمان نواز اور گنہگار خیال رہی ہیں۔ چینی اپنی جنگوں میں ملایم تھیں اپنے فاتحی کوچنگ میں نہ۔ مگر دنیا اور مغرب کے خارجہ تعلیمی میں کئے ہوئے مذہب کا رویہ اسے خاصا سب کے لئے عالمگیر وادارہ کا حصہ بنی ہے۔ ہزاروں سال قبل ہندو ممالک نے اس نظر سے اس کا اہم اہل جدید **Physical** حاصل ہے۔ ہندو ممالک کی ایک طرف تہذیب کا وقت میں ہر گز نہیں۔ ہندو ہمارے دور و ماحول کے خیالات کے لئے جارحانہ طور پر تہذیب بھی نہیں رہی۔ اس کے باوجود بھی ہندو قوم کے عقائد و رسوم کے متعلق ہندو ممالک اور جس مذہبی عقائد و رسوم کے حصول کی تعلیم کی یہی ہندو ازم اپنے معاشرے کے اچھوت طبقے کے لئے انتہائی تنگ نظر ثابت ہوئی۔ اسی دور کے مسلم ہندو مسلمان ہیں کہ یہاں ہوا۔ اسلام کا مسلمانوں کا رویہ اور اہل پرستی گمراہی پرست انسان کی طبیعت کو زیادہ اعلیٰ معلوم ہوئی۔ مسلم مفکر اقبال شرقی تہذیب کی انفرادیت اور خیال پرستی سے بہت ناگوار تھے۔ مگر اسلامی طرز فکر کی کیسائیت اور participation کے نفسیاتی پیشرو کی وجہ سے وہ اسے محکم امریت کے پیش آسانی سے ٹھکرا رہے تھے۔

جہاں ممالک میں انسان کے ایسے پر زور دیا گیا ہے۔ انسان اور اس کا خاندانی اور اس کا ملک اور سارا نظام کائنات اور زمانہ سب ایک ہیں۔ اسے مذہبی سکون آفاقی سناٹے میں حاصل ہوتا ہے جس کا وہ ایک حصہ ہے۔ فقیری، سخت کوشی اور غربت اب بھی اونیٹل کلچر کے آؤش ہیں۔ مغرب کا آؤش وہ باقی ٹوسی فر ہے جو اپنی خودی کے بل پر آفاق سے کلک لینے کے لئے لڑتا رہتا ہے۔ اپنے استادوں سے آگے نکلتا چاہتا ہے۔ مشرق کا انسان اپنے استاد، اپنے گرو کے ساتھ رہتا ہے۔ ہنسنے کا تمہنی ہے۔

مغرب کا انسان چاروں اور غیر مطلق چیزوں سے خائف ہے۔ اسے تفریح میں انفرادی مسرت نہیں ملتی۔ وہ خوشی کے متعلق بائیں کرتا ہے مگر خوشی محسوس نہیں کرتا۔

انسان کی کسی جگہ سے تعلق حاصل کرنے کی، کسی گروہ میں شامل ہونے کی حاجت کو مشرقیوں نے زیادہ آسانی سے حل کر لیا ہے۔ وہ اسلام اپنے ماحول، اپنے خاندان، برادری، طبقے اور قوم میں شامل رہتے ہیں۔ ہم کو اس شرکت کے لئے قریش کا رٹ، ڈیڈا، چوہ کی کنیت کا لیل اور شادی کا فائنل درکار ہے۔ ٹیلی ویژن دیکھتے وقت ہماری تہائی سب سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ ہمارے اندرونی گھنٹاؤں کو کم کرنے کے لئے گروہ کا سہارا بھی ہیں میٹر نہیں۔

اب ٹیکنالوجی اور انفرادیت پرستی دونوں کی اہم مشرق میں داخل ہو چکا ہے۔ لیکن کیا مشرق اور مغرب قریب آسکیں گے؟ انسان انسان سے مل سکے گا؟ مغرب ایر سے مسرت اداسی سے تعلق پیدا کر سکتی ہے؟

مذہب یا فلسفے کے ہمارے انسان کی طاقت اور دولت کی تلاش اور جس نے دنیا کو تقسیم کر رکھا ہے۔

چینیوں، روسیوں، کیوسٹوں، اہل ہیرس، عربوں، یہودیوں، ہسپانیوں اور جاپانیوں وغیرہ کے متعلق جو متعصب تصورات ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں ان کے زائل ہونے میں ابھی بہت عرصہ لگے گا۔ موجودہ سرورجگ اور اس کے پروپیگنڈے نے ان متعصب تصورات کو بے حد ہرناک طعنہ بڑھا اور پھیلا دیا ہے۔

اسی روز کھنے والوں کے دوسرے گروہ نے امریکی قدامتکار امیر رائس کی زیر صدارت جمالیاتی اقدار پر تبادلہ خیالات کیا۔

جاپان کے سے آئی ای ٹی نے کہا۔

ہیچیکو سلاویک کے فائنلے مشراؤوں ہر ت میٹر نے آج ایک اخبار میں لکھا ہے۔ جاپانی مصوری کے تناسب اور جاپانی طرز فکر

ہوتا تھا کہ کتنے عظیم اور فحول برہمنی اس قوم کی عظمت میں داخل ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہی احساس آپ کو نظروں کی بحر اور ادنان افغانوں کے اشتغال میں ملے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ایک بے حد کم انیز اور بے وقوف خیال کئے جاتے ہیں۔

موت کے متعلق ہمارے وہ بڑے کوئی بہت حیرت انگیز سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ جاپانی مرنے کی باطل پھا نہیں کرتے اور خود کشی جہاں سے صاف کٹ کا خاص اسٹیٹیشن ہے۔ موت سے ہم کہہ رہے ہیں کہ انسان کو زندگی کے بعد صاف نظر آتی ہے۔ اس کا اثر آپ ہمارے ہمدردی میں دیکھتے ہیں جہاں سفید پس منظر کے مقابل میں صرف ایک بھول، ایک چٹان، ایک پہاڑ یا ایک انسانی شکل آپ کو نظر آئے گی۔ یہ سفید بیک گراؤ ڈنڈا اور عدم وجود کی علامت ہے۔ یہی ہمارا بدھ فلسفہ ہے۔

گو جاپانی گروہ کے احساس سے محروم ہیں لیکن ان کا اپنے خاندانوں اور دوستوں سے بہت انسیت ہے۔ ایک قوم ہر مادی دنیا سے الگ تھک ایک روحانہ جذبہ میں رہتی ہے۔ انہی تھائی کی وجہ سے وہ اپنے گھر اور اپنے باغات کو بجا کر کہتی ہے لیکن انہیں اسے نیا عورت نہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپانی سپاہیوں کے طرز عمل کا پس منظر یہ تھا۔

جاپانی فکر اسی بدھ فلسفے کے زیر اثر سوسائٹی سے بھاگ کر تھائی میں پناہ دیتا ہے۔

پال تھائی نے کہا۔

میں ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا جہاں مشرق یا مغرب میں سے ایک کا انتخاب ایک ہزار سال سے ایک بنیادی مسئلہ تھا۔ ہنگری کو ایک ہزار سال تک اس سوال کا سامنا کرنا پڑا کہ آیا وہ مشرق و مغرب کے درمیان ایک ٹپ ہے، مشرق کے خلاف ایک فاصلہ ہے یا دونوں کے ملنے سے ایک نیا ملک کا کام دیتا ہے۔

ایک ٹیپار سے اگر یہ کہا جائے کہ اس کا ملک بھٹان کا ایک حصہ ہے تو وہ لڑے گا۔ ہمارے کھنے والوں نے پیرس، نیورس اور بیسنگ کو اپنا دھانی وطن سمجھا اور اپنی قوم کی مشرقی ذہنیت سے بے متالاں تھے۔ ان کے نزدیک مشرقی ذہنیت کا بلی، بے ایمانی، ناگوار پن اور جہالت کے مترادف تھے۔

ان کھنے والوں کا یہ فہم و فہم بہت حد تک حق بجانب تھا۔ ہم نے باؤتھیم سے تھوڑا بہت حاصل کیا مگر ہنگری کا صرف ایک بادشاہ صلیبی جنگوں میں لڑنے کے لئے گیا تھا اور وہاں سے واپسی کے علاوہ اور کچھ ماحولہ نہ لایا۔ ہمارے لئے مشرق صرف تباہی کا منبع تھا۔ تاتاریوں کے حملے اور قتل عام، ترکوں کا تسلط، ہم ڈیڑھ سو سال تک عثمانیوں کے غلام رہے اور اس عرصے میں ہماری تہذیب بالکل برباد ہو گئی۔ ہمارے نشانہ تازیہ کو تھوڑے سال تک انتظار کرنا پڑا۔ ترک تسلط کے بعد ان میں ان کی کابل اور خلافت حکومت اور آرٹ اور لٹریچر کی طرف سے ان کی مکمل بے اعتنائی دیکھنے پانے اندر غیر ملکی اقتدار کا مقابلہ کرنے کی طاقت بھی سلب کر دی۔ ہنگری کی تازہ صورت حال کی جڑیں دراصل اس وقت میں پختہ ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ہنگری قوم کے دل میں مشرق کے لئے عجیب قسم کی تڑپ جاگزیں رہی۔ مادی اقوام اپنی فوجیائی کے حصاروں میں گمشدہ تلاش کرتی رہتی ہیں۔ اپنے باغ عدن کے خواب دیکھتی ہیں۔ گیارہ سو ایشیا سے آئے تھے۔ مدفن ہمارے بہت سے ہم قوم اپنے ایشیائی شہنشاہوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں، تبت اور افغانستان اور ایران میں مارے مارے پھرے اور اب تو پچھلے بارہ سو سال سے ہنگری کی لکھ کا رخ جبری طور پر مشرق کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔

میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں اس کو بھولنے دوں گا۔ لیکن جب میں اس کی یاد دلاؤں گا تو وہ میری یاد میں رہے گی۔

تیک کا حقیقہ ہے
کہ کسی عیبیائی کو جو دھکا دے گا وہ اس کا خیر کرے

کریں گے اسے جنت شعلیٰ

اس طرح کی بہت کم جہود ہند کے بعد ہنگری اور ترک ایک دوسرے کی عزت کے اس کے ساتھ رہا کیے۔ سترھویں صدی کے
 آخر میں تو ہنگری میں ترک کے سے گہری و دردی پیدا ہو گئی اور بہت سے ہنگری وین ہتوں کے لئے جو اپنے زبان و خط کو دشمن میں کہیں ترک تسلط
 سے ڈا رہے تھے، ترک کی کڑی مخالفت پیدا ہو گئی۔

سے طرہ ہے تھے، ترکہ اکثر ہمارے ہمارا ثابت ہوا۔
 اٹھارویں صدی کے وسط میں شاعر اور تیرک راہب پانی آبیوں نے مغرب کو مشرق کے جھوٹے دار کو کھلے کوسے پہنچے کہتے تھے
 آگاہ کیا۔ اس حقت وائیک کے زیر اثر سارا یورپ مشرق کے مدافن سے محروم ہوا ہمارا وقت۔
 دیرست کہو کہ چوہا ہل کے جھڑپوں والا لاہور گیتان راغور صورت ہے۔ اس نے کھا۔

دیکھنا انسان اور پھر جس عظیم ترین عقل شاہکار تخلیق نہیں ہوئے
گلیسٹ اور کو ریل مغلوں کے

ہندوستان ہرگز نہیں گھٹے تھے

فہم جس نے وی آنا کے عمل دیکھے ہیں

تم اجڑا شے کے وحشیوں کے خیموں کو واقعی پسند کر سکتے ہو؟

یہ ایک اور بگڑی شاعر نے شرق کی خلعت کے گیت گائے اور اس وقت کی شدات دی جب مغرب کو زوال اور مشرق کو دوبارہ
مروج حاصل ہوگا۔ یہ شاعر کوئی حافظ قیصر کا بڑا پوتہ تھا۔

مردم حاصل ہوا۔ یہ شاعر سرگنائی حافظ شیرازی کا بڑا پرستار تھا۔
ہمارے عظیم ترین مجدد شاعرانہ تادی کے کلام میں اس روحانی رستہ کشی کی مکمل جھلک نظر آتی ہے۔ وہ اپنے محبوب پیرس کو خود حافظ
کہہ کر اپنے دل کیا دے وطن و الیں جا رہے۔

دکن پریس گزٹ

ابھی جے ترے اپنا لے پاک بنایا تھا

اپنے وطن واپس جا رہا ہے جہاں گیت پیدا نہیں ہوتے

اس پتھر میں کیا —

مجھے تو ہنگامی کی آواز ناہمی سے سنائی دے رہی ہے

فقیروں کی ٹولی کی صدا —

وہاں کے پھولوں کی ٹھکت میں موت ہے

زمین پر ایک نعمت طاری ہے

ان کھیتوں پر جنوں نے لکھ جو دیا

سرخ کی کھڑی کا گدڑ نہیں

لیکن اس کے باوجود میں جاتا ہوں

کیونکہ اپنی قسمت کو کوئی نہیں کر سکتا

میں وہیں پر مچل جاؤں گا

وہ شہر نے بدل اور وحشت ناک ہو رہا ہے

بھری دھواں میں غجر کی طرح اتر رہا ہے

دوسری نظم میں وہ شیطان اور شراب کے درمیان — شوق کے مکمل اوتار — سے مخاطب ہے :

’اس جدید زمانے میں میرے ساتھ بیٹھنے کے لئے

وہ اور ہی جا میں طہوس لگھڑے پر سوار

’اتھ میں تار لئے ’صبح سویرے

’مشرق سے نکل کر میرے پاس آیا

وہ ابدی کلبیت پرست ہے

’مشرق مسود تھا

لیکن موجود زمانے میں اس کی سرت کا خاتمہ ہو گیا !

اب کہہ مستقبل کو اپنی طامش ترچھ کر یوں ہی بیٹھ

’شراب سے بھیگے یزید رش پر پناہ ہے

’شیطان بحث کئے جا رہا ہے

اس طویل بحث کے دوران شاعر اپنے پچھلے برے کوشش میں مغلطی اور گھٹا رہتا ہے۔ ’مشرق شراب ہستی جاتی ہے۔ یزید پر ایک

صلیب کے سامنے دو دم بتیاں جل رہی ہیں۔

’ہم دونوں کے درمیان یہ جھگڑا بالکل کے زمانے سے چل رہا ہے

’میرے کسی فضول خفق پر کھسنے

’اے معنی یافتہ کے نیچے گاتے ہوئے سن لیا ہوا

’اور اس دن سے لے کر آج تک

’ابدی کلبیت پرست

’میرا خدا امیر بابا اور میرا بادشاہ ہے !

کچھ بچے تھے۔ نہ جانے جنہی کو کیا واسع اس گروپ کا اب کیا کریں گے۔ انہوں نے اپنے حکومت کے عروج پر بچے جنہی کو کیا چلنے کی رحمت دی اور بچے کو بھروسہ دیا۔ میں نے مہذنت چاہی۔ "میرے پاس دینا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "فلاور انڈیز بچے اپنی حکومت سے اجازت لینا چاہتے ہیں۔" پاس دیا۔ اصل وقت بھی نہیں ہے۔

"اجازت ہم دوا دی گئے آپ کو خود باغی ہو گئے۔ یہاں سے ہم بہت سے یورپین اور امریکن مصنفین کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔" شام کو ایک بھر لانے کے دوران میں میں نے شری وائسٹاشی سے پوچھا۔ "آج صبح ڈاکٹر اسٹگر نے ہندوستان میں اردو ادب کی تخلیق کا ذکر کیا تھا۔ کیا یہ تخیل ان حالات میں پیدا ہو سکتا ہے جو اس وقت وہاں اُردو کے لئے پیدا ہو گئے ہیں؟" میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب بھٹ سے بھی کیا تھا۔ وہ اس مسئلے پر بہت دلچسپی لیتے تھے۔ زبان کے معاملے میں وہ دیر لے رہے تھے۔ بالکل دیر لے رہے تھے۔ آج برصغیر میں زبان کے معاملے میں جس قدر لغت سے کام لیا جا رہا ہے اسے دیکھ کر دل لرزتا ہے۔ ڈاکٹر اسٹگر نے اُناسی سے کہا تھا۔

شری وائسٹاشی نے مجھ سے کہا۔ "اگر آپ کی ہندوستانی اکیڈمی کی طرف سے ہر سال اردو اور ہندی کی کتابوں کو انعام دیا جاتا تھا۔ اب کے سے یہ لے لیا گیا کہ اُردو صرف ہندی میں کام ہوگا۔ اردو میں تصنیف و تحقیق کا سلسلہ اب ختم کر دینا چاہئے۔ صرف ایک ہی کتاب جس میں اس تجربہ کے خلاف دھڑ دیا۔ مگر حالیہ دورے دھڑ سے کیا ہو سکتا ہے۔"

"کمال ہے۔" انہوں نے کہا۔ "میں نے انہیں خاص اُردو ہے، مشاعرے کی مقبولیت میں مدافعوں اضافہ ہوا ہے۔ اُردو کے شہرہ کا کام ہندی میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ مرزا غالب کو گھر گھر چھوٹا جاتا ہے۔ کانفرنسیں ہوتی ہیں جہاں بار بار استدعا کی جاتی ہے کہ اردو کی حق تلفی نہ کی جائے۔ مگر حکومت کی پالیسی....."

"کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" ایک انگریز لایب نے قریب آکر غرض دل سے میری بات کاٹی۔

"کچھ نہیں۔ ہم اپنے خاندانی جھگڑوں کا تذکرہ کر رہے تھے۔" مجھے یاد آیا کہ کل شام مشر راتے نے ایک امریکن کو جواب دیا تھا۔ "میرے بچے نہ لگائے۔ سنت ہر ایسے خاندان پر اور ان جھگڑوں پر زندگی اسی رو سے پیشے میں جیتی جا رہی ہے۔ اردو ہندی کا جھگڑا، ہندو کچھ اور کچھ ہندو کا جھگڑا، اکثر اور ہندی پانی کا جھگڑا۔" مجھے ایک لذت ہے امتیاز کثرت محسوس ہوتی۔ وہ کثرت جواب زندگی کا خاصہ بن گئی ہے۔ برٹش کونسل کے آل میں روشنیوں جھگڑا رہی تھیں۔ لوگ کاک ٹیل کے گلاس ہاتھ میں لے کر ہنس بول رہے تھے۔ میں اور شری وائسٹاشی اس سلسلے سے علیحدہ ہال کے ایک کمرے پر کھڑے اپنے "خاندان کے ذمہ دار کی باتیں کرتے رہے۔" مجھے کیا حق ہے۔ میں سمجھ رہی تھی۔ کہیں باہر کے کھڑوں میں اگر بیٹے بیٹے سفید جھوٹ بولیں۔ "پچھلے اور امن اور زندگی کی اعلیٰ تعداد اور پچھائی اور ایمانداری پر تقریریں کریں۔ اس کام کے لیے سفارشات کا اور امیروں و ذریعوں کے مدد کی نہیں۔" پچھلے اور زندگی کی اعلیٰ آبادی اتھار۔ "میرے پس منظر میں قوتوں اور کوششوں کے دینے والے ذمہ ہیں۔ جھوٹ اور دھوکا کی فطرتیں میرے چاند اور کھڑی ہیں۔"

مجھے ان لوگوں سے کیا مطلب ہے جو کاک ٹیل کے گلاس ہاتھ میں لے کر اپنی اپنی باتیں کر رہے ہیں؟

شری وائسٹاشی بڑی نفیس کھنری اُردو کرتے ہیں۔ گو زبان کے ہندو اسے جوں جوں سمجھ رہے ہیں پیدا ہوئے اگھڑت میں ہے۔ اب ملک آباد ہوا ہے۔ مجھے سے بالکل ڈاکٹر عظیم احمد شاکر خاں کی طرح کے مصلحت قوم پرست مہنگر میں معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے بھی ادب اور ادبی مسائل کی جو کچھ سال ہندوستان میں ہر کھنچے والے نے سمجھ لیا تھا۔ "جوش صاحب کے ہاتھ میں کیا حال چال ہیں۔" اب میں وائسٹاشی کی نگاہوں

کھانا کھاؤ۔ یہ ٹنک کرو۔ اس میں غمید کر دینے کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں انسان کی قدوقیمت ڈالر سے لگائی جاتی ہے۔ غلاماں ہمیں ہزار کا آٹھی ہے۔ غلام ساٹھ ہزار ڈالر کا سال ہے۔ وغیرہ۔ مگر امریکن درحقیقت بہت اچھے لوگ ہیں، دل کے بڑے نہیں۔ بس انہیں چھینا تو زیادہ ہے۔ اگر یہ کیریزم کی دہشت ان کے احصاب پر اتنی سوار نہ ہوتی۔ تو کیا یہاں سے انسان ہیں۔ دنیا کے سارے دوسرے انسان کی طرح۔ اب بابا برکی یزید زور کی سپیس، جان ہری اور اسٹین ہک آن بیٹھتے۔ دوسری طرف ایئر ٹاکس تنہا بیٹھتے تھے۔ آڈولف ان سب کو منہ دکھاتے دیکھا گیا۔

”پچھلے سال جب میں دلی گیا اور میں نے ایشیائی کانفرنس دیکھی۔“ بڑو دیوڑے نے کہا۔ ”تو مجھے اندازہ ہوا کہ سارا ایشیائی دراصل ایک عجیب سی حقیقت ہے۔ یہ سارے ادیب جو پیش کر رہے تھے اشتراک سے محروم رہنے تھے دراصل ایشیائی ازم سے تھے۔ گویہ لوگ انگریزی بول رہے تھے مگر ان کی حرکات و سکنات، رویہ عمل، اعمال ہر چیز خاص مشرقی تھی۔ میں فیض سے بھی ملا جو پاکستان سے آئے تھے۔“

وہاں سے بات دوبارہ ٹنک کے زمانے تک پہنچی اور حوامی حماد اور اسپین کی خانہ جنگی۔

پھر آڈولف اور بڑو دیوڑے اپنے اپنے ٹنک میں کا ذکر کرتے رہے۔

”مزے کی بات یہ ہے کہ میں پرٹنک کے مشورہ فرجی خاندان کا فرزند اور جند تھا۔ اور تم۔“ بڑو دیوڑے نے خوشدلی سے پوچھا۔

”تمہارے باپ کے یہاں باقی چھوڑتے ہوئے گئے۔“

”ہاں!“ میں نے جواب دیا۔ ”سفید تھی۔ ہماری کچھ لڑکیاں بڑا سا سفید تھیں۔ تب جس پر ہم سب سوار تھے۔ ایک روز کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اس نے زور سے اپنی سڑک اٹھا کر ایسی چٹنی دی کہ ہمارا سونے کا ہر وہ دھڑم سے نیچے آگیا۔“

میں نے جھاک کر دیکھا۔ آڈولف یزید پر رکھے ہوئے سروریت پر باقی کے اس نغز کا کارٹون بنا چکے تھے۔

اگلے روز صبح جاپان کے مصنف کوچی موریٹری ناوا ادبی سنگھ کی صدارت کر رہے تھے۔

جنوبی کو ریا کے ان سب زونگ نے کہا۔

”کو ریا انیسویں صدی کے آخر میں مغربی اثر پر کچھ سے متعارف ہوا۔ اس وقت کو رین قوم تین بڑی طاقتوں کے حملے کے خطرے میں تھی چین،

روس اور جاپان۔ آخر انہوں نے اسے اپنا غلام بنالیا۔ ۱۹۱۱ء میں جاپانی قبضے کے بعد سے حاکم قوم نے کو ریا کے قیادتوں کے علاوہ چارے دھڑلے پر بھی اتار دیے۔ کو رین میکملوں کو تحریر و تقریر کی آزادی سے مکمل طور پر محروم کر دیا گیا۔ اس کے باوجود کو رین ادیب اپنے قلم کو جاپانی شہنشاہیت کے خلاف استعمال کرتے رہے۔ جدید کو رین ادب آزادی کے لئے اسی جدوجہد کی پیداوار ہے۔“

کو ریا کی تاریخ آج سے سو چار ہزار سال قبل سے شروع ہوتی ہے۔ کو رین قوم چین میں اور جاپانیوں دونوں سے بالکل حلیہ اور مختلف ہے۔

لیکن ان ہی کی مانند روحانیت کی دلداد اور مرزیت پرست رہی ہے۔ ہندوستان کی تہذیب کو ریا ہی کے راستے جاپان پہنچی۔

جاپانی جابریں نے ہمارے کھنے والوں پر ایسی ایسی سختیاں کیں جن کے تذکرے سے وہ گلے کھٹے ہوتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے

دوران میں ہمارے جاپانی نگرانوں نے میں اپنی قومی زبان استعمال کرنے کی بھی ممانعت کر دی تاکہ دنیا کی تمدنی تاریخ سے کو ریا کے باب کا ایک سرے سے

نام و نشان ہی مٹ جائے۔ اہل کو ریا کو مغربی زبانیں کیجئے کی بھی اجازت نہیں دی لیکن اس کے باوجود کو رین ادیبوں نے انڈر گراؤنڈ طور پر اپنی جدوجہد

جاری رکھی۔ اس زمانے میں ایک شاعر نے ”دردِ دل کے زمانے سے کہا۔۔۔
 ”سمندر کے دھبے میں ایک چراغِ شعلہ ہے
 رات کے سمندر پر یکساں تاریکی بھائی ہے
 اور آزادی۔۔۔ ا۔

میری زبان پر بادیِ عالم کا قطعہ ہے
 اور شاعری کے پند
 تو سمندر پر سے روتا ہوا پرواز کر رہا ہے
 آج کی رات
 میں ’نورِ گر‘ ایک تنہا بے جان کی مانند
 تیرے ساتھ ساحل پر جاؤں گا‘

چالیس سال کے اس تجھے کے دھان چاہانی فاضل کو کیا کے سارے تہذیبی خزانے لوٹ کر اپنے یہاں لے آئے اور اپنے
 باقی کی وراثت کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمارے پاس کچھ نہیں بچا۔ یہی یقین ہے کہ اب یہ پجزی کو دیا واپس وٹا دی جا رہی گی۔
 جدید کو برین ادب نیز اڈیٹڈ لٹرم، نیچرل ازم، ٹیکنیکل فیس، رومانیت اور کلاسیکیت کے ادوار سے گزر چکا ہے۔ غلامی کی وجہ سے
 اہم پرستی چالی خصوصیت رہی۔

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء میں کرنا چاہانی کی غلامی سے آزاد ہوا۔ مگر کچھ ہی عرصے بعد میں دفعتاً معلوم ہوا کہ جاری قوم کو اڈیسیوں عوض البلد کے
 زیرِ تسلیم کر دیا گیا ہے۔ ۲۵ جون ۱۹۴۷ء کو کینسٹنٹن کے محلے کے بعد سے تاریخ کی ہر ناک ترین جنگوں میں سے ایک شروع ہوئی۔ بہت سے
 ادیب اس جنگ میں مارے گئے۔

کرنا عرصے سے پہلے درپے غیر ملکی مظالم اور اقتصادی مصائب کا شکار رہا ہے۔ اب کینسٹنٹن کی وجہ سے ہیں جہیں نصیب نہیں۔
 کینززم کے خلاف شدید جدوجہد ہمارے ادب کا نصب العین ہے۔

پاکستان کے ڈاکٹر عمر حیات ملک نے کہا۔۔۔
 ”یہ واقعہ ہے کہ مشرق کی ادبیات کی طرف ساجند ایک ماہرین کے عام طور پر مغرب نے مطلق کوئی توجہ نہیں دی مشرق کو مغرب نے
 اپنا فلام بنا کر رکھا تھا۔ غلامی بڑی آسانی سے روح کی طاقت پر ہوا سبب کر لیتی ہے۔ کچھلے دو سو سال کی جنگ میں ایشیائے اپنی خود اعتمادی کھودی اور عظیم
 ادب پیدا کر دیا۔ ملاحظہ ہاں یہ عجیب جاتا رہا کہ مشرق مغرب سے بے حد مختلف بالکل ایک علیحدہ دنیا ہے۔
 محل کی نفس میں ایک صاحب نے یہاں فرمایا کہ ان کو چاہانی میں بالکل ایک نئی کائنات نظر آئی۔

اگر یہ بات کسی عام آدمی نے کہی ہوتی تو یہی ٹھیک تھا۔ مگر ایک اہل نظر دانشور کا یہ کہنا کہ مشرق مغرب سے بے حد مختلف ہے بہت عجیب
 بات ہے! مشرق کی بھی وہی دنیا ہے جو مغرب کی ہے۔ یہاں بھی ویسے ہی مرلینڈ انسان جیسے ہر جیسے مغرب میں کہا جاتا ہے کہ چاہانی ناقابلِ فہم میں
 یہاں دو ممالک سال سے پہلے سان کریں نے پاکستان، یورپ یا امریکہ کے انسانوں سے مختلف نہ پایا۔

مغرب نے ہمیں انسانی آزادی اور حقوق اور مساوات اور جمہوریت کے تصورات سے ایک دہریہ بنانے پر مشغول کیا۔ اس کے ساتھ ہی برصغیر سے قوم پرستی کا تصور بھی آیا۔ اور مشنلزم، خصوصاً انتہا پسند شکل میں انتہائی خطرناک چیز ہے۔ اس کے علاوہ ہماری پرانی عداوت اور عقیدے قائم ہو گئے اور ان کی جگہ کسی نئی روایت یا عقیدے نے نہیں لی جو روح کے اس خفا کو کر سکے۔ کیا ہمیں مغرب کوئی عقیدہ دے سکتا ہے؟ کمینہ زمزم یا جنت اربعین یا چیزیں ہیں جو روح کو لگا سکیں۔ کوئی ادب بغیر عقیدے اور یقین کے پروان نہیں چڑھ سکتا۔ تاریخ عالم میں صرف ان ہی ادوار نے اعلیٰ ادب تخلیق کیا ہے جن ادوار میں عقیدے رائج تھے۔ عقیدے کی تباہی کچھ کی تباہی ہے جو آرٹ یا لٹریچر کسی عقیدے کی بنا پر نہیں کیا گیا اس کا اثر بھی نہیں پڑا۔ لہذا وہ عقیدہ اب کہاں سے حاصل کیا جائے۔

وہ عقیدہ یہ ہونا چاہئے کہ انسانیت ایک ہے اور متحدہ۔ اگر آپ کسی رسمی عقیدے میں یقین نہیں رکھتے تو انسانیت کے ایکے میں یقین رکھئے۔ اٹلی کے البرٹو سارادینا نے کہا۔

”مشرق وسطیٰ“ روس، چین اور اب جاپان کی سیاست کے بعد مجھے احساس ہوا کہ مشرق و مغرب کی تفریق بہت غیر واضح ہے امدان کا اختلاف اقتصادی اور صنعتی ترقی کی مختلف سطحوں کی وجہ سے ہے۔ ہم لوگ ایک زبردست صنعتی انقلاب میں گھرے ہوئے ہیں۔ مشرق جیسے ”ہسٹانہ عالمک“ کے عجیب و غریب نام سے یاد کیا جاتا ہے پچھلے پچاس سال سے وہی کچھ کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو مغرب اس سے قبل کر چکا ہے۔ یعنی زندگی معاشی نظام کی جگہ صنعتی نظام قائم کرنے کی کوشش۔ اسی کوشش نے نخل ریز انقلاب پانچنے۔ اسٹالنزم ”بھی دراصل چند سال کے عرصے میں ایک صنعتی روس کے قیام کی نگین تھی۔ یہی کام یورپ نے سرسالی میں کیا تھا۔ دس دھڑی ساری ایشیائی اقوام کو جس انقلاب میں گھسیٹ رہا ہے مغربی نہیں صنعتی ہے۔ جاپان اس انقلاب سے تین ہجریں گزر چکا لہذا اس وقت وہ ایشیا کا سب سے ترقی یافتہ اور جدید ترین ملک ہے۔ جب میں بیس سال قبل چینی گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا اٹھارہ صدی کی انگلیں دھاپ رہی تھیں۔ ہم لوگ دراصل وسعت کے بجائے وقت میں سفر کر رہے ہیں۔ امریکہ مستقبل میں رہتے ہیں، دوسرے حال میں زندہ ہیں اور بہت سے ماضی ہی جیسے جا رہے ہیں (اکثر یہ ماضی زمانہ قبل از تاریخ سے تعلق رکھتا ہے) جاپان میں بھی مستقبل اور حال اور ماضی اکٹھے نظر آ رہے ہیں۔

ایشیا صنعتی انقلاب سے دوچار ہے۔ یہاں نئے روس کی تعمیر و ترقی۔ نئے چین کی تعمیر و ترقی ہے۔

ہم ایشیا کو کیا پیش کر سکتے ہیں؟ اٹلی کا نظریہ کمالات اب بھی نشاۃ ثانیہ کی بہترین نمونہ ہے۔ اس نظریے کا مرکز ملک یا مذہب یا کوئی ایشیا کو جی نہیں۔ اس کا مرکز انسان ہے۔ یہ نظریہ آپ کو اٹلی کے شاہکار ادب کے علاوہ اٹلی کے علم اور ہم عصر تخلیقات میں بھی ملے گا۔ یہ نظریہ مشرق کے خیالات سے مختلف ہے مگر ہم اپنی طرف سے آپ کی خدمت میں اسے پیش کر سکتے ہیں۔

سائنس کے بعد سائنس کا نیکان کی اسی عمارت کے فرنیچر پر شین ڈیگر ریسرچر میں جاپان کے وزیر تعلیم اور یونیورسٹی کے جاپانی مشنلزم کے پیر میں کی طرف سے ملے تھا۔ ریسرچر ان کے وسیع ذہن کے دیگروں میں سے ڈیگر کی فکر میں علمات نظر آرہی تھیں۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔ بیسویں اور شامیں رنگ رہی تھیں۔ ڈیگر دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہی میری برابر میں ڈاکٹر گلیسنیپ بیٹھے ہوئے تھے اور نظائش کا ایک نوجوان صحافی جو اب زوردار کی حیثیت سے آگیا تھا۔ میں ڈاکٹر گلیسنیپ کو دیکھتی رہی۔ یہ اتنی سالہ بڑا جو جوان انسان دوستی اور مشرق پرستی کی خاطر آتا ہو اور سفر کر کے یہاں آیا۔ وہ کسی بات نہیں کرتے۔ لیکن مجھ سے ہمیشہ ایشیا کو جی کے موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ کس قدر پیارے اور متفین بزرگ ہیں۔ نظائش صحافی جس کا کوئی ماضی نہیں، کوئی قدیم زبان، تعظیم تہذیب نہیں، چھاپ بیٹھا بنارس اور بیانت پر ہماری باتیں سن رہا ہے اور کھانا کھا رہا ہے۔ میں آمد

ایک عظیم ایک روحانی اور جذباتی پس منظر میں شریک ہیں۔ پیغمبر و دروگھڑا گیا ہے۔ پھر اس نے ذہنًا مجھ سے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے۔“
 کیا ارادے کر رہی تھیں؟ باتیں نہ کہنا چاہتے تھیں۔“

دشمن کے بعد ہر شخص یہی کہہ رہا تھا۔ کہ کیا کاٹا ناندہ جاپان میں انگریزوں کو کدو لکھنے تک آج گایاں دیتا رہا۔ یہ چیز سب کے لئے
 بے حد جاہل انگیز تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس اجتماع میں انگریز بھی ہیں جنہوں نے میرے برصغیر کی اقوام کو دو سو سال تک غلام رکھا
 اور چلتے چلتے ایسی چوٹ دے گئے جس کا نشانہ پچھلے دس سال سے دیکھ رہے ہو۔“ اس محفل میں ان کے شمار بھی ہو رہے ہیں جو کراچی میں اقوامی
 اصطلاح میں انڈین اور پاکستانی کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ یہاں ڈچ بھی ہیں اور انڈونیزین بھی اور شرق میں ڈچ کو سترہ سو سال کا ریکارڈ تارک رکھ کر ہے۔
 انہوں نے انڈونیزیا کو صدیوں تعلیم تک کی روشنی سے جبراً محروم رکھا۔ یہاں عرب بھی ہیں اور یہودی بھی فرانسیسی بھی ہیں اور انڈو چائنا دے بھی انڈونیزیا
 بھی ہیں اور امریکن بھی۔ پھر ہم سب کا میزبان جاپان ہے جس نے صرف چند سال قبل آرمے ایشیا کو اپنا غلام بنایا تھا اور اب خود کس بڑی طرح امریکہ سے
 پٹ چکا ہے اس کا فٹنس کے مارے نائنڈے ایک دوسرے کے جانی دشمن رہ چکے ہیں یا اس وقت جانی دشمن ہیں۔ انگریز سب اپنا اپنا حال دل رکھنے
 پر آئے تو تیسری جنگ عظیم کی ساری تیاریاں اسی ایٹم بم پر مکمل ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ خون پرست حضرات ہیں، پیشہ ور سیاستدان نہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ یہاں
 ایسی باتیں نہ سوچیں گے۔“

”کوہ یاروف چالیس سال جاپان کے قبضے میں رہا ہے۔“ غلامی کے صفائی نے کہا۔ ”مجھے دیکھو۔ میں نے چار سو سال تک اسپین کی
 بدترین غلامی کا مزہ چکھا ہے۔ میں امریکہ کی کوئلہ رو چکا ہوں۔“

بڑے اندر دو بحث خاموش بیٹھے ہماری باتیں سنتے رہے۔ کالی دھاس اور انہندوں کی دنیا میں رہنے والے اس دانشور کو ہماری باتوں سے
 تکلیف ہو رہی تھی۔ کچھ میں نے شکر آچاریہ اور مادھو پران سے تبادلہ خیالات شروع کر دیا۔ مگر وہ بہت دگلی نظر آ رہے تھے۔
 ”پرہیز۔ جنگ کے زمانے میں آپ کہاں تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں؟“ میں ٹہکتے ہی میں تھا۔ لیکن اتحادیوں کی بھائی سے میرا سارا کتب خانہ تباہ ہو گیا۔ اب میں وہ پیشہ ہاسٹلر نہ
 تھاں سے لافوں گا۔“ وہ خاموش ہو گئے۔

”معاف کیجئے۔“ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”ہم پھر سیاست کے تذکرے میں الجھ گئے۔“

”ٹھیک ہے۔“ انہوں نے بے حد شفقت سے جواب دیا۔ ”میں تم فریادوں کے اس جوش کا اس بے پایاں غمی کو سمجھتا ہوں۔“

”دہ مشرق پاکستان میں ابھی میتا سٹی کی کھدائی جاری ہے۔“ میں نے وضوح دلا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ انہوں نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”کیا کیا نئے انکشافات ہوئے۔؟“

میں نے ان سے ہنگام کے چند روزہ خدائیاں کا تذکرہ شروع کر دیا۔ ہم دوبارہ اسی صدی میں پہنچے گئے جو بے حد محفوظ تھی۔

مجھے کے بعد ایک صاحب جو پا کر تان سے آئے ہوئے تھے محمد سے آہستہ سے برلے۔ ”دیکھا آپ نے۔ ہمارے نائنڈے نے“

نیشنلزم کے سلسلے میں اٹیا کرسی چوٹ کی۔ بھٹ آگیا۔ ”یا۔“

باہر کر رہی دو میں ایک نسبتاً نئی مریض لکھک اور ان کی بیوی میرے پاس آئے۔ ”ہم یہاں سے واپس ہیں کراچی آ رہے ہیں چند روز“

وہاں قیام کر کے ہمارا ارادہ ہے کہ پاکستان پر ایک کتاب لکھیں۔ ہمیں پاکستان سے شدید محبت اور ہندوستان سے دلی نفرت ہے۔ — پشت نورو ہمارا خیال میں ایک بے حد بے ایمان اور گھٹیا سیاستدان ہے۔ ہمیں پاکستان بے حد پسند ہے۔

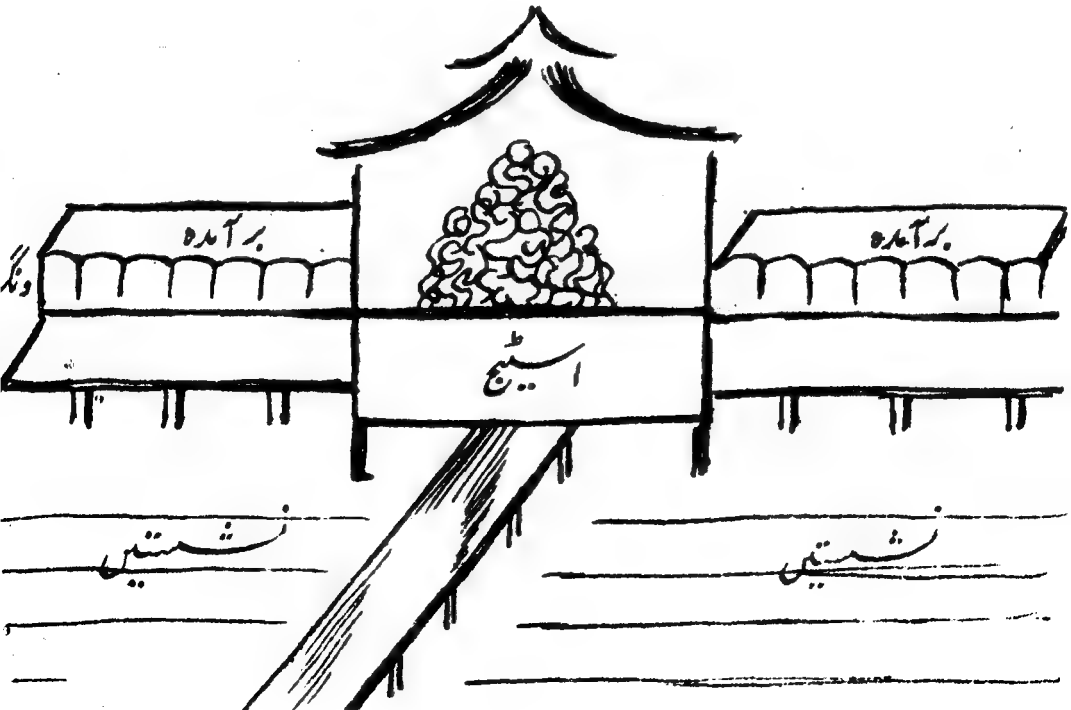
”جی۔“ میں نے جواب دیا۔ یہ سیاسی جھگڑے ہیں اور ہمیں امید کرنی چاہیے کہ بہت جلد ان کا کوئی قابل قبول حل تلاش کیا جائیگا۔

آپ تو اٹھکچھ بٹل ہیں آپ کو نفرت کے مسئلے پر زیادہ راسخ طریقے سے سوچنا چاہیے۔

وہ خاموش ہو گئے۔ فائنڈان کی کچھ مہمیں نہیں آیا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ میرے اس رویے سے ان کو جو ایسی ہوئی وہ ان کے چہرہ پر سے حیاں لختی۔ انہیں توقع رہی ہوگی کہ میں ہر ذمہ بھانڈا سنبھالنے کے بعد کہ وہ کراچی میں ایک ہفتہ قیام کے بعد پاکستان پر ایک محرکہ الاراء کتاب لکھنے والے ہیں خوشی سے یہ حال ہو کر انہیں کافی چلنے سے جاؤں گی۔

تیسرا پر

اب ہم لوگ جاپان کا کلاسکیل ڈرامہ تو دیکھ رہے ہیں۔ یہاں بھی سبب معمول ہیں تھیٹر کے دروازے پر پتھوں کے پلندوں سے لادوایا گیا ہے۔ ہال میں ہماری آدھ کوئیل وچرن پر پیش کیا جا رہا ہے۔ ہال دوسرے تھیٹروں کی مانند بے انتہا شاندار اور انٹرا ڈرن ہے۔ سامنے اسٹیج کی جگہ ایک بے حد خوبصورت چوٹی مندر ایسا بنا ہے جس کے عقب میں میزنی کے پردے کے بجائے ایک بہت بڑا پائن کا سبز درخت کھڑی کی دیوار پر نقش ہے۔ یہ درخت توہ ڈرامے کا سب سے مندر کے ایک طرف کھڑی کا کوریڈور روگ کی سمت جاتا ہے۔ ایک ہل ایسا آڈینس کی نشستوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ سارا کھیل ان تین راستوں پر پیش کیا جاتا ہے لہذا اتنا شاندار گویا کھیل میں شامل رہتے ہیں۔



تو چہ مغرب میں اب تک بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ایذا یا قوت نہ لے کئی فوٹو تھیلوں کو ترجمہ کیا ہے مگر ہمارے ملک میں کسی کو اس کے رسے کی ہدایت نہیں۔ یہاں فیکٹری سے کے دلچسپی ہے۔ اللہ نملوں کو سلامت رکھے۔

یہ ایک ایسا عجیب و غریب تماشہ ہے جو واقعی ہاری دنیا میں شامل نہیں معلوم ہوتا۔ سارا ڈراما چین کی طرح مجسم پر مبنی ہے۔ سارے وقت بیاہ پڑھوں میں جوس کو دس بیس منظر میں موجود رہتا ہے۔ ایک طرح سے عجیب و غریب آوازیں نکال کر مکالمہ کرتے ہیں۔ یہ آوازیں میں سننے سے تعلق نہیں ہیں۔ مکالمے کے دوران میں کورس کے دوا شامیں ٹھوڑی ٹھوڑی دیر بعد انتہائی بے ٹھری بانسی بجاتے اور ٹھوڑی پیٹتے جاتے ہیں (معلوم ہوا کہ یہ ٹھوڑی بھی تو وہ کہ ایک بڑا زبردست فن ہے اور اس کے بہت مشہور موسیقی نواز گویا جاپان کے احمد جانی ٹھوڑا اور نوکے قال کا دربر رکھتے ہیں) جاپانی موسیقی کی خصوصیت یہ تعریف نہیں کر سکتی۔ بے ٹھری، بے لگم آوازوں اور انتہائی غیر ترقی یافتہ سب سے سارے چند سازوں پر مشتمل گویا جاپان کی قومی اور مکالمی کر سکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کوئی ایک قوم سارے ہی فنون لطیفہ کی استاد ہو جائے۔ ان کی موسیقی اور رقص سے خدا پناہ میں رکھے (معاف فرمائیے گا۔ اگر آپ بڑا ذہین نہیں عرض کروں کہ یہ صرف اس تیر صغیر ہی کو حاصل ہے جہاں آجنا ہو مائیکرا اور ساکچی بھی ہے اور منظر مصوری بھی۔ تجارت ناچم اور تھک بھی ہے اور دنیا کی جنگل ترین اور خوبصورت ترین لاسکیل موسیقی بھی۔ اسے آپ غیر ضروری قوم پرستی کہہ بیٹھتے یا تو ذہن مگر یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا فرق البتہ یہ ہے کہ ہمارے عظیم وسیع رعبو تاجھو کوں مرتے ہیں اور ایرانی اور روم ڈھانڈی اور ٹھوڑی کھاتے ہیں اور جاپانی میں بے ٹھری ٹھوڑی بجانے والے کو قوی پریدہ بھاجاتا ہے اور اس کے فن پر گتا جی تصنیف ہوتی ہے) توہ کو اکثر قدیم رومانی ڈرامے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے اکثر ایکٹار مسک پہنتے ہیں، مرد عورتوں کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ کورس اس ڈرامے کا بڑا نمایاں حصہ ہے جو ایکٹروں کے مکالمے کے ساتھ ساتھ روتا کاٹا رہتا ہے۔ پورا ڈرامے کی ایک Ritnal کی سی کیفیت ہے۔

اللہ کی کو شہیدز انتہائی بڑی مکمل اور پچھلی صدیوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہیروئن کا پارٹ ادا کرنے والا عظیم ترین تھوڈ ایکٹور جو بہت بڑھاپا ہے (مارکس کہتے ہیں کہ تھوڈوں کے گھناؤنے بچے یا تھوڈوں ہمیشہ مسک پہنتے ہیں گویا مکمل مجسم) ہیرو ایک پندرہ سالہ لڑکا ہے جو اپنے فن میں پورا استاد معلوم ہوتا ہے۔ کہاں شریگن محمد سے تعلق ہے۔

براہر کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ڈوس تیس اسٹیٹ رٹھ میں بیٹھ جاتا ہے غور اور انماک سے ڈرامہ دیکھ رہے ہیں۔ براڈوے کے ڈرامہ نگار ایمر تانس بھی بہت بیٹھتے ہیں۔

"Pure Drama ہے۔" ڈوس تیس مجھ سے چپکے سے کہتے ہیں۔ "ڈراما ان کی اداکاری کی گہرائی تو دیکھو۔"

اپنے جذبات چھریں پنچو کہے ہوئے خواب کے سے عالم میں ایکٹرا بیچ پر چل پھر رہے ہیں اور حلق سے لڑھکیا آوازیں نکال رہے ہیں۔

دوسرے سین میں دیکھش کو دنا پھانڈنا چتا ہوا آیا اور میں دھڑا اپنی فانس دنیا میں واپس آگئی۔ یہ تو بالکل کٹھالی کی طرح کا ناعقا کٹھالی کے مقابلے میں بخیرانہ لیکن بہت کچھ اس سے ملتا جلتا۔

بیکل نظام میں بھی ہلکا دھڑکی نے مجھے چپکے سے ٹھوکا دیا۔ "اے یہ تو کٹھالی ہے۔" انہوں نے جھک کر کھس پھس کی۔

"ہاں۔ ہاں۔ بالکل۔" گویا جی ٹھوڑی کہتی رہے ورنہ ڈوس تیس مجھے مارے گا۔ وہ اس وقت Pure Drama میں غوطہ زن ہے۔ "میں نے کھس پھس جاری رکھی کیا تعجب ہے توہ کا ڈانس ڈرامہ کٹھالی ہی سے متاثر ہوا ہو۔"

زیرِ ریشی میں چھلکتا ہے۔

موسیقی کی ترجمان ترجمہ کے خطرے سے آگاہ کیے بھی اور نیا دور روایتی ناولوں کی انگریزی ترجموں پر ہر دوسرے کرنا چاہتا ہے۔ مگر راجا نے کہا ہے کہ ترجمہ کو خود ترجمہ کرتے وقت تخلیق کے تجربے سے گزرنا چاہیے یہ اصل درست ہے۔

جس پر ایک کتاب "مفتاب جا پانی ادب" امریکی شائع ہوئی تھیں ایک برطانوی ناشر نے مفت دوسرے جلد پر خریدنا ہی کافی سمجھا۔ اس کی دلیل تھا کہ یہ دوسرے جلد پر برطانیہ اسٹریٹیا نیوزی ویڈیو کیٹیڈ انٹرنیشنل ساری دولت مشترکہ کے لئے کافی ہوں گی۔

اس صورت حال کا دوسرا رکن ہے؟

رسمی اور اخباروں کے اڈیٹر

اس جلد میں میں نے لکھی ہیں جاپانی مصنف کا ایک شاہکار ناول "سیدان کی آگ" شائع ہوا۔ نیویارک ٹائمز نے مجھ سے کہا کہ صرف چار سو الفاظ ہیں اس کا ریویو لکھو۔ نیویارک ٹائمز کے اسی پرچے میں اس سے کہیں کم تر درجے کی کتابوں کے ریویوز بھی ملے گی کام سیاہ کئے گئے تھے۔ اسی طرح یہ کتاب "مفتاب جا پانی ادب" پر لندن کے ٹائمز ٹریڈر پلیٹ کے مترجمین صفحہ پر دوہرا گراف کا ایک چھوٹا سا ریویو شائع ہوا اور اسی شمارے میں ناقدہ کیٹیڈ کے گرجاؤں کے متعلق ایک کتاب پر پانچ کام صرف کئے گئے تھے اگر کسی ادبی رسالے میں مثال کے طور پر۔۔۔ جاپان کے متعلق ایک مضمون جنوری میں شائع ہو جائے تو مترجم دوسرا مضمون شائع نہیں ہو سکتا ورنہ اس رسالے کو مشرقی بعد کا ضرورت سے زیادہ طعنہ لگھا جائے گا۔

زیادہ تر ترجمہ حاصل کیجئے۔ ان کو زیادہ پیسے دیجئے اور پریس کی اس بے اعتنائی کو ختم کیجئے تب جبکہ ہم ملکی ثقافتی اتحاد کی بات کریں گے۔ امریکی کے مسئلے کو پیش کرنے کا۔۔۔ ذرا غور کیجئے کہ بیمار سے ترجموں نے، جنہیں آنا اور کام سمجھا جاتا ہے، دنیا کی تہذیب پر کتنے احسان کئے ہیں۔۔۔ رومین رولین کو ایگلر کیس میں ترجمہ کیا گیا اور اس کے بعد جدید انگریزی میں ورنہ روم کے زوال کے بعد تہذیب کا خاتمہ تھا۔ نثر کی زبان دوسرے نزدیک تمدن کی زبان ہے شاعری محض منتر پڑھنے کے مترادف ہے اور کسی کچھ اور کسی ملک میں کبھی تخلیق کی جا سکتی ہے، انگریزی نثر کی زبان کو ایلیف آئی اور جس کے عہد میں ترجموں نے سونا مارا اور نکھارا۔ روایتی تفسیروں کے خیالات کے ترجمے کے ذریعے پہلی بار بریل خیالات کا تعارف ہوا۔ ترجموں کی دولت ہی بحیرہ روم کے لوگوں کے خیالات شمالی یورپ پہنچے اور پھر اٹھادیس صدی میں انگلستان اور لائینڈ کی نئی بورژوازی کے نئے diatic حلقے اور ترقی پسند نظریوں نے اٹل جنوب کا سفر کیا۔ یہ زیادہ تر فرانسیسی ترجموں کا کام تھا اور انہی کی وجہ سے انقلابِ فرانس ہوا۔۔۔ اسٹیون اسپنڈر نے کہا۔

"مشرقِ چین میں داخل پاکستان کے مغیرے مخاطب ہوتا چاہتا ہوں۔ خیال یہ ہے کہ کل کی ان کی گفتگو کو اس سٹرک کی لپٹ میں تفرجوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ تقریر پرست اور غیر خدائی تھی۔ اس صورت حال کو واضح کرنے میں بہت کامیاب رہی جس کو ہم سب محسوس کرتے ہیں۔ وہ صورت حال عقیدہ کا فقدان ہے جس کا ذکر مغیرہ پاکستان نے کیا۔ میں ان کی اس استغناء بازی کا بھی مداح ہوں جس سے کام میٹے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان کے ہم مذہب یعنی مسلمان ادیبوں اور دانشوروں کے ایمان ناقص اور ان کے عقیدے ترنزل ہو چکے ہیں۔

میں اکثر باتوں میں ان کا ہم خیال اور چند باتوں میں یکسویت ایک مغربی انسان کے ان سے متفق نہیں ہوں۔

ان کا ارشاد ہے کہ جن ناولوں میں عقیدے رائج تھے انہی ناولوں نے عظیم ادب پیدا کیا۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ لیکن ہے یہ بات

ہندوستان، پاکستان اور ملل ایسٹ کے لئے صحیح ہوا وصالِ اسلامی ہوا اور اس نکتے پر میں سمجھتا ہوں کہ مغرب اور مشرق کے فرق کو واضح کرنا بہت ضروری ہے۔

اہلِ فکر کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم چیزوں میں تفریق کریں جو بائبل کے گھڑے گھڑائے مفروضے اور کلیات و ہر اسے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں بتانا ضروری ہے کہ ہم سب ایک ایک ایک مخصوص جزا اور مخصوص تاریخ کے ہمیں نظر سے مل کر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ کیا جانا یہ فرض ہے کہ ہم ان مختلف جزاؤں اور تاریخوں کو آپس میں گڑبڑ کر کے اور الجھنیں پیدا کریں؟ ہم سب کو اس چیز کا شدت سے احساس ہونا چاہئے کہ ہم ایک نہیں بلکہ ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں۔ یہ حقیقت کہ میں ایک جا پانی سے مختلف ہوں، ایک ایسا واقعہ ہے جس کے لئے ہم دروں کو شکستہ گزارنا چاہئے یہ کہنا کہ میں اور میرے وہ گورین اصحاب یا اس آل میں حج دوسری اقوام کے حضرات ایک ہیں بالکل لاشعنی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم سب کی روحانیتیں بھی ایک جگہ سے دفر ہو۔ لیکن ہمارا ایک دوسرے سے مختلف ہونا سب سے اہم چیز ہے اور اگر ہم مذہب پر گفتگو کر رہے ہیں تو کم از کم یہ قریب میں کہ مذہب سے ہماری کیا مراد ہے۔ مذہب اور عقائد بھی مختلف اور مخصوص ملاءوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے الگ الگ سبب، رسوم اور روایات ہیں۔ میں یہاں آپ کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ مغرب میں ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ مالگیری بدوار برادری کا نظریہ اور شخصیت جزا فیر اور تاریخ کی تفریق کا ازالہ ادب کے لئے تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ دلائل و ثبوت ہیں کی قسم کے جتنے او بار نے اس نظریہ کو فروغ دیا وہ مغرب کے زوال کے باعث ہوئے۔ لہذا میں آپ سے دوبارہ درخواست کرتا ہوں کہ یہاں کلیات میں جانے کے بجائے اختلافات پر زور دیکھئے۔“

اسٹیون اسپنڈر کی اس تقریر سے دل پرستانا چھا گیا۔ ہر ایک کو ان کا عجوبہ مست ناگوار گذرنا تھا۔ چند لمحوں بعد بڑے پوش شاہ سلوٹی تسکی نے کوئی بات کی اور پھر ترجموں کے متعلق تبادلہ خیالات دوبارہ شروع ہو گیا۔ پرورمہ فنانک کرشننگر لگ بھگ لے گیا۔

”میرے ملک میں انگریزی زبان میں بہت سی کتابیں اور رسالے چھپتے ہیں اور مختلف ہندوستانی زبانوں کا ادب بھی انگریزی میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ لیکن چونکہ کسی بھی لفظی شہرت کے پیشنگ اوکس کی طرف سے شائع نہیں ہوتے لہذا انہیں بیرونی دنیا میں قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا ہمارا ادب کے متعلق یہ رویہ ہے کہ کل جب یہاں جمالیاتی اقدار کے سلسلے میں ہندوستان کے نظریات پر گفتگو کی جا رہی تھی تو اسی جگہ پر بیٹھے ہوئے چند معتقدانہی معضلیں نے منحنی کی تعلیم گوارائے بغیر بلکہ کے اشارے سے اس پوری بحث کو یہ کہ مسترد کر دیا کہ مگر اس ہے۔“

بگس وکسن نے کہا۔

”اہلِ ایشیا کا جیسا کہ اعلیٰ ہندوستان کے نمائندے نے کہا یہ فخر حق بجانب ہے کہ ان کی کتابوں سے اس لئے بے اعتنائی بقی حاتی ہے کیونکہ کسی مروجہ اشاعتی ادارے کی طرف سے نہیں بھیجتیں۔ میں ان سارے غیر معروف ایشیائی اداروں کی خدمت تیار کر کے مغرب کے اوڈیو کو دینا چاہئے تاکہ وہ یہاں کی بھیجی ہوئی کتابوں پر توجہ کریں۔ کل ہم ان سارے مسائل کے متعلق ایک تجویز آپ کے سامنے پیش کریں گے۔“

اداکٹر حوشی نے پاکستان کے سفیر فاکر عمریات ملک کی تقریر کی تفریق کہتے ہوئے کہا کہ کل مشرابر قوسوادیانے اعلامی نٹ وائیہ کی انسان پرستی کا تذکرہ کیا تھا جو ان کے ملک میں رائج مذہب ہے۔ مغربی تہذیب نے انسان کو کائنات کا مرکز بنایا ہے لیکن سب تین چار صدیوں کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ انہیں اس سبب کی اس وقت سے مدد ضرورت تھی۔ یہ رویہ بہت زیادہ غلط ہے یعنی تعالیکن کہا جاتا ہے کہ مشرق میں خدا کو کائنات کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے سارے بڑے مذاہب مشرق ہی میں پیدا ہوئے۔ لیکن اس وقت اہل مشرق روحانیت کے لئے ملاء انہیں ہیں بننا کہ معتقد کیا جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ ہم اہل مغرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ روحانیت پرست ہیں مبالغہ ہے۔

اور چونکہ مذہب مشرق میں پیدا ہوئے اور مذہبی جنوں کو بھی مذہب کا نام دیا جاتا ہے لہذا چند مقتدر پروپیگنڈہ باز حضرات کی زورم کو بھی ایک مشرقی مذہب کا نام دے رہے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کینززم جو مغرب کے صنعتی انقلاب کی جائز اولاد ہے مشرقی کیوں قرار دیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر ملک نے اس بات کے اتنا پر زور دیا ہے۔ ٹیکو نے بھی انسانیت پرستی کے نئے مذہب کا پرچار کیا تھا۔

یہ نیا عقیدہ کہیں باہر سے مستعار نہیں لیا جاسکتا۔ یہ ہمارے اپنے اندر پیدا ہو گا۔ بہت ممکن ہے کہ مستقبل کے نئے والے مشرقی و مغرب کے باہم اثرات کی اتنی پروا نہ کریں اور محض فن کے مکمل پن پر زور دیں لیکن سچہ کہیں کہ ایک فن پارہ اگر وہ دوسروں کو متاثر نہیں کر سکا پھر بھی فن پارہ ہی رہے گا۔ ٹیکو مجھے مودرن آرٹ کو متاثر کرنے سے پہلے بھی بڑے فن پارے تھے لہذا اصل چیز یہ ہے، ہم کو یہ یقینا چاہئے کہ ایک قوم اپنی اندرونی جمالیاتی حس کا کس طرح اظہار کرتی ہے اور اگر ہم میں اتنا ظرف موجود ہے تو ہم دوسروں کی جمالیاتی حس کے منظر پر خود ہی پسند کر سکیں گے۔

مشرعہ دیا نے صحیح کہا تھا کہ مشرق کو اپنی انفرادی جنس پہچاننے میں ابھی بہت عرصہ لگے گا۔ ہم لوگ ایک ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جو پورے فن نے تعمیر کی ہے۔ بحیثیت ایک آرٹسٹ کے مجھے اندازہ ہے کہ ابھی تو مجھے اپنے گھر کی چھ پرستے خواص کو تلاش کرنا ہے۔ آرٹ کی اہل عالمگیر ہے مگر فن پارہ ایک ایسی مغفوشے ہے جہاں اپنے مخصوص زمان و مکان کے سیاق و سباق سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی بات ابھی مسٹر اسپنڈرنے بھی مگر منسکرت کے تقادمدیوں پہلے یہ نظریہ پیش کر چکے ہیں۔ کروچے کا مطالعہ کرتے وقت مجھے اس کا نظریہ فن سمجھنے میں وقت ہتی کر دوچے کے نزدیک آرٹ روحانی ہے اور آرٹ کے فن نے نص **Physical reminders** ہیں۔

لیکن پڑھنے والے اس تجربے میں کس طرح شامل ہو سکتے ہیں جس کے نتیجے میں آرٹسٹ نے اپنا فن پارہ تخلیق کیا؟

منسکرت کے تقادمدوں نے ہزاروں سال قبل یہ مسئلہ حل کر لیا تھا اور اس میں کروچے والی الجھن شامل نہیں۔

ابھی برازیل کا فائسٹہ تقریر کر رہا تھا جب ٹیکس وکس کو برترنگ اور میں اور پولی میں آکر ریڈیویشن کی تیاری میں مصروف ہو گئے کام بہت تھا اور ہمیں جلدی سے چادھینے کے بعد پھر باہر جانے کے لئے تیار رہنا تھا۔ شام کو گورنر ٹیکو نے ہم سب کو کابینہ تعمیر کے لئے مدعو کیا تھا۔

جاپان کے ہر چھوٹے اور بڑے شہر میں ان گنت تعمیریں جہاں جدید ڈھانچے، اوپیرا، میوزیمز، کالمیڈز اور بیسے دکھائے جاتے ہیں۔ اداکاری اور ایچ کرافٹ کے لحاظ سے جاپان کا تعمیر پورے اوسامریک کے تعمیر کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ درحقیقت ایک جاپانی کھیل دیکھتے ہوئے ہم کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم پیرس یا میلان یا لندن کے کسی تعمیر میں بیٹھے ہیں۔

لیکن کابینہ کی فز کی طرح یہاں کا پانچ سو سال پرانا قومی تعمیر ہے۔ کہانیاں مشرقی انداز کی ہیں۔ اداکاری کی طرز بھی خالص مشرقی ہے۔ لیکن ایچ کابینہ کی ایچ دیکھ کر ہم سب انگشت بندانہ رہ گئے۔ یہ ریڈیو ایک ایچ مغرب کی ایچ سے دو گنی مٹی اور چوٹی مٹی ایک بیک گرافٹ میں جس طرح کی منظر کشی کی جا رہی تھی وہ ہم میں سے کسی نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

ایک جگہ ایک جھلک کا سین تھا۔ ایک کونے میں گل تھا۔ اس کے نیچے بہت چوٹی پہاڑی مٹی بھر دی تھی۔ جانے ان لوگوں کو تو زمین کی استعمال سے کیا ترکیب کی تھی یا کیا کاست تھی کہ پورے وقت مٹی کا پانی بہت حاصلے اور مٹی سے پس منظر کی پہاڑیوں میں سے نکلا شجر کا پتہ اندک روشنی میں جھلکائی کے نیچے سے گذر کر جہاں کہاں غائب ہوتا رہا۔ اس میں پانی کی پھاریں بھی اڑ رہی تھیں۔ جگہ جگہ پس منظر کی وسعت اور گرائی میں کہہ اٹھ رہا تھا۔ چاند پر چھتری تھی۔ دوسرے مناظر بھی اسی طرح حیرت انگیز صحنہ حقیقی تھے۔ ایک مرتبہ ایچ میں پروا عائد آباد ہو گیا۔ بارش ہوئی، کچھ دھبے، پھر جاڑے آئے، ہف گئی

کئی چیز ایسی ہے جو بالکل انہی انوکھی جگہوں میں ملے گی کہ جو عروج و قوت ہے اور جس سے بڑا بار بار و چار ہستہ تھے۔

مصر میں ایک ایک کھدو کے ساتھ شام کو گیتن جبر کہہ کر اٹھا کہ وہاں میں ایک ٹوک کے ساتھ سب عرب نلتے۔ مجھے ترکی شاعری ملتی اور ترک انگریزی سے نہ واقف تھا۔ ایک دفعہ مولد کے ایک ہودہ نے کہہ دیا کہ وہاں پر کھڑا کر دیا۔ اٹلی شروع ہوئی جو بیحد ممتحن تھے اور ترک نے اپنی اپنی جگہ پر عیسویں کی کہ اس میں جگہ ہیں باہوئل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ عربوں میں ایک طرف کہ ترک کر پڑ گئے اور دوسرے طرف کہ وہاں سناری انہیں ہم دونوں سے نہایت کسی طرح ایک دوسرے سے کیوں کر پڑا کہ اس کو اچھے گھنٹے ہم دونوں نے ایک دوسرے کے اپنی سوانح حیات لکھ کر دکھائی اور سننے نہ انوں اور پہلی پھل کا ذکر کیا اور کسی ماحول پر طے سے ہم کو محسوس ہوا کہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس طرح کا تجربہ مجھے بہت بار ہوا ہے کہ ہر کوئی اس کتابت کے باشندہ ہیں انہیں کوئی چیز مشترک ہے جو اس ماحول میں اور خطابت سے مختلف اور بلند تر ہے جس سے اعلیٰ ادب پیدا ہوتا ہے۔ وہ انسانیت کی خصوصیت ہے یہ خصوصیت ان انسانوں نے پیدا کی ہے جو اس دنیا میں جیتے ہیں جہاں اپنے اختلافات کے باوجود کسی نہ کسی ذہنی کیٹ لپیتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے ہر روایتی ادباء لکھتے تھے کہ وہ ادب کی ری پبلک کے جوہر ہیں۔ کیا ہم ترک اچھی دنیا میں ایک ادب کی ری پبلک ملے گی پیدا نہیں کر سکتے؟

اس کے بعد سلطان قیصر نے بھی جواب دیا کہ۔۔۔

”ہر جگہ شرق و مغرب اس وقت پیدا ہو رہا ہے۔ انما بقیت کے دو تیسے نے مردوں کو ترک نہ نہیں کیا۔ ہم صیبا انڈونیشین لوگ جیتے ہیں کہ ہم دنیا کی تہذیب کے قافی دارانت ہیں۔ پہلا کی کی دنیا میں جزائیان حدود اور خصوص توہی دیات کے بجائے افراد اور جہول کہ آزاد ملی اعلان کیا اور انتخاب کی خوشخبری آری کرکٹ کی حرکت ہے۔ دوسری جنگ عظیم، تجویز، فلسفی، مذہب کے منتقل یا تو یہ کہہ دے کہ ادبی اور بزرگ شاعری۔ یہ ساری چیزیں سارے عالم کی ادبیات پر یکساں طور پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ ادب اب قیامت پر نہ نکل نہیں رہا۔ ساری دنیا کے سماجی ایک جیسے ہیں انہیں میں ستر اسپنڈر کے خیالات سے متفق نہیں۔ آج کے فکر کا اپنی مادہ کوئی سے پھٹکا کر اس کو چاہئے جس کی وجہ سے وہ اتنے فوٹو ٹنگ نظر سیاست دانوں کی باغی کی کا نشانہ رہا۔“

اپنی تقریر میں انہوں نے کہتے ہوئے کہہ کر کہا کہ میں ستر اسپنڈر نے فرمایا کہ اس کا فوٹو نہیں بار بار کہتے تھے کہ حوالہ عرب دیا گیا ہے۔ چاہاں کے نوروں کا جھانسنے لگا۔۔۔

”اب تک میں نے نظر میں تھا ستر ستر کی فلی میں آپ کی تعداد کہ آپ لوگوں کے کافوں کے لئے فوری ہو کر نہ رہے میں مصروف تھا وقت مجھے، اندازہ ہو کہ ہم دونوں کے سامنے کیو کی کشین کو کس قدر زبردست اور وقت طلب ستر ہے۔“

اب انہوں نے بھی اسپنڈر کو مخاطب کیا۔ ”ہنگری کا کوسٹینا۔ بیتا، ترک کی سرکاری فلی اور فوٹو خصوصیات سے بھر پور ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انگریزوں کی فلی میں آپ سے امریکا اور یورپ اور جاپان میں بے انتہا پسند کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ابلی سنگ کی کوکاس بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا ہوا ہے۔ عملی ان کے فوری مینوفیکچر کی تعلیمات کی اس پرش میں شامل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔“

انگلستان کے کینرنگٹنگ لگا۔

”یہ فوٹو کون سا کامیاب اور میں نے کل رات گیسٹنگ لک کی تقریر کا سلام کی جو وقت کے وقت تمام آپ انگریزوں سے مل کر نہیں ملتی تھی۔“ یہ فوٹو کون سا کامیاب اور میں نے کل رات گیسٹنگ لک کی تقریر کا سلام کی جو وقت کے وقت تمام آپ انگریزوں سے مل کر نہیں ملتی تھی۔ ہم کہنے والے مدعوں کے لئے کہنے کے لئے کہ وہ فوٹو کون سا کامیاب اور میں نے کل رات گیسٹنگ لک کی تقریر کا سلام کی جو وقت کے وقت تمام آپ انگریزوں سے مل کر نہیں ملتی تھی۔

جنا کے دفتر کی دفایا پیدا ہو گئی تھی جہاں جھکا کر ایسٹین ٹم نے کہنے سے روک دیا جانا ہے۔ اس لیے وہ بھی کانفرنس کا کارڈ ملنے کے بعد مل گیا۔

تو جو کہ اس طرح کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے بہترین طریقہ بتا دینا چاہتا تھا کہ کون سا طریقہ بہترین ہے۔ اس کے لیے اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔ اس کتاب میں کونسی کتابیں لکھی گئی ہیں جن سے اس نے اس کتاب کو لکھا ہے۔ اس کتاب میں کونسی کتابیں لکھی گئی ہیں جن سے اس نے اس کتاب کو لکھا ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔

اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "Classic Anthology Defined by confucius" ہے۔

ہم کہیں سے کہیں اس قدر دور پہنچیں گے کہ "میرا سوال"

حکومت

”ابو جبر ان پچاس برس کے جو ان کے ضمیر کو لاحق ہیں۔ ان کے ماں سے بھی نہیں ملتا۔ کو۔“

”فکر خیر کیا ہے اور کیا ہو چکا ہے؟“

41

”مکمل احوال و حالات کے تحت کس کو ایک طرح سے گھاس جڑ کی کہی۔“

مجلس انجمن اہل حق — خاتون و حضرات — جس کے سر پہ کسری ہوئی لٹکی نے ایک ہاتھ میں سے کرکٹ شروع کیا۔

میں نے کہیں نہ کہیں مل جائے۔۔

[Signature]

میں نے کچھ نہیں دیا۔ جس کی وجہ سے خیر الدین غفلت اور سادہ اور پان کی پیک اور سورہہ طہ پڑھ کر نہیں ہے۔

ایسا محنت افزہ ترقی یافتہ ملک ہے جہاں اندھے بھی بھیک نہیں مانگتے۔ سارے اندھوں کو ٹیبل ماس کے کام پر لگادیا گیا ہے۔

— ۱۰۰ —

مختصر

— ۱۴۱۴ —

حج

ان رہنمائیوں کے پیچھے جمایا ہوا ہے۔

چند ہفت روزہ کا ایک نمونہ ہے۔

کونستانتینوپول میں

اسلامیوں کو ان کا حق ملے۔ غرض کہ مقتدر کے ہوا سے مملکت کو حکومت کے کیا کیا سببوں پر مرور ہو۔ فریڈرک نے اپنے بیوی بچوں سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ اس کا حق نہ ملے گا تو وہ اس کے لیے لڑے گا۔

[illegible]

مشرق قریب کی کونیز سیاست حاصل کرنا چاہتے تھے، انھوں نے انڈیا کے جیسا کہ پانی کی لہر کے لیے اطلاع کی کہ وہ وہ پیران

نموده شد

کرمات کے کوٹنگ کے ماتھے کے موت مکس کی پینڈو زونوں پہلی ادھرت لکھو انکو اسطرح پورا کرنا ضروری ہے۔

ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔

کوئی جاننا اپنے غور سے غصے کے آثار نہیں دتا۔ کبھی غور میں نے دیکھا، ہر ایک حال کے لیے ایک طریقہ واسطے سے ہر آدمی پر بھیجتا ہے۔

کونئی جانی! آپ کے پرستار کے لئے یہ ہے کہ وہ اس کے لئے

والہ شک سے اور کچھ گورنر بھیجے ہیں اور دستے بھی بھیج دیے ہیں۔ یہ سب سچے سچے ہونگے۔

گھلادری، خاموشی سے اس سوس کا اگلا ہریدار ہی سمجھنے سے پہلے کہ وہ

ایمانداران کا یہ عالم ہے کہ اس کی طرف سے ہرگز کوئی شک و شبہ نہیں رہتا۔ گھنٹہ گزرتا ہی نہیں جاتا۔

میرے سے کہتے ہیں۔ وہی درویشی ہے جس پر ہرگز غور نہیں کیا جاتا۔
 "حکام طرہ" کے نام سے ایک نئی فنی سے میرے لئے ایک خاصہ لکھنا چاہئے۔

سمیٹنے لگے تھے۔ جبکہ رعایا کے حکام پر پورا ناکامی کی سبب سے بے بسی ہو گئے تھے۔

میشے کو لے کر اور اس کے دوستوں کے ساتھ شہر کی سڑکوں پر گئے۔ شہر کی سڑکوں پر گئے۔ شہر کی سڑکوں پر گئے۔

ہم نے جن صاحبزادوں کو یہاں لایا ہے ان میں سے ایک صاحبزادہ کی عمر آٹھ سال ہے۔

دینا کی کھوپڑی کے زینے پر ایک دوسرے سے ملا کر ہیں۔ ہمارے تو دل میں جہان ہیں۔

کیا اس اور اس کے انتہائی ساریٹ فیضان پہنچا مگر گزری اور گزرتی میں بالمشقت کہ پورے پورے ایک۔ دو اور تین جہازیں۔

کونفرنس کے اراکین کا حکم کیجنا باوجود اس کے کہ ایک غریب صنف جو نیت مقصد سے اس ادارہ میں باہر نہیں آ سکتی۔

میں نے کہا کہ یہ ایک خیر خواہ ہے۔ اس نے کہا کہ یہ ایک خیر خواہ ہے۔ اس نے کہا کہ یہ ایک خیر خواہ ہے۔

انقلابات نہیں لانے کے۔

صحیح کے رشتہ کیسے کہیں کہ وہ کسی کا نفیس کے ہم نواں کی کہے کہ کریں کہ کوئی طرف اور نہ ہو۔ چار لکھ تین سو اسی

میں نے اس کے چلنے کے لیے سب سے پہلی بات فرمائی تھی کہ وہ لوگ دیہاتوں کے پاس نہ جائیں۔

ہمیں بڑی بات کے پچھلے سے پریشان ہے۔ یہاں نہ۔
نامتقلانہ کم کار کا زمانے جیسے نہیں کہی گئی تھی۔
وہاں اظہار ہے۔ ہنر کے پر بارش سرور، جتنی سے منظر کے جلو

ہمارے ملک کا رعبہ کے تحت ہے یہاں ہیں

جے جی صاحب کو مل گیا تو۔ مگر کلا دیو کے الگ الگ لوگ تھے۔ اپنا قصہ چھپا کر انہوں نے فرما دیا کہ میں نے فراموش کر دیا ہے۔
 اسی وقت آپ کی جہالت کا عالم ہے۔ کہ کوئی آپ کے کہے نہیں سمجھتا۔ انگریزوں نے شرط لگا دی۔ خود بخود ہو گیا۔ ”اوپر لوگ۔“ تو فرما دیا۔
 ”اوپر تو جیسے کہ گمان ہے۔ دوسرے ماسے کے ماسے پر وہ بھی اور۔ آپ نے کس طرح ایک دوسرے کو تباہ کیا ہے۔ لہجہ کی
 مگر جاتوں پر بھاری کی ہے۔“ لاکھوں کو کچل کر جنگ میں صحت کے گھاٹ آباد کیا۔ آپ جو بڑے تہذیب اور انسانیت کے شعلہ بھڑکتے ہیں۔
 ”کیوں بلکہ سر کس پر تھی بھی۔ میں نے اس کے کہا۔“ اسی کو کھلنے کے لئے کہ نام ہے۔ کیا یہ پر کیا آپ کی بات سے کچھ جانتے گئے؟“

”ہا۔“ وہ۔“ ذرا ان کی باتیں تو سنو۔“

”کیا یہ دراصل حق نہیں کہ رتہ و کچلتا ان کو خدام بنایا جاتے ہیں۔“ تو نوازک کہنے دست نے کلا دیو کی کو خالص کیا۔ ”تو کو
 کیا تھی کہ وہ کچلتا ان کو خدام رکھے۔ پاکستان صدیوں سے ہندوستان سے ملے ہوئے قوم ہے جسے انگریزوں نے برٹش انڈیا کے نام سے ہندو
 کے ملک سے نہ کھینچا تھا۔ اب تنہا کو کوئی تھی۔ کہ وہ پاکستان پر حکمرانی کرنے کا ارادہ کرے۔ پاکستان کی انڈیا سے۔ اس کو جھگڑا نہ پانچ ہزار سال پہلے
 ہے۔ کیا یہ سچ نہیں۔“ انہوں نے ٹھٹھ سے پوچھا۔

”مگر دیو کی۔“ میں نے ان سے کہا۔ ”اس سب باتوں کو جو آپ ان کو دیکھتے۔ میں تو کھانا کھا رہی ہوں۔ چاہنے

الگ نہ کرنا کہ ان کو کر دیا۔ چاہنے اس میں۔ دستورہ دانا کیا کیا۔“

”اچھی ہو گا دستورہ۔“ ان لوگوں کی باتیں تو دیکھو۔“ ذرا ان کو اصلیت کھاتو۔“

”اصلیت کھاتوں۔“ لیکن کو۔“ اصلیت کھاتے تو کون آگاہ ہے۔“

چاندیوں کوٹ کو سب سے بھول کر تھکے گا کہ ہے۔ تو نوازک کا ادیب کلا دیو کی پر ہنسنا شروع کیا۔

”جی تو دیو کی کہیں نہ سنا جائے وہ خط خدا کی کہہ گا کہ۔“

”میں ایسا تو خیانت سے باہر نکلی تو سر شوہر شادوں جھلک کر اخلاقی سے کھلا گئے۔“ ارادہ دیا کرتے گئے۔“ اور سے یہ قسم تو

خوش ہو کر صوفی ہو۔“

”پھر نہیں۔“ چاہا کہ ان سے۔“ میں نے جلدی سے جواب دیا اور مار مارا لگائی۔

”دوسرے روز بھی تین دہائی تھیں مگر میں کو کھانسی کا آخری سسٹن تھا۔ کپڑے کے اخبارات نے تو کھانسی کے اخبارات کی طرح جاری سے
 ”تمہیں کھانسی کی اطلاع ہو چکی ہو۔“ ایک اخبار میں ”Heming beak Hoax“ کے عنوان سے ایک مزاحیہ تصویر چھپا گیا تھا جو
 کسی نے مدعی برائوں کے فرضی ار سے کھینچا تھا۔

”یہ صلیب کب تو مقرر ہوا یہ تو نوازک اسٹ ایجنٹک جاباں میں ہیں۔ اس وقت وہ لوگوں سے سیدھا کہنے لگے۔“ لیکن کھانسی کی خبر
 میں نہ سنا۔“ ”میں سنا تو اس وقت کے کھانسی کے جہان میں مل گئے۔ وہ سب سے بھلا۔“ یہ خبر تو فراموش ہو گئی اور وطن برائوں کے کھانسی
 نہیں کے کھانسی کے بارش کی کھانسی اور بچہ لڑا ہوا ہیں۔

”یہ یہ ان کھانسی کے کھانسی۔“

ہینگ بک : جون ادو جلائی کی بارش کے بعد آپ کے یہاں اگست کا مہینہ بھی بڑتا ہے ؟

یونہ : کیسے بڑاشت کی باتیں کریں۔

ہینگ بک : اچھا، جاپان میں کانگری کی نمونیت کی کوئی ایک قابل قبولی وجہ بتاؤ۔

ہینگ بک : ایک وجہ یہ بتاؤں جو یونہی ہی ہے۔ مگر مشکل بہت ہے۔

یونہ : موصوف مشہور ہیں۔ جس ادو کی ان کے یہاں خزانہ ہے۔ اس کا مشکل ہیں۔

ہینگ بک : مشکل۔۔۔

ہینگ بک : کیا آپ کو میرے معلوم نہ لگتا؟

یونہ : خداوند انا کانگری کی شان کی تیرے تیرے سرور بارش کی آوازوں تو پڑا شکر ادا کرتا ہوں۔ کیونکہ انہوں کی اس قسم کی نشاندہی بہت

پسند ہے۔ انگریزی۔ یہی ہی بہت مشکل۔ سے ان کی کچھ میں آتی ہوگی۔ تو وہ مطلب ہے کہ جاپانی طالب علم جو بیرون کے پتے

پاک نہیں چھوڑ سکتی، سے بھی ایسا کر کرتے ہیں۔۔۔

یونہ : اکثر۔۔۔

ہینگ بک : اور اگر اس سے زیادہ ایسا کر کرتے ہیں کہ ان کے پتے کچھ نہیں پڑا۔

یونہ : میں یہ بات نہ کچھ سکتا ہوں نہ ایسا کر کرتا ہوں۔

یونہ : آہ۔۔۔ چار سارا غیب!

ہینگ بک : سہا جی میں عقلی ترین لاسٹ کوئی کن ہیں۔۔۔ آجکل؟

یونہ : کانگری ہینگ بک کے اسٹیشن بک ادا آپ۔

یونہ : تو میں کیسے۔

یونہ : اس کے کانگری اور بک۔

یونہ : اور آپ کی سببیت کی چند عقلی وجوہات ہیں چندنا مسئلہ۔

ہینگ بک : نہیں، ہم سب تر مشکل اس میں نہیں ہیں۔ ہینگ بک سے اور اس میں بک لاسٹ کانگری کی مانند قریب نہیں ہیں نہ کہ ہینگ بک کا

یونہ : کیا جانتے۔۔۔

ہینگ بک : ہینگ بک میں قبولیت کے لئے لائی نہیں لیکن ایک حقیقت فائدہ مند روز ہے۔ کہ چند علم اور اس کا لگاتار

یونہ : ہینگ بک میں۔۔۔

ہینگ بک : آپ کا کہ ہینگ بک سے کیا مطلب تھا۔۔۔

یونہ : آج سارا۔۔۔ میں۔۔۔ آپ کا کہ ہینگ بک سے کیا مطلب تھا۔۔۔

ہینگ بک : میری تو یہی وجہ بہت زیادہ کانگری کی طرف سے ہے کہ وہ معمول اور جب زیادہ مشکل پسندی پر ازاد تو بہتر ہوتی ہے

یونہ : ایک مشہور نقاد کا الفاظ ہیں۔

ہیٹنگ بک : اگر تو لوگوں نے نہ اس میں کبھی مغرب میں ترجمہ کیا جاتا ہے کہ تو لوگوں کو غریبی کے لئے سب کچھ دے دے تاکہ لوگ غریب نہ بن جائیں اور ان کا دل بھی تسکین پائے۔

برادوں : یہاں بھی مشکل ہے کہ آپ کی بات مان لی جائے کہ تو لوگوں کو اس کے وسیعہ اشعار نہ پڑھیں، ایک سوٹی ہو جائے گی۔ آدھ درجن کے قریب اشعار کو میں جانتا ہوں جو Absolon پر وسیعہ کر دیتے ہیں۔

یونہ : آہ۔۔۔۔۔ پڑا سوڑا غریب۔۔۔۔۔ بابائی اشعار پر یہ مقدمہ ڈھال دیتے۔

برادوں : غم نہ کرو۔ اس کتاب میں اگر کوئی قسمی نہیں تو یہاں کے اشعار زور و زور و زور نہ لکھائیں گے۔ اس سے ضعف کو بھی نادمہ ہوگا۔

یونہ : اچھوہ زور و زور جاتا ہے، اگر وہ دوسری قسمی پہلے وضع نہ ہو چکے ہیں۔

ہیٹنگ بک : یہ بڑی زیادتی ہے۔ میرے وسیعہ اشعار کو مجھ سے زیادہ ہمارے دوستوں نے نکلے۔۔۔۔۔ عظیم تر ہو کر۔۔۔۔۔ کیا تمہیں معلوم تھا کہ میں ہر کس ہیں۔۔۔۔۔

برادوں : اب تک نہیں۔۔۔۔۔ دیکھو کہ غم کے ایک جڑ سے بھاری تھار نے اس ضمنوں میں تحقیق کر کے ثابت کیا ہے کہ آپ نہ صرف غم کے مصنفین سے ناواقف ہیں بلکہ:

نصرتیوں سے ناواقف ہیں!

نصرتیوں کو میں نہیں جانتا، میرا خزانہ ہیٹنگ بک میں، غم کے طلبہ نے حکیم کو ملکر یہ بیان کیا،

ایڈیٹر نے ملکر بیان اور دواغلی افغانی لکھ کر باغ۔۔۔۔۔

یونہ : میرے سر میں زور و زور جاتا ہے۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔ پڑا سوڑا غریب۔۔۔۔۔ کس کے لئے زندگی۔۔۔۔۔ کس کے لئے۔۔۔۔۔

Absolom۔۔۔۔۔ کس کے لئے ڈیڑھ۔۔۔۔۔

دیکھو کہ آناؤ سنسٹ لاؤ اسٹو ایکس پر، ہمارے کئی انڈین بھی شہر سیدنی کی چھپنے والے ہیں۔۔۔۔۔

ہیٹنگ بک : یونہ کو اس پرین دو۔۔۔۔۔

برادوں : بیکار ہے۔ بے ہوش ہو چکا ہے غریب۔ آئیے۔۔۔۔۔ سیدنی آگیا۔ ایک کانفرنس میں آپ کا انتظار رہا ہر گاہ۔۔۔۔۔

میں نے اخبار تذکرہ کے ایڈیٹر کو سنا دیا۔

ہم لوگ تین دو بڑی زندگی سمجھتے تھے جہاں لوگوں کا آخری شہر نہ تھا۔

”اس جگہ رہنے والوں کو تو زندگی ہوتی تھی۔۔۔۔۔“ گویا کھانا کھا کر میز کی سیٹ کے قریب کھڑا ہو گیا کہ کس کا تھا۔

جہتی بھی کبھی نہیں کیا کروں۔۔۔۔۔ میں نے دل میں کہا۔

ان کا ڈیڑھ لوگوں نے اپنی اطلاعات سے کہا کہ وہ کھڑا تھا۔ ”ہاں تو یہ کہہ رہا ہے“ ایڈیٹر کو سنا نے بات جاری رکھی۔

”ہو نہ کیا۔۔۔۔۔ میں نے داخل نہ کر لیا مگر وہ ستر پیر بھی مل کر نہ پائی کیا کھنے سے مل لیا جاتا ہے۔۔۔۔۔؟“

”پتہ نہیں۔۔۔۔۔ دراصل۔۔۔۔۔“

میں اور ایڈیٹر کو سنا کہ سب محول زور و زور سے ایک اور بحث میں الجھے ہوئے تھے۔

ساحلِ ازل خالقِ کسے راغ میں ————— یہ تو کسی محضی کا امر ہو سکتا ہے ————— میں سن رہا تھا۔

چنانچہ ملاحظہ کے باعث میری یہ نوبت بھی لاوارث ہو رہی ہے۔ میں نے کہا۔

ایمڈر سٹے نکلا۔۔۔
 میہ جفا تھا۔۔۔

Nature pure yet designed

Spring renewing the mind

اب رھو پھلکانی ہے۔ تھیں تو یہی نذر سے چھڑانے کے لئے صرف بڑے درختوں سے ٹھکی ہوئی پائیاں کھنٹی ہیں۔ نذر کے خنب ہیں پہاڑوں کے کنارے کنارے اترتے ایک ایک پھیل جاتی ہیں کھول کے کھولوں سے پٹا پٹی ہے۔ صاف صاف کٹائی کا بنا برباد نذر رھو پھلکانی ہو چکا ہے۔ اس کے باغات کی تنہائی تہن قطع کی گئی ہے۔ پہاڑوں کے ماحول اور پھولوں میں پیچھے ہٹے چھٹے چھ۔ جسے سمندر بہت چوکی کر بیٹھنے کے ذریعے بڑے بند سے ملتی ہیں۔ اس کے خوشیاں اپنے اپنے طرح شرافت ہیں۔ درختوں اور پھولوں کے اندر ہلکی کھل کے لوگوں کے انگوٹھے نظر کے خالص حسن کو نہ خیر نہ بد ہے۔ اراک کی کھنٹی چائیں اور بھر نے رنگت کے ماحول میں پیشگوئی یاد دلانے ہیں۔ سنگ جمہ کے کہتے ہیں مذہب کی بنیاد ایک۔ ملا دان کے لٹ کے ملنے سے ملتا تھا۔

میں نے ہندو ایک ہلالی وار لارڈ کے حکم سے کسٹوینیو میں بیٹھ گیا تھا۔
میں نے کہا کہ ہندو ایک ہلالی وار لارڈ کے حکم سے کسٹوینیو میں بیٹھ گیا تھا۔

اس کے نالغیر کسی شے شروع ہو چکا ہے۔ سب لوگ ڈرے ڈال میں غرض پر بیٹھ گئے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اس کے بارے میں سنا بیاں دے گا۔

ایک عظیم الشان جنگ کی طرح نظر آ رہی ہے۔۔

ایکس و آسن ایکس پر جا کر کہہ رہے ہیں۔

یہ بھی ایشیائی ہے۔ دیس ہے۔ غمزدہ ہے۔ ایک

[illegible]

کے لئے جاری ہے۔

کشمکش حالات میں اقبال و غیر اقبال کی طرف جڑتے دیکھا اور لمحے لمحے اگلے۔ اس کی توفیق و سعادت کو قائم رکھنے کے لئے ہمیں نے اپنا انہی سب کے اندر
جس کے چرم پر گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ خود بہرہ منس۔ انا۔ میری توفیق و سعادت رکھنے کی خاطر اپنی بے انتہا شائستگی بھی اپنے لئے کی خوشکشی کے تاثر میں بھی
کرتا تھا گویا جلا دار تھا۔

پیشہ وادار اور دوسروں کے اوپر نہیں مینا بہت بڑا وصف ہے۔ حالات میں ٹھنک کر صورت پہچان کر اس سے مظلوم ہونے پہنا ہوتی

آپ اٹھ گئے اور اپنا مذاق رائے جانے لگا۔ سب سے پہلی نعمت ہے۔

مندرجہ ذیل سے اجازت بخشوں کے باوجود خاندان کو اکٹھا کرنے کے بعد کہیں نہیں مل سکتا تھا یہی محلات کا وضع کیا۔

کے یہ محنتی ہمیں سب سے آگے تھے۔ محلات کی ان گنت ٹیلوٹھیاں (مچھلیاں اور چنار دیواریں) ہمیں جھانکنا پسند نہ تھیں۔ ہم واقعی شہر تشریف لے رہے تھے۔

کہیں ٹھہرے، مانتا ہے۔ کہ چورہ سو منہ ہیں اور باغ۔۔۔ باغ۔۔۔ جہان کے لینڈ الکیپ باغات کی خوبصورتی کو آسانی سے بیان

نہیں کیا جاتا۔۔۔۔۔ انہیں صرف بکھڑا اور عجیب و غریب کرنا چاہئے۔

کے ساتھ مل کر وہی لڑائی لڑ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے پاس ہتھیاروں کی کمی ہو گئی۔ ان کے پاس تو اس وقت بھی ہتھیاروں کی کمی تھی۔ ان کے پاس تو اس وقت بھی ہتھیاروں کی کمی تھی۔

[illegible]

کستور اٹل کے بانگات کا پتھر لگاتے ہرے ہم جھیل کے ایک بہت اونچے بل پر چڑھے جو دھوئی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے ایک اور سی علاقے تھا۔ غیر شگے کا پل اٹانکب خاکشکر دو آدمی اس پر سے ساتھ ساتھ گزر سکتے تھے۔ بہت احتیاط سے قدم رکھتے بانوں میں مصروف تھے۔

میں اور مادو آدیا کے گیسے جا رہے تھے کہ چند فطرت کے ساتھ زور اٹھتے تھیں۔ یک نیت انہیں طرف ہماری نظر پڑی۔۔۔ دور نیچے پانی کے کنارے پر لڑکی بچیس کیوں نہ ہو دو لڑکا اپنے تیروں کا رننگ ہماری طرف کھٹے کھٹے ہرے تھے۔ ”دروڑ کے گا۔“ انہوں نے چلا کر کہا۔۔۔

”ہم لوگوں نے دوسرا قدم اٹھ چکا ہے ہمارا کسی لمحے دوسری طرف سے اڑاؤ آئی۔۔۔ صرف ایک منٹ۔“

ہم نے جو ناکہ کرنا شروع کیا اس کے باوجود اسی طرح مسعود کو طرعی تقویٰ میں لے کر آئے غافلانہ طور پر

اور خاندان کے انحصار سے نکلے، آزادانہ طور پر ایک روز ساری طرف مڑنے میں بھی مقبول گھسنے سے باہر جانے لگے اور وہ غریب سے جاتے ہی بچے کی تعلیم اور سارا کٹھن حالت کو ملحوظ رکھ رہا تھا۔

شمار کوہنٹ ایگیکر آدمی کے گھر میں ضیافت ہے جو حکمرانوں کی بہت بڑی ٹیم کے ساتھ ہے۔ بہت ساری مہمانداریاں اور بیڑے بھی

استقلال کے لئے جو رہو ہیں۔ مگر گہریاں مکان کے اندر بھی (جا پاں میں) اظہارِ شوریٰ اور غیر ملکی تہذیبوں کا یہ امتزاج عجیب و غریب ہے) کر کے کرنے کے بعد یہ ایک ادبِ جدید یعنی انٹرنیشنل گاسٹ میں پچھلیں جو بارہ کے خیر مان کے گھر کا پتہ یہاں ہے۔ پچھلی پچھلی

[illegible]

”خدا کا ہے۔ سب لوگ کلمہ فاش ہو گئے؟“

”انارڈائن ہے۔ اور مرد ہو گئے ہیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”پھر اس طرف نکلیں۔ شاید کچھ ٹھکانے کی چیزیں“

کھانے کو مل جائے۔ چلی عبود کر کے اس پر مبینہ پہنچے جہاں بہت جامع ثقافت و تمدن کا شراب کا دروہ مل رہا تھا۔ قریب ہی کشتیاں بندھی تھیں۔ بیل چھل کے صدمہ ایک جلی بارودی میں ٹکرا کر ان رقصوں میں پہنچے جھک آیا تھا۔

مکتبہ اعلیٰ عربیہ مصر ہے۔ "کسی نے کہا۔

”مگر تجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہاں کیا چیزیں ہیں کھانے کی۔“

گھوڑوں عالمی دوسرا تھا۔ گوگ نے پیرس میں طویل پرورش گزارے تھے۔ بھائی سیمنون اسپینڈرکس کی اس پر شکل کشی کی گئی تھی۔

[illegible]

ہمارا دلدادہ نے چپکے سے کلہاڑی سے مجھے یہاں سے گزرتی ہوئی گاڑی کے پچھلے کھنڈے پر بٹھایا۔ گاڑی کے پچھلے کھنڈے پر بٹھایا۔ گاڑی کے پچھلے کھنڈے پر بٹھایا۔

فارسی -

”آپ لوگ کچھ کھاپی امتیں؟“

مجھ کو کہہ دیجئے کہ اس ناخوش شروع کی۔ اس وقت ہمیں یوں اور گڑبڑوں پر مسائل پر رشتہ کے کہنا میں، مصوری پر اہلیوں کے نیچے بہت جانا ہے۔ نہ صرف ان کے جو گاہ ٹیلیویس والی رانگیوں کے ساتھ، ہوتے کہ ان کو دیکھ کر لینے کے بعد اچانک سے کہے کہ اسے

ہندو مذہب کی ان گنت اقدار سے بھی ہندو مت ابد فراموش نہ ہوئی۔ اب پھر روایت شروع ہوئی کہ گھوک کے ارے الگ حالت خرم کر اب کیا کر جائے اسے نہیں کاغذ میں لکھ سکتی ہیں اس لئے کہ یہ سب کے لیے چھو، اندر، اور بیرونی چیزیں

اسلامی مریہ کے لئے گوشت، خنایا، پرک، یاچی، چو، یا شراب۔ تم تو نیکو دنیاوی و دینی انسان بنو۔ مریہ پر صوم و صلاۃ پیدا۔ کہیں تو کہہ کر کہیں صلاۃ خانے سے کہیں کہیں بھوک بھرتی ہے۔۔۔

جھیل کے کنارے والی ارشال پر حسب معمول جو جم تھا، یہ الگ سترت کی تلاش میں بیٹھے جہاں ہم لکچر کی۔۔۔ آئیے اس پر یک نظر کیجیے
 یہی کوہا جیو ٹریکس گلے خانوں میں۔ نے نہ اٹھ کر نچر گیا۔ وہاں ملک کی جیٹیں شور مچا رہی تھیں اور آج چنے صاحب ناچ رہی تھیں۔ یہ الزا کاس کی تھیں
 تھیں۔ کیا یہ کوہا جیو ٹریکس گلے خانوں میں۔ نے نہ اٹھ کر نچر گیا۔ وہاں ملک کی جیٹیں شور مچا رہی تھیں اور آج چنے صاحب ناچ رہی تھیں۔ یہ الزا کاس کی تھیں
 کوہا جیو ٹریکس گلے خانوں میں۔ نے نہ اٹھ کر نچر گیا۔ وہاں ملک کی جیٹیں شور مچا رہی تھیں اور آج چنے صاحب ناچ رہی تھیں۔ یہ الزا کاس کی تھیں

طراسر میں دیکھ لیا۔ آپ کی اکبریں۔۔۔۔۔ ہم سے کہا۔ پھر ہر بزرگ پر یسین کی چیر چسبیں۔۔۔۔۔ سے آخر کر گئی کہ اس کی خصوصیات پر آپ نے شیشے پہلے سے دہاں شیشے کے چند نمروں بعد رفتہ ایک ”کرک“ لائٹ کا بیج تار کی طرف کر دیا گیا۔

”اب بتائیے، اگر یہ ہو کر کسی نہیں تار کی حد سے زیادہ شیشی کی جارہا ہے تو کیا غلط ہے۔۔۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔۔۔“

یہاں سے بھی اٹھیں۔“

ہم وہاں سے اٹھ کر آپ دوست کے پیچھے آ کر میز پر بیٹھے۔ سائے کچھ نا سے پر نشیب میں اسٹال لٹکی ہوئی تھیں، جہاں مٹاؤ کی بجائے کھجور، خشک شہرچہ، بادام، پانی پرستے، گڑ کی آوند، آلو کی جالہ، دارہ دہلی میں نقصان زدگیوں کا کھسکا پانی میں کھلا رہا تھا۔

[illegible][illegible]

کر رہے تھے۔ ایک آدمی پانی پانی پتار دھا تھا۔ اس کا چہرہ کل کر سیاہ ہو چکا تھا صرف : انہوں کی سفیدی نظر آ رہی تھی۔

جھیل کے کنارے ایک بڑا بڑا دریا بہا کرتا تھا اس کا پانی اسی دریا کے کنارے سے بہا کر رہا تھا۔

جس وقت بجلی کا سا کوند الپا میں باد چڑھی جانے میں کڑی برق دھند تھی میری آنکھوں میں کچھ بھی نہ تھا۔

مکمل طور پر محو ہو چکی تھی۔ اگلے سال جب ہم نے اس کالج کے کھنڈریں میں جو ریل سٹیشن منگدی تو انہیں شے میں صرف چاکلیٹ کا ڈبہ ملا۔

جس پر میری کہیں کیا کھانا تھا جس میں وہ بچے جے یا کرتی۔ اس کالج میں تین سو ساڑھے اسی تھیں۔ سب کی سب امی اچھے ختم ہو گئیں۔ متعدد

زیستگ اسکولوں کی اسٹریٹوں اور پیرس میں اسکولوں کا ایسا صفیا ہوا کہ ان کا ایک طالب علم زندہ نہیں بچا۔ سب آپن واسٹو ختم ہو گئے۔

چاندانی کے دخترین پر تیرہ ماٹھا۔ بچوں میں چھچھہ پڑے گاؤں اسپیکر میں سے آتے ہوئے سنسنی خیز آواز سنائی دے لگی۔

دانش کے دور سے بدلتا ہے سیتال کے آگے میں آئے دھا گھوڑا بھٹکتا ہوا آتھلا۔ اس کا چہرہ کل چکا تھا، آواز نکلتی

والتھ کے دور سے دو نماز مسیتال کے اس گھر میں آج بھڑا کھڑا بھگت ہوا۔ اس کا چور چل چکا تھا اور آٹھ گھنٹہ پہلے اس کے درمختصر تیرہ راقا تھا۔ بڑوں میں چھپے ہوئے لاؤڈ اسپیکر زمین سے دو گونج رہے تھے۔

七

1

میرزا محمد علی

وہ گلاسٹون کے لئے پھر مصلحان سے اس کا سوال کی سمٹ لوٹ گئے۔

میر سے شوہر نے عدالتی شام جمعہ۔ بات تک نہیں کہ میں ان کو محبت و کرم میں گھر بیٹھا ہے رشتہ خلی جوا جارا ہے۔ یہ۔

ان سے باتیں ہی نہیں ہمارا گھر اسے رات گھسٹتے ہوتے آرہے ہیں۔
 کل کو گھنٹہ سب جیسے لوگوں نے انسان تہذیب کو زندہ رکھنا ہے یہی کام ہے اس کا قلب اور احوال ہیں۔

بادشاہت کا نام۔
 اس کا حال ہے کہ اس کو سب پر جو سوار ہو کر چلا کر چلا گیا ہے۔ اسے چند سال پہلے ایک دیوانے نے ماہب نے لگی

ایک لکھنؤ میں لکھا گیا کہ کئی کہتی ہے۔ خاموشی سے صرف کے کچھ کوڑیوں پڑھ رہا ہے۔ لیکن اس کا حال ہے۔ سے راجہ چند پتار

سب کو لکھنؤ میں لکھا گیا کہ کئی کہتی ہے۔ خاموشی سے صرف کے کچھ کوڑیوں پڑھ رہا ہے۔ لیکن اس کا حال ہے۔ سے راجہ چند پتار

اس کو لکھنؤ میں لکھا گیا کہ کئی کہتی ہے۔ خاموشی سے صرف کے کچھ کوڑیوں پڑھ رہا ہے۔ لیکن اس کا حال ہے۔ سے راجہ چند پتار

اس کو لکھنؤ میں لکھا گیا کہ کئی کہتی ہے۔ خاموشی سے صرف کے کچھ کوڑیوں پڑھ رہا ہے۔ لیکن اس کا حال ہے۔ سے راجہ چند پتار

اس کو لکھنؤ میں لکھا گیا کہ کئی کہتی ہے۔ خاموشی سے صرف کے کچھ کوڑیوں پڑھ رہا ہے۔ لیکن اس کا حال ہے۔ سے راجہ چند پتار

اس کو لکھنؤ میں لکھا گیا کہ کئی کہتی ہے۔ خاموشی سے صرف کے کچھ کوڑیوں پڑھ رہا ہے۔ لیکن اس کا حال ہے۔ سے راجہ چند پتار

اس کو لکھنؤ میں لکھا گیا کہ کئی کہتی ہے۔ خاموشی سے صرف کے کچھ کوڑیوں پڑھ رہا ہے۔ لیکن اس کا حال ہے۔ سے راجہ چند پتار

اس کو لکھنؤ میں لکھا گیا کہ کئی کہتی ہے۔ خاموشی سے صرف کے کچھ کوڑیوں پڑھ رہا ہے۔ لیکن اس کا حال ہے۔ سے راجہ چند پتار

اس کو لکھنؤ میں لکھا گیا کہ کئی کہتی ہے۔ خاموشی سے صرف کے کچھ کوڑیوں پڑھ رہا ہے۔ لیکن اس کا حال ہے۔ سے راجہ چند پتار

اس کو لکھنؤ میں لکھا گیا کہ کئی کہتی ہے۔ خاموشی سے صرف کے کچھ کوڑیوں پڑھ رہا ہے۔ لیکن اس کا حال ہے۔ سے راجہ چند پتار

اس کو لکھنؤ میں لکھا گیا کہ کئی کہتی ہے۔ خاموشی سے صرف کے کچھ کوڑیوں پڑھ رہا ہے۔ لیکن اس کا حال ہے۔ سے راجہ چند پتار

نہاں آتھوں کے متعلق باغ میں بارش سے پناہ لے کر ایک سنوہار بن بھائی کے اندر رہے سے پڑا سوتا ہے۔

واپسی —

آرا اور اوسا کا اور سریشو کا پھول لگا کر اب لوگ آگ مختلف تھوڑی جابجاس ہیں۔ اسباب بندہ گئے۔ خضاحا فلک کے چاچکے۔
شروع سے سب سے اور سو فیوہ اور پورے ڈھڑے اور کھنڈیست۔ سب اپنے اپنے راستے لوٹ گئے۔ پورے پورے ملک راج آند کی عزت بہت بڑی
کئی ظہر بنا لے لی گئی گئے۔ باقی سب لوگ انہی کی زندگی میں لوٹ رہے ہیں۔ تیرک اور پوجت اور تیراک اور لکھت اور اوسا اور لندک۔

بال بکھو کے جو رنگ ال کی کھڑکیوں سے ٹھکرا رہے ہیں۔ عقب کے در کھوں سے چند فیوہ کے خاضے پر آٹا کر رہے
ہیں۔ ان کے پانی کی کھنڈوں سے در کھوں کے پیشے، دھندل گئے ہیں۔ شا رنگ ال میں خاموشی ہے۔ صرف ایک بونیکے چادوں طرف لگا رہی
اوسا ماسکو کوئی اوسا نہ لکھتے دھندلے اور دوسری نواس، ننگلا اور تیرہا متھ خاموش بیٹھے ہیں۔

شہر کی میں میرے گجراتی دوستوں کو پیراسا کھاتے ہیں۔ "اوسا ننگلا کہہ رہے ہیں۔

میں ان بچوں کو دہیں بیٹھا چھو کر باہر آ جاتی ہوں۔

باہر جہاں ایک عظیم غلام رہے جس کی یہ دھندل رہی ہے۔

پہلے چٹا چرواہا لاکھو گرواپس لکھا گیا۔ اسے لے لے کر خاشاب ہے۔ لکھنا خاموش سے اکیلا بیٹھا ہے۔ اس کا سریشو
اور سریشو پھنس کے پھرنے دھڑلے۔

صرف غلام ہے نہ سریشو نہ چٹا چرواہا۔ فضا سے لپکتا کوئی آپ لکھتا ہے؟

چرواہا لاکھ کے تیرے اور تیرے پھنس کر دیکھتا ہے۔ نمایاں ہو رہی ہیں۔ ان کا رخ کو صحت، بھرنے پھنس کر کس کے ہٹے کھلے ہیں؟

اس کے پھر پھرنے کا پھیلاؤ بند ہے۔ جڑے جڑے گھنٹاں ہیں اس کو نہیں جان سکتے، اپنا زبڑا سنبھالے وہ باز آ رہا ہے۔

ہوتا ہے۔ اپنے بھائی پھیکا وہ گرواپس لکھتا ہے۔

پہلے جو شخص سے لنگے پائی نکلتی ہیں پڑیوں پر دیوانہ جھانک پھر رہا تھا۔ لڑکے نے بالآخر اسے قابو میں کر لیا۔ اب بین مدی

کے کنارے لگا کر رہا ہے۔ شروع ڈوبنے والا ہے اور دھندل چھایا ہوا ہے۔ سفید پیل اب سفید بادلوں میں گھس گیا ہے۔ چاندنی

میں سے گھبتی ہے۔ پیل خاشاب پھیکا ہے۔ اب چرواہا اپنے وقت کا ملک ہے۔ وہ اس بادلی کی مانند ہے جو پہاڑوں کی کھڑکیوں پر پڑنا پھرتا ہے۔

اب چرواہا اوپر دونوں خاشاب ہو گئے۔ روشن چاندنی خالی ہے۔ اس کو کوئی مایہ نہیں، صرف ایک خلا ہے۔

اگر اس کا مطلب جاننا چاہو تو ان سفید لکیریں کو دیکھو جو منظر گاس میں کھل رہی ہیں۔

محو الکامل پر چلیے ہوئے بھائی ملے گئے ہوئے خوشگام سمندری طوفانوں سے گزرتا ہوا اسیلہ اس کو دیکھتے دھندلے کے سے نکلا کر

لے "پہلے اور چرواہا ہے کی دلی تصویریں، چھپنے کے وقت کس دھندلے کے تھکنے کو دانا نہیں کی نظم۔

شکاک کے اور پورے پراتا۔

میں ہاں آئی۔ چھپے پرائے کیچے سے پہلے خستہ حال چوں نے غشیش اٹھ گئی۔ میں در اندرون سے بے ایجابی کر کے زیادہ پیچیدہ موصول کرنے کو ششکر۔ مجھوں نے کانوں میں جھینڈنا شروع کیا۔

میں جہز ششتری ایشیا داپس پہنچ چکی تھی۔ سرسبز طریقہ مکمل کھجور پر استادہ کوکری کے جھونپڑے دیکھے اور اناناس کے ٹانغے خستہ حال انساناں ششامی عمارات پر بیچ مقلد جہاز کا غروب آفتاب کا منظر دیکھا بہترین خوش سہا قندب کا منظر ہے۔ فلپینز لوگوں کی بے مثال

سامانگی اور خوش خلقی۔

جہ ایشیا کا واحد صوبائی ملک ہے۔ گرجا قادی میں اس پروردہ ہے۔ جگہ جگہ صید فیروز کے کشتیے نصب ہیں۔ اوزار کے زور میں اپنی چند سوکستوں کے جہز اس ماس میں شامل ہر جہاز سیارہ اسکراف اوڈھے ٹرینر ٹکاب کے کھیل لگے۔ اوزار کیاں اور سہا ہائی کا کوئی نہیں طیسرے فلپینز وائٹین جھکی پھکی پھیرا ہی مقصود ہے۔ ہر سپاہی کی تہذیب جہلی ایشیا میں، فرانس کی تہذیب، انڈونیشیا میں، برطانیہ کی تہذیب، ڈچنگ کا ملک، اٹلیا اور فیلیپینز نوہ پانڈستان میں، مغرب کے اس بے پایاں تہذیب کا اندازہ تو کیجئے۔

اس میں نے حسب معمول جہز ششتری ایشیا اور سپہانہ ملک کے مسائل کے سمجھنے میں ترنا شروع کیا۔ وہی سامان ہائی میں جہاز

مالک کے خوشگست اور مستمان اور ملک کو کالی بلیٹی کے ماہرین کہتے ہیں۔

افلاس کا کل، گندگی، بھائی اراضی، نوجوان اٹھنا، فخر و شرف، کمینڈر کم خلوہ آواز دینا کا اتحاد اور مگر امداد غیر جانب دار

مالک کی عاقبت۔

قیلا کی نگہیں میں اندسہ طرز کے مکان ہیں۔ کوسہ کی حال بار بالکیاں، مویشی مزار میں، سرکوں پر ٹھکی چھٹی جیسے چلی رہی ہیں۔ اکا تو کا قدیم سپہانہ وضع کی گھڑا کوشی رکھا دی۔ جے جاتی ہے۔ اندسہ ملکات گئے۔ ٹرینر میکلا، رنڈل میں کچھ کھڑے ہیں جن میں غنائی کا اعلیٰ محقق رہتا ہے۔ جگہ جگہ فیصلی کے اندر چھنا شہر ہے جو سپہانہ میں نے قزاقوں کو کھلی کے پیردہ میں شہروں کی طرح پھیر کیا تھا۔ یہ سارا شہر جہان بانی داری سے تیار ہوتا ہے۔ اس میں کوکسترات کے علاوہ کچھ نہیں۔ مارے شہر میں افلاس زندہ لوگوں کے جھونپڑے چھپے ہیں۔

جہان میں ہر طرف امریکی بمباری کے نشانات، رکھائے جاتے تھے۔ یہاں ہر طرف جہان بانی کی بمباری کے نشانات نظر آ رہے ہیں۔ خوبصورت قدیم کھیتل جہان کو ششہ ہیر تو پڑ کے جہان بانی نے کو لگا کر تیار کیا۔ خوبصورت مکان، پورا نے بیونیم۔

اہل اندونیشیا کا طرز ان لوگوں کی جہان بانیوں سے نفرت ہے۔

ان کی سہا سپاہیہ سے بے اندازہ نفرت ہے۔ جنوں نے چار سو سال انہماکی جہان بانی کو کوسٹ کی۔ چپا تین میں امریکی بے انتہا مصلحتیہ یہ جیسا کھک، مگر کی کوکلی، دیکھیں امریکی آکاؤں نے جہان تسلیم کھلی کی فلپینز کو کہ ہر ایک کا دور جو ملایا اور آخر میں پڑے پراس اور دوستاں کو طے سے

آواز کو سکھایا۔

فلپینز نفسیاتی طور پر اگلے برس سے لوگ نہیں ہیں۔ جس جہان میں فلپینز صحافی نوکے کو ہمیشہ چھو لگتی تھی کہ تہذیب کی حق تہذیب نہیں اور کچھ کی قدیم تہذیبوں کا تار بہت کثرت، کھیتل جہان بانی سپہانہ ایشیا نے بھی اپنی ایک چھان دیو تیار کیا کہ لوگ اڑا۔ جسک اٹامی سے خاصا ہر جہان بانی تھا۔ سپہانہ عجیب و غریب لوگ ہیں۔ انوں نے دنیا کی تہذیبوں کی سر طرز پر غنائی کی ہے اس کی مثال ناہین میں نہیں ملے گی۔ چپے کھانگی

پھر اس کا محفل میں ملے ہوئے تھے۔
مدعوے صحابی نے مجھے تفصیل سے ملک کے اقتصاد مسائل سے روشناس کرنا شروع کیا۔ پھر اس کا گفتگو کا مضمون ہندو مسلم مسائل،

ہندو ملک کے گھبراہٹ اور کشمیر کی طرف تھلا گیا۔
رات گئی بھٹی گئی۔ مدعوے سے خلاص، روز بیک، جس کو سنی کا اعزاز بھی تھا۔ نیچے دو ملک آگئی میں بہت سے خوبان صحابیوں کے کھانا
دو گھنٹہ کے بعد چلے گئے۔ چلو دین کا پھر گوارہ تر ہو چکا تھا۔ لوگ اس امر میں مجھے باتیں کرتے رہے۔ پھر دو دو ٹھاکا۔ میزان میں بھی خوش خوش ملی سے
سکراتے رہے۔ سات کا اندھیرا دیکھ کر آگے سو رہے میں ان پیارے لوگوں کو خبر یاد کہ کر مینا سے جا رہی تھی۔

گفتگو کا تمک۔ میں یہ کرکڑی رنگ کے خوبصورت لٹیف میں بیٹھی ان کی بالائی سے باہر کرتی رہی۔ ان لوگوں کی شادی کرنا اعلیٰ درجہ کا کام
ہوئے ہیں۔ ستر کرکڑی رنگ کی تیل کرکڑی ناز ہیں۔ ہلا یہیں پیار بھٹی لٹیف۔ ان کی ایک سالگرہ کی کوہنچی کیا کھلا رہی تھی۔ ادب اور سیاست کو کھل کر
ہم لوگ شاہ گنگ، دو ملک کے غیر اور کراٹے اور اس سے تشدد سنا گیا کہ کرکڑی کرتے رہے۔ ستر کرکڑی رنگ نے ملایا کہ اس کا تانا بکڑا کرکڑی کرکڑی
ان کی کڑی سنگاپور میں ہے۔ بل بھٹی تھی۔

خدا کا شکر کہ میں مدعوے سے روبرو موجود رہوں۔ میں نے ایک گھر اس میں لیا۔ سامنے پورہ پٹی کی عمارات سرسبز پہاڑوں
چھوڑ دو ملک لکھنؤ تھیں۔ جس سے پورہ کرکڑی رنگ یہاں خار اور شرمشتری چڑھاتے ہیں اور کوہنچی کی گھر میں چھپتا اور آگس کے ساتھ
بھلا نیکی ناشکی کر رہے تھے۔ اپنے والد کی طرح ہر علمی ستر کرکڑی ہیں اور اپنی نوکری کے باوجود بہت تنہا طبیعت کے جسے عموماً اکٹھی ہیں۔ پورہ پٹی
میں خاصہ انگریزی اس میں ہے۔ سیمپل انگریزی کے ساتھ شہر پرانی شاہی پڑھ کرکڑی ہیں۔

کہا کہ وہاں ہندو تھا۔ ہندو ستر کرکڑی اور ہندو نہیں کہاں تھے۔ چھپا ہوں پر سکھر۔ پاری ٹھیک کرکڑی کر رہے تھے۔ دولت کی طرح کی شہر کرکڑی
فیٹ کی ہاتھی۔ سے میں نے سامنے نظر لائی۔ چاندوں اور لکھتے تھے اور وہی راستے تھے اور وہی شہر میں شہر کرکڑی کر رہے تھے۔ جو ان کی
بسیں چلی رہی تھیں۔ پورہ پٹی۔ بالے انگریز تانت۔ سے بیکوں کو مار رہے تھے۔ چھپتی تھی کرکڑی کر رہے تھے۔ چھپتے چھپتے پیر والی جیسی عورتیں
تھیک لگتیں ہیں سے چھپا کرکڑی تھیں۔ ملک تو ہیں انہیں کاروبار بھی تھا۔ پٹی رانوں میں ہندو نہیں کہہ رہے ہر داتا تھا۔

وہی تھیں بے میں ستر کرکڑی کر رہے تھے کسی اعلیٰ درجے کے بھلا کرکڑی ملک کے راکھ سے میں بیٹھے ہوئے میں رسدو یہ سمجھ سکتا
ہے اسی قدر کہ ایک چارہ صاحب ایک دوری خاص میں ماس لے رہا ہے۔ آزاد دینا کہہ نہیں تو اب بھی مرے سے انہیں کھانا ہے اور دینا ہے۔
جیب کرتا ہے، چارہ میں کرکڑی ہے۔ چھپا کرکڑی ملکی سیاحوں کو خبر دکرکڑی کے خوش گئے ہیں کہ جیب کرتوں سے ہر شیا رکھنے لگا۔

شنگھ کا گانا ملک، دو، عیش و عشرت کو کھینچ کرکڑی نے روٹ کرکڑی کرکڑی۔ دواں کی طرح تھیں ستر کرکڑی کرکڑی کے کام پر لگ گئیں
مگر یہاں خدا کے فضل سے اعلیٰ درجہ کی دولت ہے۔ میں مینا چٹا ناہیں لوگوں کا خوش ہر اگر تھیں۔ پورہ پٹی دینا انگریزوں سے پوچھ لیجئے جو ملک کا ملک
بھڑکے ہوئے ہیں اور جن کی دیر سے یہاں سکھ کرکڑی آباد کی ہو چکی ہے۔

مگر یہاں یہ حال بہت حد تک ہے۔ پیکلک میں بھلا کرکڑی تو خاصہ خانہ ہے۔ میں مینا سے مدعوے میں شہر کرکڑی ہے۔
ایک تو امریکہ، پوری تو چھپتی اور مدعوے میں ہیں سے یہاں شہر کرکڑی کے کوئی کہتے ہیں اور کہیں ستر کرکڑی ان کو خبر دینا نہیں سکتے

کیونکہ اس کی حکومت کی طرف سے اس کی سامراجی ہے۔ ان جتنی ایشیا کے خیر خدے کا مطلب ہے ہوا گر کیا وہ دشمن ملک سے تجارت کر رہے ہیں یا ان کے
 کو بے حد حکومت کی اس وجہ سے ہر کچھ نہ پونہ ہے۔

آج کل جب ملک و مسلم کی تصویر دیکھی تو آنکھوں میں زلزلہ آگئی اور وہ گزشتہ اڑیس برسوں سے ہوئے بے یقینی جنگ پر نظر ڈال کر خیر خدا

کی جی بھر کیا سیرا۔

مشرق میں جہانگیر علی کی آخری کردلی۔۔۔۔۔ پاکستان!۔۔۔۔۔

کریم چنگ نے کہا۔ "ڈیڑ لاکھ لاکھ مالے بے حد اس کا تیار ہیں۔ کچھ تو اس کی شکل و صورت و انداز کی قسم کے لوگ خدائے آسمانی آتے ہیں پڑا
 وہ تار مار اور پورے گھر کا رھاڑ کاٹے بیٹھے ہیں۔"

"سیر کی طرح کے لوگ کی ذرا وضاحت کرو۔۔۔۔۔ یعنی آدھی سا لکھ لوگ۔۔۔۔۔؟"

ڈیڑ لاکھ لاکھ مالے بے حد اس کا تیار ہیں۔ کچھ تو اس کی شکل و صورت و انداز کی قسم کے لوگ خدائے آسمانی آتے ہیں پڑا
 وہ تار مار اور پورے گھر کا رھاڑ کاٹے بیٹھے ہیں۔"

ہمارا نام ہے۔ چاہتا۔۔۔۔۔

ہمارا نام ہے۔ چاہتا۔۔۔۔۔

ہمارا نام ہے۔ چاہتا۔۔۔۔۔

ہمارا نام ہے۔ چاہتا۔۔۔۔۔

ہمارا نام ہے۔ چاہتا۔۔۔۔۔

ہمارا نام ہے۔ چاہتا۔۔۔۔۔

ہمارا نام ہے۔ چاہتا۔۔۔۔۔

ہمارا نام ہے۔ چاہتا۔۔۔۔۔

ہمارا نام ہے۔ چاہتا۔۔۔۔۔

ہمارا نام ہے۔ چاہتا۔۔۔۔۔

ہمارا نام ہے۔ چاہتا۔۔۔۔۔

"Love is a many

splendoured thing.

لہذا اس لئے دیکھ کر اس کی شکل و صورت و انداز کی قسم کے لوگ خدائے آسمانی آتے ہیں پڑا

کے تاقی کلب میں رہتے ہیں جو ٹانگ لٹک لٹک کے کسی سابق گنگرنگی پیری کے نام پر مہمنوں ہے۔ تیسرے پیر کو کسی پیر سے ملے ہیں جو ٹانگ لٹک لٹک کے سات کوٹل سر کھادی ٹپنے کی دھڑول میں شامل ہوئی ہیں۔ اس کو حسب سے ان کی زندگی گنتی ہے۔ ان کی تعلیم ان گنت انسان اور برتر ریشہ کے دانشمند سکولوں میں ہوتی ہے۔ ایک سکاٹلینڈ کے سوسائٹی رسالہ ایک محود ہے۔ ان کو کینٹ کی پیچہ نہیں ساگر ٹیٹ ان کو دیکھتے تو ہنسی کے مارے دہرائی ہو جاتے۔ یہ بے جا دلی دلیاں جو بھلائی پر پیسٹ، اپکلاس سماج کے آخری چراغ ہیں۔
صبح مارگریٹ کو دیر پہلی کیریر خیال تھا کہ لٹک لٹک شاید وہ اس سال تک برطانیہ کے پاس رہنے کے شکار ایک چھٹی نے

اس سے کہا کہ مختلف چار سال کی بات اور ہے۔
چند روز اور میری جان۔ — — — — —

ایسی بد شگون کی باتیں مارگریٹ کرتی ہے۔
مارگریٹ یہاں سے جا پان ہوئی ہوئی سٹڈی جیلے گی۔ اس کے پانچ بھائی ہیں جن میں سے بھرتا اس کے ایک سٹ اور تین کہیں ہیں، پانچوں پر میری بڑی بڑی پڑھنے پڑھانے ہیں۔ باپ کا مقصد ان سے سب سے بڑے بھائی کی دو مہینے قبل شادی ہوتی ہے۔ مارگریٹ نے اچھا اپنی بھانجی کو نہیں دیکھا۔
”میری اپنے ایک سٹ بھائیوں سے خوب جھگڑا رہتی ہے۔ تاکرنگ وہ مجھے قاتل کہہ رہے ہیں انہیں میلانی بناسکی۔“

بڑا اعلیٰ آتا ہے۔“

دوسرے روز بک فاسٹ کی نینز سرس بنگٹ نے اس سے کہا۔ — — — — —
”نہیں جا رہی۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

”اوسے ایک وی اکشنری ملک لکھی دیکھ آؤ۔“ فائدہ ہوگا۔“ میں نے کہا۔
”وہ موش ہو گئی۔“ میں نے فک کو اب نہیں بتایا تھا۔“ اس نے مجھ سے کہا۔ ”کیونکہ ہم لوگ یہاں آنا خوشگوار تھ

گندار ہے میں نے کہہ کر سنا کر خندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔“

”کیا ہوا۔“

”پہلوں مجھے گھر سے بل ملا ہے کہ میرا رٹا ایکسٹ ہو ائی اور اس کی کئی رہن اپنے گھر سے ہی سوسر ہے۔“ لنگس گھڑا
جلنے کی وجہ سے دونوں دم گھٹ کر سو گئے میں خیر ہو گئے۔ — — — — — میں کی سٹڈی جا رہی ہوں۔“

دوسرے روز مہتممیں لٹک لٹک کے روانہ ہو رہے تھے۔ سات کو تک پہنچنا۔ سے پہلے اپنا سارا سامان چھپا کر

فرش پر بیٹھ گئے۔

مارگریٹ اور آلا دوس ادھ بھیجے سے ٹھہروں تھنے کے کرائی تھیں۔ چھین میں ان کو جو تھنے فرسے گئے وہ جیت اچھڑتے
پہلوں سال چلنے پرورات سینیٹروں میں پڑائی پوچھنا اور سوسے انتہائی پیش قیمت لارڈ۔ — — — — — میں بنگ بلے خود بجا اور سرت
سے ایک پیر کو تھو رہی۔ — — — — — ان سے اچھا خاصا سینیٹروں کو مل سکتی ہے۔ — — — — — انوں نے کہا۔

دوسری صبح میں تھو سے لڑ کر کرکٹوں کی طرف رخ روئی تھی تاکہ میرے بار لکھنے والے سافول کے پیر بڑے بڑے بکن سنے

بچے سے آواز دی۔

میں نے ہر کر دیکھا۔

ننان کھڑکیں جھپک رہا تھا

”لو۔۔۔“ میں نے کہا۔ ”تم یہاں کہاں۔۔۔ معمور ہر تہ سے ابھی تم راہزنوں کی آواز دے گئے تھے نہیں جوتی۔“

”ہر جگہ۔۔۔“ اس نے گونے کے ایک کونہ کی طرف اشارہ کیا۔

”ان اداں۔۔۔“ ٹھیک ہے۔۔۔“ میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔ ”لیکن یہ خباک دہی میں۔۔۔ مجھے ابھی چند

منٹ میں ہوائی جہاز پڑنا ہے۔“

”پہرے میں ضرور ملے۔“

”ان اداں! یہاں میں ضرور ملے گی۔۔۔“ میں نے تیزی سے قدم اٹھائی آگے بڑھے۔ ”کانگ کانگ پانی کے دورے کے بارے پر

ہم گئی کوئی نہیں۔۔۔ رنگ گاہک سارا اکھاڑ جاتی تھی۔ میں نے گھڑی ہٹا ڈالی۔۔۔ سائے پتھر سے چھل گیا تھا جہاں سے مجھے چند لمحوں میں ایرلوٹ

جہاز کے سامنے ایرلانڈ کی بس پکڑ لی تھی۔

”یہ کہ مجھ کو کہہ دیتے ہوئے لے کر گریٹ اور پانا نظر آگئیں۔“

خدا حافظ۔۔۔ وہ لائق ہمارے چلنا ہیں۔۔۔ بہت دور ننان کی طرح ابھی ہر طرف ہر جگہ لے آگیا جاتا تھا بہت محروم اور

قابل اگر معلوم ہو رہا تھا۔ سارا کانگ کانگ آوازوں کی محروم اور قابل رحم تھا۔ لاکریٹ اور پانا آوازوں اور مصیبتوں سے بھری تھیں۔

”تین معلوم ہے ہم دوبارہ کہاں نہیں گئے؟“ لاکریٹ نے غریب آتے ہوئے پوچھا۔

”نہی تاؤ۔۔۔“

”لو کانگ کانگ میں۔“

”خدا خیر کرے۔۔۔“ تم تو جانتی بہت بڑی طرح برین وکشن کر رہی تھی ہو۔ نہہرا کا ہنسنے پر کہ۔۔۔“ میں نے منتظر ہو کر کہا۔

پھر ہر طرف کے کن سے لڑنے پر کہ خوب بننے اور دونوں کی لپاں پانا پانا سامان اٹھائے اپنے راستے چلی گئیں۔

اب لاکریٹ گھر پہنچا جہاں اس کا چھتا بھائی موجود ہے۔ جب لوگ گھر پہنچے ہیں تو ایک لاکہ ہے۔

ہر طرف کے بعد گھر جو رہنا چاہتا ہے۔

اور گھر تباہ نہ ہونے چاہتیں۔

دنیا کے، ایشیا کے شہروں کو لپا لپا رہے پکارا۔

میں نے سوچا کہ اگر یہی صحابہ ہیں۔۔۔ غور یہ کہ وہ لوگ تو کس قدر سب سے وابستہ مصروفی، لوگوں اور پروپیگنڈہ اور مزاحمتی کارروائی

بہت۔۔۔ میں نے کچھ ہی عرصہ قبل ایک نہایت ایسی چیز دیکھی تھی کہ کوئی کونسا جاسکا تھا۔۔۔ ایرلوٹ پر مافوق کی بات

نہایت عجیب تھی۔۔۔ جہاں عورت کی سب سے پہلی کوکھ سے۔۔۔ ابرو کوکھ پر چٹیک گھوم رہے تھے اور نہایت عجیب و غریب

11

"6-11-13"

”انہوں نے انکی سے دوبارہ اشارہ کیا۔“

”میں نے اسے کہا۔“

”آپ آگے تشریف لے جا سکتے ہیں۔“

شاہ کے اہل خانہ اور اہل اوصول کے بڑھ چڑھ کر ہنسنا اور ہنسنے سے روکنا۔

ہم نے امرِ سنسکرت میں وہاں تک تو خیریت ہے مگر یہودیوں کی غلط بات سن کر دم بولا جانا ہے۔

— ۱۰۰ —

کیا جو کہ حقانی لید ہے۔

ہمناقی کے معنی آنا دے کے ہیں۔ یوں یہ لکھ کر فریور لکھی، آزاد لکھی کہ بہت بڑا علم بردار ہے۔ اسی لئے ظنی تو ان پاکستان اور عثمانی تہذیبوں

”مذہب کے مخالفین نے رسام کی قدر و اہمیت کو الودھ کیا ہے۔ یہ وہ ہے اس کے پار کی جگہ پر ایک گورڈ رائٹ ہے۔“

میرا ملک کرواقاٹ ہو جائے۔ آپ ابجو نہیں گئے؟

میں نے کہا کہ اگر اس کے ہمارے مندر صوفی یہ ملک تک پہنچ جائیں۔

۱۹

در اس کا یہی تھمکتا خلعت کی یاد دلا رہی۔ کہ تو یہ کہ زیر اثر سیام کے فوجی طیف نے بے عزت تو کی۔ تیجوری صلی میری سیام کے کبر پڑا ہی کے ذریعے
بڑی ہشام ایک کرم الفاظ حاصل کیا۔ پالی استسکت اور کجورین الفاظ سے ان کی خاموشی کی شکل ہوئی۔ مادا حق تعالیٰ ادب کی بنیاد ہے ادا اس کا
سیا دلشیں یہاں کا اکل انہر کا کھیکہ کھجا جاتا ہے۔ یہاں کے بادشاہ اور شہزادے علم و ادب کے بہت سر پرست رہے ہیں اور انہوں نے
خود بھی کتابچہ کھو گئے تھے۔

ذہب کا یہاں ہر چیز بہت سخت لکڑی سے بنی ہوئی ہے۔ دیہات میں لوگ اپنے اپنے دیو تالیق و زخمتوں اور پڑھنے کی عادت گتے
پر دستار پہنا کر اعلیٰ طبقہ کی مذہبی طریقہ خاص بنو رہے۔ جنگ لاک میں چاروں طرف تھا جہاں ہندو مت کے کھنڈ اور چھوٹوں کے لاکڑیوں سے
ہر طرف ہندو دیوں اور گنڈوں کی کھجور ہے۔ یہاں مسلمان شہزادوں کو بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ مسلمان ترقی یافتہ ہیں۔
گنڈو بھی ہندوستان میں ہندو دیوں کی کھجور سے بنے ہوئے ہیں کہ تو یہ سے آیا۔ گنڈوں میں شہزادوں کے آئینوں اور رنگ رنگی کھنڈوں اور پڑھنے
کے پڑوں اور پڑوں والا ہے۔ طریقہ غیر خاص سیاسی تصویریت ہے۔ ہندو مت کا یہاں کئی کئی مختلف طریقہ ترقی ہوئے۔ داتا ہندو کے ہر پڑے
مستور ہے۔ ہندو مت مذہب، کئی کئی کے بھی ہیں۔ ہندو کے سر پر تھوڑا ہوتا ہے جس کا مطلب چھتر ہے۔ —

اس سے قبل کہ میں اور نیکو گنڈو گنڈو میں اس موضوع کو تبدیل کر رہی ہوں۔
بلکہ آگ مشرقی کا تیس کھانا ہے۔ ہر بہت سی خوراک کے جو شہر میں سے گذرتی ہیں۔ مگر یہ نہیں زیادہ مزید ملتا ہے اور ان پر چھنے والی شہزاد
لکھتے اور گنتی اور خاموس کر لکھتے ان میں کئی کئی انا نوبت نظر نہیں آتی۔ دیہات سے پڑھنے والی کھنڈیں، حلال، اٹھائے گنڈو راکھی ہیں۔ دیہات میں ملک کی
خاص تجارتی شہزادہ ہے۔ اس کے دونوں طرف سیوگنڈوں میں کئی کئی پڑھنے والی کھنڈیں، اٹھائے گنڈو راکھی ہیں۔ دیہات میں ملک کی
نہیں گنڈو یا اس کا کھجور کھجور گنڈوں میں جہاں کھنڈیں پر ہاٹ گئے ہیں۔ شہر میں، ہر طرف ناہر کھجوروں والے راہبوں کی ریل پیل ہے جو کھنڈوں پر کھجور
کھنڈوں کے پاس جاتے ہیں، وہاں سے خیرات ملے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

خانی میں گنڈو سا دارا حلال اس قدر خاموس ملتا ہے کہ کھجور بالکل یہ احساس نہیں ہر کہ میں کسی بھی غریب میں ہوں، یہ سب تو پڑا لگام
کہاں ہے۔ یا شہزادی پاکستان کے کسی بھی شہزادی کا ہند۔ ایپورٹ سے شہر تک کا راستہ گنڈوں سے ڈھاکے جانے والی شہزادی کی شہزادی ہے چھ
چھڑے کھنڈوں کے چھڑے، ٹوٹی ہوئی چھکڑا ایسی ہیں، مسابھل کر کٹا نہیں، کھنڈوں کا اب اور نالے۔ ہنڈو دیوں اور نالوں سے مشرقی پاکستان
وادی جنوب مشرقی ایشیا کا ایک حصہ ہے۔

مجھ سے ایک امریکی نے کہا۔ یہاں کھنڈوں کی آواز ہے۔ ملک اپنی ضرورت بھرا دے اور چوڑی آواز لکھتے۔ لوگ خوشحال ہیں لیکن حد سے
زیادہ کھنڈ۔ مجھے ایک اور راقم امریکی بہت عجیب۔ میں جانتا ہوں کہ اہمیت کیا ہے۔ دیہات میں کھنڈوں اور خوش باش نہیں ہیں۔ سیاست ان کے نزدیک
محض ایک اور فوجی شہزادہ ہے۔ ان کے یہاں حکومت تبدیل کرنے کا نالہ طریقہ کئی کئی ہے۔ اور لوگوں میں ایک کھنڈ۔ ہر کھنڈ میں۔ آئینہ طرز پر درجہ بندی کھنڈ
ہیں۔ یہاں کوئی ناکہ پیش ہے۔ بے شمار سیاحی کامتیں ہیں۔ سب اپنی اپنی جگہ ہیں مگر ایک عام آدمی کو یہ سب کھنڈوں میں ہنڈو، گنڈو، کھنڈ
میں نے لکھا ہے کہ شہزادہ ہر راقم فوجی طرز پر ہوتا ہے۔ بلکہ لاک کی شہزادوں پر بے شمار فائدہ دے گا کہ ان کے ہنڈوں پر سے ہیں۔ "میں نے چھ
"ہر سب، دیہاتی پر دیکھتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "خانی میں شہزادوں کا ملک ہے۔ لوگ اپنی کھنڈ میں گنڈوں میں ہنڈو، کھنڈ، کھنڈ
ہر سب سیاست دان کو نہیں لکھیں۔ ہر سب نے انہوں نے کھنڈوں سے لکھی ہے۔ بادشاہ اور ہر لوگ کو یہ لکھنا کہ راقم شہزادوں والے اسرائیلی ہیں۔ ہنڈو ہیں۔

—

یہی وضو چنانہ ہوتی تھی جو خدا اگر عیسوی نہ ہو جاتی تھی۔ لڑکی ایک خستہ ہر جاتی تھی۔ جیسے کہ ان کی خستہ ہر جاتی ہے۔

[illegible]

یہ جانے کو کہ کسی جگہ ہے۔ صحرائے نمونہ شہزاد کی فرج کیمپ ہو، بامیں اور خاردار تار و درجی کیمپ سے، جیسی کہ مورتی ہیں۔

ملک کی ہر دارمختی ترہیں قتاد ہی کوئی پیاسی دیتا تھا۔ وہ ملازمین کیسرو پر ان دکھائی دے رہی تھیں۔

نظامی کا کہنا ہے۔
 دوسری جہازت کی جھلک تھی اور وہی وہ تھا کہ شہر کا جہاز تھا۔ وہی جہاز تھی کہ جس نے کسی کی تصویر پکے جیسے پیل کی وہ کر
 بلکہ ان کی جہازت تھی کہ وہی جہاز تھی کہ جس نے کسی کی تصویر پکے جیسے پیل کی وہ کر

وہندو لوگ زبردستی کھائی دے رہا تھا اس وقت سے قریب نیلا بسٹا ہی بہتر ہے۔ اس سے نہ چاا اور کبھی کوڑا کر کے لے کے چلا پڑا۔

ہر ماہ میں کئی زحمت۔ البتہ جگہ جگہ درد اور اذیاء اور کم کم کے پاس سہل اور کم محسوس تھے۔ دیوار اور چار بجالہڑ کے پارک کے بارے میں کوئی زحمت۔ البتہ جگہ جگہ درد اور اذیاء اور کم کم کے پاس سہل اور کم محسوس تھے۔ دیوار اور چار بجالہڑ کے

دور آمدے میں جادو نظر ہوا اور اس خیال سے کہ شاید کرکے میں کوئی شخص بوجہ ہرجس سے دہ پھ کے کہ وہ ان کی سی جگہ ہے اور

تھے۔ نیکو کر کے میں لکھتا تھا: نام کر سبیاں خالی کر سبیاں۔

صحرائی نے در ایک کلکری سے جھٹکنا۔ ہر کلکری میں ایک سا منظر دیکھ کر وہ حیران چرا کر سے خالی پا کر وہ تنہا ایک ایک کرے

سے داخل ہو گیا۔

اندر بھی کچھ لوگ ہندو اس کی نگاہ و عندیائی ہی کچھ اور تھک وہ کھڑا رہا۔ تاکہ انھوں نے اگر پرے سے اسے شکوک کھانے یا اسے کچھ پورا دیکھتی۔ وہاں تھا کہ اگر کسی چورنگ گزرتے سے آواز پیدا ہو جائے۔ تو سب یا سب ایک کی کہیں ان نیچے کوڑی سے نکل کر اس پر دالوں کی۔

موت کو جس کے صوفی لکھا تھا۔ میں نے یہ کہہ کر اس کو دلو کہ فردیاد جانے لیا تھے یہ بیچارہ۔ اس نے سر ہلایا۔
 میرے صوفی بھائیوں کو کہ یہ بھروسہ کرتی تھی وہ میرا سوا نظر سے اوجھل ہو گیا۔ پھر کہ میرے بیٹا شاکب کی کوہ نگر بننے

کو کیسے کوئی جمع نہیں ہو سکتا۔ اور پاؤں مار رہی ہوں اور میرا خوش چھا لیتی۔

میرا بھائی سمجھتا تھا کہ یہ بیٹا تھا ایک سال بن گئے۔ جو کہ ایک روز جیسا ایک صوفی بدھ صوفی کہتی تھی وہ اس اور دادانی آزاد ہے۔ وہ
 کوئی ایک طرف پہلا ہوا اور دوسرے دیکھنے لگا۔ بعد میں سے آزاد ہو گئی تھی۔ سالوں کے بعد میرے بیٹے کو ایک شہر بلند ہوا جیسے ایک عجم آباد ہو۔
 وہ بھگوانیہ رہا۔ وہ دس کا شہر تھا۔ کہیں آ رہے تھے۔ اس نے کہنے کا چہرے جانو دیو اور ماں بھنڈا خطو سے سے خانہ تھا۔ اور ہمارے
 بھائی اور بھی پر خطر تھا۔ عجم اس کی نگاہ ایک بھلی کہیں پر پڑی۔ جگہ لاس نے مدعا کو کھولا اور نوکری بیڑ تھی۔ اور ذکر سی۔ چاندی
 طرف اللہ دیوں اور دیگر کیوں میں کائنات کے ڈھیر بڑے تھے۔ وہ اس کر کے میں داخل ہو گیا اور لاری کے پیچھے چھپ کر کھڑکی کے
 شیشوں سے باہر دیکھنے لگا۔ سامنے بہت سے لوگ آ رہے تھے جیسے نول باباں جو۔ جو چھپے بڑے گروہوں میں بیٹے ہوئے تھے۔
 ایک مدرسے سے نکلتا تھا کہ تین کر کے میں مصروف تھے۔ نہ میں بھی کی طرح میں بھی تھا۔ اتنا اتنا میں میں مصروف تھے۔ انھیں زندہ تھا
 کی طرح ایک برقی تھیں۔ وہ مرا شیل کر کے تھے۔ قلعے لگا رہے تھے۔ منہ باندھے تھے۔ بیچے دار رہے تھے۔ لیکن ان کی آواز میں محض
 ان کے ختمے ان ختموں سے مختلف تھے جنہیں مدہ سننے کا عادی تھا۔ ان کی آواز کا انداز۔ ہی الگ تھا اور ان کی آواز میں لیں مکم اور
 بھانک تھی۔ یہ بھی ختمیں جیسے کپڑوں سے ڈھکے ہوئے ڈھول بج رہے ہوں۔

اور ان کی حرکات عجیب سی تھیں جیسے سب روڑنٹ کا غلط چل رہا ہو۔
 سالوں کے گئے اور عجم کے کلسے سے صوفی یہ کہہ رہا تھا جیسے وہ سب بھروسہ کر اس پر جہاں کلسے کے لیے آ رہے ہوں، شاید اس
 عجیب الغت نے مجھے نہ سمجھا۔ اس نے بہت کچھ دیکھا تھا۔ جیسے کہ میں ایک بھلی میں داخل ہو گیا ہے لیکن اس عجم
 کو یہ کہہ کر تکی ہو گئی۔ وہ تو اپنے آپ میں کہنے پر نہ تھے۔ بہت بڑا اپنے آپ میں ہلک تھا۔ ہر گز وہ دوسرے کے جوہر سے بے خبر تھا۔
 جہاں تک کہ جتنے ہوئے ان کی آواز اس شاکب کی طرف بھی نہیں تھی جس پر وہ چل رہے تھے۔ وہ وہیں چل رہے تھے جیسے احساس ہی نہ ہو کہ وہ چل
 رہے ہیں جیسے انہیں چلنے سے کوئی ٹھہری نہ ہو جیسے انہیں سہم ہو۔ ہر گز انہیں کہیں پہنچا ہے۔ جیسے ان کی اپنی ذات ہی منزل نہیں ہیں
 وہ شدت سے کھولے ہوئے تھے۔

انہوں نے سنیہ فیض ادا کا لی تیار۔ زب تن کر کر تھیں۔ ان کے چہرے بے حد بڑے تھے۔ سر کے بال اعلیٰ تھے۔ کھوپڑی
 سے لمبی تھی۔ پٹیاں تھیں جیسے ہر گز نہ تھیں۔ جیسے کہ وہ ان کی اپنی لکھی لکھی ناک اور ناک کے ختموں میں صوفی جو یہاں سے ملتا تھا۔ کلسے میں کئی تھی۔
 سے انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ چہرے کی کوئی تصویر ہو۔ کلسے میں ان کی ناک کی پڑے بڑے شیشوں والی عینیں تھیں جو
 انہوں نے ناک کی زیریں چھوٹی ہر گز نہ تھیں۔ ایک دوسرے سے اتنے کترے کہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ عینوں کے شیشوں
 کے اوپر سے دیکھتے تھے۔ پھر وہاں نے عینوں کیوں کہنے ہوئے تھے وہ ان کے کپڑے سے پھر وہاں چہرہ میں صرف زردا میں ختمیں تھیں۔ وہ کہہ
 کر ننگا اور حرکت کا احساس ہوتا تھا۔

ان کی تپڑوں پر چوڑی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور دائیں اٹھتا ہوا ایک کے ساتھ ساتھ تین لفٹ لیے یاہو دھڑ سے سے ہیں ملک

[illegible][illegible][illegible]

دیکھو۔ دائرہ نانہ والہ ابولا۔ ایک تیار اپنے ذہن میں اُئی ہے میری تصویر دیکھنے والے نے رکھائے عزیز اور دیکھا اور کہا

وہ بین والے کے لئے کہا مطلب تو یہ ہے کہ اہل کراچی کا دار بے کار ہو جائے۔ اور اور اور — دو خاموش شہزادیاں اس

پچھت کی طرف گھومنے والے نے آہ بھری۔ اب قرآن کا داخل کیا۔ دوبارہ اساتے انہوں نے ایک اور کٹ کھا ہے۔

[illegible]

میں اس وقت کہتے ہوئے تھا کہ ایک کاغذ تھا۔ اس کاغذ پر لکھا تھا کہ دشمن کا وار پیل ہے۔

اپنی تمام تسکینیں خاک میں مل گئیں۔
یک ہوا

دریہ کی بات ہے

میں نے پہلے ہی کہا تھا۔

افراد کے فی — سب چیز خفے

دستبرداری نے اپنے مصلحتوں کو بچانا۔ خود ارادہ لڑا۔ اس کی ترقی منظرِ ہجو کی ہے اپنی سب کشتیں کا رت گیس۔

نہیں کہ ان کے پیشانیوں پر کھینچے ہوئے ہاتھوں کی جھلکیاں نظر آ رہی تھیں۔

غیر آگے حاد۔ اسے حاد۔ وہ سب خوش لباس کو بیوقوف شہر چا سکے گئے۔ جاہ نے نکلی، زائد اسیے اور اداس کی طرف دیکھی۔ یہ جمال کہ

لالہ ناز جمال رشتہ دار کا فخر کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ اگرچہ وہ ایک عورت تھی مگر اس کی ہمت اور ہمتی سب کو شرمسار کر دیتی تھی۔

درہ تکسٹو فرات سے ایک سو کل طرف گھٹے ہوئے اُردو ادوار داخل ہو گئے۔

فخر و اعلیٰ ہوتے وقت یہ ایمان پانچوں انسانوں کے لیے اور فیضِ انوارِ حق کے طور پر حق کے اصولِ نمبر ۲۲۲ میں قرآن مجید کے آیتوں کے خلاف ہے۔

فہر دور میں سے کہیں چھان کر ناں کھڑا ہو گیا میرے دوست کہ سمجھو ہم نہ بچا بیٹھو۔ وہ لڑا لٹنی دروازے کا خانہ خبر ۵۰ سال تک بچ کر ۶۴ برس کے دور سے پرے ہیں وہ صحت سے دور رہتے کہ اگر اہل کار نہ بنیں کیوں کہ پچھتے ہوئے ہر ایک کو دوا کا وعدہ طر پر فریبت سے بندھے ہوئے تھا۔ اعلیٰ عدلی کے خط و تقی کے اصل نمبر ۶۴ سے مترا ہو گا۔

مختار نقل سے دوڑے جانے والے چھوٹے اور کمالی قابلِ فہرست ۳۵۶ اس سرسکِ رضا سے کہتے کہ اہلِ کلام قسم ۲۰۰ بکثرت کا مجموعہ ہے۔ اس کے سحر کے میں، اصل جوڑنے کے آداب سے کوئی قیوتی نہیں۔

نموداروں نے ایک نقطہ پر مل گئے۔

یہ ہے آپ کا بیع علیہ جو اس واقعہ کے لئے دھندلے فہرست کا۔

نورادوں نے اپنے آپ کے قبضے پر ہاتھ رکھ لیے۔

اس شخص کو توڑ دے۔ نہادیت اطمینان سے کہنے لگا۔ کیا میرے دوست شخص دروازے کا ٹکڑا لٹکانے کو تیار ہیں۔
 یہ کچھ لوگوں کے تخیل کے قبضے پر چڑھ گیا۔ اور دروازے کے ٹکڑے اعلیٰ و کھینچے گئے۔ پھر چاروں نے
 باہر نکلے۔ خود دروازہ کھلے۔ ایک نے چھوڑ کر لوٹ گیا۔

کھینٹے کھینٹے اعلیٰ معیار کے روڑوں کے انوار پر ۲۵ کھنڈر منظر کو دکھاتے ہیں۔

مسترحمد اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ جو براہیں دانوسے بناتا تھا۔

اور خلیکے بچے خلیکے ہے۔ وہ دونوں کا فائدہ لیکن میں حسرت ہر تنہ کیون آراں دیکھ کر وارنے لگا۔ بیچ ک کہیں نہ لگا۔

3

نہم روزگار کیش غیر ۲۶ پیشیل کا وہیں چائے پلائی ہوگی۔ لودھائے کے ساتھ دیگر ٹنٹ قسم د۔ س کے نام روزات ہوں گے۔
منظور ہے منظور ہے۔ سب جلائے گئے۔
جہاں کو انہے علم۔ تازہ کی صورت ہو وہ والا۔ ہم کسی میں تیار ہونے کیلئے تیار نہیں۔ اور شرعیہ ہوگی۔ کہ برائے کے

جب احمد کھنے سے فارغ ہوا۔ تو اپنی کھلی جوا کا صندوق پر پیش کر پیش کیا اور ان کا صندوق خود سے لیا۔ اور پھر خود سب چیزیں اداوار کر کے سے اس پر ٹھکانے اس پر ٹھکانے نہ صرف نہ صرف بھاگے۔

ان کو کھینچنے کے لیے حوالائی اس کھڑکی میں جا کر ابرو ابرو لڑائی کے پیٹ نہاد کی طرف نکلتی تھی۔
دہ پیٹ نہاد کی ٹیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے اور پٹنگ کر رہے دور یہ کھڑکے پر گئے۔ ان میں سے ملازمہ جنازی صفت بڑی چڑھ گئے
انھیں نہاد صنفی کھلا۔ ادھر کھڑکی کو کھینچ کر حیرت برتی کہ وہ اس صنفی کے رونق کھل رہے تھے۔ اس وقت اُسکی آنکھ کھلیں آگیا کہ وہ
سمانہ صنفی نہیں تھا۔ بلکہ نالائق لڑکی تھی۔ جس کی رونق اڑائی میں مصروف تھے۔ تاکہ نالائقہ غیبہ رونق کے صنفی کے کسے متعلق فیصلہ کر سکیں۔

وہ ایک صحرانوردی سے اس کتاب کی طرف دیکھا تو اس نے زندگی بھر میں اتنی ہی کتاب کبھی نہ دیکھی تھی۔ کتاب کے اوپر شیدہ دھلی چھ
بیرونی لگی ہوئی تھیں اور اس کے پہلو میں کڑی کے نیچے بنے ہوئے تھے اس کے باوجود وہ قندب شیشوں کی دود سے اسے پڑھنے میں مصروف تھے
انہیں کچھ اگھوڑا کی آنسو سے کام لے کر دیکھا تھا۔ اسے ان پر توں نے لکھا تھا۔ اور وہ مسروس کھٹے لکھا تھا جیسے وہ نیچے کوئی کے
دیکھ کر بھول گئی تھی۔ خود ساختہ تصویریں دیکھ کر اس کے دل میں ہلچل مچا رہی تھی۔ وہ قندب سے غصہ کر رہی تھی۔ اسے اہر کل کر پڑنا چاہیے۔ ان کو گوں سے راستہ پوچھنا بھی
پے کھلی تھا وہ تو خود کو کہتے ہوئے تھے۔ وہ راستہ بتا کر رہ گئے۔

وہ پہلے دھڑک رہا تھا۔ اس کا انداز تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا جذبہ کسٹن طرف تھا۔ ہر گیارہ گیارہ جی وہ چند قدم چلا تھا اس نے دیکھا کہ کچھ
لوگ دھڑک رہے تھے۔ لوگوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر لوگوں سے بھاگ کر لوگوں نے اس کی طرف کھنکھانے شروع کر دیا۔ وہ انہیں گلیاں پھینکا
اٹھا کہ اس کی طرف اشارہ نہ کرتے گئے۔

اٹھی۔ دھڑکی دھڑکی گلیاں پھینکا کہ اس کے پیچھے کی آواز سنائی دی۔ یہ سارن چلے سارن سے بھاگ کر مختلف قسم کا قندب صحرانوردی نے اس کی طرف
دیکھا کہ کچھ صحرانوردی اس نے غصہ کر لیا کہ اس کے پیچھے کچھ شیش کی آواز سنائی دی۔ یہ سارن چلے سارن سے بھاگ کر لوگوں نے اس کی طرف کھنکھانے شروع کر دیا۔ وہ انہیں گلیاں پھینکا
اٹھا کہ اس کی طرف اشارہ نہ کرتے گئے۔

اس کے پیچھے کچھ صحرانوردی اس نے غصہ کر لیا کہ اس کے پیچھے کچھ شیش کی آواز سنائی دی۔ یہ سارن چلے سارن سے بھاگ کر لوگوں نے اس کی طرف کھنکھانے شروع کر دیا۔ وہ انہیں گلیاں پھینکا
اٹھا کہ اس کی طرف اشارہ نہ کرتے گئے۔

اس کے پیچھے کچھ صحرانوردی اس نے غصہ کر لیا کہ اس کے پیچھے کچھ شیش کی آواز سنائی دی۔ یہ سارن چلے سارن سے بھاگ کر لوگوں نے اس کی طرف کھنکھانے شروع کر دیا۔ وہ انہیں گلیاں پھینکا
اٹھا کہ اس کی طرف اشارہ نہ کرتے گئے۔

اس کے پیچھے کچھ صحرانوردی اس نے غصہ کر لیا کہ اس کے پیچھے کچھ شیش کی آواز سنائی دی۔ یہ سارن چلے سارن سے بھاگ کر لوگوں نے اس کی طرف کھنکھانے شروع کر دیا۔ وہ انہیں گلیاں پھینکا
اٹھا کہ اس کی طرف اشارہ نہ کرتے گئے۔

اس کے پیچھے کچھ صحرانوردی اس نے غصہ کر لیا کہ اس کے پیچھے کچھ شیش کی آواز سنائی دی۔ یہ سارن چلے سارن سے بھاگ کر لوگوں نے اس کی طرف کھنکھانے شروع کر دیا۔ وہ انہیں گلیاں پھینکا
اٹھا کہ اس کی طرف اشارہ نہ کرتے گئے۔

اس کے پیچھے کچھ صحرانوردی اس نے غصہ کر لیا کہ اس کے پیچھے کچھ شیش کی آواز سنائی دی۔ یہ سارن چلے سارن سے بھاگ کر لوگوں نے اس کی طرف کھنکھانے شروع کر دیا۔ وہ انہیں گلیاں پھینکا
اٹھا کہ اس کی طرف اشارہ نہ کرتے گئے۔

صحرانوردی ایک مدافعت سے جا کا کہیں ہے۔

شاعر غائب، وہ بڑے ایکسیات کو اپنی اثرات میں دھو بیٹا غائب ہو۔

مختصر و مختصر نے انشا کے انہیں مدح کی دی۔ یہ کہیں بہت اچھی ہوا ہے۔ پیسے ہیں یہ جانا ضروری ہے کہ یہ شخص کن ہے۔ لہذا اس مداخلت سے جا کر پیسے، ہر قانونی ضرورت ۲۰ ادا پر اصولاً حالت غیر قانونی الفاظ اور انشا کے اندر جو ۶۰ کے وہ بد چینی کیا گئے۔ اور

ان کی پرستش بھی کی جاتی ہے۔ یہ کہ وہ ان کے خلاف کثرت کو کرتے ہیں نہ صرف ہر گئے۔

نائبہ نام کے لئے سے غلطی کے وہ کوئی ایک بار ان سے جوتے ہوئے ایک کر کے سامنے رکھے جس پر ہر قانونی ضرورت ۶۰ کی تحقیق کر دی گئی تھی۔

میں سے ایک شخص نے کہنے میں بھیجا تھا اور ان سب کو اشارہ کیا اور وہ سب کو کہ میں داخل ہو گئے۔ کہتے ہیں جہاں عدل طرف اشارہ کی ہوئی تھیں۔ جس میں کوئی کوئی جلد ہی بھی ہوئی تھیں۔ وہ بیان میں ایک بڑی بڑی کوئی تھی جو کا خدات پڑے تھے۔ ہر قانونی اس کے لئے کوئی ضرورت کی باتیں پڑے ہوئے اور ہر ضرورت سے تھے جیسے کہ ایک اور ضرورت وہ اپنے خیال میں اس حد تک کہ تھے کہ وہ یہ تک انہوں نے کو ادا دلی کی طرف اشارہ کر دیکھا۔

وہ تک وہ سب غلطی بنا کر دیکھا رہے گئے رہے۔

سہ سہ سہ سہ سہ میں ہر قانونی نے اپنی دائیں اٹھکی منہ میں ڈالی۔ وقت انہوں نے ایک دیا سامعہ بنایا۔ ہر وہ سہ سہ انہوں نے کچھ کیا کیا۔ لیکن ان کی اٹھکی منہ میں گئی۔ وہ وہ کی شدت سے بڑھ گئے اور مختصر اور مختصر پر ان کی گئی گئے۔

وہ وہ وہ وہ ہر قانونی کی طرف تھے۔ ایک نے انہیں تھم کر آرام کسی پر جا دیا اور سر سے اپنا درمال نکال کر ان کی پرانگی پر لپٹ

جب وہ وہ کی شدت کچھ کہتی۔ تو وہ بڑے۔ ہوں کیا گئے۔

مداخلت سے جا کا کہیں ہے حضور

ہر قانونی نے خود سے محوئی کی طرف دیکھا۔ ہوں۔

کسی شخص نے یہ کہیں پڑا ہے۔

نہاں کے حضور ایک شخص جھک کر ادب بجالاتے ہوئے بولا۔

ہوں۔ کہیں تو ہم انہوں نے پڑھا۔

ناطیبت۔ مداخلت اور اذات اب ان کے حضور میں جوتے ہوئے اور ان کے کمرے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ حضور اور ہر

نہیں کیا ہائے گا۔

حضور اور سرور لا۔ یہ کہیں نائب نام علی م نے حضور کی خدمت میں بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ حضور اور ہر

نائبہ الفاظ اور اصطلحات غیر قانونی کے در در میں کیا جائے اور پورٹ نائب اعلیٰ کو بھیج دی جائے۔

تو پتے ہر انشا کے لئے کہ وہ پیش کر۔ وہ بڑے

مختصر وہ دور و دور کی بھیج دیے۔

انہیں بھیج دیے۔ وہ جب تک مداخلت سے جا کر کوئی خاصے میں رکھ۔ انہوں نے نکلی ڈانڈا سے کیا۔

ہیں ہنس لگے کہ تیرے تالان پہنچنے میں
شک ہے۔

خود کے لیے بھی سے ایک شخص کی طرف نشانہ کیا تو غصہ فانی کی جگہ ۱۲۲ کے قانون جوڑ کی ۲۰۰ توڑ لگا کر اس کے دیو کیوں نہیں نے اپنی
مردوں کی حالت اشد کد تھوڑے کہا کھادو بروہا کے صحت میں خصوصاً صابن داؤدنی کے دوران میں واقعہ جو اس کی غصہ زدگی ہو جائے
لاکھو جو حکم پہ کڑاں بدلے طور پر کد پیر بر ملاوی ۱۶۷۲ء سے مل سکتا ہے تم کہا لاکھو کی لک کے اسی کا اور اس قسم ذاتی لوگ اسے جندی خانی میں
پہنچا دو۔ بدلہ۔

بندہ خاوند ایک سیکڑ کر خراج کی دیا اور میں بیسے بڑے سران تھے۔ ۱۲۳ اور اسے شتی اندر پتی رہے اور چونکہ بار اندر بھی ایک کر
دیکھ کے کہ میں ایک طرف تھمت کھا تھا جس پر کل سے تھے۔ دوسری جانب چارو ہے کی کر سیکڑ اس کا یک میر ختی اور اپنی میں ایک چھوٹا سا خسل خاند تھی۔
مورانی تھمت پر سر کر کر تھوڑا۔ نہ جانے اس کا بڑا۔ وہ بچے لگانے والے اور آگ سے لاکھ لکھ لیے پھر کر لے۔ اور اس کا وہ ۱۱۰
جس کے وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ کیا کہ لگا کر کھروانی اطلاع دیتے بغیر ہی جھاگ گیا۔

بہر کو کو خوشی سے نرسے گا۔ ہے تھے۔ دندہ باد۔ دندہ باد۔ یہ دانت ہے جا کا کھیں ہوا۔ ہے۔ شاباش۔ مرسا سوس ہی تو کہہ ہر گا۔

اور ان کے لے گا۔

پھر تیرے آہستہ آہستہ دھڑکتے گئے اور غصہ خوشی چھوٹ گئی۔ پھر اس نے عورت کی جیسے دیوار سے قریب کچھ لوگ گر گشتیاں کر رہے تھے۔ وہ
انہو ٹھیکہ اندر بوزار سے قریب کھاراں کی باقی لکھنے لگا۔ بعد ازاں ہر گا۔ مرسا سلات میں تو کہہ ہو گا۔ ہنچو

بڑی کا کر کر دی رکھی ہے۔ انہوں نے

اسی جی جالی چو کر ان کے کیسے کرے پر پانی پھر جائے۔

مضنی کا تو ان کے بدلے ہر ۵۰، ۶۰، ۷۰، ۸۰، ۹۰ کے معانی یہ اسے بندی خانی میں بند نہیں کر سکتے۔

وہ تو تھیکہ سے لیکن اپنی کر کے گا۔

اند پھر اپنی ہی پر لگے گی۔

اسے میں تھاکاں۔ مداخلت ہے جا کر جھکا کر دی نہ دیا جائے۔

دیکھ۔

• مال خانی کے عین نیچے کدنا بار بنایا ہے۔ اگر وہ خسل خانی کے فرش کا دھانی نکالے تو یہ جانیخے آڑ سکتا ہے اور پھر وہاں
• طوطی مل پڑت آہستہ آہستہ بیسے جا رہے گا۔

پاسے بنائے کر ان۔

کرکشی ترکو۔

وہ آہستہ آہستہ دوا اور ایک مال کر کے لگے۔ مرسا دانت بے جا

• بندہ کی خانی کے دوسرے۔ وہ آہستہ آہستہ پتلا ہونے لگے۔

کہتے ہیں اس ملک میں ایسی کئی جگہاں ہیں جہاں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا۔

پانچ۔ سیاہی کے جہت سے دوڑاں یہ قوت بدستھی کئی کئی سو سال پہلے کا وقت تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں اس ملک میں آؤں گا۔ یہاں پر وہ ملک آئے گا اور وہاں سے وہی جہت سے کہنے لگا۔ ہر قوم یہاں سے اترے گی۔ یہاں سے تھے کہ ان کے دشمنوں کو ہار دے گا۔ یہاں سے تھے کہ ان کے دشمنوں کو ہار دے گا۔ یہاں سے تھے کہ ان کے دشمنوں کو ہار دے گا۔

یہی ان جی لوگ تھے جو ان کے گھر کو روکا۔ یہاں ہی چلے گئے کہ ان کے گھر کو روکا۔

یہاں ہی تھے کہ ان کے گھر کو روکا۔ یہاں ہی تھے کہ ان کے گھر کو روکا۔

یہاں ہی تھے کہ ان کے گھر کو روکا۔ یہاں ہی تھے کہ ان کے گھر کو روکا۔

یہاں ہی تھے کہ ان کے گھر کو روکا۔ یہاں ہی تھے کہ ان کے گھر کو روکا۔

رات، چور اور چرساند

بلونت سنگھ

(پہلی قسط)

دیوالی کے روز شمس مال کے والے دیو پادامہ اداہ کسی بنکری صہنت میں قائم رات نہ کا۔ دیوالہڑتے گئے۔

پالا سنگھ کے سہرائی میں کوئی فرق نہیں کیا دیتی۔ پیر کے دن، کھلڈینا، دوستوں کے چٹھیتے، دہی گندے ذائق، بیہودہ کھانے، اور دن ہتیزوں کے ساتھ دل میں ایک دلی کی کسک، ایک خاموشی کو، بالکل کی طرح اندر ہی اندر کھل جانے والی۔

رات اس کے لیے کوئی بھی چیز نہیں تھی وہ کسی عورتی سے گفتگو نہ کر سکتا تھا اس نے عورت ذات سے کبھی زیادہ امیدیں نہیں بنائی تھیں۔ وہ رات کو سہرائی تھا اس کا خیال تھا عورت بھرپور جانی جانی ہے۔ اور یہ کوئی رات عورتی کے لیے اتنی ہے۔ دن بھر کی محنت اور زندگی کے گھبراہٹ سے تھک کر ایک خاص وقت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

ساتھ اس کی یاد کی کہیں بھی کوئی شخص ہوتی تھیں وہ میں اپنی عورت کی کھانا کی تہنیتی سے کڑیا کرتا۔ اور تھوڑا دیر ایک جید کھڑکڑا ہوتا تھا۔ عورت کی پہچان تھی اور ساتھ اس کے اپنے باجوہ کہہ سکتے کہ کچھ اجنبی جگہ پر جا رہا تھا۔ جس میں اس کے اپنے کھانوں میں چڑھی سرسے کی کھانوں کا منظر ہوا کرنا اور خود پہچان تھی کہ کوئی عورت کہے میں کرنا۔ لیکن کھانوں کے معاملے میں وہ بے خبر نہیں تھا۔

گاہوں کی کھانے کے وقت گاہوں میں سے ایک دوکان اس کے دوست خیراتی کی تھی۔ خیراتی بھی ایک سنگ زچہ تھا۔ اس کے گھر کی حالت اس پرکھنے کی کی عادت تھی۔ وہ تھا کہ کمرے، بدن کا مصورت انسان تھا لیکن آواز بہت ایک اور صہنتی تھی۔ گاہوں بھر میں صہنتی

نواب، جی اس سے اچھا سنگ نہ تھا۔ نواب کی آواز تو دوسرے بجار سے تھی۔ لیکن اس میں بے حد راج اور روح تھا۔ کھور اور کے کھنے خیراتی نے دوکان کھول لی تھی جس میں گاہوں کی دوسری دوکانوں کی سرخیز جوڑ تھی۔ پاس پاس سوداگر بھی آتا تھا۔ کیوں کہ شہریت اور کئی برس کے رہنے تھے۔ معاملوں میں کیا کرے۔ اچانک چوہے میں ہر شے کی کوئی کوئی کوئی خیراتی جوڑ تھی۔ مال اگر کوئی نہیں کھیتی تھی تو بڑا کھڑے۔ دہلے اسے بڑا کھڑے بلانے کی ترکیب کلاں سے لگا لگ تھی کسی کھیر سے میں دوڑی ہوئی بڑی چھوٹے آخروٹ کے برابر چل جاتی تھیں۔ اب سر بہ تہنہ میں بھی نہیں کھاتا تھا۔ ایک تو تہنہ اچھا تھا اس پر گاہوں کا لکھنا حکمرانی اور صہنتی جو اس کے کمرے کے دستوں میں سے ہور لٹھنی سے بڑا کھڑا کھانے کے لکھنا۔ بڑے کھیر سے ساتھ چاندی کے روتوں کی منڈا ش کی جاتی تھی۔ اس پاس کے دیہات میں ملایا صہنتی کھنت تھی۔ خیراتی کو بڑا کھڑا کھانے کے جمل تیار ہوتا تھا ایک جیسا اسی طرح کا کھوکھو کا تازہ مال تھا۔ اگر کسی کے پاؤں لگا رہا تھا

پر محبت نہ رہی دیکھی۔ "اے جان حبیب دیکھ! اور صبر علی دوسہ!..... اور سے تو ہوا!"

انہی باتوں نے غصہ پیش کیا کہ ایک چیز نے پھر دیکھ جاتے جو نے عداوت کیا۔ اور کیا؟ تو جو صبح سے یہاں بیٹھے ہو سو؟
پر یہ باتوں نے سنی ان کو کہتے ہوئے اس سے کہنا شروع کیا۔ "بچپن میں بھی کسی کی ایسی جی۔ جی۔ تو بڑے تیس ایک مڑوا

بات سناتوں!"

یہ کہہ کر شاہ نے کئی نگہوں سے انہوں کو دیکھا کہ جانب دیکھ جاؤ جس وقت سے بچپن سے پہلے بدل گیا تھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ کج سمجھت
ہو رہا تھا وہیں کیا کہتے تھے اس نے کہنے کو اب جانے! میں خاص برج نہ تھا، بچپن میں ان دنوں مائیں نے اپنے جانے ہی سے
یہ سمجھ کر کھانسا تھا انہیں اس نے۔ اور ایک کوڑی تھالی جو جانتے تو دوسرے کوڑے چھین سے پرک جانے لگے۔

"بچپن کی بات نہ ہوں ایک۔ بڑے بڑے سمجھتے تھے..... کہ کم دین کچھ کیا کہ اب کوئی وہ کوئی کی بات، نہ نے دلا ہے۔ وہ
خود بھی بڑی شاعری کہتے تھے کہ ان کے سر سے سکونے نکلا۔ ہر پر شاہ نے سلسلہ کام جاری رکھا۔ "تم دو روز کے گھر دوا سے بھی ساخ تھے۔ اُنٹنے
میں جانیں کہ ہم دیکھ سہ۔ ہاتھ پیر کر کھٹ ادا کیا۔ ہمارے زبانی کی طرف بڑے جاس وقت حبیب کی دوا تھا، جانے ہی بڑھتی اس کی کوڑی
کھس جیسے ادھر سے یہ رہا۔ پھر ہمیں ہی کہنے کے۔ "مہرست پر ہونا؟"

اس بات سب کوک نہ تھے۔ جو انہوں نے اپنی زبان میں اُچھال دیں۔ ہر پر شاہ نے اس کی نقل آتے ہوئے برا حبیب سا منہ
بنا کر کہا۔ "جی جانتا ہے کہ اب ہم دین حبیب کی نہ تھے تو بچکے سے دھری سیف کو اس کی کوڑی میں بیٹھ جانے اور انہوں... تم سب سے
بڑے ہونا؟"

"اے!..... یہی بھی..... ہو جو..... اور ہر....." پیٹے سے بھی زور دار غصوں سے آسمان کو گنج لیا۔ اتنے میں حبیبوں کا پہلا
پہلو نکلا اور سب میں گشت۔ اس طرح حبیبوں کے ساتھ گرم لطفیوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ یہاں کہ حبیب بہت پسند آئے اور اس کے درست
خیراتی بھی کہ جو کسی سے نہیں دیا۔ نہ تھے وہنگ کے نقل بالی اس کی تو دین آئی کہ وہ سوچنے لگا۔ حبیب ضروری تو قرعے سے تھوڑے وقت کے
بعد نکلے جائیں۔ بالی کی بھی اچھی کامیابی نہ تھی۔ اسے بھی سب نے اُگسا اور اس نے بھی اپنی کوڑیوں کو آدھرتے ہوئے دوا چھڑک
نا تھے۔ لوگ اس کی باتوں سے بہت غلط فہم تھے۔ پانی کے بعد وہ کم دین کے پیچھے پڑ گئے۔ آخر کار دین بھی چٹکنا نہ تھے کہ پین تیار ہو گیا۔
کہ اتنی باتوں میں زور پر شاہ کی بھی خبر سے نہیں کے۔

جب لوگ کم دین کی باتیں سننے میں محنت توہی نے نظر اٹھائی تو درست ایک ٹوک آئی کھانی دہی۔ اسے فوراً شک کر اکر وہ سر زوں کو
یکے حبیب وہ مڑ سے ٹری آڑا کا شہر دور ہوا۔

گاؤں میں اگر حسب اس نے پہلے پہل سر زوں کو کھانا آئے اپنی اُسیدوں سے بڑے حاکمین پلا۔ اس نے حالات کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ لیکن
وہ سر زوں کے معاملے میں کوئی بڑی دشمن نہیں کر چکا تھا تھا۔ اگر بھی اس کے دلی ہی تجربہ کا خیال یا اچھی تو اس نے اسے فوراً دبا۔ کسی اٹھانے جوندہ کے
تحت اس کے خیز زور داری کے نظریہ میں تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ یوں بھی اسے بات کا یقین تھا کہ سر زوں سے اس کی شادی ہو جائے کہ اور خود ہی
اس نے اس بات کا ارادہ کر لیا تھا کہ سر زوں کے والدین کی نظروں میں نہ تھے کہ لیے پڑنے پاہوں سے زورنگ کر رہا ہو گا۔ مگر جب اس
نے پھر پانی لکھ کر کھانسا تھا اس کے من کی کئی ہند بات اُچھڑائے تھے۔ نہ جانے وہ کس کی اور واقعی تو ہر لمحہ اس کے کان میں خبردار! خبردار!

دورانی قریب چھ سال تک رہا۔ اس وقت کے حالات یہ تھے کہ اس دور میں

دویدہ حال کے پاس پہنچا اور اس کے ساتھ ہٹ کر بیٹھے تو بڑے پرلا کہو پالی !

خیر نمک نہیں کی.....

نواب نے اس کی طرف غصی کیے ہوئے کہا: ”لوگ!۔“

”اے کھلم کھلم ہمارے لئے ہے“

”کہنے والا تھا۔۔۔“

”جیسا کہ اس کے اکلوتا سا..... وہ پتھریں دیکھ کر جھل پڑا ہوں.....“

.....

”فہم میں نے اس لگاؤں سے کچھ درد“
”ادھر قبرستان سے بھاڑے....“

نرمی مجھے کچھ ملے گا۔

ترکیبا کی دوزن کو تم نے ساتھ ساتھ دیکھا تھا؟

”نہیں..... پر مصلوہ ہر کتابت کو ضرور سٹے ہوں گے اخراجی دور جانے کا کریکریں کیا کام.....؟“

چالاک سے بڑے بڑے ترقی تھی۔

سرور اچھی دھڑلہ سے کہتا تھا۔ چیلان پانی کی بجائی تھی اور تھی۔ دوسرے واسے سے لے کر ڈک بھرتہ ہو کر لاکھوں کروڑ کا رقم تھا۔ یہی ہیں۔ تو میں تم کو میری مثال، مل جلک سے۔ جو کہ بڑے بڑے ہو رہے۔

کب دیکھ کر رہے؟

اچھی اچھی..... سبب میں، دہشت سے روٹ رہا تھا۔

کیونکہ نے اچھی طرح دیکھی تھا کہ وہ بڑوں کی تھی۔

اچھی اچھی! تو کیسے سرور کی تھی تھیں پچھتاہ؟

پانی پھر بڑے بڑے چپ بڑا اور بڑے دہشت کے کہہ رہا تھا کہ کرولا۔ ڈیکو یا کسی اور کو سووم نہ ہو۔

ہاں کل نہیں۔

پانی کو اب پر پر اور دوسروں تھا وہ قابل اعتماد تھا بھی۔ لکھا تھا کہ والی اس کی طبیعت ہی نہیں تھی۔ دوستی کے، طے پالی کی۔ بتانا کہ اس نے خیر دہی کھا۔

پانی کو کئی کئی بار اٹھ کھڑا ہوا اور بڑے بڑے کے ساتھ قبرستان کی جانب چل پڑا۔

وہاں صاف تھا کہ کہیں اسے پر بھی پانی تھا۔ پتھر۔ دانات۔ دروازے کی تہی بھی نہیں ہو کی لیکن وہ اس بات سے مطمئن تھا کہ پر عقیال نہ تھا۔ لکھ بڑے بڑے کی ترالی کا پانی تھا۔ دیکھ کر بڑے بڑے بھی حیرت کھاتا تھا۔

پانی کو کئی کئی بار اسے گاؤں سے باہر جاتے دیکھتا تھا کہ اس سے ایک بول تھا۔ بڑے دیکھ کر پانی چپکے سے کھسک گیا رہے۔

”کوئی بڑے جو اڑا لھوڑے کر۔“ وہ سر اڑا لہا۔

اس پر لکھا چپ چاپ تھیں کہ اس کے کچھ بھی ہو گیا۔ زراب نے دیکھا اور لکھا کہ لکھا۔ اور جب کہتے ہو پاس کے کھیت میں کھانڈ کرانے کی اچھی روٹ نہ تھی۔

”کیا تجھ سے کہ کر گیا تھا۔“

”اچھی تھی تو کیا چھوڑتے تھا بڑوں عجب اول جمل آدمی ہو۔“

اس طرح اس نے سب سے چپ کر لیا اور پھر ان کو حیاں ملنے کے لیے خیر لاتی سے لایا۔

”بے کھیر لائی ہو گیا ہے تجھے۔ حیرت لا حیرت۔ کھڑا کھڑا خیر لاتی ہے۔“

پانی بڑے سے خیر لاتی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اچھی ٹھک۔ عے بڑے لکھا تھا کہ اگر ان دروازوں کوئی ایک بل جائے تو اس سے کیا بڑا کرے گا۔ لیکن چھوڑے کے آثار اچھے نہیں تھے۔ وہی میں ایک طوفان پیا تھا۔

آخر وہ قبرستان کے قریب سے ہوتا تھا۔ اس کی پانی طرف سے بھی لکھا تھا کہ میدان صاف تھا۔ وہ دیکھ کر نظر دوڑا کہ کھانڈ پر تھی وہی کھانڈ اسے جاسے پر کھینچ لیں گی کہ اس کو کھلا کر دیکھ کر دیکھا۔

”کچھ دیر تک۔“ وہ لکھا اور پھر اس کے بالوں میں سرسبز ہوتے لکھا اور کئی دروازوں سے اس نے مالی نہیں۔ دھنسنے تھے سر پہنے لکھا۔

کےیں جوہیں، پھر کی ہوں! اپنی پیچھے پائی پر غصہ کرنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کہنے لگا۔ سرنوں کو اس قسم کی حالتوں سے سزا دینا نفرت تھی۔ اور اب کچھ حد تک چلنے کے بعد آس کا مزاج اور دیگر گائی خاصہ وہ سرتھے لگا کر تھی اگر ایسا نہ ہوتے تھے، تو وہاں کو ضرور سزا ہو گا کہ اس نے بھی کڑی سزا دیا کہ اگر سرتھے ہوتے، تو یہ آس کو کھانے کے پیچھے پائی میں جھونکے گا اور دوسرے وہاں سے پیچھے ہٹ جائے گا اور اس کے پانی سے اگر چھ لٹا لے گا۔ صوفی نے کہہ سکیں سے چھیل کر تیل بھی لایا گئے گا اور اس سے لالہ کو خوب چھلکے گا۔ پڑوسے ہندو بھی جالی اور اس کے چھندے نہ چھو سکا پائی (دو میل سے کچھ نہ چھتے، انہیں بھی دھوڑا لے گا)۔

لیجے بیٹھنے والے کے بعد وہ حالات کے نئے طریقے سے جائزہ لیٹنے لگا۔ اس نے سرتھے کو کہنے کو سرنوں، دوسرے پائی کے، اچھن ایسا دیریا مسلمان، ہر سرتھے کو سے خود سرنوں سے پریم ہے اس لیے بھی، مگر نہیں سب شکر اس کے، نہ خان کی پیدار اور ہوں، آخر سرنوں سے بیاہیں میں، کو لٹ ہی کیا کر سکتی تھی۔ خداوند کے لانا سے اس میں کیا فخر پائی تھی۔ اگر سرنوں کو فائدہ نہ پہنچا تھا تو سرتھے کا لانا ہی آیا تھا اس نے بھی کوئی ایسی دوسری حرکت نہیں کی تھی، جو آلا سٹے دو کر پکا دلی سے اس کو خاموشی نہیں تھا۔ وہ کو کیک اس نے جو لالہ کے وہاں شرب پیا اور کھان کھانا تھا تو اس دلی اس نندہ نہ لگا کہ جی علی علی کر سکا کہ لالہ کا دل پر نہ چلا تھا، یہی قسمی بہت شرارت تو لگا، لالہ کا دل کو جو جان نہیں کر سکا تھا۔

اس نے سرنوں کے بارے میں بھی سرتھے سے سوچا چاہیے، وہ کچھ بھی کہتا تھا، مگر سرنوں نے اسے کبھی شکایت کا روتھ نہیں دیا تھا۔ وہ ایسی سرتھے کو کبھی کبھل کی طرح کھا جاتا۔ ہر وقت اس طرح سے رہنے کی یہ بات ہی تھی جو اس کے لیے ایک مصیبت بھی تھی اب وہ اس کے نہیں کو ایک بات کھکتے کہ تھوڑے دیکھتے تو اس کے دل کی کسی طرح کے شکر کو پیدا ہوجاتے نہیں نہیں، پر سب شکر بے بنیاد تھے۔ کچھ ایسی دلی نہیں ہو سکتی بلکہ وہ خود ہندو کی زمین کو کر ایک دلی سے لپٹی کر ہر کیا تھا، پر اس کی اس کو حرکت بھی سرنوں نے برا نہیں مانا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے دل کی گراں گیری اس کے لیے بگڑے، اگر وہ دھڑکتے آئیں گے تو لعلات صغیر کا رکے گا.....

اور دیر لالہ کے وہ صبح وہ صبح ہی نہیں، بلکہ ایسا ہر سرتھے کا تھا، چنانچہ سرنوں سے کہہ دیا کہ پائی تھی جسے خدا سے ترسنا ہی چائی چلی آئی اس وقت اس کے دل کا بہت بہت باریک رنگ بھی مٹھیں، مگر اس کے دل میں اس کے لیے جگہ توئی تھوڑی، وہ اس طرح آئی وہیں ہرگز نہیں لالہ اس طرح پائی نے اپنے دل کو حاکم ہی، وہ دھڑ دھڑ تک تنگی دور کر چھیلے ہوئے کھینچوں کی آرمی کر تھی۔ جالی سا بھتی ہوئی مہیندوں، اتنی کے پڑوں کے کھنے سالیان تلے دلوں کرتے ہوئے سرتھے، لیکن میں چھپ چھپ کھڑے ہوئے چھڑ سرنوں اور اس کے چھندوں کی جانب دیکھتا ہوں۔ کھل ہر اور پر سکون تھا اس کے دماغ وہ اعتقاد پر پراسنا تھا پڑا۔ اس نے جی بھی بھائی لالہ کو لکھ دلی سے وہ سرنوں کی قسم کی کشیدہ اندیشوں سے سرتھے سے تسکینات قائم کر کے لگا اور دھندلے کے لیے بھی اس کو کھیا لالہ کے لگا کر کھینچ لے سرنوں کے خدشات واضح اور پھر میں سرتھے نہیں لے گا وہ اس پر سرتھے شاک نہیں کر لے گا۔

وہ بھی بھانسا کہ کبھی کبھل لگاتار لالہ کی طوطی لٹ پڑا پئی دھن میں اسے صحت سخری کبک، دھند پری چھینے کا دیا جان بھی دیا جدو اس کے پانی نہ تھے، دوسرہ بھانسا پائی اس کی پائی کے پائی برسات کے دواں میں کو شیشیوں کے کھروں سے بھنے ہوئے گونگھوں میں پڑ گئے۔

اور اس دلی کے پاس لالہ کی لکھی صورت ہوئی تھی۔ جب وہ اس دلی کے دوسرے کھیر کی چوٹی چٹائی چڑھا رہا تھا تو اس نے لالہ کے پچھونکوں کو دیکھ کر کہہ دیا کہ کبھی سے کھینچتے چلے آئے تھے۔

آب و خاک را در کوزه‌ای

دال دھڑی

五

5

نیری صورتی زردی زردی زردی

اور پھر پلینت، ایک میٹروپک لائٹ تھی اور اسے اس کے پھیپھڑوں کی طرح احمر اور جھانک نکلا۔ اور یہاں سے آخر بڑا لڑائی کو
مکڑی گھٹنے کے لیے نکلا۔ ان کی سرت جھری اور پتھروں سے فساد کرنا اعلیٰ۔ اور آج کی سڑک راہ۔

عمرزادہ وارثی کی بیٹی تھی۔ وہی پالٹ گل دلا اور وہ بھیر دیا گا کر کی روشنی اندر نہس گئے۔ انہوں میں رہنے کے کچھ محل رہے تھے۔
 نوحہ اس نے رشتہ کیوں کیے تھے۔ مافیٰ نہ کہ قلمی اپنے اپنے کھڑوں سے بندھ کر بیٹھا۔ بلا وارثی کے اور اس طرح اپنی بہنیں نکال کر رہے تھے۔
 مکمل عیال پر مافیٰ اس نے بہت سی چٹھیاں لکھیں۔ یہی کیا اور عمر مافیٰ سے ملے اور دھوکے بنا۔ وہ دھوکے کے مافیٰ لکھیں۔ لگا اور جب مکمل کی چوڑا دے
 اس کی گاڑیوں میں لکھی ہوئی تھیں۔ مافیٰ اس نے غصہ سے ان کی گاڑیوں کو تھپکڑوں تک ڈھونڈا۔

[illegible]

پارہ خزانہ کیجی کہ ہونگا۔ . . . وہی ہے۔"

”ہوئے، کہیں جاؤں گی“

پڑے ہوئے؟

1

یادِ عمر کے محبوباؤں کی ہے۔

ایکھا نا با نا دیں جتنے زیادہ کھیر میں کھا کر دیں۔"

三

پیشہ ورانہ

جہاں کھینٹ سنبھلے اُن کے لیے کدو سے ہر.....

نہاں غفلت از سرِ حق کہنے کے لئے اسے دو بار کہ

”نہیں بھائی تمہیں قسم ہے..... ماں سے کچھ دکنہا..... اب آجی جاؤ۔“
”ذرا بات کروں۔“

”ہم بھئی بات ہی کریں گے۔“

”کہوں سیرا بھیا چاہتے ہو شفقت میں.....“

”واہ بھائی! ہم اس چاؤ سے بلا رہے ہیں لوہم.....“

”بیرا بھیا بھیا۔ میں بس ذرا سی بات کروں..... اچھی آتی ہوں۔“

”پانی پھونک کر طرح چل گیا۔“ تا بھئی ہم نہیں..... تمہیں قسم ہے۔“

”گراہ بھائی چھت کی پرلی طرف پڑوس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ پانی جانا تھا کہ اس کی ذرا سی بات کتنا وقت لے گی۔ پر اسے زیادہ دیر
نہیں گزری کہ پڑاؤ ڈھکی کا دروازہ کھٹنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی ماں آئین میں داخل ہوئی اندھوڑتے ہی بارنی۔“ بھائی
بھائی کہاں ہے۔“

”چھت پر۔“

”چھت پر؟“

”ہاں..... بہت دور نہیں چھت پر ہی ہے.....“

”ماں بڑی بڑی چھت پر تو ہے۔ پر میں پوچھتی ہوں کیا ہو رہا ہے وہاں؟“

”باتیں ہو رہی ہیں۔“

”باتیں..... ارے باتیں؟“

”ہاں..... کیوں؟“

”وہاں نہ بھلا باتیں کرنا بھی کوئی کام ہے؟“

”بھ سے پوچھتی ہو؟..... اسی سے پوچھو؟“

”آئے دو۔“

”اچکی وہ؟“

”کہوں پڑوس کے وہاں پکا ڈیرا ڈال دیا ہے کیا۔“

”معلوم تو یہی ہوتا ہے۔“

”آخر بات بھی تو ہو کوئی۔“

”بات کیا..... دو گھنٹے تو میں ہی انتظار کر رہا ہوں..... ضرور کوئی کھاس بات ہے۔“

”سندال کو تعجب ہوا۔“ دو گھنٹے سے؟“

”اور نہیں تو کیا۔“

اتنے میں لٹا لٹکے بھی آگیا اس نے یہ بات سنی۔ اب بند آؤں سے نہ رہا گیا۔ ارے تباہاں تباہاں !!
 لٹا لٹکے نے سر سے گڑنی اتار کر اسے بھاڑا اور پھر اسے پرے چار پائی پڑھیکے ہوئے بولا۔ "کنی بار کہہ چکا ہوں اس چرنلی سے
 اتنی باتیں نہ کیا کہ گھر کا کام کیا کر؟"

پانی نے جتنی پرتیل ڈالا۔ نہ مانے کہہ سجاتے ہر اس کے سامنے تو پھیل جاتی بنے رہتے ہر۔
 یہ اڑا دین کی ایک بار تو لٹا لٹکے کو تار دیا لیکن اس نے پانی سے کچھ کہا نہیں۔

سندھان لے پھر دھمک لگاؤ۔ ارے تباہاں۔

آخر تباہاں جلدی جلدی کھٹ پٹ کرتی بیڑھیوں سے نیچے اترتی۔

سندھان بھری مٹھی میں اس کے اتنے ہی برس پڑی مگر وہی کی مزاحقا ہے تجھے باتیں کرنے میں جب دیکھو وہ گھٹنے باتیں کرتی پہلی

جاتی ہے۔

"تباہاں بھی گڑ گئی۔ کب..... میں کب دو دو گھنٹے باتیں کرتی ہوں۔ تمہارے جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہوں۔
 اب نہ لٹکے نہ شوہر نہ ستھون کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تیرا نہاں کیسی جلتی ہے دی۔ ذرا کام کی بات کہہ دو تو مر رہی ہوتی ہیں۔"
 "مجھے مر جیوں کیوں کہیں؟"

اس پر لٹا لٹکے نے آگے بڑھ کر دھمکیاں یاد رکھو زبان کھینچ لوں گا منہ سے۔

یہ دیکھ کر سب اپنے مقولہ دم کے اس پر پل پڑے ہیں تباہاں کی آنکھیں پر آب ہو گئیں۔ خیراتی ہوئی آواز میں بول کاٹ کر کھا لے
 دی بھر کا م کرتے ہوئے کوڑاٹ حال ہے، دکھڑی کسی سے بات کر لی آسکے سب سر پر سوار ہی ہو گئے۔

یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی دھمکے ہوئے کپڑے دسی پرچ کر سب سے اندر داسے کمرے میں گھس گئی اور دھڑام سے پٹنگ پر
 جا گئی۔

لٹا لٹکے نے چار پائی گھبٹ کر اس کی ٹہنی پر بیٹھے ہوئے کہا۔

"عجب عورت ہے۔ بھلا پوچھو کہ سچی بالی بچوں والی گھر کا کام کاج کرتی ہیں نہ کہ منڈیر پر چڑھ کر پردہ سیروں سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔"

سندھان اور لٹا لٹکے دونوں بات بڑھانا نہیں چاہتے تھے اس لیے جب پانی بھائی کو منانے کے لیے بھتر کر اور بڑھاتا تو ان دونوں
 نے اطمینان کی سانس لی۔

اندرواسے کمرے میں۔ یہ کی بھائی رہتی تھی نہ کہ کی کھڑکی تھی زرد روشن دان سے دسے کے چھت میں ایک گمہ دسوار خ تھا جس میں
 سے دوپہر کے وقت کچھ روشنی آتی تھی پر اب شام ہو چکی تھی اور گمہ کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

جب وہ ایک دم اندھیرے میں داخل ہوا تو پیٹے تو اسے بالکل کچھ نہ سوچھا تاہم کی میں صرف سسکیوں کی آوازیں آتی رہیں۔

"تباہاں کی اس بات کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ سادی آگ دیوڑھی لگائی ہوئی تھی۔ اس لیے جب پانی کی آنکھیں دمہ دہشی سے مائل ہوئیں

اور اس نے بھائی کے لرزتے ہوئے شانے پر ہاتھ رکھا تو بھائی نے اعتراض نہیں کیا۔ پانی نے بھرپور سے کہا۔ "بھائی۔" وہ سسکیاں بھرتی رہی۔

"بھائی؟"

ہے اس قسم کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا لیکن چونکہ ابھی ابھی بدلتی ہوئی کمرے سے اسے خوشی ہوئی تھی اس لیے اس نے ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "کون لہذا ہے؟"

"یہی اپنی سرزوں....."

ہنے نے اسٹ کی طرح شور مچا کر کہا۔ "کمال ہے۔"

سندان ابھی اس قسم کے سننے والی کی ضرورت تھی۔ چہنچہ سے چونک کر بیٹھ گئی۔ رازدارانہ لہجے میں بولی وہ ہے نا.....

پر تھی بال..... یہی نام ہے نا اس بچہ کی نا..... تو نے دیکھا ہی ہوگا اسے؟

اس پر ہنے نے سخر کھول کر سر ہلایا اور بولا "نہیں میں نے اسے دیکھا تو نہیں نام سنا ہے..... ابھی ابھی جب ہم جیب کھا ہے تھے تو اسی باتیں ہو رہی تھیں۔"

پالی کو تعجب ہوا شاید نواب نے کچھ کہہ دیا ہو۔ حالانکہ اس کو اس سے اس قسم کی تعلیم امید نہیں تھی۔

ہنے کی بات سندان کو اور شبہ ملی۔ "مجھ بھلا کر کہنے کی؟" اچھا تو اب وہ کاز پر تھی ایتیں ہونے لگی ہیں؟ بھیجی وال میں ضرور کچھ کلا ہے۔

پالی کا پرکھا کرتا تھا.....

لہذا بولا "آرے نہیں ہے بے ڈھنگا تو اسے سننا ہی اپنی گاڑی چھوڑ دیتی ہے۔"

سندان کو قدر سے فخر آیا۔ "ارے واہ! تو کھٹے ہی تو....."

کھٹے ہی کیا..... میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ اس کے بارے میں اسرار دھر کی باتیں ہوئیں۔"

سندان نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا "اب یہ بھی تو بتاؤ کیا باتیں ہوئیں؟"

"ارے بڑھیس..... کہتے تھے بڑا کھب صورت ہے۔ تم جاؤ تو اس کو ایسی باتوں کا چسکا ہوا ہی ہے..... ایسی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔"

پس کہ سندان کو ناامید ہی ہوئی اور وہ بولی "موتوں میں تو جوتی بھی ہیں باتیں؟"

"ناہال بولی! ماں موتوں کو کیا ہے۔ وہ تو بڑھیس کہنے لگتی ہیں۔"

سندان بزرگانہ انداز میں بولی "پریشا کوئی نہ کوئی بات تو ہوگی ہی..... ہے بنیاد کے بات تھوڑے ہی اڑتی ہے۔"

"ناہال! اُنے انگلیوں سے انا چھڑاتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہیں روک تو چاہتے ہیں کہ کسی پر الزام دھر کر نواب ملک مرجع لگا کر باتیں کریں؟"

سندان کچھ نرم پڑ گئی۔ "اچھا ہو! اب میں کیا جو کریں گے سو بھریں گے تم کیوں بھئے اداس؟"

اپنی داستان میں گہری جھجک کے اس ناول کے دہرانے پر سندان کو امید تھی تاہل اس کو تعریف کی نظر سے دیکھنے کی لیکن تاہل نے کچھ ظاہر نہ

ہوئے دیا۔ بلکہ ہنسنے لگی "اور تو کسی سے ایسی ویسی بات نہیں سنی جب سنی تمہارے منہ سے....."

"ایسا ناہال! سن کر جواب سن کر غصہ تو آیا لیکن یہ جھگڑے کا فرقہ نہیں تھا۔ نرمی سے بولی "نا بھئی! سرزوں تو میری بیٹی سی ہے بھلا

میرا اسے کہنا نہ ہو کہ اس نے کیا باتیں اپنے گھر میں بات کرنا تو باپ نہیں۔"

اس پر تاہل کچھ نرم ہوئی۔ سندان نے زیادہ صفائی کے لیے بات جاری رکھی۔ "بلکہ اگر کوئی میرے ساتھ ایسی ویسی بات کرنا بھی تو میں اس

سے یہی کہتی ہوں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ کسی کی اڑائی ہوئی لپ ہے۔"

پالنے ان کے بے تکی ہاتھوں سے نوب کر کہا۔ ماں اب کہ مجھ کو لڑکیا بات سنی ہے تم نے اتنا کھڑا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔
سن ان نے تاہاں اور ہال کی طرف ہارسی ہارسی دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”یہی سنا ہے کہ دونوں میں جلی جلی ہے“

”مغفول کوئی“ جیسے پالی کر بھین نہ آیا ہو۔

”یہی سنوں اور پڑھتی پان“.....

”شاید تھیک ہو پھین بھی کب صدمت“ لسنے نے دوائے دی۔

سن ان نے چپک کر کہا۔ خاک کھب صدمت ہے“

لناتہ گیا۔ ”بھئی میں کیا حازوں، لوگ ہی کہتے ہیں..... سنی سنائی کہہ دی میں نے“

سناں ہاں کو انگریزوں سے داتے ہوئے بولی چلاک تو ہے۔ مجھے ایسا آدمی مل گیا نہیں تھا... مجھے تو دھوکے باز نظر آتا ہے“

”تاہاں تو اچھے پر رکھتے ہوئے بولی ماں انہیں بکیر بکھے بجائے کسی کے برے بھلے کا لپکا پتا چل سکتا ہے۔“

”ہاں جی، باگرو رہی جانے۔“

پالی کے دماغ کا سکون ختم ہو رہا تھا۔ بھلا وہ کیسے خاموش رہتا۔ ماں ان کی کسی نے اسے اس کے ساتھ دیکھا ہے؟

”تاہاں کہہ باتیں بالکل سب سے نہیں اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس قسم کی باتیں ہوں لیکن چونکہ پانی ان میں دلچسپی سے رہا تھا اس لیے

اس نے ٹوٹنا مناسب نہیں سمجھا۔

سناں بولی ”باگرو کے بکیروں کا بھید کن جاتا ہے لوگ یہی کہتے ہیں کہ دونوں میں جلی جلی ہے سرزوں بھی تو ان کے گاؤں

جاتی بہتی ہے۔“

”تاہاں کے دل میں یہ خوف پایہ ابھرا کہ کہیں پالی کے دل میں یہ خیال جو نہ پڑے بیجا۔ جی دیکھی ہو گا اس لیے اس نے سناں کی بات کی

تو دیر سے ہوئے کہا۔ ”ان کے گاؤں تو وہ ہمیشہ سے جاتی ہے پسے تو کبھی کوئی بات نہیں اٹھی.....“

سناں نے کہا اور وہ بھی تو ان کے یہاں آتا ہی ہے۔“

”تو کیا سرزوں کے ماں باپ اندھے ہیں انہیں بھی تو پتہ ہی ہو گا۔“

”بھئی چونکہ مجھ پر جب تک گڑبڑ ہو رہی باتیں نہیں بناتے۔“

”تاہاں نے آنے کا بیڑا بٹاتے ہوئے جواب دیا۔ ”اصل بات تو یہ ہے کہ لوگ ان سے کہتے ہیں ان کے پاس کچھ دھن ہے لوگ

انہیں دیکھ نہیں سکتے۔“

”بات سناں کے دل میں بھی پریشیدہ تھی اس نے کانوں کے گوشوں سے چھپتے ہوئے کہا۔ جی نہیں میں کیڑی ہے جو ان سے ملیں

میں کس بات کی کمی ہے؟“

”تاہاں نے ردی تو نے پراٹھا دی۔ ————— نہیں ماں میں نہیں نہیں کہہ رہی ہوں میں تو اور دای کی بات کہہ رہی ہوں۔“

عبدال نے جواب دیا "اس کے بیگ آگے تک نہیں پہنچتے کہڑے سے بندھی ہوئی ہے بے فکر ہو۔"
 نہیں بابا!..... چلو پالی مجھے دروازے سے باہر چھوڑ آؤ۔"
 پالی کھلنا نہ انداز سے گھنٹوں پر ہاتھ ٹیک کر اٹھا۔

"ڈروپ کر کہیں کی"

ڈروپ کسی میں پہنچ مٹا چنتر رک گئی اور پھر پالی کے گان کے پاس مٹھ لاتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا "تیل دیل کا تو بہانہ تھا اصل بات یہ ہے کہ تمہیں جو لانا سگھنے بلایا ہے..... اور سنو میں ڈروپ کر نہیں ہوں تم سے بات کرنے کو کوئی حیلہ تو ہرنا ہی چاہیے تھا۔
 پالی کو یہ سن کر انداس چلتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر عجیب قسم کا احساس ہولاس نے جانپ لیا کہ اسے کس غرض سے بلایا جا رہا ہے۔ اس نے چاہا کہ صاف انکار کر دے۔ لیکن کام ہے.....؟"

وہ چپ رہی۔

"پھر بھی..... تمہیں تو معلوم ہی ہو گا۔"

چنتر نے مردانہ انداز میں سر پیچھے کی جانب جھٹک کر اس کی جانب بھر کر نظروں سے دیکھا اور پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "بس یہ کچھ تو تھانے شان کے شہاں نام ہے۔"

انکار کے الفاظ پالی کے ہر نثرن تک آتے آتے رک گئے!

"اچھا"

"تو کب آؤ گے؟"

"تم ہی بتاؤ۔"

"جلد از جلد"

"لیکن کوئی گڑبڑ ہے کیا؟"

"نہیں نہیں گڑبڑ کوئی نہیں۔ ابھی تو بات ہی کر رہی ہے۔"

"تو میں کھانا کھا کر آ جاؤں گا۔"

"ضرور۔"

"ضرور۔"

چنتر کو رخصت کر کے پالی صحن میں آیا تو اس وقت گفتگو کا موضوع بدلی چلا تھا۔ لیکن پالی ابھی تک انہیں خیالات میں گم تھا۔ اس نے سر چاٹ کر سرسوں کی بابت افواہیں عطی ہی ہوں نہیں اگر اس کے والدین کی نظر پر بھی پالی سگھ رہی تو وہ پھر سگھوں کو بھی کیا اعتراض ہو گا۔ اور اگر اعتراض ہو بھی تو وہ کیا کر سکتی ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ اگر سرسوں ان حالات سے بچنے کے لیے گھر سے بھاگ جانے پر آمادہ ہو تو وہ اسے بڑی خوشی سے بھگا کرے جائے گا۔ لیکن اس سے سیدھا کھلتے پہنچ جاتے۔ کوئی اچھا سا دھندلہ شروع کر دے جس میں گرفتاری کا ڈرن ہو۔ ایک چھوٹا سا گھر سو امدادیں وہ بڑا لاد سرسوں۔

دوسرے لمبیں پالی کا ذہن دل کی ان حماقتوں پر ملامت کرنے لگا۔ اس نے سر چاڑا کر سر زل زلایا اس کے والدین کو ان کے خیالات کا علم ہر جائے تر وہ اس سے یقیناً بہت متنفر ہو جائیں۔ سر زل بچاری کو ان باتوں کا کچھ ہوش ہی نہیں۔

ترہ! اسے اپنے خیالات درست رکھنے چاہئیں۔ بار بار اس کا ذہن اٹھی لٹی باؤں کی طرف کیوں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے خیالات حقایق کی طرف منتقل ہو گئے۔ سر زل نے ابھی تک اس سے محبت کا اظہار یا انقباض نہ کیا تھا۔ اس کی حرکات سے کچھ افغادہ نہ لگ سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہنا جاسکتا تھا کہ اسے اس سے نفرت نہیں تھی۔ لیکن نفرت نہ جہاں ہی کافی نہیں محبت کا جہاں بھی لازمی ہے پھر اسے یاد کیا کہ وہ رائل کی مات جب وہ اسے منہ کے لیے آتی تھی اور جب تنہائی میں اس نے اس سے کہا تھا کہ میرے پاس تمہاری اور تمہارے پاس میری نشانی جہاں چاہیے تر اس نے اس بات کا کچھ بھی جواب نہیں دیا تھا۔ حالانکہ اس میں سرچنے کی بات بھی کچھ نہیں تھی۔ وہ اس بات پر شرمائی بھی نہیں۔ بھائی کے وہاں پہنچنے سے پہلے اس نے اس کے پاس جواب کے لیے وقت بھی بہت کافی تھا پڑ معلوم اس نے جواب کیوں نہیں دیا۔ اور پھر اس کے ذرا سا خفا ہر جانے پر کس قدر وہ اس دکھائی دیتی تھی۔ عجب ڈکی تھی۔ اس کی باؤں اور حرکات سے پچھلے دڑپا تھا۔ اسے بہت کوفت ہو رہی تھی۔ دماغ عجب عجیبے میں گرفتار تھا اس کی بھابی نے اسے سرچ بچا میں تم دیکھا تو رڈ کی تھا اس کے آگے کھٹکتے ہوئے برلی۔

"کیا سرچ ہے ہو؟"

"تاہاں لم بھراس کے چہرے کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھتی رہی پھر سرگوشی میں برلی۔

"دیکھو۔ جیسے کی باتوں میں اگر ہم میں مت پڑنا۔ وہ تو یہ سنیں آئیں بائیں شاہیں کتنی رہتی ہے۔"

"وہ نہیں بھالی تم کو خیال مت کرو۔ میرے دل میں کوئی شک پیدا نہیں ہوا۔"

بھائی نے بال کر بڑی ہمدردی تھی اس سے۔ آخر اس کے دھوکہ درد کا بھی تو وہی ایک ساتھی تھا۔ وہ اس سے بہت محبت کرنے لگی تھی۔ وہ اسے بزرگ بھی سمجھتا تھا۔ وہ اس کا محافظ بھی تھا۔

بال کے جواب سے اسے مکمل طور پر تسکین نہیں ہوئی۔ گو وقت وہ گفتگو کرنے سے احتراز کر رہا تھا اس نے اسے مزید تسلی دینے کے لیے کہا۔

"میں کل جاؤں گی سر زل کے پاس اور پتہ لگاؤں گی کہ یہ بات کہاں تک درست ہے۔"

بال نے شکایت آمیز بھے میں کہا۔

"تمہیں تو کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔"

"تاہاں نے خطا دار اور ادھار سے پالی کی طرف دیکھا اور قدرے سکوت کے بعد برلی۔

"میں تو ہمیشہ تر وہ میں رہتی ہوں۔ پر پالی تمہارے سر پر بھی تو بھٹتا سوار ہے نا۔۔۔۔۔"

سندال نے انہیں گناہ چھوڑ کر تے دیکھ کر ذرا جلد آواز میں کہا۔

کیا بات ہے آج تو بھابی دیور بہت سر جوڑ کر بیٹھے ہیں۔

اس پر دونوں نے باتیں بند کر دیں۔ اور تاہاں سندال سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں میں کیا۔۔۔۔۔ کتا ہے سر میں درد ہر رہا ہے۔۔۔۔۔ بچا ہی سندال نے گھر میں ک پشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

اچھا۔"

پالنے بجائی کی طرت قدر سے کر دی نظروں سے دیکھا کہ مفت میں نصبت اس کے گلے ڈال دی۔
سہاں کہ کر چکتی تھی بلکہ جلدی میں اسے آدھ کوئی بات ہی نہ سوجھ سکی تھی۔

لخصے نے شاید کچھ مل ہی ہنس سیکر کی زبان پر بات سنی ہو گی اب حکمت بھارت نے کار و قاتل سے بیکر کر جانے دینا۔
کچھ رخصت سے بھی سرور ہوئے تھے ہے کھیراتی کی وہاں سے بڑا کامرے لے آؤ یا جے مل کے ماں سے گھنڈا لاکر گرم گرم دودھ کے ساتھ کی
ڈال کر صبح پیٹ ہٹا کر جانے

پالنے سے پال ڈال کر کہا۔

سر سے پیٹ کا کیا متبل؟

نسا بھارا بھی کیا حکم تھا۔ دیکھ کر ہلا۔

”ہمچہ دجانے..... میں کیا سلوٹم علی اسٹوکر گت تھا..... اسی سے مناجت میں نے.....“

فتنا پائی کر خیال آیا کہ اسے باہر بھی جانے سے نہ ہو کہ ماں اسے پیٹنے پر مجبور کر دے۔ بولا۔

”ماں تو پھر غلک ہو گا۔ روٹی کھا کرے آنا ہوں بڑا کامرے.....“

منسا نے رائے دی۔

”بیانا تو لیٹ رہو۔ لہنا لادے گا بڑا کامرے۔“

لہنا تھا کہ آدھ تھا اس کا ہر جانے کر بھی نہیں چاہتا تھا اس سے وہ چپ رہا لیکن جب منسا نے کہا کہ لہنا ان باتوں میں بہت سیانا
ہے اسے اپنے بڑے شریک کی سوچیں بھی بہت آگے نے پندہ میں قوم جانے میں چڑا لی ہرچ نہ سمجھا۔ کہنے لگا۔
”ماں پالی بھیا تو لیٹ رہو میں ہی لادیتا ہوں۔“

پال قدر سے کشت بے میں بولا۔

شعبے۔ تو مجھے بل لگی چھو بھتی ہے میں کہہ جی لے آؤں۔ جو اکل ہوا بھی کہا آؤں گا۔ لہنا بھا۔ اب شک تھا کہ آپس آیا ہے۔
اب پھر عکاد بھارے کو..... اب لیٹا رہنے دو اسے۔ لڑکوں بالوں سے بات چیت کر کے دل بھلائے گا اپنا۔

بے سکر دنا مسل ڈاڑھی کھلانے کی بجائے لڑکوں بالوں سے بات چیت کر کے دل بھلانے لگا۔

اب سب رنگ چپ ہو گئے اور اس قدر گھری خاموشی طاری ہو گئی کہ پالی کو اپنے منہ کے جلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اور
بھر جب سب لوگ آپس میں بات چیت کرنے لگے تو وہ ذہنی طور پر ان سے بہت دور ایک مرتبہ چپ اپنے خیالات میں کھو گیا۔

ایک مرتبہ پھر بھائی سے ملے کر پرستی پال اور دونوں تک سب اس کے ذہن میں گھوم گئے۔

اسے بھائی سے امید نہیں تھی کہ وہ سسرول کے دل کا پتہ لگا سکے گی۔ اسے سسرول اور پرستی پال سنگھ کی بابت خود ہی غلط فہمی
پیدا ہو چکی تھی۔ بھلا ایسی حالت میں وہ ان کی حقیقت کی کج سمجھ سکتی۔ سچ پوچھتے تو اس میں اس کا قصہ بھی کیا تھا آخر وہ خود ہی تو سسرول کی بابت

قلبی طور پر کچھ کہنے سے قاصر تھا۔ اس جگہ بتی کہ پالی کا داغ متناہم کے خیالات میں گڑبگڑ ہو کر رہ گیا اور خیالات کی رو سے حد تیز اور بے تک تھی۔ اس
ذہنی غلط فہمی اسے ایک نہایت دم دیکھ و ادب آواز آئی۔ کو کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ سسرول کے خیالات اور اس کے دل کی کیفیت سب نیاز ہو کر

اس کے عاقلین کا دل اپنی ٹھنی میں لے۔

اس مقام تک پہنچ کر اس کے ذہن کو رُخ کی نشان دہی کا احساس ہوا۔ اور اس نے سر جھانک کر دیکھا تو وہیں ہائی بھر کا راجہ محل سے مسدود دروازے نظر آئے۔

جس سے پہلے اس نے گڑھی کے اندر دو انگلیاں داخل کر کینٹین کے چنڈا پر زور سے برے بالوں کو اندر داخل کیا، تہذیب کے پُر
دہار میں گویا ہر دور جو توں کے پاؤں کے پتھر میں چھپا کر دور زور سے جھٹکا اور پھر زور دے گا
چاندی رات تھی خاموش ٹھیکریں میں کچے کھانوں کے سالیوں اور چاندی کے دو حیا دہشتی کا تضاد آنکھوں کو بہت بھلا دکھائی دیتا تھا۔
دو چار کتے اسے دیکھ کر کھانا بند کر کے دم ہلانے لگے وہ اس کی صورت سے ماراں تھے۔ اسے چور، اچھا، یاد آکر نہیں سمجھتے تھے۔

رہت پرچہ بدلتی تھی۔ پانی آکر کوس کوئی دست موجود ہو رہا اور یہاں چھڑا ہوا مشکل ہو جائے۔ حالانکہ اس بات کا کہاں بہت کم تھا۔
گاہکی کی پرلی طرف اندھے کمر کی تاثیر پر مینے اس کا انتظار کرتے ہوئے۔ جو لوگ موجود تھے ان سے مسکراہٹوں اور مسکری جھبشوں کا تبادلہ ہوا اور
وہ بھر و عافیت آگے نکل گیا۔ اور جتنا غلط ہے وہ بہت جاگرتور کی طرف چلا گیا اور پھر دیکھ کر طویل چکر لگاتا ہوا جولا لنگھ کے مکان میں داخل ہو گیا۔
صحن کے احاطے میں خراساں چل رہا تھا۔ زور سی ساڈی سست قدموں کے ساتھ ایک دروازے میں گھوم رہی تھی۔ خراساں کو چلتے
دیکھ کر اسے شک کر آیا کہ کس پر کھیں رہے اس نے داؤں نے اسے دیکھ کر پہچان لیا تو اس کے حق میں اچھا ہو گیا مگر اسے باہر کوئی سے جولا لنگھ کے
ساتھ بات چیت کرتے دیکھ کر اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ بھائی بہن کی بات جو افواہ ڈھکی ہوئی تھی اس نے انہیں قند سے دھام کر دیا تھا لیکن وہ
بہت پرانی بات ہو چکی تھی اسے تو چھڑا ہوا چل گئی تھی۔ اس لیے اس بات کا خیال بھی رکھوں کے دلوں میں سے اُتر چلا تھا۔ پانی کو زیادہ خوف تھا تو سرول
کے گھر والوں نے انہیں بران کی زبان بھی اس نے کبھی جو جولا لنگھ کی برائی نہیں سنی تھی۔ لیکن پرانی اس کے دل میں یہ خیال جبر کھڑا کیا تھا کہ جو جولا لنگھ سے
اس کے گھر سے تعلقات کو وہ پسند نہ کی کی نظروں سے دیکھیں گے اس لیے اس اب میں جتنی بھی احتیاط کی جائے بہتر ہے۔

شکر کا مقام تھا کہ جو لوگ گھبرائے ہوئے تھے وہ ان کے گاؤں کے آدمی نہیں تھے۔ اور ان لوگوں نے سوائے اس بات
کے کہ ایک لاکھ لاکھ جان ال کے قریب ہر کہ باجر کو حاطے میں سے گذرنا ہوا اندوہی صحن میں داخل ہو گیا ہے اور کسی بات پر دھماکا نہیں دیا۔

صحن میں ایک طرف مرمہ برسات اور مرمہ سرائے کے ایک باورچی خانہ بنا ہوا تھا۔ باورچی خانے کے دو طرف اونچی دیواریں تھیں۔ اور
باقی دو اطراف مائل کھلی تھیں صحن میں چھاج، چنے پھانسنے والی بڑے اور آٹے چھیدوں والی جھلینی اور چرخہ وغیرہ بے ترتیبی سے پڑے تھے
ایک کتے کو زمین پر زور دوز سے دم چٹنے دیکھ کر پانی نے کسی اور طرف دیکھے بغیر سمجھ لیا کہ ابھی گھر کے لوگ چوکے میں بیٹھے روٹی کھا رہے ہیں۔
چن پچودہ اسی طرف کو چلا گیا آٹے میں سرسوں کے تیل کا چرخہ روشن تھا اور اس کی ٹمٹاتی ہوئی دھم دھم روشنی میں کبیروں اور کھبیروں کی لپٹ ہوئی
چند صدمہ تھیں دکھائی دیں۔ دوڑا نہیں پہچان سکا۔ لیکن اسے دیکھتے ہی گریا ان بے جان سالیوں میں زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔

”باگورد جی کا کھانا لے آؤ۔“

”سری باگورد جی کی صحت“

پانی نے جواب دیا۔

بہت قریب پہنچ کر پانی کو معلوم ہوا کہ چند چوہے کے آگے بیٹھی ہے۔ اور چار پانی پر جولا لنگھ کے علاوہ دو آدمی اور بیٹھے ہیں۔

جی میں سے ایک، جی روٹی کھا رہا تھا۔
انہوں نے اسے دیکھتے ہی اس کے پیشخانے کے لیے چا پائی پر جھک جھڑوی۔
جو الاسنگھ نے اٹھا کر لیا۔

”سنا، بیٹا پالی! بہت کم ملتے ہو۔۔۔۔۔ موم بڑا ہے کچھ، نکش برہم سے، نہیں؟“
پالی نے موم بدھشی میں جو الاسنگھ کے پاس سے کراخ طرح پر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے منہ کر جواب دیا۔
”نہیں چاہا بھلا کون تم سے نکش بھی ہو سکتا ہوں میں۔۔۔۔۔؟“
”تو پھر آتے نہیں کبھی۔۔۔۔۔؟“

”یو رہی ادھر ادھر کے دھندوں میں پھنسے رہتے ہیں۔“
جو الاسنگھ نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیچ پر دھموکا دیا۔ پیار سے اور غم میں غصی ہوئی آواز میں گڑ گڑایا۔
”اچھا بیٹا اب اپنے چاچا کو بھی چکے دیتے لگے یاد رکھ تو ہمارے ہاتھوں میں پلا ہے۔۔۔۔۔؟“
پالی نے یقین دلانے کے لیے جی میں کہا۔
”کھا چاہا۔۔۔۔۔ چمکے کیسا۔“

”داہرے پالی۔۔۔۔۔ شش شش۔۔۔۔۔ بھلا بتا تو تجھے کام ہی کیا ہے۔۔۔۔۔ کیوں کسی کی دھمکانی جگالے جانے کی چمک رہی
تو نہیں ہوتا۔“

”باگرو! باگرو!۔۔۔۔۔ پالی نے گریا اس قسم کے کاترکس پہنچا، تھلا تھلی کا اظہار کیا۔
اس دو دن میں اس نے دیگر دو دیروں کو پہلنے کی کوشش میں ان کی رٹ بڑے غور سے دیکھنا شروع کر دیا تھا چنانچہ جو الاسنگھ
نے حقیقت حال تیار کر بادل کی گڑ گڑا بہت کے مانند تھنہ بند کرتے ہوئے کہا۔

”ارے انہیں پہانتے نہیں۔۔۔۔۔ ہر ہر ہر۔۔۔۔۔ بھائی یہ ہے جیل سنگھ اور ادھر وہ سادھو سنگھ روٹی کھا رہا ہے۔۔۔۔۔؟“
بیشک بھاری چٹان کی مانند بیٹھا ہر شخص سوانے جیل سنگھ کے اور ہر بھی کون سکتا تھا اسے ایک مرتبہ دیکھ کر زندگی بھر اس کی
ذرت بھلا نا ملے گا۔ اور وہ بھی یقیناً اسے پہچان لیتا لیکن تاریکی کی وجہ سے پہچان سکا۔ اپنا پوزیشن صاف کرنے کے لیے اس نے کہا۔
”نہیں میں جیل سنگھ کو کھرب اچھی طرح پہچانتا ہوں یہ چاچا نا روشتی، کم ہے نا۔ یوں میرے دل میں سب تو تھا کہ ہونا ہو یہ
جیل سنگھ ہے۔“

اب سے جو الاسنگھ ہذا تو اس کے بڑے گول گول کندھے آواز کے زبردست کے ساتھ لڑتے رہے۔ معلوم اس میں جسنے کی کیا بات
تھی۔ چنوت کی طرف، زرد چھبک کر والا ”شتی بز چنوت“ جو اوپر اور چرانا، ادھر کو جیل سنگھ کے منہ کی طرح۔
جیل سنگھ بھی جسنے لگا۔ اس نے پتے سمک کے گرد لپٹے ہوئے چارواخان کے کہیں کے ذور ہی اندر رہے چینی سے سپرد بدل کر کہا۔
”وہ! وہ! نہ لانے کی کیا جرأت ہے۔ میں دیر۔۔۔۔۔ کی طرح منہ کیے دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے دشمنی کا طرف چہرہ بڑھا دیا۔

جوالا سنگھ بولا

”کیوں جانی بکھریا“

”ہاں چا چا دیکھ لیا“

”آگے کرتا نہ بھروسے؟“

”بھولا تو اب بھی نہیں تھا پر اس کا منہ تھا برا اندھیرے میں.....“

”آج جانی چل سنگھ دیر سے کی طرف مت کر کر ایک بار پھر“

اس پر سب لوگ کھٹک کر ہنس پڑے۔

ہنسنے کی ان آوازوں میں جوالا سنگھ کی آواز ایک مرتبہ پھر بلند ہوئی۔

”اس کھٹکی میں دوڑوں تو تھوڑا طویل“

ان دونوں نے ہاتھ ملائے، سادھو سنگھ کھانا کھا کر اس لیے اس نے دہسنے کی بجائے یاہاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

جوالا سنگھ نے اب ذرا سنجیدہ بن کر دریافت کیا۔

”کوہنر کے لوگ تو اچھی طرح سے ہیں نا؟“

”ہاں سب اچھے ہیں“

”..... تمہاری جانی اور اس کے ال نہ تھے؟“

”سب ٹھیک ٹھاک ہیں“

جوالا سنگھ نے جہانگیرہ بزرگوں کے سے بھی میں کہا۔

”ہے نابہ نگاہ بات۔ ایک گاؤں کے رہنے والے ہم ان کی کھیریت یوں پوچھ رہے ہیں جیسے وہ کہیں پر دس میں رہتے ہوں

..... لہذا تو کھیر کو رام میں جبار رہتا ہے۔ اس کی تو بات ہی ماننے دو ہاں کبھی راستے میں جھینٹ جہاں سے تو وہ باتیں کر ہی جیتے

ہیں بھلا کوئی سنداں سے پوچھے کہ انھار سے کیا کام پڑے رہتے ہیں ایسے کبھی شکل ہی نہیں دکھائی ان کر..... کے دن ہو

کئے ہیں بھلا اس کی شکل دیکھئے؟ کیوں چنتر تھے تو کھال ہو گا کچھ“

چنتر نے چنتر سے سکتے ہوئے اچلے کی راکھ جھڑتے ہوئے جواب دیا۔

”اس پکیریں دوش دوش تے بروہ پجاری تو آج ہی ملی تھی.....“

پالی کو ایک لمبی سی جا ہی آئی۔ اس نے جوالا سنگھ کے بے کیف باتوں سے اٹا کر بے معنی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا تھا

جوالا سنگھ کچھ اور مطلب سمجھا اور سر کر اس کے قریب پہنچ گیا اس کی نعل میں اپنی کھنی سے ٹھوکا دے کر بولا

”کوہنر کی تلاش ہے“

پالی نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں کا شمس گن کی ہوتی تھی۔“

جوالا سنگھ نے اسے سر ہلادیا جیسے وہ سب کچھ کہتا ہو۔

”وہ یہاں نہیں ہے۔“

پالی نے قریب سے جوالا سنگھ کی ڈاڑھی کے گھنے اور کھردرے بالی اور اس کا انداز بیان دیکھ کر ششدر رہا اور سوچا کہ کیا۔

”میں چلی گئی جہاں سے آئی تھی۔“

اب پالی کو معلوم ہو گیا کہ جوالا سنگھ کا اشارہ کسی حدوت کی جانب ہے۔ اس کی آنکھوں میں تپتے ہوئے پیاوڑ کی حدوت گھوم گئی۔

جوالا سنگھ نے خوب اچھی طرح دانت نمایاں کرتے ہوئے کہا

”بھاری بہت یاد کرتی تھی نہیں۔“

پالی نے قدرے استیقا سے پوچھا۔

”داکی بہت یاد کرتی تھی۔“

”تو کیا میں جھوٹ کہتا ہوں۔“

یہ کہہ کر جوالا سنگھ نے منہ قدرے زیادہ اوپر کو اٹھا دیا اور اس کے منتھنوں کے فیضان بال نمایاں ہو گئے۔

پالی کو پیاوڑ کی حدوت یاد آئی تو دل کی کچھ کچھ ہونے لگا۔ کیسا بانٹا جسم تھا پیاوڑ کا۔ سر سے پاؤں تک گٹھا ہوا۔ اسے انوس بونٹا تھا کہ اس نے انھی شہنشاہی میں آکر اسے چھونے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ وہ بہت سنگھ پر بات ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ وہ اسے زبردستی کے بعد پیاوڑ سے دست بردار ہو سکتا تھا۔ لیکن اس جذبے سے بھی مضبوط تر جذبہ ایک اور تھا اور وہ تھا اس کا سرور۔ اسے پیار عشق کے مبار میں یہ بھی ایک قرانی تھی۔ ان باتوں کو سوچ کر ان کاظم خاں ہونے لگا اور بالآخر اسے اس بات پر خوشی محسوس ہوئی اس نے سمجھا ہی کیا جو اس حوالہ قدرت سے غلط نہیں ہوا۔ حالانکہ وہ ہزار جان سے اس بات پر آمادہ تھی پیاوڑ کی بات اس کا استیقا دفعتاً بھڑک کر ٹھنڈا ہو گیا۔ جیسے اس نے سلسلہ کام جاری رکھنے کے خیال سے پوچھا۔

”اکھڑ نہیں تو تو تم ہی ہو گا کہ وہ کہاں گئی ہے۔“

نہیں دھرم سے مجھے اس بات کوئی کچھ نہیں۔ بھلا مجھے بتا دینے میں یزید کیا مارج تھا۔

”اور وہ آدمی.... ماتا کے داگوں والا.... کیا نام تھا اس کا بہت سنگھ۔“

”وہ بھی تو اس کی دوس سے بندھا ہوا ہے۔“

پالی کو اس کے ساتھ اپنی چھٹ یاد آئی۔ اس نے مخصوص انداز سے جوالا سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”مت سنگھ مجھے برا بھلا نہ کہنا۔“

کچھ دیر تک جوالا سنگھ چپ چاپ اپنے دانتوں اور سرخ مسڑھوں کی فائبر کر تکم۔ چوڑاس نے زبان نکال کر اس کے سرے

سے مونچھ کر چھڑتے ہوئے جواب دیا۔

لیکن پالی نے ”دانتو ایسے کھائے کہ سارا پیرس کی تک اور مسڑھوں میں سے ہڈی نکل گئی۔ پھر تو باطل بوی بن گیا تھا۔ اسے

”نہیں.... بس میں تو کھڑا کیا ہوں باگورد تمہیں اور دے“

ہائی کی اس بات پر جوالا سنگھ جھوم اٹھا۔

”کاما.... واہ ہائی واہ واہ۔ کیا بات کہی ہے۔ باگورد تمہیں اور دے۔ بالکل باگورد ہی سب کو دیتا ہے۔“

جیل سنگھ نے ڈھیلے جوڑے کو ذرا کس کر باندھنے ہوئے کہا۔

جوالا سنگھ بات تو نے ٹھیک کہی ہے۔ مینے والا تو باگورد ہی ہے پر ایسا بھی نہیں کہ آدمی آپ سے تو کہے نہیں اور نرمی باگورد ہی

پر اس کا نے جیسا ہے۔“

جوالا سنگھ کی گردن نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے جب وہ ان بات میں سر ہلانے کا اثر کے ساتھ مارا دھڑ بھی ہنسنے لگا۔

”کھر کا کھی۔ ہاں بھائی راجی تو باگورد کی کی ت ہے....“

انہیں میں سادھو سنگھ نے مٹی کی انگلیوں میں سر کے اگلے سلگ رہے تھے چارپائی کے قریب آن رکھی شدت کی رکی پڑی تھی کسی

نے انگلیوں کی طرف اٹھ بڑھا دیئے اور کسی نے پاؤں۔

جیل سنگھ نے پاؤں بڑھایا تو اس کی ہونٹیں مضبوط اور سڈول پنڈلیاں عریاں ہو گئیں تجھیں دیکھ کر اس بات کا بھولی اندازہ لگ سکتا تھا

کہ وہ کتنی طاقت کا مالک ہے۔ ایسے موقع پر سادھو سنگھ بھی منہ سے جھانٹے بغیر نہ رہ سکا۔ چارپائی کے بجائے انگلیوں کے قریب پڑی ہوئی چوکی پر

بیٹھتے ہوئے رہا۔

”باگورد ہی کسی جیل سے دیتا ہے آسمان سے نہیں برساتا راجی.... کیوں چاچا جوالا سنگھ“

جوالا سنگھ نے آفسیرین بھیجے ہوئے کہا

”کیا بات ہے.... واہ واہ.... سادھو سنگھ تو پچھلے جنم میں جو در سادھو ہوا ہر گا.... اس جنم میں نکھیر حوام جا رہا ہے۔

پتا.... کیر راجی سنگھ سنی ان کی بات؛ متبل یہ کہ آدمی جب تک کھڑا کھڑا نہیں دے کہے باگورد اسے کچھ نہیں دے سکتا۔“

”باگورد کھڑا ہے.... جہنم نے ذرا چھوڑا ہے چہلے وقتا تو کہ کھڑا شروع سیسے واگورد کچھ اس کے کان میں یہ بات کہنے

کے لیے آیا ہر....“ واگورد کھڑا ہے سنگھ (اسے انسان) دیکھ میں نے تجھے یہ نہ کر دیا ہے جو تو اس کا چھانڈہ اٹھانا چاہتا ہے تراٹھا لے۔

باد میں پھر نکھیر مجھ سے کہ میں نے تجھے کچھ نہیں دیا....“

تھوڑی دیر تک ہر طرف سے باگورد اور باگورد کی صدا میں آتی رہیں۔ سب لوگ بڑی سنجیدگی سے انھیں منہ سے اس انداز سے بیٹھتے تھے

جیسے ان کے دل جھنجکیں اس میں جھکے ہوئے رہے ہوں۔ جیل سنگھ کی تقریباً ساری ٹھوڑی میں گھپی ہوئی تھی۔ وقتا اس کی انگلیوں میں گھس گھس کر

رہی تھی سکر اہٹ پیدا ہوئی اور اس نے جوالا سنگھ کی طرف دیکھ کر پر معنی کہنے میں لگا۔

”بھئی سرکا تو باگورد نے اب کے بھی ہمت اچھا دیکھ ہے.... کیوں نہیں۔“

”نہر ہاں.... کیوں نہیں۔“

اس کے بعد پھر قہر سے ملوث خاموشی جاری ہو گئی اور بالآخر جب پھر تھوڑی ہمت نکھڑا شروع ہوئی تو جوالا سنگھ اٹھا اور پائی کو اشارے

سے اپنے ساتھ لے گیا۔ چھ دنوں اس پر گئے۔ وہاں جوالا سنگھ نے کام کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ایک آدمی بٹھا رکھا تھا۔ اس نے وہاں

جوالا سنگھ سبز باغ تو خوب دکھا رہا تھا۔ وہ بھٹتا تھا کہ چونکہ پالی کو چنے کبھی ایسے کام میں حصہ لینے کا موقع نہیں ملا اس لیے وہ کچھ بچکا ہوا ہے۔ لاکھ پالی کو اس قسم کی بچکاہٹ نہیں تھی۔ اس طرف تو اس کا بھتی رحجان تھا جن کاموں میں وہ اناٹہ ڈال چکا تھا وہ بھی کچھ نہ شرمکا نہیں تھے۔ حقیقتاً ڈالنی بھڑائی مار پیٹ۔ قید و بند بلکہ موت تک کا خوف اسے کبھی غم نہ پہنچا تھا۔ ایسے پروگرام میں حصہ لینے میں اسے اعتراض بھی کیا ہو سکتا تھا۔ بلکہ وہ سب سے اگے سینہ تان جانے کو تیار تھا۔ اگر اس کے چہرے سے بچکاہٹ کے اثر نظر آتا ہے تھے تو سنو، اپنے حالات کو بغور دیکھتے ہوئے جب وہ گاؤں میں آیا تھا اس نے اس قسم کی صحبت اور اس قسم کے کاموں سے عمدہ آہستہ آہستہ لے لیا تھا۔ اب وہ مذہب کی حالت میں تھا وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

جوالا سنگھ اس کی خاموشی دیکھ کر کھیراں ہوا رہا تھا۔

”ارے بیٹا۔ اس کام میں شکی ہی کیا ہے جو تم ایسی گھر کو سچ میں پڑ گئے ہو جو آدمی ہمارے بیچ میں ہے نا وہ ہے مگر کس سب باؤں پر بھیجی ہو۔ سوچو ہوئے ہیں کہ کھیت کرنے کے بعد اسے بھی مار ڈالیں گے۔ زرے باؤں ذبح فرما دیں۔ پھر کن جانے کا کس نے ڈاکو ڈالا پس کے آدمی اس کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ لیکن میں نہیں پا سکیں گے۔ ارے بھائی آؤ دس جہاز تو ایک آدمی کے حصے میں جو نہی، (یونہی) آجائے گا تو بھی اس روپے سے لڑی جین کھریہ لیجیو اور بڑے عیش سے رہو۔“

جوالا سنگھ نے آخری فقرہ راسخہ لکھ دیا جیسے اس نے پالی کے دل کا حال کلی کتاب کی طرح پڑھ لیا ہو اس کی ساری کھیر رازی کا پالی کے دل پر اتنا اثر نہیں ہوا جتنا کہ صرف اس ایک بات کا ہو۔ پالی کی خیال کو گویا پر لنگ گئے۔ زمین خریدنے کے واسطے روپیہ حاصل کرنے کے لیے وہ دنیا کا کوئی کام بھی کرنے کو تیار تھا۔ سرزن کے ماں باپ کے دل میں اس کے سزاوار اور کوئی بات بھی نہیں تھی۔ وہ لوگ اتنے دنوں سے اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ ادھر پالی زمین خریدے اور وہ اس کے ساتھ سرزن کا لیا کر دیں لیکن پالی زمینی کہاں سے خریدے۔ جب میں روپیہ ہر تھجی نا۔ روپیہ دوختوں کے ساتھ دنگ تھا کہ وہ جا کر لڑ لڑائے۔ آسمان سے نہ برتنا تھا کہ، جا کر بٹور لگے..... پھر دستا پالی کو احساس ہوا کہ خود ہانڈو والی پرکھ نے اسے شکل میں دیکھ کر اس کے لیے یہ سنو امو کا پیا کیا ہے اگر وہ اب بھی چوک گیا تو پھر اس کی قسمت کی تعجب راج سے چند روز بعد سرزن کے ماں باپ کے گاؤں میں یہ بات جا پڑے کہ سردار جوالا سنگھ زمین اور دو بڑی بلی خرید لیا ہے۔ یہ سننے ہی زنجی سنگھ دوڑا آچلا آئے گا باؤں باؤں میں تغیرات پڑ چکے گا۔ پھر وہ اسے اپنے گھر بلائیں گے، جہذاں اپنے مخصوص انداز میں اس سے پرستی مانگیں گے گی۔ اور پھر پالی سنگھ اس طرح غائب ہو جائیں گے جیسے آدھ می کے آگے شس و خاشاک۔ ادھر کسی کو اس بات کا علم نہ ہو گا آخر کسی کو خبر ہو گی کہ یہ کون سا کتبی ہے کسی بھانے سے مثلاً یہ کہ اس کا ایک دوست کلکتے سے امرتسر میں آیا ہوا ہے وہ اس سے ملنے کے لیے جا رہا ہے۔ بس اسی دوران میں سارا کام ختم کر کے واپس آجائے گا جو ماں پوچھے گی کہ اتنا روپیہ کہاں سے آیا تو وہ کہہ دے گا کہ برما میں ایک دوست کے پاس اس کا روپیہ موجود تھا اب وہ برما سے واپس آیا ہے تو اس نے روپیہ بھیج دیا۔ اسی قسم کا کوئی اور بھانہ لگا دے گا۔ آخر گھر دسے پیچے تو پڑ جائیں گے کہ گھر میں روپیہ کیوں آگیا انہیں تو وہ پچے سے کام اس بات سے غرض تو کیا کہ کہاں سے آیا۔ ان کو تو معلوم ہی ہے جیسے اس کا باپ گھر میں روپیہ لایا کرتا تھا۔

پالی اپنی سوچ بچار میں غم تھا۔ اور جوالا سنگھ اس کی پراسرار خاموشی پر کچھ پریشان ہو رہا تھا۔ وہ اس دوران میں بڑے یقین سے ایسے منہ میں زبان کو گھٹاتا پھرتا رہا۔ پھر وہ حندی روشنی میں دونوں کی نظریں ملیں۔ انہوں نے بھانیاں لیا کہ وہ دونوں ایک ہی میدان

میں شہر رہیں۔ پائل خٹک کی کچھ پکاری چھوڑ کر سکر ایڈ جوائننگ کے باجیس چوٹیں۔ خاموشی کے رقتہ پر اس کے خداداد اجہرے تو اس کی چھوٹی چھوٹی انگلیں اب بھی چھوٹی دکھائی دینے لگیں۔ یہاں تک کہ باؤختر رضا رول کے ابھار اور مجنوں کے درمیان ہی وہ سنی دو بول کی فائدہ دکھائی دینے لگیں اور وہ ہاتھ بڑھا کر بالی کی تپتہ تپتہ پیٹنے لگا۔

پلاٹنگھونے اطمینان سے نہیں میرا رہے ہوئے کلاسی کے ستون سے پیٹھ ٹیک کر پوچھا۔
کس درجہ؟

”بس..... کل نہیں تو پرسوں..... اذہر چل کر جیل خانہ سے بات چیت کر لیں گے“

بال نے قہر سے آگے جمنا کر پوچھا۔

”تم نے وار کی تسلی کر لی ہے، نا، سامی بیسی ہے۔“

سوال اسٹو نے پیش کیا کہ۔

اے آسمانی کی کیا چہیتے ہو سو رائے نے ٹھہری میں خود جا کر گھر دیکھ آیا ہوں سا جو کار ہے سا بڑا بڑا بھر جنت مال افتخار
میں کھیل کر تماشہ تو دیکھو

”اچھا تو تم نے کدو دیکھ لیا ہے مگر“

”ہاں جیسی نکاح“ پھر جلاسل نے انکھوں کو چھپتے ہوئے کہا۔

”کھدائی انکھوں سے دیکھا میں نے.....“

اب یالی کا شوق تیز ہونے لگا۔

اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہاں گاؤں ہی میں مال ہے سب

”ہاں مہربانی دو اپنے گھر ہی میں لکھتا ہے، لیکن میں کلام ہے۔“ اور وہ بولے: ”مجھے سب اس کے پاس ہی رہنا ہے۔“

”ترجمہ سب باتیں اس مجیدی نے بتائی ہیں؟“

ایک بات اور بھی تو ہے۔ اُن نے گھر میں ہر دُک (بندوق) بھی ہے۔ جو ان کے گناہ پہنا ہے۔

”تو بتاؤ بدوگ رکھنے کی کیا جوت ہے۔“

پالنے مانتے پر لی ڈال کر کہا

یہ بدوک والا مایہ فیر چلے برا.....“

جو الاسٹیک اپنا منہ اس تقدیر سے اکا کر پال کر اپنی گود میں پر اس کے منہ سے حلقی ہوئی گرم گرم ہوا کا احساس کرنے لگا۔

جو اللہ شکر نے پکیں حبیب کاٹے بغیر اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ پھر اس کے سرے پر سنہری ٹیڑھی

بھید نہ کہ جانی طور سے کہ ان کی جان کو گولی تھی اس کے مرتے کے لئے شہرہ مجسم دی گئی تھی۔ ان پنج سات

”نہیں آئے گی اور تم اس سے پہلے ہی سارا کام مکتم کر آؤ گے۔“

[illegible]

خود سے غمگین ہونے سے پہلے اس نے ایک کی چمکا دی سی آواز میں کہا۔
 "پال! ہمارے پاس بھی تو ہرگز بدوک!"
 پال کا دل اسے خوشی کے اچھٹنے لگا۔ اس نے منہ پھیر کر نگاہ تعجب کیا۔

ہاں بھائی! میں نے سب پڑھ لیے ہوئے ہیں۔ ایسے کچھ گریاں نہیں کیلا ہوں۔
 ہال نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا۔

”چاپا، دکنی تم اکل بند (سختی)، آدمی ہو“

جراثیم نے بھی خوش مرنے میں غل سے کام نہیں لیا۔

تم چراغ افشاؤ تو دیکھنا..... اسے جب نیراب چند غماؤ بڑے بڑے میدان مارے تھے جسے تو کیا تھا میں سوچ رہا تھا کوئی موکا پڑے تو کم دنوں ساتھ ساتھ ہمیں۔ تو تو پہل اپنے باپ کا روپ ہے۔ دو تیرے برابر اوکا نہیں تھا۔ غمراپ و دراب بھی بہت پتیا تھا لیکن پھر بھی بڑا جو۔ تھا اس کے بدن میں۔ اسے اس کی تو آدراج بھی ایسی تھی جیسے شیریں لکڑج۔ سینے والے کی کھلی بندھ جاتی تھی..... جبر ایک ٹیٹ..... غمراے ہو۔ میں کھر اس تک ہو گاؤں....."

جواباً اس نے کہا: "پس اے عیسیٰ، میں نے تجھے پہچان لیا ہے۔" اس نے کہا: "میں نے تجھے پہچان لیا ہے۔"

• بھیجی جیلا سنا! یہ سادہ فی بہت بڑھی ہو گئی ہے اس سے تو چلا ہی نہیں چلا جاتا اور چل کے پھر بھی ٹھیک کام نہیں کرتے۔ جیلا سکر نے خوش طبعی سے ہنستے ہوئے کہا۔

..... ہاں ہاں... یا آپ یہ کام بھی کیڑا ڈالیں گے۔

اس کے بعد جب جبرائیلؑ اس کے آگے گھبریں لاکھا چلے کر ٹھہر کے اندھیا لڑائی بھی اس کے قریب چلا آیا جو الائنس نے اسماعیلی کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا۔

”باغورد کالی پرکھ نے آسمان میں تارے بھی کیا کھرب بنائیں۔ جب آدمی کاجی جُڑا جائے تو آسمان کی ترچہ دیکھنے لگے۔۔۔۔۔ ہر چہ ہر مذہب معلوم کھنٹے تارے ہوں گے کیوں یا بی بھار سے کم تو کیا ہوں گے۔“

پالی کو تامل سے کوئی مہسپ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کچھ جواب دیئے بغیر گاؤں پر ہنسی لگایا۔ اردو: اس کے ہر جھمکے سے چہرہ اٹنے لگی۔

جو الاسٹیک نے اسے اپنی دھن میں لگن پکا اپنے آدمی کو آواز دی۔
 ”ہر گھنٹہ ہر“

• برتھا •

“ ”

”اسے باہر آؤ تو اندر ہی مریں گا۔“

بجاست فیضانِ اور سست آدمی تھا۔ اس نے صبح کے دو دانے جی سے گردن نکالتے ہوئے کہا۔
"ہو تو میرے نیچے کیوں پڑ جاتا ہے....."

جو الاسگھ نے اس کی بات سنی ال سنی کرتے ہوئے کہا۔
"ڈاچی کو طرے میں باندھ دے جلد ہی سے۔ حرام جادے بدستگرم
تو ہی بتا بجا بڑا جادو سادہ کی گیل کر لے اسے اصل کی طرف لے گیا۔
جو الاسگھ نے پانی کو اشارہ کرتے کہا۔

"اؤ اندر میں۔ اب سردی میں اس جگہ بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے؟"
دو دانے صحن کی طرف بڑھے۔ دو دانے میں داخل ہوتے ہوئے جو الاسگھ نے لکھم لکھم کرے کر کہا۔
تعبہ ہوئے۔ باہر کا دروازہ بند کر لیکر کھڑا ہو چکی تھی۔
"ہو" اور سے آواز آئی۔

پھر دونوں صحن کے اندر داخل ہوئے۔ اوچی خانے کی محلِ رخواست پر چکی تھی۔ جیل سنگھ کھڑکیوں کے قریب بیٹھا پیشاب کر رہا تھا۔
سادھ سنگھ ایک آواز دے کر کوئی نہ کوئی ڈال رہا تھا۔ چنتو ایک میرے ہی سے غائب تھی۔ شاید جب وہ دونوں خراس سے ذرا پارے چلے گئے
تھے اس وقت چنتو ان کے علم کے بغیر ہی اور سے گزر کر باہر چلی گئی تھی۔
جیل سنگھ جب اٹھ کھڑا ہوا تو پال کو اندازہ ہوا کہ اس کا ڈیل ڈول کسی قدر درست ہے۔ دیو کا دیو معلوم ہوتا تھا۔ وہ تہ بند کے نیچے
اپنے کھمرے کا اندازہ باندھتے ہوئے اور کیا۔ اس نے پرستی نظروں سے جو الاسگھ کی جانب دیکھا۔ جواب میں جو الاسگھ کے گوشت سے
پڑ چہرے پر کئی نشیب و فراز پیدا ہوئے۔ اور پھر اس کی گردن شکل لی اور منہ کھلا۔
"میں امریکا کام"

پالی کو اس کا مطلب سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔
جو الاسگھ نے آنکھ مار کر کہا

"نڈے کو گرو منتر دے دیا ہے میں نے"

جیل سنگھ نے دو دانے انداز میں اپنا بھاری جگر کم ہاتھ پالا سنگھ کے کندھے پر رکھ دیا۔

سادھ سنگھ نے ان کی باتیں سنیں فردہ بھی قریب کھٹک آیا۔ اور پھر وہ آپس میں بات چیت کرتے ہوئے پیار میں چلے گئے۔

جو الاسگھ نے پُرجھا

"چنتو کہاں گئی ہے؟"

سادھ سنگھ نے ڈکارے کر کہا۔

"دو گھڑی کے لیے باہر گیا ہے"

پھر سادھ سنگھ کے سوا سب چار پائی پر بیٹھ گئے۔ اور سادھ سنگھ اپک کر اُپر تے دھری ہوئی گیہوں کی بریوں پر چڑھ بیٹھا۔

جولانگہ رولا
ابے مادھو سنگھ جو انٹرنیٹ میسجے آنا اور؟
مادھو سنگھ نے بون کی طرح کندھوں کو حرکت دے کر جواب دیا۔

”جسٹاؤ اب کون جہنے چو کے ہیں“
جولانگہ نے جھڑپ تان کر اس کی طرف دیکھا
”جے میا داد نہ جڑو.....“

مادھو سنگھ نے استغوثے دیکھا تو بے دلی سے باریاں پر سے نیچے اتر آیا۔ باہر نکلتے نکلتے بڑبڑایا۔
”جھینے کی سی رونی پھڑکی ہے..... سردی سے متونہ جائے گا۔“
یہ حقیقت تھی کہ ان میں سے سردی کے مارے کوئی بھی مریز الا نہیں تھا لیکن جولانگہ کو تو مہماؤں کی خاطر سردی کی منظر تھی نا۔
آخر کار مادھو سنگھ کی ٹیگٹھی میں چند سرکے چائے اپنے ساگھا کر لے آیا۔ اور اسے چار پانی کے قریب رکھ کر پھر باریاں پر چڑھ بیٹھا۔
جولانگہ نے اسے بندر کی طرح بیٹھا پایا تو بولا

”پتھر اچھوڑو۔ کھک گئے تو دھڑام سے نیچے آئیں رہے گا۔ ساری شہی کر کر ہی ہو جائے گی۔ یہ چونچ سی ناک پچکھ جائے گی۔“
جیل سنگھ نے ناپنیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:
”ابے چھوڑو چراغ اچھا دے کر..... کوئی کام کی بات ر“

جولانگہ نے فوراً بات کا رخ بدلتے ہوئے جواب دیا۔
”ہاں بھائی پال کی کس تھی سو بڑی ہو گئی۔ وہ ہمارے ساتھ چلے گامیں نے تجھے چلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ اپنا بیٹا ہے جانے پر
تیار ہو جہنے گا..... بس ہمارے کہنے کی دیر مٹی۔“
جیل سنگھ نے مطمئن ہوئے ہیں کہا۔

”یہ تو مجھے روم تھا لیکن پھر بھی میں نے سوچا اچھی نا تجربے کا رہے شاید ایسے کام سے گھبراتا ہو۔“
”ہو ہو..... تم اسے نا تجربے کا رہتے ہو۔ یاد کیا بات کہ وہی تم نے اس روج اپنی آنکھوں سے اس کے ہاتھ کی سچائی دیکھ
پکے ہو پھر بھی.....“

”نہیں مٹی اتنا ذہین ماننا ہوں کہ وہ بڑا کرادہ جوان ہے اگر اس دن رٹائی نہ بنی ہوتی پھر بھی اس کی صورت سے اندازہ لگ سکتا ہے
میں بھی نکلنے سے آئی کہ پہچان لیتا ہوں۔ اگر میرے دل میں اس کے لیے پریم نہ ہوتا تو بھلا میں اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تمہیں اتنی بار
دکھاتا.....“

جولانگہ نے نود سے کب ہلا کر کہا
”ہو تو ٹھیک ہے۔ پر تمہیں معلوم نہیں پانی ہی بڑا حیرت ہے کھٹنے میں اس نے بڑے ہاتھ مارے ہیں۔ جان تمہیلی پر رکھ کر
گند کی پھرج سے ٹرک چو اچھا کرنا۔ اب تو جہاد ساتھ رہے گا تب دیکھنا اس کے ہاتھ.....“

باللہ سب باتیں مٹی کر بہت خوش ہوا۔ اس نے انکا ملنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دائرہ کی فائش کر کے دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے دائرہ کی دساتر سے متحرک کی پکڑا دی چھوڑ دی۔

جوا لاٹکے نے اپنی چھٹی ٹیکس مٹی گردن کو شکل آگے بڑھاتے ہوئے خدا وادہ امان لہجے میں پوچھا۔

”اچھا جانی جیل سنگھ! اب بھئی تادہ کرکس دن مانا ہوگا کل گئے آدمی ہوئے ہمارے ساتھ کیا کیا ملان ہو چکا الال کا انا اچھا ہی ہے۔“

جیل سنگھ نے دھندلے آدھ آدھ میں چٹ کر کنبیاں گھنٹیں پڑتیک دیں۔

”اب تجھے کتنی دپے بتانا ہوگا کہ بڑا مالہ انا سا پرکار ہے تجھے تو کھر بھی دکھا دیے اب پھر وہی پرانی بات پرچھے جاتا رہے۔۔۔۔۔“

”ارے نہیں یاد رہنے لیے نہیں جوا پانی کو بنا دے نا بھے تو سب کچھ دم ہی ہے!“

پالی کا بھی ہما نہ تھا۔ وہ زندہ اصل مال عدالت کا ذکر بار بار سن کر خود اسے حلقہ محوس ہوتا تھا۔ اس نے ہال کی طرف مناجب ہڈ کرنا۔

”رہنا پالی سن یا۔ میں نے کچھ سمجھوٹ نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ ہاں یاد تھیر کس مدح کا کیا مال ہے۔“

جیل سنگھ نے دانا پرزدہ ڈال کر دو چار ٹکے خور کیا۔ اور پھر فیصد کی لہجے میں پڑا

”ہیں کل شام کے ٹھنڈے کھے میں میاں سے چل دینا چاہیے۔ دائرہ ات ہم کا ہی سنگھ کے دواں بچ جائیں گے۔“

”بھئی! کہیں سنگھ کو مل ہے“

”اوسے نہیں آتا بھئی یاد نہیں۔ نکالنے صاحب کے میسے پر جودہ کب حدت سا آدمی تھا نا۔ اوسے جانی جب ہم سبے بھٹک

ہلانی ادا کا بن سنگھ کر ایسی ہنسی چھڑتی کہ بس تو رہی جیل۔۔۔۔۔“

جوا لاٹکے نے ذہن پرزدہ ڈال ٹیکس کچھ یاد آگیا۔ جیل سنگھ نے بے چین ہو کر کہا۔

”ہو جس کے دانت بہت پھیدہ تھے۔ تیس برس کی عمر ہو گئی تھوڑے دن کی ڈاڑھی تھی اس کی۔۔۔۔۔“

”ادہ ہاں۔۔۔۔۔ یاد آگیا۔ تم ہی نے بتایا تھا نہ ثابت کہ اسے ایک حدت نے بیا بنا لیا تھا۔“

ہاں ہاں بس وہی۔۔۔۔۔ بڑا چمکا پڑا ہے۔ وہ حدت جس نے اسے بیا بنایا ہے نہ ڈر دی تھی اکیس بائیس برس کی۔ حاجی چنیل

تھا اس کو کچھ مال بھی تھا اس کا بن سنگھ تیرم تھا لیکن بڑا حرام کا ٹکڑا تھا حدت نے اسے بیا بنالیا۔ ”چار برس یا د جب اس کی ڈاڑھی مرنے چھڑنے لگی

تو ایک رات اندھیرے میں اس حدت نے خبر ناں ہونی شروع میں کہا۔ ”وے کا بن کیا کرتا ہے۔“ تو اس حرامی کے پٹے نے جواب دیا۔ ”بے

جوا دیر باد پڑھ لیتی تو تیرا کیا جوڑھتا“ اس پر حدت نے اسے کچھ کہا اور نہ کوئی سوال جواب کئے۔۔۔۔۔“

”ہر جو۔۔۔۔۔ ہر جو۔۔۔۔۔“

وہ سب تہمتے لگاتے گئے۔

جوا لاٹکے نے شکل ہنسی روکتے ہوئے پوچھا۔

”جب کہا نے پینے کا کھرب ہے تو پھر ایسے کا بن میں کہیں پڑتا ہے وہ۔“

”ارے ہمارا اتنا راجا نہ ہے نا۔۔۔۔۔ بس لت پڑ گئی۔ بعد ہے بھی بڑا پری آدمی۔ اب ہلو گے تو پھر دم ہوگا۔“

پالی نے پوچھا

اچھا تو وہ بھی سنا سے ساتھ چلے گا۔

”سچوہ بڑا کام کا آدمی ہے ایک بار لڑے تو کب لگے کہ ایسا روح والا آدمی نہیں دیکھا۔ وہ کھد بھی کتاب ہے میں تو روح والا آدمی ہوں۔ ہاں بھی چاروں کی چاندنی چھرا نہ میری رات ہے۔ اور باگوردو اکال پرکھ سب کا دکھ والا ہے۔“
جوا لا سنگھ اس وقت باگوردو اکال پرکھ کی باتیں کرنے لگے تو وہ میں نہیں تھا۔ اس نے چھتر حقائق کی طرف آتے ہوئے پرچھا۔
”ہاں مگر کتنے آدمی ہوں گے.....“
جیل سنگھ نے حساب لگا کر کہا
”کل چودہ آدمی ہوں گے“
”چودہ“

”ہاں چودہ..... لیکن بے چکر وہ سب کو برابر کا حق نہیں ملے گا۔ ان میں سے بہتے زبیر سے چلیے چائے ہیں۔ اور پھر بھلا کھیاں بہرے کہ گاؤں میں اور دو چار آدمیوں پر مٹی اتھ بیٹ کر دیا جائے۔“
جوا لا سنگھ نے کہا۔
”چنتر بھی تو ہوگی۔“
”اچھا چنتر ساتھ چلے گی..... بڑی بشار ہے وہ بھی ان کاموں میں۔“
”ہاں وہ تو میں بھی جانتا ہوں..... چنتر کو لاکر کل پندرہ.....“
”اور بھیدی“

”ارے ان اس کا تو کھیاں ہی نہیں رہا۔ بس سب ملا جلا کر سولہ ہو جائیں گے۔ سولہ کے سولہ گاؤں میں داخل ہو جائیں گے سب کے سب کھب مجبور اور ہشیار۔ باقی رہا سادھو سنگھ تو یہ مرٹھ یا قبرستان کی جھڑ بیریں میں مائدہ تیوں کی رکھالی کرے گا۔“
”اچھا تو اگر ہم کل شام ہی کو چل دیں تو ساڈنیروں کا انتہام کوں کرے گا۔“
”بے چکر رہو یہ سب کام کا بن سنگھ کے پاس پہنچ کر جو جائیں گے بلک میں نے تو اسے پہلے ہی سے کھردار کر دیا ہے۔ وہ بڑا ہی پرچی آدمی ہے سب کام ٹھیک ٹھاک کر دیں گا۔“ جوا لا سنگھ نے اطمینان سے سر ہلایا۔
”اچھا تو کل شام کو چل بیٹا چاہیے..... سن لو پالی! اگر لی باز مدد نہ کھڑو کھڑو گھرداؤں کے لیے“
پالی نے مسکرا کر جواب دیا۔

”بے چکر رہو چاچا!“
”جوا لا سنگھ گدھ کے پردوں کی طرح اپنا کھس چنتر پھرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔“
”اچھا تو کل رات ہم وہاں پہنچے تو اصل کام کس رات کو کیا جائے گا۔“
”بس برسوں ہی — اور کب؟“
”ہاں بس ٹھیک ہے۔“

بالہ نے لقمہ دیا

”بیسے کام میں رہ نہیں کر رہی ہے۔“

یہ سن کر سب ہنس پڑے۔

پانی کے دستوں بٹنے، کشتے اور ذرا بکا ذکر بھی آیا لیکن اتفاقاً رائے سے طے ہو گیا کہ وہ اتنے اہم کام میں مصروف ہیں

کے قابل نہیں ہیں۔

لہجہ سانیس ہر ہی عینیں شاید نہیں اپنا اس سے بھلا زادہ اور ہاتھ تقسیم سے پہلے جب ان کا شہر بوندہ تھا۔ ان کا اپنا ایک چھٹا سا گھر تھا۔ اس گھر میں وہ وقت بھر چاندی کی چڑیاں بنی تھیں۔ پر دل کی ہر جتنیں پھٹکڑوں والی باریب بھی تھی اور دوسرے کے لیے بے بندھے گاؤں پر ہلاوت سے تھے۔ یہ زور و زور کے جہیز کے سی ٹوٹتے تو اپنے۔ مونا چھوٹا مہین کو خوش عینیں کی چاکری تو نہ کرتی تھیں۔ شام کو میاں کچھ نہ کچھ ہاتھ پر لاہرتا ایک بیاض ہونے لگا۔ میاں کی شادی رچانے کے سرا کوئی ٹکڑا تانے والی نہ تھی۔ مہی کی ٹنگی بھی کھاتے بیٹے گھر میں گردی تھی اور جب وہ پیدا ہوئی تھی میں اسی وقت سے جہیز کے نام پر وہ چار دانے روز کو ملک میں جمع کر دیتی۔ ڈاک کے بیانے ہونے تک اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی تھی۔ شادی کو ایک ماہ بانی تھا کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ جس کا بدھرمنا اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ بھی ٹھہرا چھڑا ایک قافلے کے ساتھ ہوئے۔ مہی کی بھاری کو ملک اور نیکو کی پٹلی میں داپنے داپے واقعہ مثل ہو گئے۔ راہ کی وہ وہ مشکلیں جھیلیں کہ مہییں آدھی رہ گئیں۔ کیمپ تک پہنچے تو بیٹے نے لوشلیا۔ شہر ہر کے کفن دفعہ ہر علاج پر گو ملک کا ایک ایک چیدہ چھڑ گیا۔ چند دن بعد زور بھی ساتھ چھڑ گئے۔ اس وقت سے زندگی گزارنے کے لیے کیسے کیسے جتن کر رہی تھیں۔ اس پر پٹی کی جوانی کی سل بیٹے پر دھری تھی۔ اس وجہ سے تو بس کیوہر منہ کو آیا جلتا۔

کھانا ختم ہو گیا۔ چھوٹے رتی سمیت کر وہ دھونے کے لئے بیٹھ گئی۔ اندامان برق سر پر ڈال کر چھرا اپنی ڈیوٹی پر چلی گئیں۔ چائے بنانے کا وقت ہو رہا تھا۔ کچ کر وہ اپنی بیٹی کو ٹھہر چھڑنے کی وجہ سے وہ پہر میں آگئیں۔ درمیں گئی شام کو چار بجے واپس آئیں۔ وہ مارا دلی تنہا پرے پرے اٹھا جاتی۔ ایسے میں کجنت جو میں بدھ بھی سرکستی پر آتے آئیں۔ وہ ٹھہرا کر کھڑی کے دروازے کے پاس جا بیٹھتی اور مٹا کے پردے کو ذرا سا سرک کر باہر جھانکے۔ کتنی قسم کتنی عینیں ہزار میں آتی جاتی دکھائی پڑتی۔ وہ بیٹھے بیٹھے ان کچھ کپڑوں کے سن اور قیمت کا اندازہ لگاتی۔ بہت سے ترانہ کپڑوں کے نام بھی نہ معلوم تھے۔ اند جانے ان دن سے پہلے کپڑوں کا کیا نام ہو گا۔ اسے بس کے برا حال ہو جاتا۔ اسے تو بس دوسری نام آتے تھے۔ آٹھ کا فٹہ اور دل کی پیاس۔

اماں کے جانے کے بعد وہ مٹا کپڑے سے جا گئی۔ چھڑا ہی ذرا گردن اچھا کر باہر جھانکی۔ سڑک کے اس پار نواری خالی بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ "حرام زادہ"۔ اس نے جلدی سے گردن اندر کر لی اور پھر کپڑوں کی لہروں میں ڈوب گئی۔ اسے کپڑے چھٹ پچھٹ کر اپنے جسم پر پیٹھے۔ لہجہ کی ٹھٹھٹ کے اندر سکڑنے لگی۔ ایسے وقت میں جو میں بھی کس قدر باغی ہو جاتی تھی۔ نقد کی دنیا میں کھلی نے بل چل چادری۔ مارتے کھیا ہٹ آکھوں میں آنسو آگئے۔

آج شام اماں ذرا جلدی آگئیں۔ انہوں نے اتنے ہی رتی کھنٹی پر ٹکا دیا۔ بدیوں کی پٹلی اور دال کا ڈبہ جو محلے کے پاس دیکھ کر اسے عجیب سی غمزدگی سے دیکھنے لگیں۔ وہ اٹھ کر آگ جلانے لگی۔ اماں نے مٹی کا دیوارشن کر کے طاق میں رکھ دیا اور پھر خود بھی چھلے کے پاس بیٹھ گئیں۔

"اندھیرے میں کیوں بیٹھی تھی، دروازے تو بند رکھا کر"

"مسی کی جنت ہے، اندر آئے کی تو مارتے دھوئیں کے آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ اس نے ٹھہر کر اماں کی طرف دیکھا۔

"ایسے ہی کر رہی ہوں، زمانہ خواب ہے"

"ہوں! کچ تو گیم صاحب نے بڑی جنت فاضلی دے دی"

"طبیعت خراب ہو رہی تھی۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی ناکھیں دبائے لگیں۔ کھڑکی کی ساری زمین مکھ

گھومے، وہی جبریا کرنا بھی ہوتا ہے جیسا کہ لیب ڈاؤن

”لیب ڈاؤن کی“ اس کا تصور سخت خدا مالا کی ایسی نظروں نے اس کی جان بھادی تھی۔

کھانا گرم کسے۔ وہ دونوں کھانے بیٹھ گئیں۔ باہر تھوڑی ٹھنڈی ہوا چلی رہی تھی۔ کہیں کہیں باد کے ٹوٹے اور تھپہر رہتے تھے۔ وہ منٹوں سے جلی جلی ہوا کے جھرنے اندر تک آرہے تھے اور دینے کی رو باد بارش کی تھی۔

کھانا کھا کر اماں اپنے بستر پر پک گئیں۔ وہ دیر تک چوڑے کے پاس بیٹھی آگ کر دیتی رہی۔

”ہاں رات ہوا تو ہو آگ نے قار کو دیکھے بغیر کما“

”جون! اماں نے جلدی سے آفسر پر چوڑے کو گناہ میں منہ چھپا دیا۔“ آپ تم بھی سرور ہو۔

وہ آٹھ گھنٹہ کی بستی بستر پر جانے سے پہلے کہ کھول کر باہر چھا گیا۔

”جیسے کہیں باد چھانے ہیں“ اس کی نظریں پڑاڑی کی دوکان پر پڑ گئیں۔ ساری دوکانیں بند تھیں۔ گھر کے کھانا سے بچھا کر

کھا رہا تھا۔ ”آواز دے کہاں ہے دنیا ساری جواں ہے۔“ بادوں دھیرے دھیرے دھک رہے تھے۔ اس نے جلدی سے وہ اندر بند کر دیا

اور اپنے بستر پر لیٹ کر کھینچ کھینچ کھانے لگی۔ جاتے کب بند آگئی اور خواب میں پڑاڑی دم سے آگوا۔ وہ ہر بار آگوا جاک پڑی اور پھر دیر تک

لا حول پڑھتی رہی۔

صبح نرنگے اماں چائے پی کر اپنے کمر پر چلی گئیں۔ اس نے بستر پر کچے کھنکھری چھاڑی۔ اپنے لیے دو دریاں اُلیٹیں اور پھر روز کی بیچ

مات کے پردے سے نکل کر بیٹھ گئی۔ کپڑوں کی سارا دیکھتے دیکھتے جانے کیسے اس کی نظریں پڑاڑی کی دوکان سے ٹکرا جاتیں۔ اس کو کھانا یاد اور

آکھ مارنا یاد آجاتا۔ اسے شرم کے سادی جان سے لپکنا آتی تھی۔ حرام زادہ ذرا اپنا منہ تھوڑے کیسے — وہ سر پہنے تھی۔ اس کے اپنے

میگسٹر کے گھر جیسے پل ہے، اس سے اچھی مکان ہے، اللہ نے کچ بچاؤں دکھایا ہے تو کیا سداؤں ایک سنہیں رہیں گے۔ آج وہ سوں کے کپڑے

”کتنی ہے توکل سے بھی ایسے جلیں ہائیں گے۔ کچ کتنی ہیں اہل کرگنوار اپنے میں توئی ایسے بھی بولا بکارتا ہے، بھرے بازار میں نقاب اُٹ دی ہاؤں

دھمکی کر دیا“ اماں کی جرات سے اس کی جان مٹی آج دنیا بات اس کے جی کو ٹک رہی تھی۔

دو اڑہ بند کر کھینچنے لپنگ پریٹ گئی۔ ”ان کپڑوں کے پیچھے عزت خاک میں ملا دی گئی ہے۔ اماں سے آکھ ملاکات نہیں کی۔ اب

تو اگر وہ دروازے پر بھی جائے تو لعنت ہے صورت پر۔

پڑاڑی دیر تک وہ چپ چاپ پڑی پنڈلیاں اور کمر کھاتی رہی، جب کوئی کام نہ ہو تو کھت جو میں بھی بیٹھا ہوا کھل دیتی ہیں۔ وہ کھنکھری

کی دیواریں چھاڑنے لگی۔ دروازے کے پاس کی دیوار پر پہنچی تو زنجیر کھل کر ذرا سا باہر چھا گیا۔ عورتوں اور لڑکیوں کا پردہ انوال کا حول ہنستا

برتا جا رہا تھا۔ وہ آنکھیں چھاڑ چھاڑ کر ان کے کپڑے دیکھنے لگی۔ جھٹک دیا تھوڑے سے گزرتا۔

بڑی دیر بعد جب وہ دروازے کے پاس سے ہٹی تو لمبی لمبی آہیں بھر رہی تھی۔ اتنی بڑی دندگی یوں ہی ترس ترس کر گزرتی گئی۔ کوئی یہ بھی

مینا ہے۔ کیا پتہ مجھے دن کب آئیں — اسے اپنے پس کواکھ فقہ یاد آگیا۔ اس دن اس نے غصا کی لڑائی کی خوشامد کے قیاس میں لی

تھی۔ کتنے ترسے ترسے بچوں پر تھے اس پر۔ اسی وقت کجنت خالص صاحب ادھر سے اُڑے اور اپنی لمبی کٹر ک پرتنگ دھڑنگ اچکتے دیکھ کر

اس کا منہ صاف کھنکھانے لگا کہ وہاں پھر تباہ اس کے آفس پر پہنچے تھے۔ اور چھینٹ کی ایک قیاس بڑا دی تھی۔ چھینٹ کی قیاس لگے سے وہ

وہ اس طرح کام کرتی رہتی جیسے ماں کی بات سن ہی نہ ہو۔ بیکراہت چھانے کے لیے درمیک اللہ کے سامنے مندر کرتی۔

ادھر کچھ دنوں کے بعد ماں بھی نظر آئیں۔ انھوں نے کوئی چٹپٹی بات بھی نہ کی تھی۔ وہ کچھ گئی کہ ماں بڑائی کے خیال سے رنجیدہ ہیں۔ اماں کے جانے کے بعد وہ سارا دن ٹاٹ کے پردے سے لگی بیٹھی رہتی۔ ہر گزیرے کو دیکھ کر سر جھپٹی رہتی کہ ایک جڑا تو ایسا بھی بڑا ہے گی۔ مگر مظلوم سارا جسم گم گم ہی بن گیا تھا۔

کچھ اسے پتہ چلا کہ اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ ہر بات غلط سمجھتی ہے۔ اماں سخت ہراساں نظر آرہی تھیں۔

کیسی بڑی برکتی ہے، دینا بھی ہے دیکھو یہی پوچھتا ہے کہ کیا کیا ملے گا، سلام کرائی میں بڑے کو سائیکل ملے گی یا نہیں، اور یہ اپنی طرف کے لوگ تو امد میں ہر نیت ہوتے ہیں جو چاہے اسے ادھر چھوڑ گئے ہیں تو اس کا چوگا وصول کرے یہ بتل گئے ہیں۔ ہمدردی تو اٹھ ہی گئی دنیا سے۔ وہ سر کوڑا کر آیاں بھرے گئیں۔ تو سچی بات تھی کہ ان دنوں انھوں نے ادھر ادھر کے کئی ٹھکانوں میں جھانکا، خانقاہوں میں اور بیرون کوٹھانے کی کوشش کی مگر سب بے سود، بچاری بیگم صاحب کو بھلا کب خدمت تھی ان ٹھکانوں کی۔ وہ تو بس کئی کئی دنوں کے ان دشمنوں کی سترن بنا دی گئی تھیں۔ اماں کی ان باتوں نے اس کا کیمبر بولا دیا۔ اسے وہ تو چھپے چھپائی تھی کہ کچھ ابھی نہ ہو گا۔ بیگم صاحب اپنے پیش میں بھلا اسے کہیں نہ دیکھیں گی، کبھی اپنا پرانا ریشمی جوڑا تنگ تو نہ دیا پہننے کو۔

رات اماں کے ساتھ کھانا بھی نہ کھایا اور دیوں ہی بستر پر آگئی۔ ساری بادل دھمک دھمک کر رہتے رہے اور اس کا کیمبر مٹی جونی کی طرح بٹنا رہا۔

رات نوازش سے ٹاٹ کا پردہ ایک طرف سے پھٹ کر نکل گیا تھا۔ آج جب وہ بڑی اُداسی سے دنیا کی گھما گھمی کو دیکھ رہی تھی تو بڑی بے اعتنائی سے پوری گردن، ہر کمال دی، پھر کھڑے ہو کر پورا دیل پردے کے باہر چھیل دیا۔ پڑاؤ سوٹ کا ہیکل سے فرصت پا کر گام تھا۔ وہ بڑے زور سے کھٹکھٹا اور پھر ہانچ کا نوٹ لاتے ہیں کہ ہوا میں لہرانے لگا۔ وہ جلدی سے اندر ہو گئی۔ پڑاؤ کی سوائے کسی نے بھی نہ دیکھا تھا۔ ٹرک پر گزرنے والے اس کے دھڑ سے کسی قدر بے خبر تھے۔ انھیں پتہ بھی نہ تھا کہ ایک بے چین جی دنیا میں چھکنے کو تڑپ رہا ہے۔

درد وازے کے پاس سے بہت کر دہا بھی کھڑی ہی تھی کہ پڑاؤ کی اپنا سفید تہ بند لہرانا اس کے درد وازے کے پاس سے گزرا۔ ٹاٹ کے سرورخوں سے اندھا لگا اور پھر اس کی گلا میں لپٹا ہوا چلا گیا۔ وہ جیسے اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی۔ لمبی لمبی سانسیں پسینے کے پرچے اڑائے دیتی تھیں۔ بڑی مشکل سے وہ آگے بڑھی اور وہ وہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔

دوسرے دن درد وازے صوف اسی وقت کھلے جب خال گھریں آئیں۔ آج کل وہ اسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ کتنی الفت میں اور کتنے عزت کے واسطے تھے۔ ان کی آنکھوں میں۔ وہ کیسی دلی دلی مہم جو تھیں کچھ نہ کر سکنے کی حسرت آنکھوں میں سنگ رہی تھی۔ حال اس عالم میں دیکھ کر بڑے غمزدہ سے سر جھٹکتی۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ وہ کبھی بھی ایسی نہیں ہو سکتی۔

دو تین دن درد وازے بند رہنے کے بعد پھر کھل گئے۔ وہ ٹاٹ کے بنے ہوئے پردے کے پاس لگ کر بیٹھ گئی۔ ہنسنے کی بہت جگہ اندازنے کی۔ وہ پردے کی اوٹ سے باہر جھانکنے لگی۔ خالق اس سے منہ موڑے جیسے بے تحاشہ گزری چلی جا رہی تھی۔ کیا دیکھ رہی ہو جان، میں کیوں نہ پاتی ہو؟ ٹانگ لکھتا ہوا پڑاؤ ہی اس کے سر پر کھڑا تھا۔ وہ لڑا کر کھڑی ہو گئی۔

”یہ تم کو نہیں دیکھتی، میں تو پتھر سے دیکھ رہی تھی۔“ وہ بڑی مشکل سے بولی۔

”تم بھی یہاں ایسے کڑے، میں دیکھ رہا ہوں کہ اس نے اپنی ایک موٹیر پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے جلدی سے دھڑا دھڑکا دیا اور ہنگ پر گراؤنی سیدھی سانس لے لی۔ اس وقت وہ کچھ بھی دیکھ سکتی تھی۔ شام کو سب لائیں قرآن سے نظر ملاتے ہوئے کترار ہی تھی۔
 دوسرے دن دروازے پر بند ہو گئے۔ وہ بھی بھلانے کے لئے کھڑی ہوئی زمین پر گلی مٹی پھینتی رہی۔ دوپہر میں دروازہ کھٹکا اور اس کے کھانے کے خیال سے خوش ہو گئی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ پڑاؤ کی ایک کاندھ اٹھ گیا۔

”میری ہانچیں نہیں پڑا، دیکھا دیکھ کر اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ اس کی طرف بڑھا۔ اسے عکس ہو کر دھچکا جگ سے ابھی نہیں سکتی پڑاؤ کی ہانچیں سے بیٹھ گیا۔

”میں نے تمہارے لیے پڑاؤ بچاؤ کی پیاس کا سوٹ سلایا ہے۔ دروازے سے کدھے کو کھانسی سے ”وہ اسے بھینپے جا رہا تھا۔
 اس میں جانے کہاں سے جان آگئی تھی کہ اس نے کدھ کو کھانسی سے کھڑی ہو گئی۔

”جاؤ نہیں تو میں چمکوں گی“
 ”ماشوقوں سے ایسا سلوک نہیں کرتے۔۔۔۔۔ وہ ہنس۔۔۔۔۔ کل پوڑا ایک آؤں کا پھر تو خوش ہو گی؟ وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

دروازے بند کدھ جیسے بے ہوش سی اپنے جنگ پر لگ گئی۔ جسم میں جانے کتنے تیز دھچکاتے تھے۔ اس کے کانوں کے گھٹنے کی ٹپ سے رات کو سنے میں پڑاؤ کی کھانسی کا زور تھا۔ اس نے پیاس کا سوٹ اس کے جسم پر پھینکا۔ وہ جھٹکتے ہیں بار بار چمک پڑی۔
 صبح اٹھانے کے جانے کے بعد اس نے بڑی احتیاط سے دروازے بند کر کے جو تھکے برتن اسی طرح پٹے ڈھک دیے تھے۔ بستر کے پڑے تھے۔ کسی کام میں جی ڈگ رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر منہ دھو کر کھانسی کی ادویہ ڈالتی۔ بعد آٹھ گھنٹوں میں دم دار کا بل لگایا۔ اسے بار بار خیال آ رہا تھا کہ اگر اس وقت اس کی پیاس کا سہرا اس پر نہ لگتا تو اسے ساری زندگی کی حسرت آج اس کے چہرے پر چھپکا رہ کر بس یہی تھی وہ سر جھکا کر پڑھی پڑھتی۔ جو تھیں بھی تو کچھ جانے کیوں بری طرح بے کل ہو رہی تھیں۔

”میں نے بیٹھے وہ اٹھی اور کڑی زنجیر کھول دی۔ ایک ذرا اسی گردن اس کا باہر چھانکا۔ پڑاؤ کی دکان پر کئی گاہک کھڑے ہوئے تھے۔ دروازوں کیوں ہی جھیر کر پھر پڑھی پڑھتی تھی۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ولی کی گفتار کیسی بے دھچکائی ہو رہی تھی اس پر دماغ ایک دم سن۔

دوپہر ہوئی تو عجیب سا سناٹا چھا گیا۔ جھڑے ہوئے دروازے آہستہ سے کھلے پڑاؤ نے اندر آ کر زنجیر چڑھا لی۔ وہ اپنے اٹھ میں ایک بیٹی پر گرنے لگا۔ وہ ہنستا ہوا اس کے پاس آ بیٹھا۔ پوٹلی کھول کر ولی کی پیاس کا سناٹا چھوڑا اس کی گردن میں ڈال دیا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے پڑاؤ کی طرف دیکھا اور پھر کپڑے دوڑاؤں سے دھو کر کھڑا ہوا۔

”پس دیکھا تو میری بانی! وہ اس کی طرف کھٹکا جا رہا تھا۔“
 ”وہ کی جھیر غلام دہوں گا۔“
 ”اٹھ سے کھانا!“

”وہ ڈھکوں گا ابھی تو تڑپاؤ“ پڑاؤ کی فی البدیہہ پڑاؤ کی قیمت وصول کرنا چاہتا تھا۔ اس نے خود کو پھڑپھڑانا چاہا۔
 ”تمہیں مجھ سے محبت نہیں، لاؤ پڑاؤ سے دو میں جاؤں۔“ پڑاؤ کی غصے میں بڑبڑایا۔ ”محبت کے ٹھٹھٹھ کر کے“ اس نے پڑاؤ

کی طرف بڑھ گیا۔

میں امان سے آرام میں قائم رہا اور مجھ کو اس نے پہنے پہنے سے جینے لیا۔ نراری بڑے غصے سے مسکرایا۔
"وہ تو سب بعد ہی ہو گا۔ نراری اس کی طرف بھاگا۔ جو اس کا گدے سے زمین پر گر گیا۔

نراری کے جانے کے بعد اسے شرمندگی نے غرور کی دیر تک دتی رہی، پھر آفسر پرچہ کرنے جڑے کو دیکھنے لگی۔ نئے بچے کے گالوں
کلیج نرم مسجاند کی کڑوں کی طرح چمکتا ہوا رہا۔ وہ جیسے سب کو جھل کر جلدی جلدی چوڑا پھینے لگی۔ مارے کپڑوں سے درست ہو کر اس نے آئینہ
دیکھا۔ شیشوں کے ڈھپے کی گھر گھٹ اتنی ہی برقی کا آئینہ چھپ گیا۔

شام میں برقی مٹی اس نے چونک کر جلدی سے کپڑے تبدیل کیے اب اسے رنگ تازہ ہی مٹی کو ان کپڑوں کو کھانا چھپائے۔ اگر امان نے
دیکھ لیا تو۔ شرمندگی کا احساس اس کے کیچے کی طرف لیکنے لگا۔ کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے غور سے توکر کے اپنے بستر کے گدے سے
چھپا اور جو مٹے برقی صاف کرنے بیٹھ گئی۔

رات جب امان کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی تو انہوں نے غور سے اس کی طرف دیکھا
"کیا دقتی رہی تھی؟ امان نے زالا پھیر کر پوچھا اور لمبی سی آہ بھری
"نہیں تو"

انہوں نے آہ کھانا چھڑ کر اپنے بستر پر لیٹ گئیں اور ایک کروٹیں بدلتی رہیں۔

پانچویں چوڑا اس کے دل کی دھڑکن ہی لیا تھا۔ ہر وقت دھڑکا دھڑکا کر کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ کہیں امان اس کا بستر پر بیٹ دیں۔ ہر
وقت غور مند رہتی۔ خوبصورت چوڑا ہر کاشے کی طرح چھپا ہوا تھا۔ دوپہر میں جب احتیاط سے دروازے بند کر کے چوڑا پہنچی تو شرمندگی کا احساس
اٹک کھلے ہوئے لگتا۔ دھڑکنی دلوں سے مفاہات کے پردے کے پاس بھی نہ بھیجی تھی۔ دل بھلانے کا یہ سالانہ بھی نہ تھ سے گیا۔ وہ تو اس خیال ہی سے
کانپا ہنستی کہ کہیں نراری سے انھیں چارہ ہو جائیں۔

وہ آہستہ آہستہ دیکھ رہے تھے۔ خزاں نے صحن کے چھوٹے سے درخت کو باطل لٹھ منڈ کر دیا تھا۔ جب اسے کوئی کام نہ رہتا تو باہر
کے دروازے کو ایک نظر دیکھ کر جوڑا پہن لیتی۔ کٹھن کے اندر ذرا دیر کر بہاؤ جاتی تو شرمندگی اٹھنے کے درخت کی طرح لٹھ منڈ اس کے سامنے آکر نہ
ہوتی۔ جوڑا اب تنہا کھانا چھڑ گیا تھا۔

اس صبح جب امان جا رہی تھی تو ان کو دکھا ہکا بننا ہو گیا تھا۔ جاتے ہوئے کئی مٹھیں کو دوپہر میں چھپے کر اٹھ گئی، است امان
کی ٹکر ہو رہی تھی۔ کہیں بننا تیز نہ ہو گیا ہو۔ راہ دیکھے دیکھتے تھیرا پھر ہو گیا تھا۔ آج بہت دن بعد وہ گھر پر دوسے سے باہر جھانکنے لگی، شاید وہ
سے آتی برقی امان دکھائی دے جائیں۔ جھانکتے ہوئے اس کی نظر مکان کی طرف اٹھ گئی۔ نراری کا کمرے کے کچے کہ اس کی طرف دیکھنے لگا اور
پھر زور سے ہنسا۔ اس کے گاہک بھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ ہلا کر اندر ہو گئی۔

پراخ جلتے امان آئیں تو ان سے لپٹ کر پھوٹ پڑی۔ دوتے دستے سسکیاں بندھ گئیں۔

"مجھے اپنا ساتھ بے جلا کر دو۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔

"وہاں رہی پگلی، اب تجھے وہاں کیسے بے جلا کروں، وہاں صاحب کا امداد رہتا ہے، بیگ صاحب اس سے بات کر رہی ہیں۔

پچاس روپے پانچ سو تانبے اور تانبے سے چھل خیرتے ہیں اماں اس کی طرف سے مزید کر جیسے اپنے آپ سے کرتی تھیں۔ حدتے جانے کو بھی جانتا ہے۔ خدات کی راہ سے تریا نہ آؤ گئی۔ اس نے اماں کو خالی خالی نظروں سے دیکھا اور چرچلے میں آگ جلاتے بیٹھ گئی۔

پنوار می کے تھپنے سے اندوگڑل سے اشارے کرنے کے بعد سے پھر اس نے چڑا نہ بیٹا جب خدمت ہوئی تو یوں ہی اسے نکالی کر دیکھتی اور رکھ دیتی مگر وہ دیکھا پچاس کے لیے کتنا اذیت ناک ہوتا۔ کبوت پر اڑی دانستے نکالے اس کے سامنے آکر ہوتا۔

آج جب دوپہر بالکل سناں ہو گئی تو اس کے کتے بچے سے چھٹا نکالا۔ چند منٹ تک اسے چھوٹی رہی بعد چرچلے میں سے ہیں کو کھڑی ہوئی آئینہ دیکھتے ہوئے اس کو کھٹکھٹ می برتی گئی، چہرہ سر جھکا کر دیکھ گئی چند منٹ بعد اس نے تیزی سے اپنے کپڑے پہن لئے جوڑے کو کاغذ میں لپیٹے ہوئے اس کے اٹھ کا پ رہے تھے۔ کھڑی سے رتخ آمار کو اڑھا۔ پھر باہر جھانکی اور بندل کو بٹل میں دبا کر چلے گی سے شرک پار گئی۔

وہ پنوار می کی مکان پر چپ چاپ کھڑی تھی۔ وہ اس وقت خالی بیٹھا فلمی کیٹوں کی کتاب پڑھ رہا تھا۔

• اور چڑا چاہیے! نوؤ دیکارہ ہو پاؤ۔ اس نے ناک سکڑی۔

• میں تیرا جزا دینے آئی ہوں۔ اس نے بندل بازوں کے تختے پر رکھ دیا۔

• اری مجھے کیا کرنا ہے، اپنی جڑا وہی نہیں جو پہنے گی، اسے جانا پنوار می رکھا سا گیا۔

پھر اس نے منہ پار سے اپنا چڑا میرے ہم کر نہیں لگاتا۔ وہ رنج اور غصے سے رو پڑی۔ توگوں میں میرا مذاق اڑاتا ہے۔

یہ تیزی سے مڑی اور اپنی کوٹھری کی طرف بڑھ گئی۔

دوپہر کی کوٹھری کتنی دیوان ہو گئی تھی۔ یہی سہی، رات بھی پنوار می کے تختے پر بیٹھ آئی تھی۔ کوٹھری کے دروازے بند کر کے پھوڑا سے صحن میں پیل ٹی اور ٹولی برتی کھاٹ پر لیٹ کر ہوا سے ہتی ہوئی بناریوں کو دیکھنے لگی۔ اب وہ اس طرح ہوتی کوئی نظر اڑ رہی تھی جیسے اس کے بچے کچھ بھی نہ رہ گیا۔

جس بڑے کو وہ اتنی ہے وہ دی سے پنوار می کے تختے پر بیٹھ آئی تو اب اس کی یاد بھیجے کی برل بن گئی۔ جو میں پھر سے برکشی یا آمادہ ہو گئی تھیں۔ اور جب وہ جوڑے کی مالک بنی تھی اسے خیال ہی نہ رہا تھا کہ ان پریدہ کپڑوں میں جو میں آؤا دیں۔ اب وہ راتوں کھاٹ پر لیٹ پڑے کو کھٹکھٹ کر دیکھا کرتی رات مرنے میں اسے محسوس ہوتا کہ جوڑا گدے کے نیچے چل رہا ہے۔ وہ چونک کر اٹھ جاتی۔ اماں کھٹکھٹ کر کرکٹ بلیں تو چپکے سے منہ چھپا لیتی۔

کسی دن یوں ہی گزرتے گئے۔ وہ کوئی کوئی پھر کرتی۔ شام کو اماں اسے نیچے نیچے نظروں سے دیکھ کر کھٹکھٹ آہیں بھرتیں۔ انہوں نے دوسری بار صاحب کے اردلی کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس نے زکونی بار اماں کی طرف اس طرح دیکھا تھا جیسے پوچھ رہی ہو۔ کیا ہوا، صاحب کے اردلی کا کہیں اسے بھی تو سلام کرائی میں سا بیکل نہیں چاہیے؟ اماں ان نظروں کو دیکھ کر کھٹکھٹ کاٹھیاں۔ اب وہ کیسے کہیں کہ اردلی بھی ان کے جھانسنے میں نہیں آیا۔

وہ بھی کھاتے پیتے گھروں کے خواب دیکھ رہا ہے۔

آج رات جب اماں کھانا کھا کر اپنے بستر پر لیٹ گئیں تو کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دو تھے رتن صاف کرتے ہوئے اٹھ مدک کر بیٹھ گئی۔ اماں اٹھ کر دروازے کی طرف لپکیں اور مزید کھٹکھٹ کرکٹ کے پردے کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ باہر پنوار می کی آواز آ رہی تھی اس کا جی چاہا کہ پیچ پڑے۔

اماں جی بے وقوف اندک پر لے رکھا، اگر شتہ منتظر ہو تو صبح کھلاؤ دینا۔

ہو رات کی پٹی بندھی میں اماں ول کی پیاس کے نارنجی چورے پر چھلک ہوئی تھیں اور وہ سر جھکائے رتن رگڑ رہی تھی۔

تاریک صلیب اور زرد چاند

اے حمید

اور پھر لوں جو آویں گئی تے مینے کی ایک رات کو جبکہ لورہ چاند سبز آسمان کے وسط میں چمک رہا تھا اور آدموں پر سُرخ آہی تھی اور محلِ نضائیں اُڑتے جاتے تھے جوڑے سویت پیر اور میوں کے دس وار پھولوں کی خوشبو سے موش جوتے جا رہے تھے وہ تجھے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اُس نے جانے بانی اور ہم چھوٹے سر کرے میں بیٹھ گئے۔ یہ ایک منزلہ سرخ مکان کو اڑکی طرز کا تھا اور شر سے باہر ایک سوکھی ہوئی دیر لکھائی کے پاس واقع تھا۔ کچے ٹکس این ٹیم کا ایک گنا پتھر تھا جس کی تہیوں پر پھول اُڑ رہے تھے۔ ایک طرف کونے میں اندھے پڑے ٹوکے میں مرغیاں بندھیں۔ کسے کسے اُٹھتی ہوئی بھاریوں پر گرد پڑی تھی اور ہانڈا دھانڈے کمرے میں اس کی بیاباں اور بہن بھائی سو رہے تھے جس کمرے میں ہم بیٹھے تھے وہاں چھت پر ہم سب روشن تھا اور سیل کے باہر دیواروں کی سفیدی وہ ایک جگہ سے اکھڑ رہی تھی۔ رانی وضع کی اُسام کرسیوں پر دھول کی تہ۔ جی مٹی اور کٹڈاں پر فریم میں سجی ہوئی کچھ تصویروں کے درمیان چند ایک کتابیں لٹی سیدی پڑی تھیں پاس ہی ایک کالے رنگ کا میلا سا کھدک ہادی چھوڑے سے بھرا ہوا تھا۔ میز پر کچھ نئے اور پرانے اُکڑی رسائے گھر سے جڑے تھے۔ چنگ پر سبز لحاف کے اوپر کوڑے کا ایک بادامی پتلون بے خیال میں چھپا کر رکھا تھا۔ گھر کی کچھ دیواروں پر کھائی کی جانب بٹھکتے تھے اجداد سے آنے والی خشک ہوا بیرونیوں کے چھوڑے اور بزرے کی مٹک تھی۔ سائے و خروش کے تنوں میں سے ترکاریاں لے لیتے اور دُور ٹاپیروں کے جھنڈ بھر لورہ چاند فی میں سناٹ دکھائی دے رہے تھے کسی وقت انہی درختوں کے جھنڈوں میں کسی ہوا زور کی آواز اس آواز اپنے پیچھے ایک دیوان سننا جھپٹتی ہوئی گونج جاتی۔ میرے دوست نے گریٹ جلا کر پالکیوں میں چائے اُڈائی تو نغما میں اس کی تازہ منگ لکھائی۔ میں اُسے ہوس کر کھانسی کی بُرت غلط ہو گئی۔ رات بڑی چپ چاپ تھی اور ہر طرف ایک جادو بھری، کچھ کتہری، کچھ سنسنی، گہری خاموشی طاری تھی جس میں بھی بھی۔ ہر چہ زریوں میں چھپ کر بولنے والے جیسے کھنکھول کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ چائے بنا کر اس نے ایک کھوکھو لیا۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کالے کھنکھول سے پاس جا کر باسی چھوڑی پر زرمی سے ہاتھ پھرتے ہوئے بولا۔

میں نے گلا زور دی کی کہانی صلیب کا درخت ضرور پڑی ہوگی اور تمیں اس کی امیر و تن میں بھی یاد ہوگی۔ نیگی۔ یہی اس کا نام تھا۔ کالے بالوں اور غلیظ آنکھوں والی باریب طرکی جو اپنے نسووم بہن پرانیوں کے ساتھ دھاتی مکان میں جیتی تھی جس کے عقب میں صلیب کے درختوں کا پُرانا شاخ تھا اور جسے اُس کے بیرون مجھ نے اپنی بار بزر دھوان سے نیچے اُڑتے دیکھا تھا اُس گہری اٹھائی ہوئی مٹی اور کالے بالی ہوا میں اس کے ہاتھ پر لہرا رہے تھے۔ ماسخ نے پوچھا۔ یہاں رات بسر

کرنے کو کوئی جگہ مل جائے گی، لیکن پتہ سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا: یہاں سے تھوڑی دور ایک چشتر ہے وہاں عمارت کھڑی ہے۔
ساتھ گئے۔ وہاں میری امی اور تباہیں اسدیک گائے بھی ہے اور ہم آپ کو چاہتے..... اور پھر ایک شام اسی دیہاتی مکان کے باغ میں
وید کے ساتھ ٹھہر کر مہمانے لیکن سے کہا تھا: جب سہوہا میں تو رات کو یہ بچہ روٹا بیچے گا۔ اور پھر ایک روز لیکن اسی رخت کے نیچے چھپنے
کے لیے وہاں میں مرنے پائی گئی تھی۔ اس کے سر کے سین اور پیچروں میں منہ سے پھوول کا ایک روٹا لگا رہا تھا۔ اس کا چہرہ کسی ننھے بچے کے چہرے
کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ مرنے سے پہلے اسے سب کے شکرت کی چھری کی منہ نہیں سے لے گئی تھی جیسے اُس نے ہاتھوں پر لگا رکھا
تھا.....

میری محبت کا بھانم بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ قرن مرنے آتا ہے کہ مجھے کہیں سے سب کے شکرت کی منہ نہیں مل سکی اور میرے
سہوے پیچروں میں منہ سے پھوول کا روٹا نہیں آ سکا۔ میں نے بھی جب پہلی بار اُلویہ کو اونی اس میں سے مال روٹا روٹتے اور پتہ
پر اپنی طرف آتے دیکھا تھا تو وہ مجھے بالکل سببیں ہی لگی تھی۔ زردی مال کی گندی سا رنگ، دور یا جسم، نہ پاؤں، نہ لب شک، سر کے چونک
نگل ہوئی ہاریک، رنگ، ہلکے بھورے بال، چین کر وہ مجھے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے بیگے رخت کی ہر دوں پیچروں سے بھری ہوئی ڈگری
اٹھا سے سر غرار کی دھالوں سے پیچھے اتر رہی ہو۔ مال روٹا ایک چھکنے میں ایک پرائی پر سکون داوی ہی تبدیل ہو گئی۔ زمین بزرے اور پھوولوں سے
ڈھک گئی اور کھرا ہوا ایلا آسمان پر بڑوں کے داگ سے ٹوٹ اٹھا اور ہواؤں میں شکر کی خوشبو لگئی اور میں ابھی لیکن سے آگے بڑھ کر کچھ پوچھنے
ہی دلا تھا کہ ایک ٹر بڑوں دیتی ہوئی گر گئی۔ اب لیکن اُلویہ میرے قریب آ گئی تھی۔ اپنے آپ میں لیکن اور خاموشی میں ایک ایک قدم اٹھاتی
جیسے پھولوں پر چل رہی ہو۔ میں پیل کے رخت کے ساتھ میں گھڑا تھا۔ اُلویہ نے سب سے گدڑتے ہوئے ایک پیل کے لیے اپنی پکلی اٹھا کر
میری طرف دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ دھاسا سکا آئی ہو۔ یہ مسکراہٹ بڑی حیرت انگیز اور خوش تھی۔ اس میں کوئی بھولا بھرا حرا یا دولا نے
والی کیفیت تھی۔ میں نے دیکھا کہ اُلویہ کے گالوں کا اوپر کا حصہ نکلا ہوا تھا اور پھر سے خشک بال چمک رہے تھے۔ فادرل سیٹ کی اداس دمک
کانیز سانس میرے ہونٹوں کو کھینچ کر لگایا۔ تیرا گرچہ کسان کی کھن رٹکی تھی لیکن اس کی چال میں یہ قدیم سنہنٹالی شہزادوں، لہجہ و تقارور بائیں تھا۔
تھوڑی دیر جا کر وہ اس گلی میں گھر گئی جو ہماری ٹھکانے کے عقب میں پرائیوٹ کمپنیوں کے دفتروں کی جانب نکل گئی ہے۔ میں اپنی کتابوں کی
دکان کے شوروم میں واپس آیا۔ مجھے اس دکان میں نوکری کرتے دو سال ہو کر رہے تھے مگر آج تک ایسی کوپن رٹکی کو نہیں دیکھا تھا۔ میرا
کام صبح سے شام تک یہاں شوروم میں لگا ہوا تھا۔ آخر مقدم کا اور انہیں ضرورت کی میرا کتاب اور رسالہ وغیرہ ہم پہنچا ہے اور اس دوران میں
کچھ بڑے چھپن اور غیر کچھن رٹکیوں سے رابطہ پڑا ہے لیکن میں نے ایسی راز بھری مسکراہٹ، ہنسی سمیٹنی، انہیں اور سنہنٹالی شہزادوں کی ایسی
پرتو نمکنت شکل پیشانی نہیں دیکھی۔ جیسا کہ تم جانتے ہو میں فطرتاً شہزادوں میں آئیں۔ آج تک سبھی گفتگو کے سر کبھی نہ رٹکی سے کل
کربات نہیں کی۔ سلاہہ بریں میرے حالات ایسے نہیں ہیں کہ میں رٹکی سے کل کربات کر سکوں۔ اُس نے اظہارِ عشق کر سکوں۔ میرا پاپا
مرچکا ہے۔ ماں دائم المرض ہے۔ دو جوان بہنیں کروری بھی ہیں۔ بادامی باغ سے ہر روز سائیکل پر آتا ہوں اور سائیکل پر ہی واپس
جاتا ہوں۔ ہارٹس ہوا یاد تھی، مجھے اس شوروم میں آنا ہی پڑتا ہے۔ ان حالات میں کوئی کیا عشق کرے گا؟ اور پھر روزانہ دس پیل سائیکل چلا
سے نو مشن دے دیے جی تم ہر جانا ہے۔ اس کے باوجود اُلویہ کو ایک نظر دیکھ لینے سے میں اپنے آپ کو کھو بیٹھا تھا۔ اور اُسے ایک بار پھر
دیکھنے کے لیے خود بخود بس ٹاپ پہنچ گیا تھا۔ یوں عروس ہوا تھا جیسے اُلویہ کی تخصیص کے تمام رنگوں میں سب سے الگ اور سب سے

نیلان ایک ایسا رنگ نظر آگیا ہے جو میرا پانا رنگ ہے۔ وہ ایک ایسی قدیم اور پراسرار خوشبو ہے کہ میرے قریب سے گزر کر کسی تھکی جان کی دہریش لہروں
 میں میرے چہرے پر دور، ہر زندگی کے الم، درد، خوشیاں، محبت، اور تجویز، اندیشوں پر شیدہ محبت، ایک دل شکستہ، پھڑکی ہوئی، خزانہ آلود
 گودی والی ہونی ویرانی، شناسا، اجنبی، کچھ لگتی، کچھ یاد دلاتی کچھ اداس، کچھ مسکراتی ہونی پر اسرار روح کی مانند جو ایک دلیگزہ جھکر پاس سے گزر
 جائے اور انسان صحن چوڑا بنے میں یہی جہت زدہ اندھیدیت زدہ ہو کر جا جائے جیسے اس نے خدا کی آواز سن لی، ہر قسم انسانہ مفاد ہوتا ہی میری
 باتوں پر غور اور کسی دماغ سے اس کا مذاق اڑاؤ، لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا، کہ کوئی شے، کوئی غیر مرنی ناقابلِ تخیل شے ہے جو مجھ سے کچھ
 ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں سال پہلے پھر گئی تھی۔ خدا ہونے لگی اور جو مجھ سے کسی دوسری روپ میں ایک بار پھر ملنا چلتی ہے لیکن نہیں مل سکی، نہیں
 مل رہی تھی کبھی کہیں کہیں، مجھے اس کی جھلکیاں ہی ملتی ہیں، سامنے سے نظر آتے ہیں۔ سرگوشیاں ہی سنائی دیتی ہیں، آہستہ کی آہستہ ہے اور
 دیکھتے دیکھتے کوئی نئی پرہ و میان میں آکر گر آتا ہے۔ یاد آ کر پھر ہی ہوتی ہے اور ایک بار پھر جدائی کا سند، وحشی اور بھاگ اڑانا،
 غضب ناک سند، حال ہو جاتا ہے تم اس شے کو اس گریز چارمین ترین ذرے کو ایک خشک، دیوانی اور بے رنگ آدمی سے قید کر دے سکتے
 ہو۔ ایک ایسی آواز — جس کی کوئی صدا نہیں، کوئی لے نہیں، جو کہ زندہ مرنے کے نیم خوابیدہ، نیم فراموش مندوں کے گرد آلود، تھوڑا
 سے اھرتی — ندم جگہوں کے غریبہ و خوشی کو اپنے کھر دے زخمی ہونے سے چھپتی، بال پھیلاتے اور ہنر ہے داغ اور لہر لہان
 ریا جم لے قرآن و فرقان سے آوارہ اور بے خفا ہے جس نے ہزاروں سال پہلے تاریک و دھندلے میں چھپے ہوئے تھوڑے تھوڑے کی مرمریں شیں
 نشیمن میں تھکی ستروں والی برہن راہکاروں کو جلی و اھل و گول میں اپنے عاشقوں کو اٹا لے کرتے اور جھٹی غلاموں کو بچیدہ غلام گودن
 کے اندھیروں میں بھٹ کر اپنے پھر شہنشاہوں کی پشت میں پرست کرتے اور جھلان دھو کر منڈل ہاتھ میں لیتے شہر و حل کے دروازوں
 پر جھبک مانگتے دیکھا ہے یہ اٹھتی، درد پھری، اپنی تیز خوش بندوں والی صدا، آدمی رات کو جب چاند کہیں نہیں مہتا اور ہری ہری پتلی
 پر بارش کی گرم گرم ہندیں گرتی ہیں جب نایل اور تار کے گھیرے جنگلوں میں تازی کی دھن پھری خوشبو پر اسرار اندھیروں کو زیادہ وحشی
 بنا دیتی ہے تو یہ میری تلاش میں اپنے گھر سے نکلتی ہے اور کیسے باؤں پر اپنے گھر کے حنائی باؤں دھن پھر کے دروازے سے منہ لگاتی
 مجھے اپنے پاس بلاتا کرتی ہے۔ جب بارش والی راتوں کو کیسے مکانوں کی جھلکی منہ حیروں پر اٹکا جو اگلا اس اپنے بے رخ چھل چھپا لیتا ہے۔
 اور محبت کے دکھوں کا جہنم اپنا دکھتا ہوا منہ کھل کر مانگنے لگتا ہے اور جسم کی ساری ناقص لذتیں، بے ثمر بارشانی کے سائے، حلال اپنی اپنا
 علم، لغزیتیں و درکیندیاں اس آگ میں جل کر جھم جھم جاتی ہیں اور آتما کا ایک نیا روپ، ایک نیا سرا، ایک نیا سنگا جہنم لیا ہے۔ تو یہی صدا
 یہی آواز — اس آگ کے سر شے، شے کی ہر زبان میں سناتی، بھپکتی، لپکتی اور دوستی محسوس ہوتی ہے اور یہی وہ آواز تھی،
 یہی وہ شہد تھا جسے ٹوٹے ہوئے سر کی بازگشت، مجھے آئینے کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ یہی وہ پرانی عمل سر لڈوں کی بستی خلوت کا ہون
 والی خواب، ناک خوشبو تھی جس کا ایک رنگ، فارول سینٹ میں مل کر چھپ چھپ کر، سب کی نظروں سے بچ کر، میرے منہ سے چہرے کو تیز کیلا
 بن کر کھچتا ہوا گز گیا تھا۔

دوسرے دن میں نے اسے پھر دیکھا۔ میں بس ساپے ذرا ہٹ کر ٹیل کے پیرتے جا کھڑا ہوا۔ جھبک زجکرتین منٹ پر ایک
 میں آکر رکھی۔ اس کا دروازہ کھلا آلودہ نیلے رنگ کی ایک ٹوٹ بک اور پرس و پھ میں ہے، لہر انیت کی تمام دلکشی کے ساتھ، سرد
 بھلائے خاموش قدم اٹھاتی اپنے دفتر کی طرف چل پڑی۔ پہلے روز کی طرح آج بھی اس نے ایک پل کے لیے مجھے دیکھا اور فوراً اٹھ کر جھبک
 لیں

مجھے ایک ہر چہرہ میں عیسے وہ آنکھوں کی آنکھوں میں بڑی دلچسپی اور اسے مکرادی ہو۔ اس مکرابست میں نہ تو بام مہبت تھا نہ ہمت
 عشق نہ شرم نہ ہی اندہ شہادت، لغت حق نہ حشرت — میں ایک بے نام سا عواں تھا۔ یاد دہانی کا۔ قتل اور خود اطمینانی کا
 جیسے کہ وہی ہو۔ میں نہیں جانتی ہوں۔ تم وہی ہونا، جس نے ہر در میں بخت پائی ہے اور ہر صدمہ میں حتم لیا ہے۔ جو شہزادہ
 بن کر پیدا ہوا ہے اور کھڑا ہے کہ لگا لگی چکر گزیر کرنا ہے۔ جو کا تھل پر اس طرح چلتا ہے جیسے چھل میں، جو پھولوں کو اس طرح پیارتا
 ہے جیسے اُس کے بچے ہوں اور جو بچوں سے اس طرح ہنس کتا ہے جیسے اُس کے اپنے بازو ہوں، ہاتھ ہوں، ہزاروں ہاتھ ہوں، آنکھوں
 ہاتھ ہوں، جو کہ اب گزیر و حیات جمعیت نہا ہے اور کھٹک شادی کے متر چھوکتا ہے۔ جو گلوں کے ساتھ اڑتا ہے اور شبنم کے ساتھ گرہا ہے
 جو دھتے ہوئے انگارے نکلتا ہے اور دھتے ہوئے میرے انگارے جو خاموش ہے لیکن بول رہا ہے جو چپے لیکن سن رہا ہے، جوازی
 ہے۔ ادا ہی ہے۔

تم وہی ہونا؟ وہی ہونا؟

وہ مجھ سے آنکھوں کی آنکھوں میں دھتکتی۔ میں جب بھی اسے دیکھتا، اُسی پر اسرار مکرابست کے ساتھ مجھ سے ہم کلام ہوتی۔
 میں چپ رہتا۔ خاموش رہتا۔ لیکن اُسے دیکھتا رہتا، ہر روز دیکھتا۔ پرستے تو بچے شوروم سے نکل کر بس شاپ پر چل کے پڑتے آں کھڑا ہوتا۔
 تو بھگت میں یا چارمنٹ پر اس کی بس اگر وہاں نہ گئی۔ وہ آواز دیکھتا اور وہ باہر نکلتی۔ اُرتے اُرتے ایک گلاہ مجھ پر پڑا ہوتی۔ جیسے ذرا سا مسکراتی اور
 غاروں کی خوشبو اُڑاتی چپ چاپ اپنے دفتر کی طرف روانہ ہو جاتی۔ میں کبھی اس کے پیچھے نہ لگتا تھا۔ اُس نے کبھی مجھے بلانے کی کوشش نہ کی
 تھی۔ شاید اسی ایک نیکھی سی شوروم کی خود ستائی اور بے نیازی کے احساس نے میں صدمہ سے ایک دوسرے سے جدا کر رکھا تھا اور مجھے
 ابھی کتنی صدمات اور جدا رہنا تھا۔ اسی آواز میں مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ جو منی کی ایک ٹریڈر سیٹھنے والی فرم میں سٹو ہے اور ریو ہے
 گاؤنی کے قریب ہی اپنی چچی کے ساتھ رہتی ہے۔ اور اُس کا نام آلمیر ہے۔ اس دفتر کا ہیڈ آفس کراچی میں تھا۔ اتفاق سے وہاں میرا
 ایک دوست ملازم نکل آیا جس کی بلی لاہور والے دفتر میں ہو گئی تھی۔ وہ ایک روز اچانک مجھے شوروم میں آگیا اور دالسی مجھے اپنے
 ساتھ دفتر لے گیا۔ کہنے لگا چائے، وہاں اپنے کمرے میں بیٹھ کر بیٹھ گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ آلمیر اُسی دفتر میں کام کرتی ہے۔ چنانچہ بیٹھوں
 ہی میں میرا دلی دھڑکنے لگا۔ اور پھر دفتر کے بڑے کمرے میں سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ بھروسے بالوں والی ٹیک اڈام آلمیر
 دیو در کے ساتھ خوبصورت سی چھوٹی یونکے سامنے بیٹھی ٹائپ کر رہی ہے۔ اُس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اور مجھے دیکھتے ہی اُسی پر ہنسا اور
 بے ملامت سے اشارے دے اڈام میں مگر اُسی اور اپنا چہرہ ٹائپ کی مشین کے پیچھے چھپا لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی شرع چشم
 خرچے اور دوسری دال دیو اور اُسی پرانے ہندو کی رنگ لگی دیوار کے پیچھے چھپ گئی ہو۔ مجھے صرف آلمیر کے بال اور ان کے درمیان
 نکلی ہوئی ٹائپ ہی دکھائی دے رہی تھی اور پھر ٹائپ رائٹر کی ٹھنی ٹھنی ٹھنک ٹھنک کی مسلسل آواز تھی جو میں کے چھتر پر بارش کی بوندوں کی
 طرح گری رہی تھی میں اپنے دوست کے کمرے میں آگیا۔ ٹیک ٹیک کی آواز نے وہاں بھی میرا پچھلایا۔ یہ صداء آلمیر کے چہرے سے زیادہ نمایا
 پر جو شہزادہ بھر رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کائنات کی تمام آوازیں، تمام ولولیاں، تمام شہزادے اُسی ایک ٹیک ٹیک سے نکلے ہوں۔ آلمیر
 میرے پاس نہیں تھی۔ لیکن میرے لیے وہی خیال کافی تھا کہ جس کمرے میں میں بیٹھا ہوں وہاں کی فصاحت آلمیر کے جسم کے ان چھوٹے لمس
 کی حدت اور عطر بھری آنکھوں کی پاکیزہ خوشبو بولی ہوئی ہے اور کیا خبر — کہ یہ ہر وہ سانس بن کر میرے جسم میں داخل

ہو رہی ہے۔ یہ بے نیم گلابی دھندلے کچھ کر رہی ہو۔ اس کا بے صدا دوازی ہو۔ اس کا اپنا سانس ہی ہو۔

اسی طرح وقت گزرتا گیا، میں ہر روز میں شاپ پاس کے دوشن کوٹا، چیل کے پٹر سے چپ چاپ کھڑا ہوتا رہتا رہتا۔ اس سے نکلنے فٹ پاتھ پرست سٹ کر خوبصورت پاؤں اٹھاتے اور دھڑ دھائی گلی میں مڑتے دیکھتا رہتا۔ جب وہ نعروں سے اوجھل ہو جاتی تو واپس اپنے شردم میں آ جاتا۔ اس دور میں ہم نے ایک دوست سے کبھی کوئی بات نہ کی تھی۔ کبھی اپنا حال دل ظاہر نہ کیا تھا۔ وہ بھی چپ چاپ تھی۔ ہم میں بھی محبت اور انوکھی محبت کی اس دھیمی دھیمی آنکھ کو اپنی روح میں جذب کر رہا تھا۔ جس طرح کوئی غریب مسافر جاڑے کی ٹھنڈی دانت میں کسی جہان میں نہ بند دوشن کی چھوٹی چوٹی راکھ کے پاس بیٹھ جائے اور اپنے ہاتھ پاؤں تپنے لگے۔ بالکل اسی طرح میں بھی اس شردم میں تھی۔ لغزت اور گند کی کاف اڑتی۔ ٹھنڈی دنیا کے میدان میں گزری ہوئی سبوتوں کی راکھ کے پاس بیٹھ گیا تھا اور اُسے کریدتے ہوئے ڈور رہا تھا۔ انہیں پیستے سے مٹی نہ نکل آئے۔ اتنی سی آگ بھی نہ بجھ جائے۔ مجھے میسر دوست نے بتایا کہ تو پھر ایک سال سے اُس دفتر میں ملازم ہے لیکن اُس نے کبھی کسی سے زیادہ بات نہیں کی۔ ایک بار کتنے مشین نے اُسے سینا اور شیران میں ڈنر کی دعوت دی تھی جسے اُنہوں نے قبول نہ کیا تھا۔ مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ جیسے میں نے ہی مجھے منجھ کر ڈنر کی مکارانہ پیش کش کو ٹھکرایا ہو جیسے یہ ماری خود نگری، بے نیازی اور نمکنت میری اپنی ہو۔ میرے اپنے آپ کا ایک حصہ ہو۔

اسی طرح برسات کا موسم بھی گزر گیا۔ سردیاں آ گئیں۔ یہ دُست بھی گزرتی چلی گئی۔ جزوی کا مہینہ آ گیا اور جاڑے کی بادیں شروع ہو گئیں۔ ایک دن صبح بڑی سردی تھی اور کھرا چھایا ہوا تھا۔ رات بھر ملکی ملکی بوند باندی ہوتی رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر دستوں کے ملل پکھنے سے ہوا بکھڑا تھوڑا پانی جمع ہو گیا تھا۔ بڑی سردی ہو چلی تھی۔ اُس روز ہمارے شردم میں بڑی گھما گھمی تھی۔ میں نے برآمدے میں آکر دیکھا کہ باہر بادش پھر شروع ہو گئی تھی اور دستوں پر دھندلے بادہ گہری ہو رہی تھی۔ اتنے میں فٹ پاتھ پر آئینہ نووار ہوئی۔ وہ اپنا آپ سمیٹنے تیز تیز قدم اٹھاتی بارش میں جھپکی چلی آ رہی تھی۔ اُس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ بارش ایک دم تیز ہو گئی۔ آئینہ بیک کر ہمارے دکان کے برآمدے میں آئی اور ایک ستون کے پاس کھڑے ہو کر دھال سے منہ پر کھینے لگی۔ اُس نے غواڑی رنگ کی ٹوید کا مل کر کٹ پہن رکھا تھا۔ گلے میں اسی رنگ کا ٹرم آدنی تھوڑا اور کچھ ہال بادش میں جھپک کر پیشانی سے چپک گئے تھے۔ میرے قدم اپنے آپ ہی اُس کی طرف اٹھ گئے۔ اب اُس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور کچھ گھر اسی رہی تھی۔ دوسرے مجھے میں اُس کے پاس کھڑا تھا۔ وہ کبوتری کی طرح کچھ اندر بنی اندر سمٹ سی گئی۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی چپکوں کے بال گیلے تھے اور سردی میں دھندلے رنگ کی رو میں لاپ رہی تھیں اور چہرے پر آنکھوں کے ارد گرد ایک دم اور ملائم سی چپک تھی۔ جیسے کئی رات میں دریا کے دوسرے کنارے پر کوئی دیا ٹنسا رہا ہو۔ اس کا پھیلا ہوا ٹھنڈے نیلا سا جوڑا تھا میں نے جلدی سے کہا۔

”اگر آپ ہمارے شردم میں بیٹھ جائیں تو بارش کے.....

وہ جلدی سے بولی۔

”جی نہیں۔ آپ کا شکریہ۔ شکریہ.....

اُس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ وہ گھبراہٹ میں اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی اور اُس کا ٹرمخ رومال فرش پر گر پڑا۔ میں فوراً اسے اٹھانے کے لیے جھکا۔ آئینہ بھی جھکی۔ ایک دم ہمارے چہرے ایک دوسرے کے سامنے آ گئے اور انہیں ایک دوسرے کی

انکھوں کو ملنے لگیں اور ہر شے اچلی ہوٹوں پر لکھ کر مہربان ہو گئی۔ ساکت ہو گئی۔ جہاد ہو گئی اور میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے آپ کو
اندھی بن کر اٹھتے، بولیں کر گزرتے، بجلی بن کر چمکتے، پھل بن کر شاخوں میں منٹے، شیر بن کر ہرنوں پر چھپتے اور ہرن بن کر قتلہاں پر بھرتے
مال بن کر ختم دیتے اور بچہ بن کر ختم لیتے روتے بہتے، محبت سے ہمیں چھیلا تے، نفرت سے منہ پھرتے، غزلیں کے پہاڑ
اٹھاتے، گندیں چھینک کر دوڑھیل پرانے قدوں کی دیواریں چاند تے اندیم بدست بارہ دیوؤں کے دبیز قاتیلوں پر جھبک کر اٹھا
جست کرتے، سارے دارکھوں میں بیکان بھرتی رو شیر۔ اوئی سے خوریز مشق کے حمد پر بیان ہندھتے، رنگد لہجہ ہاؤں کی برفاؤں
پر خوفناک کندروں میں چھلانگ لگاتے، اور شاہی جہانیں چادر کرات کی تابلیں پر راج محل سے جنگ کی طرٹ نکلتے اور عبادت گاہوں میں
نیکدل پیرانگروں کے ساتھ بیٹھ کر تپتیا کرتے، دیانت کرتے دیکھا، جیوں دوڑتے اور جہت سے چپ کا چپ۔ وہ گیا۔ گیا کسی
نافاقل جہر دیا کا منہ دریافت کر لیا جو۔ جیسے کوئی کتاب اخیر سے لے کر شروع تک پڑھ لی ہو، ایسے ہی مہوت سی ہو گئی تھی
جیسے ایک طری، خواجگان فراق کے ہمدرد تھے اڑتے، بھاگتے، ٹھہرتے، چکراتے، صدیوں کا کد اڑاتے۔ اچانک
ایک دوسرے کے بالقابل اُگتے ہری درد و مصرم بچوں کی طرح نیک دوسرے کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں تم ہی ہر؟ وہی

ہو؟

جی نہیں۔ آپ کا شکریہ شکریہ

میں نے سرخ ڈھال اٹھا کر آئبر کی طرٹ بڑھایا، اس نے دھال لے لیا اور جلدی سے براؤس کی میز جہاں اتر کر گئی بارش
میں ہی لگی میں ٹر گئی۔ ڈیڑھ سال کی مدت میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کوئی بات کی تھی۔ میں نے آئبر کے دھال کو چھوئی ہوئی انگلیاں ہر ٹوٹوں
سے نکالیں، ان میں سے فارول کی اداں خوشبو لکھ رہی تھی، میں اس خوشبو سے بھی زیادہ اداں ہر شہر دم میں دالیں اٹکیا اور سوچنے لگا
گو کہ میری بات مان لیتی۔ ہمارے شہر دم میں آج تو دھننی کا ہر کیل سر دی کے مقابلے میں یہاں کی فضا اتنی پُر سکون اور گرم ہے۔
پھر میں نے اپنے ساتھ یہاں سے لے کر اپنے ڈھال سے اس کے لیے کرسی صاف کرتا۔ ماذہ پتھر والی سونے کے رنگ ایسی کچا بناتا اور
خود بہ پریشہ کو اس کے ٹھنڈن پر اپنی ٹھنڈی رکھ دیتا اور اسے ایک کہانی سناتا کہ کسی پہاڑ پر ایک جھول بھالی صورت والا ایک جہرہ ادا
کرتا تھا۔ اسے اپنی جھڑوں سے بہت پیار تھا۔ جب جھڑیں چوٹا گاہ کی ہری ہری گھا سس چوٹیں تو وہ درخت سے ٹیک ٹاک کر انہیں
ہانسی پر محبت کے نغمے دیتا کرتا۔ ایک روز بارش کے طوفان میں وہ گھر دالیں آ رہا تھا کہ اس کی ایک جھڑ گم ہو گئی۔ مصرم چوہا پریشان
ہو گیا اور اس کی فاش میں کہ قات کی داویوں میں جا نکلا۔ وہ بڑا غلیں ہو کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ یہاں ایک نیک دل پر پی نواد
ہو گیا اور چوہا اسے اپنے ساتھ پریشان لے گئی۔ وہاں اس کی جھڑ سے دالیں مل گئی اور پر پی نے اسے بیٹھنے پر بلایا اور ایک ہانسی
دی اور چوہا خوشی خوشی جھڑ کو کھٹے رہا۔ اپنے گھر دالیں اٹکیا۔ پھر میں نے یہ کہنا۔ آئبر! بیکور کتنی عجیب سی
کہانی ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر بھی سب کچھ سچ ہے۔ گڈیا ہے، جیسے چل ہیں۔ ہانسی کے گیت ہیں اور ہانسی کا وحشی
طوفان ہے اور نیک دل پر پیال ہیں اور آئبر! میں نے نہیں سب پہلے اسی داری میں دیکھا تھا اور سب کے درخت کے پاس بیٹھ کر
نہارے بالوں کے لیے سفید جھولوں کے باز بندے تھے اور سرخ انگڑوں کے خوشے زہر توں میں سجا کر تھامے ساتھ رکھے
تھے۔ تمہیں یاد ہے نا؟ یا ہے نا؟ مگر آئبر براؤس کی میز جہاں اتر کر بارش میں جھپکتی اپنے دفتر باجگ تھی۔ وہ

ہمارے شرور میں نہیں آتی تھی اور میری سونے کیے بلک والی چائے کی طرح بڑی ہی تھی اور بارش کرتی رہی تھی۔

ہمارے ہاں دوکان میں کبھی ایک بیٹا لڑکی آیا کرتی تھی۔ چھوٹے تذک تھی جسم ذرا بھاری تھا۔ بڑی گولی تری کی تھی شرور میں داخل ہوتی تو یوں لگتا جیسے چھوٹی کی بجلی چلی آ رہی ہو۔ چہرہ ذرا بھلا اور معصوم تھا۔ معدوم ہوتا تھا ابھی ابھی دودھ پی کر آ رہی ہے۔ وہ ہنسنے میں ایک دوبار ضرورتاً اور ہمیشہ اکیلی آتی۔ عورتوں کا رسالہ یا کوئی سنسی خیز ناول خریدتی اور بچوں کیسے قدم اٹھاتی وہاں چلی جاتی۔ اس کا نام لیزا تھا۔ ایک روز میں نے اسے شرارت سے کہا: لیزا! تم بالکل مجھے اپنی چھٹی سی سہن لگتی ہو۔ وہ اس بات پر بڑی خوش ہوئی۔ شاید اسے آج تک ہوائے اپنے بھائی کے اور کچھ اسے اپنی سہن نہ لگا تھا۔ اب وہ اندر داخل ہوتے ہی میری سیسک پکڑ لیتی۔ میری خیریت چھٹی۔ اگر لڑکی کی بات دھیل جاتی تو اسے ٹھیک کرنے کو کہتی۔ اگر سوئیر نہ پہناتا تو وہ سکرورہن کرانے کی تاکید کرتی۔ غرض کہ اسے مجھ سے بڑا لگاؤ ہو گیا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ لیزا اس کے ساتھ ہمارے شرور میں چلی آ رہی ہے۔ میں تو حیران سا ہو کر رہ گیا۔ لیزا صاحبہ عادت میری میرے پاس آتی۔ خیر خیریت پوچھی اور مجھ سے لیزا کا قصداً کرواتے لگی۔

اس لیزا — ہمارے فانات انہی کے ہاں ہوتی۔ بڑی سوٹ ہے۔

میری طرح کسی سے کہیں آپ نہیں جاتی اور ہاں وہ "اؤس و آف" آیا ہوا

لیزا کچھ نہ بولی۔ حسب عادت خاموش رہی۔ صرف کانوں کو میں سرخ ہو گئیں اور نغما میں غاروں کی سنگتی جاتی خوشبو چھیل گئی اور میں نے دیکھا کہ لیزا کے کانوں میں ترن گزرتی گئی۔ لیزا کے کندھے جھللا رہے تھے جی کے رنگ سونے کے تھے اور وہ رسالہ دیکھتے ہوئے ہمارا اپنی چھٹی چھپکا رہی تھی۔ ایک بار اس نے لکھیوں سے میری طرف دیکھا اور چھوٹی خاموشی کے ساتھ انہیں جھپکالیں۔ پھر اس نے لیزا کے کان میں کچھ کہا۔ لیزا نے مجھے بتایا کہ لیزا کو نال - دیر کا - کی تلاش ہے۔ میں انہیں کتابوں والے ڈیپارٹمنٹ میں لے گیا اور دیر تک وہ خود وہ نال تلاش کرتا رہا اور مجھے وہ چہرہ دیا اور لیزا کی جھپکاتوں کے طرکان میں گم ہو گئی تھی اور وہ اس کی کھرج میں کہ قاف کے سرور اور ان میں مل گیا تھا۔ لیگا اس پر بڑی نال کی کتاب نال کی۔ میں نے لیزا کی وساطت سے لیزا سے اس کے گھر کا پتہ لے لیا۔ دوسرے دن ایک اور دوکان سے کتاب خریدا۔ اسے چھوٹا سا غلام لیزا اور لیزا کو پارل کر دی۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا خط لکھ دیا کہ — میں آئیں۔ اگر کتاب گھر ہی پر پڑی لگی تھی۔ اسے بھیج رہا ہوں اور ساتھ ہی اس ہیئت اور محبت کو بھیج رہا ہوں کہ ایک مدت سے میرے دل میں ہمارا — کچھ دنوں بعد وہ خط مجھے داپس مل گیا۔ لیزا نے اسے پڑھا، لفظ میں نہ کر کے مجھے پرست کر دیا تھا۔ وہ خط میرے پاس موجود ہے۔ وہ لفظ بھیج رہا ہے اس نے اپنے اٹھ سے میرا نام لکھا تھا میں چاہتا ہوں کہ اپنا خط اسی لفظ میں بند کر کے کسی ایسی بات کو گھر سے بھجوں جیسا کہ میری جاننی پرانی حوٹیلوں کی مسافر ڈیوڑھیوں میں پاؤں رکھتے ڈیرہ ہی ہوا اور — دھرتی کے رستے اور بچے پرست کی چوٹی پر نہیں چھپا کر گھر اور جانوں اور لفظ پر لکھے ہوئے اپنے نام کو آنکھوں سے لگا کر چپکے سے کسی نظر نہ آنے والے شے سے لے کر میرے پر لکھ دوں — یا پتہ بھرتی رہتی ہیں اسے کسی ایک پیرائے دفن کو دوں - اچھا - بتاؤ۔

جب بہانہ ہوئے گا تو کیا وہاں بھی سرخ ہو گئے ہوں؟

میں لچھل تو صرف وہیں بھٹکتے ہیں جہاں آئیں اپنا پاؤں رکھ کر گذرتی ہے اور لیزا کو میں نے ابھی تک صرف پاتھ ہی پر گزرتے دیکھے تھے۔ برتنوں کے خمیدہ کونڈوں کو ذرا سا بھینچے، بچے سنری پاؤں کو لہراتی، بے معلوم سی سکراتی ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھتی۔ وہ

یہ فکر و تہمتا دینے والے خیال کالج میرے قریب سے گزر جاتی اور فابول کے سینٹ کی تیز خوشبو، ان خوشی تخی مسوم بچروں کی ہنسی
تھیجے وہ جاتی خوشنوا دیوں کے عقب میں ڈگریں تھامے، پھول ٹٹائی چھڑکتی ہیں۔ اگلے اس طرح وقف کر گیا ہے امدادی ہل تھکے پیچھے
رو گیا ہوں۔

دیکھا ہوا۔
 اس طرح کچھ مدت گزر گیا۔ امیر کچھ ادھار کے محل میں تنہا تھا ہاتھ پر اپنے دامن میں سینے پر تھکا ہوا تھا۔
 ایک دن لیزا نے مجھے بتایا کہ امیر ایک دانشمندی کے محل میں داخل ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ غور سے دیکھ کر لیزا نے
 سینا کے بہرہ دہانہ سے۔ وہ نے کئی ہفتوں پہلے کسی مرد کو دیکھ کر کسی روزانہ کے ساتھ لگ کر چپکے چپکے
 امیر کو اپنے ہونے دیکھا۔ لیکن ہر بار خیال کر کے روک لیا کہ اسے کسی دوسرے کے ساتھ جوڑ دے۔ لیکن وہاں جانا
 تھا کہ ایک دن یہ المیزان منظر میں مجھے دیکھنا ہو گا۔ یہ کانٹوں کا تاج بھی کس پر رکھنا ہو گا۔ یہ صیب بھی کدھے پر اٹھانی ہو گی۔ اور
 پھر وہ کار ایک غول رلائی شام میں آجی جب سینا والی کی لابی میں کھڑے بیٹے کو کہہ دیا کہ ایک خوش پرش خیر مرد کے ساتھ ڈانٹ کر
 کی شہر چلا آتے دیکھا۔ میں اسے خیر مرد ہی کہوں گا۔ میں نے کہا کہ امیر کو اس کے لیے جلا کر کون اپنا ہو سکتا ہے۔ مگر ایسے میری
 طرف تھا بھی نہ کی۔ اس آدمی کے ساتھ میں آدھ ڈالے۔ بڑے اطمینان سے لابی میں ہے۔ گزرا کہ امیر سوادی شنگ کی ایک چھوٹی سی کاریں
 جا بیٹھی اور پھر ٹھہرے۔ اس چھوٹی سی گاڑی میں امیر کی ہاتھ پر کئی۔ امیر کی پہلی شہر تنہا تھی جو میں نے جانی کر کائی۔ مجھے یاد ہے اسی کہ میں۔ جہاں اس وقت
 ہسم بیٹھے ہیں۔ میں بہت کم عمر کے ساتھ تھا۔ کھائی میں آگے بڑھی وہاں جہازوں کو کھانا تھا۔ جانے کچھ رات کا کون سا پھر مرگا کہ میری
 جتنی بڑی آنکھوں پر چشم دل نیند نے اپنی جگہ میں ڈوبی ہوئی خوشبو اور آٹھیاں لکھ دیں اور میں سو گیا اور خواب میں دیکھا کہ امیر اسی خوش
 پرش آدمی کے ساتھ ایک چوڑی سے لڑے ہوئے باغ کے کچھ میں بیٹھے ہیں۔ امیر نے اسے اپنا سرخ و مال محبت کی
 نشانی کے طور پر دے رکھا ہے۔ اور جیسے میں ایک بہت بڑے۔ بے برگ درخت۔ یاد دہشت کے دھپ میں پاس ہی کھڑا ہوں اور
 میرے تنے سے بیٹے ہوئے سرخ خون کا بہرہ دہشت بے کرتے گر رہا ہے۔ پھر جیسے ایک طاقتور اچانک نور کی رنگ کی کار
 بن گیا اور یہ کار پوری رفتار سے سڑک پر بھاگنے لگی اور سڑک کے بال پر وہیں چوٹی کی گاڑی نے گئے۔ امیر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور
 ہوش جیتی لیے اور ایک زبردست دھماکا ہوا اور دوسرے لمحے امیر کی لاش سڑک کی ٹی میں پڑی تھی، اس کی آنکھیں سرخ و مال میں
 چھپی ہوئی تھیں اور ڈانٹ کر دلی ہو گئے۔ زخم کا نشان بے نشان تھا۔ — میں بڑے جبراً اگر آدھ بیٹھا۔ مگر سنسنی تھا۔ صرف
 اس کھڑکی میں سے ستاروں کی چمکی کھڑی تھی۔ میں کسی عمر کے تحت آدھ کھڑکی کے پاس گیا اور جتنی چوٹی خشک نما
 جی آہستہ آہستہ امیر کو بچا دینے لگا۔

ایک ایک!

[illegible]

سائیں سائیں کر رہے تھے۔

سائیں سائیں کر رہے تھے۔
 دوسرے دفعہ میں نے لیز اسے آئیو کے نئے دوست کے بارے میں پوچھا۔ اب وہ میری رازدار بن گئی تھی اور اسے
 معلوم ہو چکا تھا کہ آئیو کو چاہتا ہوں۔ صرف اسے چاہتا ہوں اور کچھ نہیں چاہتا۔ لیز نے بتایا کہ وہ آدمی کسی بہت بڑی غیر ملکی فرم

کھا بھٹ ہے اور آئینہ کو بڑے قیمتی تحفے کا کر دیا کرتا ہے وہ اسے ضرور پسند کرتی ہے مگر محبت نہیں کرتی۔ آئینہ ایسی لڑکی ہے جو شاید کسی سے محبت نہیں کر سکتی۔ — لیکن میں آئینہ کا نہیں بولی لیزا۔ میں تو اُس سے محبت کرتا ہوں۔ ایسی محبت جس نے آئینہ کی پیدائش سے پہلے جنم لیا تھا مجھے بتاؤ۔ اُس نے کبھی تم سے میرا ذکر نہیں کیا؛ کبھی میری بات نہیں کی؛ لیزا کے دماغ میں نہ کسی سے چھو لول کا چھوٹا سا گلدستہ تھا۔ وہ خاموش تھا۔ ہوں سے چھو لول کو دیکھتی رہی اور پھر آہستہ سے کہنے لگی۔ کبھی کبھی مجھے یقین سا ہوتا ہے کہ آئینہ اگر اس دنیا میں کسی سے پیار کرتی ہے تو وہم جو۔ اگرچہ اُس نے مسیکہ سامنے کبھی اس کا اعتراف نہیں کیا۔ لیکن محبت، عزت کے دل کا حال بہت جلد صدمہ کر لیتی ہے۔ ایک دن وہ مجھے کہہ رہی تھی۔ بڑا بڑا عجیب سا لڑکا ہے۔ یہ بچے ہیں مگر کتاب ہے جیسے جب سے پیدا ہوا ہے مجھے چپ چاپ کھنکھاتی ہے۔ ایک بے ادب منہ سے کچھ نہیں کہتا۔ کبھی کبھی تو وہم میں اسے دیکھتی ہوں۔ کہ یہ اپنی سیٹ سے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کتابوں کی الماریوں کے پاس ہلتا ہے۔ ایک پل کے لیے ٹوکتا ہے۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہے۔ پھر سے پڑ ایک عین کی سی سکواہٹ نمودار ہوتی ہے۔ پھر ایک دم اُداس ہو جاتا ہے اور کوئی پرانی سی جلد والی کتاب کھول کر اس کے وقت کو گھنٹے لگاتا ہے۔ گویا کوئی بد نصیب شہزادہ ہے جو اجازت سے میں مرے ہونے کا ماتم کرنے کے لیے اُکلا رہا ہے۔ ہو۔ یا کوئی اچھے وقت کی عین ہوتی ہو تو جتنی جس کی باتیں لگتیں اور بڑی دل پر اثر کرنے والی ہیں، تو جنہیں کوئی نہیں سنتا۔ کوئی نہیں لکھتا۔

لیزا خاموش ہو گئی میں نے اُس کے ہاتھ سے گلدستہ لیا۔ زرد چھو لول کو آنکھوں سے نکالیا اور انہیں واپس کر دیا۔ لیزا کچھ نہ بولی۔ جانتے ہوئے اُس نے دو چھو ل میری میز پر رکھ دیئے۔

اب آئینہ اکثر اُس خوش پوش پرنس ایجنٹ کے ساتھ نظر آنے لگی۔ وہ اپنی چھوٹی فسارای کاری میں اُس کے دفتر بھی آنے لگا۔ کبھی دوپہر کو کچھ کے لیے شیزان بھی سے جاتا اور کبھی دفتر سے اُسے گھر تک چھوڑتے چلا جاتا۔ ایک روز برسات کا موسم تھا اور بارش سے لہسے ہوئے سیاہ کالے بادل مالی داسے دفتر کے باہر اور چھک اُٹے تھے اور تنگ ہوا چل رہی تھی کہ میں پریشانی دفتر سے اُٹھ کر پھر تاجر تاجر ڈانٹنگ سکول میں جا پہنچا۔ دو روز پہلے میں نے آئینہ کو لیزا کے ہاتھ تک لگا کر ایک خوبصورت ریشمی رسکارت بھجوا دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آئینہ وہی رسکارت گلے میں ڈالے۔ اُسی ایجنٹ کے ساتھ ایک طرف بھیجی گئی تھی کہانی بی بی ہے، میں چپکے سے ایک کونے میں بید کی کوئی پرچیٹھ گیا اور چائے منگوا لی۔ آئینہ نے مجھے نہ دیکھا تھا۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں ذرا اندھیرا تھا اور دوسرے آئینہ کا چہرہ میری طرف نہ تھا۔ ہالی میں ایک دم زید ریگم پر ناچ کی موسیقی شروع ہو گئی اور آئینہ نے کہانی کی پیالی میز پر رکھ دی اور اپنے ایجنٹ دوست کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رقص کرنا شروع کر دیا۔ میرا رسکارت اس کے بھروسے ہالوں سے ٹیٹ کر لہرانے لگا اور وہ خوشبودوں کے دائرے بناتی فلور پر رڑھتے ہوئے پھول کی طرح چکر کھانے لگی۔ ایجنٹ کا بازو اُس کی آغوش میں تنگ ہوتا جا رہا تھا اور وہ آئینہ کو میزوں کی لہری ہوتی، جھلکی ہوئی شاخ کی طرح سلجھاتے ہوئے تھا۔ میرا سر جھکاتے لگا۔ میں نے جلد سے کھڑکی پر پردہ پر سے تنہا کر ایک پٹ کھول دیا اور باہر جھانکنے لگا۔ پہلی بار شک کی دو تین گم نویدیں مجھے دماغ پر گر گئیں۔ پھر بڑے زور کا مینہ برسا۔ ابدی لڑکا جو ابھی تک اچکی اچکی میں اسی مرسلا دھار بارش میں وہاں سے چلی ٹرا اور واپس شروع میں آ گیا، اور کونے والی الماریوں کے پاس گری پڑی پڑی گیا اور میری کوشش برکھلے ہال کی چھت پر گر گئی۔ بارش کے شور کو سننا رہا مجھے کچھ یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں کسی بہت بڑے درخت کے نیچے بیٹھا ہوں اور شروع میں ساری الماریاں لگتی ہیں، دسلے، آدمی، عورتیں — اور سے آتے ہوئے تندرپ شہ پہاڑی نامے کی طغانی لہروں میں بھی کھا رہی ہیں۔ اور لاکھوں صدوق لاکھوں آوازیں، آہیں میں ٹھن کی کرناک، ہی صورت ایک ہی آواز میں ڈھل رہی ہیں، جو چھپ اتنی نہیں جا رہی، سناتی نہیں دے رہی،

پھر جیسے اچانک گاڑی وہی کے سید کے درخت والے پر لکھی، سوئے ہوئے گاؤں میں آگیا جوں اور جیبر بڑے چھوڑوں کے پاس
 کھیت میں بیٹھا ہوں اور لکھی، ٹوکر کی ہاتھ میں لیے، سامنے کی دھلاں سے اتر کر میرے قریب آکر کھڑی ہو گئی ہے اور اس کے سر کے
 اوپر نیلے آسمانی ریشمات سرخ چمک رہا ہے اور سید کے ٹنگوں میں سے مسیحی، سردار، گرم خوشبو آ رہی ہے اور لکھی کا چہرہ
 گرمی میں دمک رہا ہے اور ہر ٹول پر پسینے کے موتی جھلک رہے ہیں اور میں اس سے پرچھ رہا ہوں کیا یہاں تھوڑی سی رات بسر کر لوں گا
 میں ہرگز نیکو نہ جاسکے گا؟ جگہ مل جائے گی؟
 پھر ایک نئے سردار کے لاکھ نے جھک کر اچھا۔

دوسری ڈکینو کا تازہ پرچہ آگیا کیا؟

اور میں ادم جو تک اٹھا، نیر انکوٹ میں بے ہاتھ میں ہی کچھ چکانا اور چھت پر بادش کا شور اسی طرح گرج رہا تھا۔ اس گئے
 لاکھ کی طرف دیکھ کر مجھے غم اس برا کہ زندگی سید کے درختوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔
 مارچ کے پہلے پہلے آئو نے اپنی ساگرو منائی، لیزا کے ہاتھ اس نے مجھے بھی دعوت نامہ بھجوا دیا۔ وہاں جانے کو میرا دل مانا
 مجھے مسودہ تھا کہ وہ خوش پوش ایجنٹ وہاں ضرور موجود ہو گا، لیکن پھر اس خیال سے کہ چلو آئو کے درختوں کو جو جاسکے، میں لیزا کے ہمراہ آئو
 کے گھر پہنچ گیا، میں نے ساگرو کے تھکے کے لیے فارول سینٹ کی ایک بڑی ٹیشی اور چائنا سٹاک کا پیازی ڈومالی خرید لیا تھا۔ آئو کا گھر
 دیسے کا دونی میں کچھ تک چرچ رہا تھا، ہرے جیسے والا چھڑا سا کھانچا تھا، تھکے کے دروازے پر چنگی گلاب کی جھانریں نے
 عمارت سے باہر نکلی تھی، شام ہو رہی تھی گرمی اس عمارت کے تھکے سے گزرتا تو آئو کے گھر میں ملنے والے پٹے میں بڑے کی درج سے خشکی تھی اور اندر کمرے
 کو نفاذ گرم تھی مجھے دین لگا جیسے میں نے اپنا تھکا ہوا کسی ٹوکر کے گرم کوٹ کی جیب میں ڈال دیا ہو۔ آئو نے ہلکے ہنر رنگ کا خوبصورت
 ریشمی ڈاک مہن رکھا تھا اور اس کا رنگ پہلے سے کہیں زیادہ نکھر گیا تھا، وہ اسی خوش پوش ایجنٹ اور اپنے کھنی موچکوں والے سخت مزاج
 چچا کے ساتھ کھڑی مہمان کا خیر مقدم کر رہی تھی، سمجھوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے مجھ سے جی ہاتھ ملایا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے گرم
 اور ملائم پورل والی فاختہ سٹی میں لے لی ہو، مگر میں لے لی ہو، مگر میں لے لی ہو، سامنے دیا اور ایک چھوٹی سی میب ٹی بونی تھی جس پر لیو سیرج کو حصہ
 دکھایا گیا تھا، آتش دان پر چند ایک گھر پر تصویروں کے ساتھ عیدائی راہروں کی تصویریں سجی ہوئی تھیں، اسی کے درمیان سنہری جلد والی مقدس
 بائبل پر مبنی تھی، دایہ جانب پارٹیشن کی دیوار کا بڑا سا تاجا ہوا تھا اور اندر سے کپڑوں والی الماری، آدھی سہری اور ایک چھاندا
 بھدا صدف دکھائی دے رہا تھا۔ مہمانوں میں ہر قسم کے کہیں، ہندو اور پاکستانی لوگ تھے ان میں راٹھیاں، گرن، شلواریں اور فیناکی کی بو
 چھوڑتی اپنکین، پانی گڑ بڑی محنت سے استری کی ہوئی پتلیوں، خوب رنگ رنگ شلو کے مہے تھے، کرم، پاؤڈر، سینٹ اور لپ سٹک
 کی خوشبو تھی۔ جیسے پاپ اور سگاردوں کے دھوئیں، چوڑے ٹوٹی کار، تھنی ہوئی سرنگی گروہیں، چھریل ٹائیاں، ترچھی انکھیں، کاٹے رنگ
 منڈھی ہوئی جھڑی اور بے درجہ کل ہوئی بیٹیاں اور تازہ و تازہ کی ہوئی جھانٹیں تھیں جن کی وجہ سے ہرگز دوز سے ایک معلوم ہو رہے تھے
 میرے جین بھی جی گلاز میں خوب کھیلے ہوئے گلاب رکھے تھے مگر یہ کہ نفاذ، تباہ چھوڑوں، ریشمی لباس سینٹ اور ٹوٹوں کی وجہ سے
 جو جنس ہو رہی تھی۔ ٹیک سے لے کر بعد چائیزوں کے اور گروگم چھیر کر پی ٹی، سہانوں نے بڑی فساد داخل سے اڈے، گرمی کی گوریوں۔

میر فیضی بکست دستاؤں کیلئے جن پر حزان بھرا لگا تھا، لیر کا گھنی منہوں والا جھانڈا بار بار منہوں کے آگے لیک دال بیٹ
 پیش کرنا اور پھر جھنڈے کیلئے ایسی غضبناک ٹاپوں سے دیکھنا کہ صحن کی حرارت نہ ہوتی کہ ٹپٹا اٹھائے۔ ایک دیر پہلے مرثیہ انجمن
 فدائے بیرونی کو لکھا تھا ادب کا رے رنگ کا بیلا پاپ جبروں میں لیے جرم مجید کو اپنے ساتھی سے باتیں کر رہا تھا اس کو معنی سا
 سیکھیں صورت ساتھی پائی انھیں سے دانتوں سے ناخن کاٹ رہا تھا اس کی ان میں ہاں کاٹنے جا رہا تھا اس اثنا میں وہ خوش پوش ایجنٹ ملاحظہ
 آئیے کے ساتھ رہا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اب بھی اس سے انک ہونا نہیں چاہتی تھی۔ چائے کے بعد ساتھ دالے کمرے میں جہاں سلوہ کے
 گئے ایک تیز پر سے اٹھ کر انھوں نے تھک لی دھن کے سیکانہ ٹھانے گئے اور تھوڑی سی ذائق اور تھوڑی سی شہد میں ناچنا شروع کر
 دیا۔ انہیں ناچنا چاہتی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں ہاں موجود تھا۔ شاید۔ لیکن اس خوش پوش ایجنٹ کے اصرار پر کچھ شرما کر اپنی جگہ
 سے اٹھ کر اداس کے ساتھ لنگر کے لیے گئے۔ وہ تھک کر گئے تھے۔ مختلف قسم کی خوشبودن جسم کی گڑھاہٹ، چاندی ایسور دھن کی تیز
 جگہ کا ہٹ، سلوہ کے چکر اور پھر وہ گنجی ہوئی موسیقی کے باوجود ہاں کیلیم دیوانی میں چھائی اور ہر چیز دھندلی ہوتے ہوئے نگاہوں
 سے مٹھل ہونے لگی۔ ریزاکر انھوں نے پس منظر کے باڈی پر بھی سنسے موسیقی کی نقل اتار دی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر چلے سے
 آؤں کے پاس گیا۔ آئیر کے حزن والا پلٹ آؤں کے حوالے کیا اور اسے کچھ حیران سا بھڑکرا دیا اور دالی ایسور میں صبح کی مصلوب شبیدہ کو عقیدت
 سے ہاتھ جھٹا کر ہار بزل آیا۔ باہر سمتیہ توب چلا تھا اور اندھیرے میں کھلے ہوئے حوروں کی اداس خوشبودن میں کچھ کس چڑھا تاہیک
 مینار رنگ آؤں۔ بے نور آسمان کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ میں ہاں سے چپ چاپ گزرتا لنگر پر گیا۔ آئیر کے گھر سے آئیوانی
 موسیقی تب دھم دھم گئی تھی جیسے اپنے آپ پر ایک ایسے بہاؤ کا گمان آ رہا تھا جس کے سینے میں سمند کی کسی بھی ہوئی چٹان سے ٹکرا
 کر گرا شکست پر گیا ہوا ہوا اپنے دیکھ بوجھ سے دالے پھول و عمدہ تولیہ اور حوروں کی خلک شگاف چھوٹ کے باوجود گھر سے
 باہر میں ڈوبتا چلا جا رہا۔ ڈوبتا جا رہا۔

”جیسے بعد میں کیلک کرم شام کو میں نے پہلی سناوئی بار آئیر کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی، وہ مجھے یزائے ساتھ لارنس
 کے اوپن آر کیٹے میں لکھی تھی۔ اس نے جگے ڈائٹ رنگ کے ریشہ فراک کے ساتھ بالوں میں گلاب کے سفید چھلکے لگا رکھے تھے۔ یزائے
 مجھے ہاں دیکھ کر پاس بلایا۔ آئیر نے انھیں جھلکایں۔ ”کچھ آؤں معلوم ہو رہی تھی۔ شاید میں اسے دیکھ کر آؤں ہو گیا تھا۔ یزائے بھی کچھ پریشان
 لگتی تھی۔ ادب سے انھیں نہیں غلامی تھی۔ وہ آئیں کہ لکھا رہی تھی سناوئی چائے پی رہی تھی۔ یزائے چائے کی مدد پر پیالی بنا کر میرے آگے
 رکھی۔ ادب سے کسی بڑے اہم مرض کو ٹھانے کے لیے ایسی عزم کی باتیں کر رہے تھے۔ میں چاہتے ہوئے آئیر کی کھلی ہوئی پیس اور حیدہ ہند
 کے سبک خم دیکھتا رہا۔ مجھے کہیں نہیں آ رہا تھا کہ لکھی کی عزم شام اپنے دیکھتے ہوئے طشت میں سفید چھلوں کے ڈھیر لے کر بھی آگئی
 ہے۔ ہوا گرم تھی اور آئیر کی طرف سے ہوا جھار بھرا تھا۔ آؤں میں فیل کی اداس خوشبو بھی لی ہوئی تھی۔ ابھی پہلا بھڑکنا ہی آئیر
 جوڑوں کو چھوڑ کر آؤں کے لیزائے کے لکھی کی طرف سے برہما جے ہندی سے بتایا کہ پرسوں آئیر کی کھلی ہو رہی ہے۔ اور لکھا ایک
 فرم میں ایجنٹ ہے۔“

چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں تھی اور سامنے دالے کی میز میں دھرتی کے چھپے سرخ رنگ کا خون ڈوڈو گولی چاند
 ابھرتا چلا رہا تھا۔ اور گھر اس تیر گھری خاموشی چھا گئی کہ میں نے سرخ چاندنی کو لکھی ٹھاکر سننا اور آئیر کے بالوں میں گئے

ہوئے سینہ چھوڑ کر خوشبو کچھ کر دیکھ لیں چھوڑوں پر اب سرخ چاندنی نے خون ایسے دھکے چھینٹے چھینک دیے تھے۔ میں نے پائی میز پر کچھ دی لہو لکیر کا گھٹا سا ٹھنڈا پانی اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اسے آہستہ سے کھا۔ آئیر با آئیر با گھٹنی، شادی، بیاہ، موت یکسی اور جی مک کی زبان سے۔ میں اسے ہلے سے ناواقف ہوں۔ میں مرتقم کی زبان بولتا ہوں۔ اور محبت کی بولی سمجھتا ہوں جس طرح کوئی خار مدہل نئے سے پودے کا پتہ لپیٹیں لے لیتا ہے۔ اسی طرح تھکادی محبت نے مجھے اپنی خوشی میں سے نکال دیا۔ کئی روٹھیزوں کے اندھیروں کے جگہ نیٹے کو پھیلا ہوا سے تھک دیکھ لیں ان غلاموں میں تو ایک بھگڑی چھوڑی تھی اور میں تھکے شے سے تھک کر تھک ہو گیا تھا اور کئی روٹھیزوں کے، اندھیروں کے دور جگہ بیتی تھکے کر میں، جیش کے لیے اسی شے میں، کرل جاؤں گا۔ میں نے جیش تم سے خاروشی کی زبان میں لنگھ کر ہے۔ اس لیے کو محبت کی سسٹنٹ پر جاؤ بھری خاروشی کا راج ہے۔ اس آسب زندہ تھے میں جو کوئی بھی ہے مرے ایک تم بار بار بھگڑ کر ایک بار بھگڑ رہی ہو۔ وقت پانی یادوں کے چھوڑ کر تپوں لہو خود دو جہ زبوں سے دھاب ضرور لکھا ہے۔ انہیں خشک نہیں کر سکتا۔ میں زندگی کے تمام خود روٹھوں اور دھکوں کے بھڑا جھٹکا میں بھڑک رہی تھیں۔ جھلا سکوں گا تم نے اپنی پر اسرار سکائیں تھوں کے اتنے چھل کھلا دیتے ہیں کہ مجھے دونوں ہاتھ چھوڑوں سے جھگڑے ہیں۔ میں انہیں اپنی چھل میں سیٹ کر دنگ کے اقام گرم ہاؤں اور خاک آٹائی لکھیں میں سے کر جاؤں گا اور ایک کچی طرح نہ ہونے واسے دن ابھی غروب نہ ہونے والی شام کے ایک دھند اور زبانی اندھیروں کے دھیان کسی ان کے، ان دیکھے بزر دیا کے کنا سے نیم کے پتھروں پر بیٹھا، ابھی میں سینہ چھل لیے تھک اور تھک کر دنگ کا۔ تھادی راہ و کھیں گا، کیا تم آؤ گی؟ تم آؤ گی؟

بھری آہستہ سے اٹھا، آئیر کے ہالوں میں سے ایک سینہ چھل نکالا۔ اسے اٹھوں سے اٹھایا اور گھاس کے سیدل میں اس طرف چل پڑا، جدھر سرخ چاند، زندہ چاند، طلوع ہو رہا تھا، میں نے ایک پل کے لیے بھی ٹھکر کر دیکھا کہ لپکے کے نظروں سے دیکھ رہی تھی کیسے دیکھ رہی تھی اب میرا چہرہ اڑتے ہوئے لکڑے سرخ چاند کی جانب تھا جس میں صیادوں کی جھول کا خون چھلک رہا تھا اور ان گنت رتی ہوئی لال لال آنکھیں میری طرف لٹکی تھیں۔

کر سس کی شام آگئی

آئیر کی اس خوش پوش اینٹ سے گھٹی ہوئی تھی۔ میں کچھ کچھ کرٹھنیش سا بر ملا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اپنے چھپکے پاس گاؤں چلا جاؤں اور باقی زندگی وہیں بکھیر میں کام کرتے ہوئے گزار دوں۔ مگر حالات کی نزاکت مجھے اس کی اجازت نہ دیتے تھے۔ چھپکے ہال حالات عورتوں سے بھی زیادہ نڈک ہوتے ہیں۔ دھکتے تھے کہ وہ سادو سودو پوں کی زکری کر۔ دس پل دوڑا دس پل چلاؤ۔ پونے دو سو روپے لاکھ لکھ کے انراجات کے لیے دھواں باقی میں جس طرح بھی ہوا پانگہ اور دھوڑ، اور اگر اس کے باوجود کسی سے محبت ہو جائے کسی چھپی ہوئی چٹان سے جھڑکنا ہوا ہے اور سینہ شتی ہو جائے تو خاروشی سے ہونے والے پر جلد برتی ہوئی پتھوں کو سنستے رہو اور آہستہ آہستہ تاریک لکڑے پائروں میں اترتے جاؤ۔ اترتے جاؤ۔

بجز ان دنوں کہ چھوڑو۔ پتھر زندگی کے ساتھ ساتھ ہی چلیں گی۔ میں نہیں کہہ رہا تھا کہ کر سس کی شام آگئی

میں نے آئیر کے لیے ایک چھٹا سا لک بڑا ایک نر خوبصورت کر سس کا روٹھ لیا اور شام کو ان کے کھر کی جانب چل پڑا۔ کارڈو۔ نر خوبصورت تھا۔ بس پر زبیر کی ایک شاخ نئی تھی جس کے ساتھ قدیل بل رہی تھی۔ سر دی بہت زیادہ تھی اور بازاروں میں دھواں پھیلا ہوا تھا۔ آئیر مجھے اپنے علاقے کی جیتی جی کی بل لکھی۔ وہ اچھے میں کچی دودھ کے ساتھ جس پر انگوڑی خشک پیل پڑی ہوئی تھی، امرغیر کے ڈبے میں سے اندھے نکال رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر خٹک سکی۔ دھان اس وقت کوئی تھا۔ ذرا پے کھانک دیا اور کے ساتھ دھندلا سا میپ بل رہا تھا۔ آئیر نے ہلکی ٹوٹی

مثال اٹھ حد تک مٹی اندر دی نہی کاپ سے رہی تھی۔ اس کے بال جیسے تھے چہرہ شکستہ تھا اور جسم میں سے خوشبو سرد اجبان کی ہلکی ہلکی منک اندر ہی تھی۔ شاید وہ ابھی ابھی خاکرائی تھی لہٰذا اس کی مثال ہونے کی بناء پر یہاں کر رہی تھی۔ میں نے کہا کہ کس مبارک ہو! آئیو! وہ کچھ نہ بولی اور دیر اور کے ساتھ صمت ہی گئی۔ میں نے ایک ایک کھٹک لہک لہک دیا۔ اس نے ہلکی لٹکا کر مجھے بڑی اداس اور پشیمان سی نظر دی۔ وہ دیکھا اندر سر جھکا لیا میں آئیر کے اور قریب ہو گیا۔ میں نے اس کا چہرہ نازک پھول کی طرح اور پیرا لیا۔ اس کے ہونٹ کاپ سے تھے اندر فادول کی خوشبو مجھے اپنی غلیظی دکھیں کھڑے بلکہ رہی تھی اور وہ نہ بولنے کی فکر نہ تھی کی ناند تیز ہو میں اندر ہی تھی اور میں نے اپنے جیسے ہوئے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر لکھ دیئے۔ اور شاخ پر جیسے والی تندی کے شعلے سے جھڑک کر سارے درخت کو سارے جھل کی کو اپنی خون آکٹام آگ کی لپیٹ میں سے لیا اور آسمان پر بند دل سے داگ اور کچھ گرد کی ٹھیکڑوں اور نہایت کی صداؤں سے کچھ اٹھا اور آئیر جلدی سے کھلا کے اندر جیسے میں غائب ہو گئی۔ اس روز شام کی مختصر قیامت بعد وہ اس کی مجھے ایک شعلے کی طرح بھر گئی جوئی غول رنگت بیخ سنا دی۔ پر میرے آوازوں سے بلند ہوئی تھی جس کے صلفے میں فادول کی گرم لہری آئیر کا سانس بن کر سست آواز میں چھری گئی ہار آئیر کے مکان کی مٹی ہلکی میں سے گزرا اور کچھ دیوار پر پھیلی ہوئی انگوڑی ہل کے قریب پہنچ کر گئی ہار اس وحشی شعلہ نشان میں گھرنا۔ لیکن آئیر کیس نظر نہ آئی۔ کیس دکھائی نہ دی۔ اور صبح میرا نے مجھے بتایا کہ کل آئیر کی شادی ہو رہی ہے۔

۱۔ کل آئیر کی شادی ہو رہی ہے اور کل ہی دوں کے پرچہ سرنگوں ہوں گے اور سید کے ٹنگو نے ٹھنیروں پر سے ٹوٹ کر خاک پر گر کر پڑیں گے اور میرے پیادہ کی لاش جیسے کے نیلے پانی میں پھوڑوں پر پڑے گی۔ اس نے دھن کا لباس پہنا ہو گا اور بالوں میں سب کے پھوڑوں کی مٹی سی ٹھنی لگا رہی ہو گی۔ آئیر کے بالوں سے اتارا ہوا سینہ گلاب میرے پاس ہے۔ وہ میرا گھبراہٹ ہے اور اس کی پتیاں جھلک ہو کر ندو ہو گئی ہیں۔ یہ پھول میرے ساتھ جائے گا اور میرے ساتھ ہی ایک بد پھر زمین کی تاریک تھوں کو چیر کر نمودار ہو گا۔ اب مجھ سے سامنے ایک اور جہنم کا انتظار ہے۔ طویل اور دشوار لگتا ہے۔

اب آئیر وال کے میں ٹاپ پر سے نہیں اٹکے گی۔ اب کوئی فادول کی آواز خوشبو آتا۔ چپ چاپ قدم اٹھانا ٹاپ تھ پر سے نہیں گزرا کہے گا۔ مگر میں پہل کے درخت سے کھڑا ہو کر اس ٹھڑی کا انتظار کروں گا، جب آئیر وال سے اپنے نیچے کرے گزرنے لگی۔ وہ پت پت تہر کا آخری دن ہو گا اور پہل کے سارے زور پتے ایک ایک کر کے پھر پھر چکے ہوں گے۔ صحت ایک پتا باقی ہو گا کہ آئیر اپنے مصروف پہنچے کو ساتھ لے کر جیسے دیکھے لیکن وہاں سے گزر جائے گی اور وہ پتا اپنی ڈالی سے ٹوٹ کر چکر کھاتا، سسکیاں بھرتا میرے قدموں میں آئی کرے گا۔ پھر میں اسے اٹھا کر اپنے کٹ کی اندر والی جیب میں چھپا کر نزد مردم میں واپس آ جاؤں گا اور اپنے کام میں مصروف ہو جاؤں گا۔ آئیر! آئیر! ہم جی تمہاری محبت میں اسی خشک پتے کی طرح اپنی ڈالی سے ٹوٹ کر پتہ پتہ پڑ پڑے ہیں اور وقت کی تیز آندھی ہمیں ڈرنے بیٹے پر رہی ہے۔ کبھی اس جنگ میں، کبھی اس دیرانے میں — کل تمہاری شادی ہو گی، تم دھن بنائی جاؤ گی تم جیت دیں جس نے گھر سے ٹھوکی اور ہم گاؤں کے گھر سے بیٹھ کر تمہاری بارات کی تہنائیاں بھی سن سکیں گے۔ جانتی ہو جب ہمارے ہاں دھن گھر سے نکلتی ہے تو اس کی سیدیاں کرن سا گیت گاتی ہیں؟ وہ ہاتھ میں جھانڈا اور دیشی دھال تھانے چھپا لیتی دھن کی طرف اپنے سو گوار چہرے اٹھا کر کہتی ہیں۔

ہمیں بھلا تو نہ دو لگی؟

دلہن!

وہ دقتی ہوتی دلہن!

معاذ اللہ! تم دلہن بن کر چارے گھسے آتیں تو میری ہمیں رات بھر سوخا کر رہے ہیں کہ جو ملک پر گیت گاتیں۔ میری ماں بھان کی
 ریزہ ریزہ سرور کی کوئلہ نڈھیل کر تیں پہنے گلے سے لگا لیتی لہجہ — پھر ایک ایک کر کے سب حوریں اپنی اٹھا اٹھا کر تنہا رکھ کر دیکھتی
 تم شرماتی اور وہ ہنس ہنس کر کہتی: شرماء نہیں دلہن! میگی! آئید!
 اس کے بعد کہ جس گرا سکوت طاری ہو گیا۔ میرا دوست خاکوش تھا، چپ تھا اس کی آنکھیں بند تھیں اور چپ سے جیسے خاک اڑ رہی
 تھی اور کھڑک سے باہر بھل رات کا زندہ جاندار ان کھائی کے بالکل اوپر جھک آیا تھا۔

جوتکیں

ہندراتھ

اٹا جب بتر سے اٹھی۔ تو اس کے سامنے جسم میں دو کی شیشیں اٹھ رہی تھیں۔ وہاں سے دو کی لہریں نکال سے آگئی تھیں۔ جو اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو گئی تھیں۔ کئی دھڑکے سے اس نے ایک ہی خیال تیار کیا کہ اتنے کا خدا کیوں نہیں آیا۔ کیا وہ اٹھ گیا تھا۔ یا نہیں مگر وہی ہولناکی سے کانٹے کو دوڑا تھا۔ زندگی میں سب کچھ ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس ہی محسوس کر رہی تھی۔ مگر یہ سب کی نگاہیں اٹھا رہیں۔ کیونکہ زندگی کی ضروریات آٹا ہی پڑی کر رہی تھی۔ اگر آٹا نے اپنی زندگی کے ساتھ بولی اٹھائی ہوتی۔ تو یہ سارا کتبہ برسرِ کار کھپ گیا ہوتا۔ لیکن آٹا کی نگاہ دو کی دولت پر کتبہ آج تک مدد و قوت لکھنا نہ لگا تھا۔ پڑنے سے پڑنے نے شادی کر کے ٹھگ لگا لے لیا تھا۔ پھر بٹے بھانے نے پان کی دوکان کھول لی تھی اور ساتھ ہی شادی کر لی تھی۔ اور اس کی زندگی پان کی دوکان اور ایک حدوی کی اور ایک دھرت پٹے کے گرد طواف کر رہی تھی۔ بڑی بین بین ایک آدمہ مزاج عورت تھی جس نے اپنی ساری زندگی آوارگی۔ اور بھائی کے سپرد کر دی تھی۔ اس نے بھی اپنی منزل کا شکر کر لی تھی۔ اس بڑھاپے میں جو اس کے اندر گندہ لڑا تھا۔ جب شباب کا سارا سانس پھیل جاتا ہے اور جسم میں ایک دھیل پائی سا آ جاتا ہے۔ جب کپڑوں کے آس پاس بال سفید ہونے لگتے ہیں۔ جب ٹھنڈی کپڑے کا کرشت اپنی جگہ چھڑنے لگتا ہے تو کچھ رو کر رہا آپ کا قاتل کر رہا ہے۔ موت کی دستک آہستہ آہستہ سنائی دیتی ہے۔ اس وقت پر بھگوان نے بہن کی وہ عواظ قبول کر لیں۔ بڑا اٹا گناہ سنا کر رو پیٹے۔ اور پوچھنے اُسے ایک شخص کے قریب لاکھڑا کر دیا۔ جو اُسے مدد و قوت کھانا۔ ایک مدد و کھول۔ اور ساتھ ہی اٹھنے والی زندگی دے گی جس میں جہرک اٹھایا اس اپنے ڈر اٹھنے جہڑے کھولے ڈر اٹھ ہی تھی ان سب بیہوش ناک چیزوں کو ایک لمحے کے لیے دور چھینک دیا تھا۔

لیکن آٹا ابھی تک اکیلل تھی۔ اُس نے ٹھگ کے برادر کے بیٹے سب کچھ لیا تھا۔ اپنے جسم کی بازی کھٹ لگا دی تھی۔ اپنے آٹا دل اور تنہا لہو لہو کیا تھا۔ اپنے جسم اور جوانی کو بیچا تھا۔ لیکن یہ تو ایک لیک کر کے سب لوگ اُس سے الگ ہوتے گئے۔ ہر شخص اپنے غور کے گرد گھوم رہا تھا۔ اور آٹا آج زندگی کی وہ پلیر پر داخل اکیلل کھڑی تھی۔

وہ بتر سے اٹھی۔ آٹا نے یہ اپنی صورت دیکھی۔ صبح کے وقت اُسے اپنی صورت کبھی اچھی نہ لگی۔ نہایت ڈبلا پتلا سا چہرہ۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ گڑھے۔ چہرے کی رنگت زرد۔ زردی۔ بالوں کی نرمی اور ان کی چمک آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کے کپڑے جو آج سے چھ مہینے پہلے اُسے پہن کر گئے تھے۔ آج بہت ہی کٹے کٹے سے تھے۔ ہر چھ مہینوں کے بعد وہ اپنے کپڑوں کو دوبارہ سیٹا۔ کچن لاشی۔ کبھی بڑھائی۔ کبھی کر کے قریب اپنی قمیص کے گھیرے کر کم کرتی۔ کبھی بلا ڈر کو دوبارہ سیٹا۔ بعد سینے کے پھیلا ڈر کو دوبارہ ناچتی۔ یہ تبدیلیاں جو اُس کے جسم میں ہر روز تھیں ان کے تسلی آٹا کا احساس تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو دیکھ کر کبھی کبھی اٹھتی۔

اس کو بھی ایک گزند تھا۔ جب وہ چلی مارلیک دھن کی طرح دھن میں آئی تھی۔ لگاتی، لگاتی لی کھا کر چلی اس شہر میں وارد ہوئی تھی۔
 یہ شخص نے اس کے متناسب جسم، اس کی مستقیم آنکھوں، اس کی تپتی کمر، اس کے گہکوں، اس کے لمبے قد کی تعریف کی تھی جس شخص نے اسے دیکھا ایک لمحے
 کے لیے وہ بہت سا برک رہ گیا۔ ایک مسکراہٹ لیے ہوئے۔ چمکی بک جیب میں ڈالے ہوئے۔ مستقل میں زبیدوں اور تانوں کا پورا ج
 روشن کئے ہوئے۔ اپنی جانی کتنا بنانے کے لیے بیقرار نظر آتا۔ اس کی اس ناؤں میں گری پیدا کرنے کے لیے اس کی روح میں بیخبر آوی کے لمحات کا
 مستند کرنے کے لیے ہر شے داغ بڑی گرجوشی سے مٹا۔

لیکن اٹھاکو دوڑا لوگوں سے سیراب نہ ہوئی۔ ہر آنے والے سرو میں کوئی زکری کی رو جاتی۔ اگر وہ چست تھے۔ تو صورت شکل کو یہ منظر
 تھی۔ صورت اچھی تھی۔ ترک بنیں غدار۔ اگر اسے والا قبول صورت اور بنک بنیں کی فائش کر دیتا تھا۔ توڑ چلا سر سے پاؤں تک سے کرناج
 ہاتھا۔ سگڑا سے خیریں چہرہ بنیں تھیں۔ دستہ نہایت ہی پر اگندہ۔ باتیں کر دتے آہٹے۔ ذوق جمال غار جھایا تھی جس صفر بات کرنے
 کے ہر صوم جتا۔ شاید جیش یا گری کا کاک اگیا تھا۔

آشائے ان تمام مردوں کو دیکھا۔ اپنی منطی عزت اور گھر میں لان بکتے ہوئے۔ ہر آنے والوں کو دیکھا جو اس کی روح کی دیو پر رسک
 رہے تھے۔ وہ رہے تھے۔ — گریہ سب لوگ اس سے عرصہ نہ تھے۔ بہت کچھ کر سکتے تھے۔ کین جنانے کیوں نہ کرتے تھے کہ جس جہت جہری ظاہر
 سے اس کی طرف وہ دت کے کمانے کے لیے بکتے رہتے۔ اس جہری ظاہر میں لیے ہوئے۔ درے بھٹے سے بھٹے ہوئے کیوں نہ رہتے۔ جیسے
 اٹھایا لیکن کی زندگی کا مرکز تھی۔ جیسے یہ فن کی پکاسا لایا تھی۔ کو تم کچھ کہہ نہیں کر سکتے ہم سب بیکار ہیں — ہماری طاقت
 گویا ان چھن گئی ہے۔ ہمیں اپنے آپ پر یقین نہیں رہا۔ ہم کچھ نہیں ہیں۔ کچھ نہیں ہیں۔

انہی سکتی ہوئی صورتوں کو دیکھ کر آٹا کے دل میں ایک تلاطم پیدا ہو جاتا۔ یہ نگاہیں جو ہر ہا۔ ہر شے ہر سیکڑ۔ اسے اپنی زندگی پیچنے
 کے لیے جگر کرتی رہتی۔

اور شاید آٹا نے سوچ دیا تھا۔ کہ جگہ ان نے اسے ان تمام لوگوں کو پانے کے لیے پیدا کیا تھا۔ شاید ان تمام کو پیدا کر کے اس نے اپنا
 کام ختم کر دیا تھا۔ اب آٹا کی باری تھی۔ کہ ان کی سب کی کشتی کو نزل مقصود پر لے جائے۔ ایک انصاف کی طرح —

اور آٹا نے ان دس سالوں میں یہی کچھ کیا۔ انہیں کی طرف دیکھ کر۔ انہیں کی منطی اور عزت کا انداز کر کے۔ انہیں کی جھوک سے متاثر
 ہو کر انہیں کے مستقبل کو بنانے کے لیے اس نے اپنی جوانی کیلیم کر دیا۔ لیکن یہ نیلام بڑا سچ بھ کر لیا۔ جگہ کوک کر۔ دیکھ کر۔ دیکھ کر سنبھل سنبھل کر
 کیا۔ یہ لمحات جو بچہ ہیں آتے رہے۔ ان لمحات نے اس کی روح کو بھی پر اگندہ دیکھا۔ کیونکہ اس کی اپنی روح اس نیلام میں شامل نہ تھی۔ اس کی اپنی
 منزل پر نہ تھی۔ اسے خود روہوں سے محبت نہ تھی۔ اسے اپنی زندہ رہنا مقصود تھا۔ یہ سب کچھ اس نے اپنے کنبے کے لیے کیا۔ اس دس برسوں
 میں چار پانچ حشقی بھی کئے۔ ایک دو سچ بھ کر ایک دو عجیبوں کے نکلت۔ کچھ بھائیوں کو دیکھ کر۔ کچھ ماں کی طرف نگاہ ڈال کر۔ آہستہ آہستہ بھکاریوں
 اپنے ٹھکانے لگنے لگا۔ مددیرہ اپنی زندگی شروع کسے گی۔ لیکن یہ کارواں توڑتا جا رہا تھا۔ چھوٹے بھائی کے ہاں ایک لڑکی جو کبھی تھی۔ ٹٹے
 بھائی کے ہاں پانچ بچے تھے۔ "بچے آٹا کے پاس مل رہے تھے۔ اور تین بچوں کے بچہ کو خود بڑا بھائی سنبھال رہا تھا۔ سب سے زیادہ بچہ تو
 اسے اس بات کا تھا کہ کوئی شخص اس کی عزت نہ کرنا۔ اس کی ان بھی تو یہی کہتی۔ تو زندگی ہے۔ زندگی!

ہاتے یہ ٹھنڈے بھوے ان لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ جس کا کھائی میں کسی کو گایاں دیں۔ اسے ماں بہن تیری جاتی ہوں تیرے ہی خون
 کی لہجہ ہوں۔ تیری رگیں، اور تیری میری دل و جگر ہیں۔ میں تم سے ہلک تو نہیں، اسے بھائی۔ اسے میری بھابیوں۔ شرم نہیں آتی۔ تم مجھے دیکھ کر
 ہنسی کیوں کر — اپنے ہی میں خوش کیوں ہوتی ہو۔ کب تم نے میرا خون نہیں پایا۔ یہ گھر میں کھسکھس پر تعینک امیر ہنسی
 یعنی جب کسی آہٹ آتا ہے۔ اور میں اپنے آپ کو سزا دے لگتی ہوں۔ اپنے بال و جھرتی ہوں۔ انہیں سکھاتی ہوں۔ اپنے ہوں پر پلٹ

لگاتی ہوں۔ اس کے انتظار میں ایک خوبصورت نئی ماری بنی ہوں۔ یہی ماری تو انہیں پسند ہے۔ تاہم جل نہیں کر سکا۔ ہر جگہ ہر لمحے دلوں سے جاگرتی ہوئی آواز آئے دے ہیں۔ "اتن بھی خوش نہیں ہوں۔ جس دن سے وہ آتا ہے یا آئے گا، ہر لمحہ تم کوں مجھ سے ڈرتا جھکتا کرتا کرتی ہو۔ تمہیں تو معلوم ہے۔ تم میری ہر شخص کو معلوم ہے کہ یہ کیا کرتی ہوں۔ تم سے کچھ چھپا ہوا نہیں۔ تم میری کالی بوند ہو۔ مجھے تو آئندہ سے جنت ہے۔ جس کج کل دن رات اس کا انتظار کرتی ہوں۔ دن رات اس کی یاد۔ ہوں اس کا نام لیکر زندہ ہوں۔ جب اس کی یاد آتی ہے آسیریا کھول دیتی ہوں۔ آئندہ آجائے ہیں۔"

اٹھ دیکھو تو مجھے کیا ہو گیا۔ میں تو پہلی سی نہیں رہی۔ چہرے پر وہ ٹھنڈی سی ہنس رہی۔ وہ مدنی نہیں ہے۔ آواز میں وہ ٹھنڈی نہیں۔ وہ بول بولی جاتی جا رہی ہوں۔ ان دس سالوں میں میں نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ پھر بھی نہیں دھم نہیں آتا۔ شاید میں جسم دوسرے کے قابل ہی نہیں۔ میں تو زندگی ہوں۔ جو زندگی کی کالی کھاتے ہیں انہیں کس نام سے پکارا جاتا ہے۔ چھوڑو! مال کو مت کالی دو۔ ان بھائیوں کو مت کسو۔ ناگھ میں نا۔

آج آسمان بڑا خوبصورت تھا۔ دھوپ میں ایک نشہ سا تھا۔ سامنے کے مکان پر کبوتروں کا ایک جھڑا۔ ایک دو سحر سے پیار کر رہا تھا۔ تاریل کے درخت اس خشک ہوا میں جھپٹ رہے تھے۔ دور ایک جہاز سطر کے لیے اپنے پر ڈال رہا تھا۔ آج آئندہ کا خطا کا چاہیے کیا وہ آج ضرور آئے گا۔ وہ آجائے گا تو وہ اپنے دل کی مادی کہ مدت کو اس کے سامنے رکھ دے گا۔ وہ ہر چیز کو میری ہر شکایت کر۔ میری ہر التجا کرے۔ غور سے سنتا ہے۔ اور دعائوں کو بہتر ملنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی بہت دور رہتا ہے۔ تہی جیسے کے بعد۔ صرف ایک دن یا ایک رات کے لیے آتا ہے۔ اور چلا جاتا ہے۔ اپنا تبادلو یہاں کیوں نہیں کر لیتا۔ اتنی دودھ پینے سے کیا فائدہ۔ وہ جلی نہیں کھتا۔ جب آتا ہے۔ تو محض ایک تار بھید بیکہ ادیں اس کے انتظار میں تڑپتی رہتی ہوں۔ ٹھنڈی جتنی ہوں۔ اس پر غور یہ کہ جس دن وہ یہاں آنے والا ہوتا ہے۔ گھر میں ہنگامہ ضرور ہوگا۔

اُسی دن تو میں خوش ہوتی ہوں۔ وہ دن تو میرا ہوتا ہے۔ باقی سب اُن کے ہوتے ہیں۔ باقی سب شاید میں۔ باقی اُن کی ہوتی ہیں۔ اُن سے کوئی کیا کہے کہ اے گھر والو۔ کیا تم مجھے ایک سہانی صبح نہ دو گے۔ کیا میری زندگی کی ایک گرم رات نہ دے گی۔ اُن کی نگاہوں میں کھٹکتی ہے۔ اتنے ہی خود دار ہو۔ تو گھر سے نکل جاؤ۔ آئندہ بھی کھتا ہے۔ کہ اب اُن کو گھر میں کیوں رکھا ہے۔ تم نے تم نے ان سب کو زکری کے قابل بنا دیا۔ شاید اُن تک کرادیں۔ لیکن پھر بھی یہ سارا جو چھوٹا سا کدھر پر آؤ۔ کب تک۔

لیکن آئندہ کو کیا بتاؤں کہ یہ جو نہیں ہیں آئندہ۔ جو نہیں۔ جو ان کو خون پینے کی عادت ہوئی ہے نا۔ وہ ماری مگر کسی نہ کسی کا خون پیتی ہیں۔ اور مجھے خون دینے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ جب تک کوئی مجھے گالی نہیں دیتا۔ مجھے سکون نہیں ملتا۔ جب تک اُن مجھے نہ می نہیں کہہ لیتی۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ جب تک بھائی یہ نہیں کہہ لیتے کہ تم کی کچھ کر سکتی تھیں۔ اور ہمارے لیے کچھ نہ کرنا۔ مجھے راحت نصیب نہیں ہوتی۔ میری قراریں کا یہی صلہ ہے نا؟ اور کیا کرتی۔ اور کیا کر لیتی۔ آئندہ۔ اب تو آجائے۔ آئندہ۔ یہ صبح بڑی پیاری ہے۔ آسمان بے حد نیلا ہے۔ دھوپ میں منہس کے پردوں کی زمی اور گرمی ہے مجھے اتنا نہ تڑپاؤ۔

دل کے بارہ بج گئے۔ اور ڈاکہ آیا۔ اور ساتھ میں ایک تار۔ آٹا نے لپکتے ہوئے انھوں سے تار کھولا۔ لکھا تھا۔ شام

راہ بروی تہدانا اند۔

آٹا خوشو اور سیرت سے جبرم گئی۔ اور ہندو کچم یا۔ اور پھر ہندو اور دیکھا سا سننے کی چارپائی پر اس کی ماں بیٹی ہوتی تھی۔ دوسری میں اس کی بھالی کھانا پکادی تھی۔ سرہلے پر بھائیوں کے بچے بیٹھے ہوتے تھے۔ اور ہندو بچے فرش پر اس کا بجائی کرتا تھے۔ رہا تھا۔ سامان اور ہندو اور کھجور اٹھا ہر طرف۔ اور زخری تھی۔ ہائے وہ ابھی گئے تھے کہیں گئے۔ گھر کو سہا کر بھی نہیں دیکھا کی شریفوں کے گھر گئے۔ ہوتے۔ ہوتے۔ سب کچھ ہوتے ہوتے ہر طرف اعتقاد تھا۔ دیکھا معلوم ہوتا تھا جیسے سب لوگ کو کچ کی تیاری کر رہے ہیں۔ آٹا نے ہر چیز کو سیتے سے دیکھا شروع کیا۔ صوفائی جگہ پر دیکھا۔ جھاڑو سے اسے صاف کیا۔ پھر ہر چیز کو قرینے سے دیکھا۔ تصویریں کر کے سے صاف کیا۔ اپنی جوانی کی تصویر کو۔ ہائے آٹا کو کشتی خوبصورت تھی۔ اب تمہیں کیا ہو گیا ہے تصویر صاف کرتے ہوئے۔ ایک تصویر بچہ کھڑی۔ اور چنگ پر سوئی ہوئی ماں۔ جاگ اٹھی۔ کیا شہرہ چار کھا ہے۔ آٹا غم نے سرہلے بھی نہیں دیئے۔ یہ سونے کا وقت ہے۔ ماں۔ بارہ بج چکے ہیں۔ بارہ! وہ چلائی۔

”بڑھیا ہوں۔ بھیند زیادہ آتی ہے نا۔ جب تم بڑھیا ہو جاؤ گی تو مانتھ پاؤں نہ ہلا سکی۔“ دن بھر سوئی رہ گئی۔
فرش پر بھائی نے انگریزائی کی۔ اور وہ چلایا۔ ”رات ہالی کر کے آیا ہوں۔ لیکن اس گھر میں سونے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اور اس نے پھر کر وٹ لیکر آنکھیں بند کر لیں۔

کیا وہ اپنی ماں کو بتا دے۔ کہ آئندہ آج شام کو یہاں آنے والا ہے۔ اور اس نے بتایا۔ تو وہ رونا شروع کر دے گی۔ پہلے کھڑک کھان کرے۔ چیزوں کو سجالے۔ فرش کو دھوئے۔ جڑی کر تیزاب سے صاف کرے تاکہ گند کی احساس نہ رہے۔ کپڑوں کو اچھی طرح ڈالک دے۔
ہلے صاف کرے۔ برتن سہا کر رکھ دے۔ یہ سب کچھ کرے۔ اکیل۔ ماں اکیل۔ اس کام میں تمہارا کوئی ماتھ نہ دے گا۔

اس نے اپنی چھٹی بھالی کو ایک کونے میں بلایا۔ دیکھو بازو مارا ایک مٹک لے آؤ۔ دوسرے ڈھول کے چادل اور سے ماں پالیٹ کی پھلی۔ وہ پھلی بڑی خوشی سے کھاتے ہیں۔ کچھ پلاؤ۔ بنا لے۔ ایک آدھ مٹک چیز۔ میری پیاری بھالی۔ اس نے بھالی کے کائے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”سرہلو تو رکھو۔ اری پون کو تو سلا دے۔ اچھے سے کپڑے پہناؤ۔ اور حق سے دیکھو وہ اٹھ کر منہ ماتھ دھوئے۔ شام کو وہ.....
دو شرا لگئی۔ جیسا گئی۔ اور ڈھیلے ہوئے پتو کو سر پر رکھ لیا۔ بڑی سہاگنی بنی پھرتی ہے۔ بھالی۔ سب کچھ سمجھ گئی اور دوسری کی طرف گئی۔ اور بڑا اٹنے لگی۔ ”یہ شرم کہیں کی کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ آج وہ آ رہے ہیں۔ رڈی کہیں کی۔ شادی نہیں کر لیتی۔ کتنے مرد کھا چکی ہے۔ ابھی تک جی نہیں بھرا۔“ مٹکے بھر لی تاکہ کھرا کھا ہے۔ ہمارا۔ لوگ آنکھیں پھاڑ کھڑے دیکھتے ہیں۔ کل ہی گلی کا سٹنڈ امیری طرف گھر گھر دیکھ رہا تھا۔ جیسے میری مچی..... اس نے رام۔ پچھل پر کیا اثر پڑے گا۔ اور یہ کہتے ہوئے وال میں ملک ڈالنے لگی۔

• • •
ارہی مال میں ملک ڈالے جاتی ہے۔ ذرا ماتھ کو روک کر دوسری۔ ”ماں نے چارپائی پر چلا تے ہوئے کہا۔ تو رہ جاتی تو اچھا تھا۔
نڈی گشتی کہیں کی مرہی جاتی ہے۔ وہ مار کر۔ اور تم لوگ کھا کھا کر لیں ہوتے جا رہے۔ مرنے والی تھیں مال کو کھا کے گا۔“ وہ چلا کر بولی۔
بھالی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس نے زور سے ڈھکنا پٹنے پر کھا اور پاؤں سے تھالی کو ہٹایا۔ اور قریب کھڑے ہوئے ایک بچے کو ایک پتھر پرید کیا۔ اور کہنے لگی۔ ”کس کس کا کھانا پکاؤں۔ یہاں اُسے دن سہان آتے رہتے ہیں۔“ وہ پھر کھانا ابھی تک تیار نہیں ہوا کہ شام کے کھانے کی فرمائش ابھی سے ہونے لگی۔

• شام کو کون تیرا خضم آ رہا ہے۔ گتیا کہیں کی۔ حرام خود۔

ماں بکڑ رہا تھا۔ پڑا آٹا کے لیے مدھورہ کی موت تھی۔ یہ گالیاں یہ جھٹکے چہرے پر کدو ضرب کی لیکریں۔ ان سب سے آٹا اڑ گیا لیکن اس نے
کی مادہ پر عمل تھی۔ وہ ان گالیاں کوٹنے کے حادثہ گھر کے حامل میں تھی۔ یہ تندی یہ گھبراہٹ یہ دہشت۔ یہ نماز روتی یہ بہانہ بازی یہ
سب کچھ اس گھر میں بولی سے ہو رہا تھا۔ گھر کے تمام فرد اسی لیکریں میں پھنسے ہوئے تھے۔ آٹا جلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن ٹھکانا آٹا تھا۔ اسی لیے آٹا
نے ان گالیاں کو زندہ کی گالیک حصہ بچا تھا۔ جیسے گڑ ان کی زندگی سے وابستہ ہو گئی تھی۔ اس پر لگندگی جس کا مادہ اس کے پاس تھا اس سے نکال کر وہ
زندگی کے کچھ لمحات۔ اپنی خوشی کے لیے دکھانا چاہتی تھی۔ آٹا چاہتی تھی جیسے اس نے اپنی زندگی کو ان کی خوشی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اسی طرح گھر
کے باقی افراد غیر کسی عقیدے کے۔

اس کی خوشی میں شریک ہوں گے۔ اور اسے خوشی کے لازوال لمحات ملنا کہنے میں فراخ دلی سے کام لیں گے۔ لیکن یہاں فراخ دلی
کمال۔ یہاں خوشی اور شرمندہ تھی۔ یہاں دلوں میں غمی تھی۔ صرت اپنے آپ کو خوش رکھنے کی کتنا تھی۔

جیسی تو آٹا پر ان گالیاں کو خاص اثر نہیں پڑا۔ وہ اپنے کام میں منہمک رہی۔ چھوٹے جانی کو صرت پر لٹا کر فرش کو دھویا۔ دلی بھائی
کمرے کی ہر چیز کو گھرنے سے رکھا۔ خود نہانی ہالز کو محراب میں ملکایا۔ — نئے کپڑے پہنے۔ انگوٹھوں میں کاجل بولوں پر اپ شاک۔
اند ہال میں نئی اور سینٹ۔ ماتحتوں میں چوڑیاں۔ کالوں میں سونے کی بایاں۔ اور گدے میں روٹو گڈو گڈا لارہن لیا۔ اور پھر گڈو گڈے انتظار میں بیٹھ
گئی۔ گھر کا ہر گڈو گڈو انگوٹھوں سے آٹا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عجیبیاں کمرے میں سر کر رہی تھیں۔ وہ تو بیاہی ہوئی تھیں۔ ان کا ایک خاندان تھا۔ ہاں صرف ایک
بچہ پر ایک ٹیلا۔ ایک میں صرت ایک ہی مادہ کا سیندر۔ نگاہوں میں ایک ہی چمک تھی۔ ایک ہی کی صرت تھی۔ ایک ہی مرد سے
بہشتی تھی۔ ایک ہی کا انتظار تھا۔

آٹا کے سلسلے میں کتنے کئے۔ اور چلے گئے گنتی بار ایک بھری گئی۔ اور پھر جوتی گنتی بار وہ ہنسی اور پھر روتی۔ گنتی بار یہ گھر بنا
اور اجڑا۔ ہائے۔ کتنے آدمی آئے اور چلے گئے۔ اور آٹا نے نہیں کھائیں۔ کو اب وہ کسی اور سے محبت کرے گی۔ لیکن چھ مہینے یا سالی کے
بعد وہ وہی پکڑ۔ ہر شخص نے اس گھر کی بدلتی ہوئی زندگی کو دیکھا تھا۔ لیکن ہر بار گالیاں کی ہوجھا آٹا کو سننا پڑی یہ جانتے ہوئے اس گھر
کے افراد خود کچھ کرنے کے قابل نہ تھے۔ اگر قابل ہوتے تو کب کے یہاں سے چلے جاتے۔ لیکن کہاں جاتے کہ سننا نا انہیں۔ سننا سننے
والی صرت آٹا تھی اور گالیاں کھانی والی بھی آٹا!

جہاں برس کے دہائی میں حد کی آگ بھڑکتی۔ سالی خود پیش کرتی ہے اور ہم صوف ایک مرد پر قناعت کریں۔ یہ مرد کتنے جلدے گندے
اور بیمار دھتے۔ خود کچھ دکھاتے تھے۔ بہن کی گائی پر زندہ تھے۔ اُجڈ۔ گنوار۔ چپ رہنے والے ماں اور بہن کی گالیاں سننے والے۔ بازوؤں
میں محبت ہوتی۔ تو ایک گھر بناتے۔ ان کے ذہنوں میں کی بار لہوات نے جسم لیا۔ لیکن کہاں حاتیں — کون اپنا سے گا نہیں۔ اب تو
اسی گھر میں زندگی کا نئی پڑے گی۔ یہیں سے جنازہ نکلے گا۔ لیکن آٹا تو عیش کرتی ہے۔ ہر چھ مہینے کے بعد بیمار مرد بھی گورا چٹا۔ کبھی کل شل
کبھی سوٹ پہن کر کتا ہے۔ کبھی بیٹھ گا کر کبھی لاریں بٹھ کر کبھی ٹیکسی میں کبھی سینما لے جاتا ہے۔ کبھی کپڑے خرید کر دے جاتا ہے۔
حالیہ پیش کرتی ہے اور ہم۔ بس صوف ایک مرد۔ کماے کوٹے۔ ڈنکے پتے۔ جالی سرکے۔ شرے۔ محض بیمار۔ اسی لیے انہیں اچھا نہ لگتا
تھا کسی کا اس گھر میں آنا۔ ان کو درد کسان کرنے سے کیا فائدہ۔ یہ کہے تو ازل سے گندے ہیں۔ اس صفائی سے کیا فائدہ۔ جس میں ان کا رولی حصہ
نہیں۔ محض لہم کرتے جاؤ اور دو وقت کھانا کھاؤ اور جاہل مردوں کو اپنا سوتی سمجھ جی تو ناک سکڑے بھی میٹھی ہوئی تھیں۔ آج مہمان

نہیں انہیں لایا تھا۔ بلکہ ان کی جاگ رہی خواہشوں اور آسٹروں کا جنازہ منگنے والا تھا۔

ہر صبح کے بعد شام آتی ہے جب آفتاب اپنی تمام صفائی سمندر میں غرق کر دے گا۔ اور آسمان پر سفیدی پھیل جائے گی۔ تو کچھ عرصے کے بعد دلوں کے کنارے اور خواتین پر جاوے گا تو ایک نیا چاند بھگتے گا۔ کچھ عرصے کے بعد اسے کھانے کے لیے لایا جائے گا۔ اس کا ایک وقت ہی کو بیٹھتی ہے۔ بجا کر نڈی مردوں کو کھانے والی شکر کی موت پہنچنے والی ہے فیرت۔ خاندان کی عزت کو خاک میں ملائے والی۔

کاش کہ نہ آئے۔ دن بھر بھاریاں ہی سر جیتی۔ یہ کھانا بچا پکایا رہ جاتے۔ یہ صفائی، یہ روکو رکھاؤ یہ اُجلا اُجلا مافرش۔ یہ بناؤ سنگار۔ یہ مسکراہٹ اس نڈی کی دھڑکی کی دھڑکی رہ جاتے۔ یہ روکے۔ اور دوزخ سے دوڑنے، اپنے بال نوچے۔ دواؤں سے ٹکڑی کے اس کی ماں دے۔ اس کے دھڑکتے جاتی دھڑکی۔ یہ کپڑے بچا کر بازار میں ٹنگی ناچے۔ یہ ہانگ بوجاؤ تو اچھلے۔ وہ خوش بول کے لہو بہرمان کے منہ میں ہمارے سادہ چائیں گی۔

ہاں اور حیران رہنا چاہتا تھا۔ آٹھ کے دل میں انتظار کی کیاں۔ بارے ٹھنک لاجوہن نے جوئے ٹھنک بری تھیں۔ اب انہی کی گاڑی میں اسٹیشن پر ہوگی۔ اب بری دلی کے قریب۔ اب گورے گاؤں۔ اب اندھیری۔

مراستندہ اب آتا ہی ہر گاہ کھڑکی میں نہ بیٹھ۔ تیرا ناچاے گا۔ ماں نے کہہ سنبھلے ہوئے کہا۔

ہاں وہی خانہ سے قریب۔ ان کے چادرلوں کی سونڈھی سردی خوشبو آ رہی تھی۔ پلاؤ تیار ہو رہا تھا۔ چائیاں پک رہی تھیں۔ براتی ایک ایک کر کے ٹھہرے ہمارے قریب۔ جب وہ آتا ہے۔ تو مردوں کو ٹھہرے جانا پڑتا ہے۔ صوف مار رہا تھا ہے۔ بھدیاں یکا یک کرنے میں دُک جاتی ہیں۔ ایک کمرے میں جس کے ایک کمرے سے چھٹی ذاتی مسکرائیں۔ کبھی کبھی دبی دبی سیکیاں۔ کبھی آہیں۔ بیقراری۔ دھڑکے۔ قہقہے، کھڑکھڑاہٹ اور کبھی کبھار مار پیٹ۔ کسی گاڑی پر کھڑے۔ آٹا کا ادنیٰ کر کے روکھا۔ ہانے کیا کرتے ہر آہستہ سے ہالی چھوڑتے۔ یہ سب کچھ بھاریاں دیکھتی بیٹھتی۔ اور اپنے مردوں کو گایاں دے کر رہ جاتی ہیں۔ جب کبھی وہ آئے والا ہوتا تو وہ ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے دعا کرتی۔ کاش وہ آج نہ آئے۔ سچ وہ نہ آئے۔ اُسے سینیں بابا۔ اُسے کالی کالی داسے۔ اُسے وہ جہاں کے ملک۔ اُسے ہلکری داسے کاش وہ آج نہ آئے۔

وقت گزر رہا تھا۔ وقت گزر جائے گا۔ وقت گزرا رہا تھا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ گلیوں میں بچے کھیں رہتے تھے۔ آسمان پر ستاروں کی لکشاں لڑ رہی تھیں۔ چاند نظروں سے اوجھل تھا۔ گزرتا۔ زور بنا جوا تھا۔ ہر چیز قرینے سے دکھی ہوئی تھی۔ اور آٹا کسی کے انتظار میں بیٹھتی ہوئی تھی۔ مار بستر پر دراز تھی۔ ہر شخص کسی کی آہستہ کا انتظار کر رہا تھا۔ ٹیکسی مٹے گی۔ کوئی اترے گا اور آٹا کی مرگھٹ کا وارث اس دنیا میں وارث ہوگا ہر مانس میں کسی کی آمد کا انتظار تھا۔ آٹا خوش تھی اُسے کسی کا خیال نہ تھا۔ یہ لمحات اُس کے اپنے تھے۔ اپنے خداداد کردہ تھے دنیا کے ہر شخص نے اُس سے بے رنجی بولی تھی۔ ماں سے بے کربھاریوں تک۔ دوستوں سے بے کربھاریوں تک۔ ہانے اُس کا اپنا بچہ نہ تھا۔ جس کو وہ پیسے سے لگاؤ نہ لگ سکے مانی دن کاٹ دیتی۔ کبھی تو اس نے ان لمحات کو پر اگندگی کے بہتے ہوئے اُس نے زندگی کو سولی پر چڑھا کر مرنے کے ٹکڑے کو اپنے گشت کو بچ کر۔ ثواب کو نپام کر کے خون کے تالاب میں خاک و خوشی کے چند لمحات اپنے لیے بخش کر لیے تھے۔ یہ سچ کر کہ دنیا تو ہمیشہ کچھ نہ کچھ کستی۔ کستی رہے گی۔

اسی سوچ۔ بچا میں انتظار کا وقت گزرا گیا۔ شام کی تاریکی نے اندھیری رات کی چادر اور دھلی ستاروں کی جگہ لگا ہٹ میں اور اندھیرا لگا۔ مغرب سے غمزدہ ہوا نہیں جاگئی۔ اور سارے آسمان پر ایک لکشاں لڑنے لگی۔ چاند نے اپنی لغت سے مسکراہٹ مارے آسمان کو

مرد کو جلد پتہ چاندنی، یہ تاروں بھری رات چھیلی کے پھولوں کی جگہ یہ تاروں کے دھڑکتے ہوئے ہیں۔ اور یہ وہی مٹی سی تھکی اور آئندہ۔ تو کب آئیگا۔
 کھانا تیار ہوا تھا۔ لی۔ اکی سوڑھی سرخ میوہ بٹور آہستہ آہستہ کھ رہی تھی جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ اس کی بھابیوں
 خوش ہو رہی تھیں۔ دروازے کے دلی میں درو کی میسرں کا اٹھنا ہوتا تھا۔ ہاں۔ آج کوئی رنگ نہیں بھر گیا۔ آج اس کی بھوی بھول زندگی میں ہاں نہیں
 تھے۔ آج کوئی بھی آگاہی جس نے آنا ہے۔ وہ ضرور آئے گا۔

وقت بیت رہا ہے۔ بہت جلدے گا لیکن ان لمحات کی کوئی قدر کرے گا۔ وہ کھڑکی میں بیٹھی رہی۔ جاہد و ساکت ساتھ بچان کے
 ایک ٹیکسٹ کی۔ سب کچھ لکھتے ہوئے۔ جو کہ کسٹریکٹ ہو۔ یہ صبر و سکون کا دیوتا تھا صدیوں سے اس کی دوج بھیرا اور ہیا سی تھی۔
 نہیں۔ نہیں۔ یہ خوشی شہرت اور دُور کا سیلاب تھا۔ ٹیکسی وہیں رک گئی۔ ادھر نہیں آئی۔ پھر نیر جیوں پر آہٹ آئی۔ ایک قدم
 پھر دوسرا قدم۔ جیسے قدم کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ آواز کے لیوں پر اس نے اگر روک لایا۔

اگلی صبح دروازہ کھلا۔ اگلے گئے اس کے پیٹ کو۔ ناں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ تو مرجانی تو اچھا تھا۔ میں اپنی
 آنکھوں کے سامنے تیری۔ حالت دیکھ لی۔ بھابیوں نے قہر آلود نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔
 ”اگلیا۔ ملک الموت کی خوشیوں کو فنا کرنے والا۔ اُن کی بدحتمی کا جوازہ نکالنے والا۔ بھیریا۔ اگلیا۔“

آواز نے سر ہٹا دیا۔ وہی بول گئے۔ وہی ہو سکتے ہیں۔ میرا آئندہ۔ میری راجتوں اور خوشیوں کا رکھوالا۔ اسے جان بہار۔
 اس وقت معلوم ہوتا تھا جیسے سینکڑوں ہماریں عورتوں میں ہیں۔ دروازہ کھلا۔ سامنے تار والا کھڑا تھا۔ ایک خاک کی درو پی پٹنے ہوئے
 رت نگاہوں کے سامنے پہچنے کی اُس نے لحاف کھولا۔ شاید کوئی غصہ چیز ہو۔ یہ کسی خزاں تھی جس نے ہماروں کی ساری بگینی لوٹ لی تھی۔
 ”کھا تھا“

آج نہیں۔ پھر کسی دن آئیگا۔ اُنٹل
 تار پڑھتے ہی آواز کے سامنے جسم میں ایک سکڑتا سا طاری ہو گیا۔
 آواز تار کو اپنی انگلیوں میں پھینکی ہوئی۔ پٹنگ پر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بھابیاں خوش تھیں۔ ہاں کے چپے پر ایک
 دُور سا برس رہا تھا۔

رات کی آنکھیں

کشمیری لال ذاکر

کئی روز تک چلتی ہوئی بھڑی آنند کو ہمیشہ پریشان کرتا رہتا تھا۔ اس کی ایک پرانی چوٹ جاگ اٹھتی تھی اور اس انداز سے جاگتی تھی جیسے قیامت جاگ اکر رہے۔

سکول کے دنوں میں کرکٹ کھیلتے ہوئے اُس کے سامنے کے دانتوں پر چبند لگی تھی۔ پہنچ تو اُس کی ٹیم نے جیت لیا تھا لیکن اُسے کئی دنوں تک ڈاکٹر مرثا کے کیمک جہان پڑا تھا اور پھر اُس کے دواؤں دانت ٹھیک ہو گئے تھے اور کئی برسوں تک اُسے کوئی تکلیف نہ ہوئی تھی۔ بلکہ وہ تو بھول بھی گیا تھا کہ کبھی اُسے گیند لگی تھی۔ کبھی وہ کرکٹ کھیلا بھی تھا اور کبھی وہ بیٹا بھی تھا۔ ٹکسٹوں کے بہت بڑے ڈیس میں دلی اُس کے ہاتھی کی جیت کبھی اُسے یاد بھی نہ آتی تھی۔ لیکن جب اُس نے بی بی کرنے کے بعد سکول میں ڈوگری کر لی تھی اُس کے سامنے کے دو دانت اُسے پریشان کرنے لگے تھے کہ اب اس کے ذہن کے ساتھ اس کے دانت بھی اس کی شریفانہ حرکت پر احتجاج کر رہے تھے۔ آنند کوئی غیر شریفانہ حرکات کرنے کے بعد آخر بے گھیا سنی قسم کی شریفانہ حرکت کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اُس نے چپ چاپ ایک برسوں دوپے کی ڈوگری کر لی تھی۔ جس روز سکول کے ٹاٹ رجسٹر میں اُس کا نام ہا، حویں نمبر پر لکھا گیا تھا اُس روز ڈوٹ کر مینٹو برساتا اور اسی روز ٹی بیروں کے بعد اُس کے سامنے کے دانتوں میں بے پناہ درد اٹھا تھا اور اُسے اپنی پرانی چوٹ یاد آگئی تھی۔ جو اُن اور لکھاؤں کا یہ سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا اور اُس کے سامنے کے دانت اسی شدت سے دھکتے رہے اور اُس کی بوڑھی ماں رضائی میں نہ چھپائے کھانسی رہی۔

چھلے چار برس سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا تھا۔ دس برس پہلے میں ضرور بھڑکی لگی تھی اور اُس کے سامنے کے دانت اس بُری طرح دھکنے لگتے تھے کہ اُس کا منہ سوج جاتا تھا اور اُس کی ماں بستر پر پڑی کھانسی دہنتی تھی اور وہ جھپٹتے بھر سکول سے غیر حاضر رہتا تھا۔ کئی صبح وہ سات روز کی چھٹی کاٹ کر سکول آیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر سوجن تو نہیں پر کچھ بخاری ہی سا اب بھی موجود تھا۔ اُس کے ذہن میں اپنی ماں کی کھانسی کی آواز اب بھی گونج اٹھتی تھی جیسے ایک سفر کے خانے کے بعد بھی گاڑی کے جھٹکے لگتے ہوئے موسس ہونے ہیں جیسے کہ اس تاریخ تھی اور اتنا مدے کے مطابق آج اُس اپنی جماعت کے لڑکوں سے نہیں وصول کرنا تھی۔ وہ چونکہ دیر سے سکول پہنچا تھا۔ اس لیے جماعت کے ڈیوٹی سر خود ہی ایک کاغذ پڑھ کر اُس کے نام لکھ کر فیس لینا شروع کر دی تھی اور اب وہ دسویں اسے کے کمرے میں بیٹھا صہری کے رجسٹر میں کا اندراج کر رہا تھا اور اُس کے سامنے میز پر ریو گاڑی اور ڈوٹ بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ آج بہت دنوں کے بعد دھوپ نکلی تھی اور باہر میدان میں ٹھہری ہوئی دھوپ کا وکٹس سا اُجالا کرے کے اندر بھی آ رہا تھا۔ کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں اور

شیشوں سے اپر زینہ پہن کر جاتی تھی۔ وہ جب کبھی بند کروں اور کھٹے ہونے احوال میں ہوتا اسے گتا کر باہر کی
 ریتیں اُسے آواز دیتی دے دے کر باہر نکالتی۔ وہ ان آوازوں کو سن کر بھلاؤ نہ کیا کہ وہ کبھی کبھی انہیں اُس کے مقدر مہروں کی طرح مچتی تھیں
 جیسی کہ گرم گرم لاکھ کی مہر پر یہ زینہ سٹی کے منبر پر کھٹے ہونے پر چون کر سیدہ مزید بند لوں میں سی کر لگتا تھا۔ ایک ہاتھ مہر پر لگاتے
 ہونے اُس کی انگلی بھی جھپٹ گئی تھی۔ وہیں اس کے بندلوں میں جیسے ہونے اندر اپنی مجلسی ہوئی انگلی کا خیال آگیا۔ اُس نے ایک نظر اپنی
 انگلی پر ڈالی جس پر پڑا ہوا اب ہلکا صاف ہر پکا تھا اور پھر اُس کی نگاہ بند دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ شیشے کے ساتھ کسی عورت کا چہرہ لگا تھا جیسے
 اہل اٹلانٹک پر در کول کی کوئی مہر لگا رہی ہو۔ وہی مہر کے لیے جھٹک لیا۔

بائیں طرف دروازہ کھولا اور آگے دیکھا کہ اُس کے سامنے جزئی ہندوستان کے کئی دور افتادہ حصے کی رہنے والی ایک عورت
 کھڑی تھی۔ اُس کا چہرہ ایک دم سیاہ تھا جیسے مادوس کی گھنیری رات ہو۔ اُس کے بال خشک اور اُلجھے ہوئے تھے امدان سے اور پر تنگ
 اُنہی ہوتی ایک زانیہ کی سرخ رنگ کی تنگ چول میں اُس کی جوان چھاتیوں کا اُٹھا اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ بیشتر اس کے کردہ اُس کی
 سیل سی زانیہ کی طرف اور پھر اس کے تنگ پردوں کی طرف دیکھنا اُن کی آنکھیں کھلے اُس کی چھاتیوں پر آگئی جیسے کوئی تیز جھپتی
 ہوئی گیند کسی روک سے ایک دم ٹھہر جائے اور پھر اُس کی آنکھیں اُس کے چہرے کی طرف اُنہیں سیاہ چہرے پر چلتی ہوئی آنکھوں میں وحشت
 اس طرح ناگہاں رہی تھی جیسے بندھیری رات میں شیشے لپک رہے ہوں اُسے یوں لگا جیسے وہ جزوی ہندوستان کی ایک مہر کے سامنے
 ہوئی عورت کو نہیں مادوس کی ایک گہری اُٹھا رات کو دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں میں شعلے ناچ رہے تھے۔ جن میں روشنی کم امداد دینے
 کی صلاحیت زیادہ تھی۔

بندھری میں مادوس کی گہری رات کی اُٹھا تار کی تھی اور باہر میدان میں سردیوں کی ٹھہری ہوئی دھوپ انکڑیاں لے رہی تھی۔
 کیا ہے؟ اُس نے عورت سے پوچھا

عورت نے جزوی ہندوستان میں بولی جاتی ہوئی کسی زبان میں اپنی بے بسی اور بے جا رگی کا اظہار کیا۔ وہ صرف اتنا بھی سکا کہ اُس
 عورت کو کہیں جانا تھا اور اُس کے پاس کوئی کسے پیسے نہیں تھے۔

"کتنے پیسے چاہیں تمہیں؟"

"دس روپے" عورت نے اپنے دو ذراں ہاتھوں کی اُنچلیاں پھیل کر سامنے کر دیں۔

اُنہ نے دیکھا کہ اُس کے دائیں ہاتھ کی پہلی دو انگلیوں کا درمیانی حصہ سگڑا ہوا بیڑیاں پانی کی درو ہو چکا تھا۔

"سگڑا ہو گیا؟"

"ہاں" عورت نے اثبات میں سر ہلایا اور ذرا سا مکروہی اور اُنہ نے دیکھا کہ اُس کے دانت بیدار تھے اور پیسے تھے۔ اُنہ نے اپنی جیب میں سے
 سگڑا کی ڈیبا نکالی کہ اُسے ایک سگڑا دیا اور پھر دیا نکالی جلا کر اسے سگڑا بھی دیا۔ جزوی ہند کی اُس عورت کا سگڑا جلاتے ہوئے لہروں کا
 جیسے دیا نکالی کا شعلہ اُس کی آنکھوں میں پگھلتے ہوئے شعلوں سے اچھا لگتا تھا اور بندھری میں جیسے ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری
 کرنیں ناگہاں تھیں۔

"بڑی جادو"

آنند کے کہنے سے عورت فرخ پر ٹپکے گئی اور بڑے مزے سے سگرٹ پینے لگی جیسے وہ اپنا سارا دکھ درد بھول چکی تھی۔
 آنند وہ بارہ گز شرمیلی خیموں کا اندراج کرنے میں غور ہو گیا۔ اُس نے کچھ ہی لمحوں کی فیس درج کی تھی کہ عورت بول اٹھی۔
 "میں نہ شرمی کہہ سکتی۔"

اپنے دفتر میں ہے آنند نے جواب دیا۔

"ایک نیٹ کا گاڑی جانا۔"

آنند نے غور کیا کہ وہ نہ تو شہر اندہ اور نہ شہر بندی ہی بول سکتی تھی لیکن افلاک کو چڑھ کر اپنا مطلب ادا کر لیتی تھی۔ اُس نے
 کلاں کی ٹھری کی طرف دیکھا۔ بارہ بج رہے تھے۔ اُس نے سوچا اگر اُس عورت کو ایک نیٹ کی گاڑی مل جائے تو اُسے کچھ دے دلا کر چٹا کرنا چاہیے!
 "یہ تو ایک سوویت آنند نے میز پر کھڑے ہونے والوں میں سے ایک نوٹ اٹھا کر عورت کی طرف بڑھایا۔ وہ اپنی جگہ سے ایک دم اٹھ
 سگرٹ کے آخری جیسے کوڑی بے پروائی سے کمرے میں پھینکا لیکن ایک نیٹ کے ٹکڑیاں نہیں۔ اُس کی نظریں میز پر کھڑی ریزکاری اور نوٹوں پر جم
 گئیں اور جانے کیسے اُس کی پرانی میل سازھی اُس کے کندھے سے ایک طرف سرک گئی اور اُس کی تنگ چولی میں ڈھکی جھپکوں اور بھی زیادہ
 ابھر آئیں۔"

"بس ایک دو پیاسے اُس کی آنکھوں میں جیسے شعلوں کی پلک اور بھی تیز ہو گئی تھی۔"

"اتھار لو ایک اور" اُس نے میز سے ایک نوٹ اٹھایا۔

"بس! عورت نے عجیب نظریں بھرے انداز میں کہا جیسے اُس کی مردانگی کا مذاق اڑا رہی ہو۔ اُس کی نظریں پائے کے نیچے
 سے میز پر کھڑے ہونے والوں اور ریزکاری کو گھور رہی تھیں۔ اُس کی دھڑکی لاپرواہی سے سر کی تھلا
 رہ چلی تھی۔ ہر ماہر جو اب تک خاموش کھڑا تھا اُسے سے بلا اور آنند کو اس کا اس جو کہ وہ دہان ایک یا نہیں تھا۔ کوئی دوسرا شخص بھی
 موجود تھا جو اُس کی سرکات کا جائزہ لے رہا تھا۔"

"یہ لو اور جاؤ" آنند نے یہ نکال دیا۔ اُس سے ایک انٹمی اور انتہائی اور اڑھائی روپے اُس کی طرف بڑھایا۔ پتہ اُسے پہنچے من
 میں عجیب سی جھلکا ہٹ کا احساس ہونے لگا۔

"پانچ لینا ہے" عورت نے اپنے دہانے کی انچلیاں آنند کے پہرے کے سامنے کر دیں۔ آنند کو لگا جیسے وہ اپنی چھاتیوں کے
 اُبھار کا مال تول کر رہی تھی۔ اُس کے بلے کر دیو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اُس کے جسم میں کچھ بھر کے لیے ایک عجیب سی تھر تھری پھیل گئی۔ اُس نے عورت
 کے پہرے کی طرف دیکھا۔ اُسے غور سے دیکھا کہ اُس کے رات کے سینے پر ایک دھواں سا لادو لگا رہا تھا۔

پل بھٹکتے لیے اُسے خیال آیا کہ کاش یہ غور سے دیکھتا تو کس وقت کمرے میں نہ ہوتا۔ لیکن پھر قراری اُس نے نہ اپنے آپ کو ٹھٹھا جیسے
 اپنے ذہن کو طبعاً مار کر رہا جو کچھ وہ سوچ رہا تھا وہ غلط تھا۔ اُسے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ وہ ایک شریف آدمی ہے اور بہت سی غیر شریفانہ
 حرکات کرنے کے بعد اُس نے روزی کرنے کے لیے ایک شریفانہ حرکت کی ہے۔ وہ چاہا۔ ہاتھ کا وہ عورت فوراً ہی اُس کی نظروں سے
 دور ہو جائے۔ اماں کی رات کے سینے پر نہ ہوتا ہوا لادو جیسے اُسے جھلس رہا تھا۔ وہ کچھ سمجھ رہی اُس کی حاضر کی کرداشت نہیں کر سکتا۔
 اُسے ایک دم چلے جانا چاہیے۔

”ہو پانچ“ اُس نے پانچ لاکھ لکھ کر اٹھ کر عورت کے ہاتھ میں تھمایا اور اپنے رجسٹر پر جھک گیا۔ اسے بھابی جیسے عورت کی آنکھیں برے کی طرح اُس کی گردن پر چکی اُسے سنبھال رہی تھیں۔

”جہاد اب“ اُنہ نے سختی سے کہا اور کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔
 باہر کھڑی ہوئی تو دھڑکے سے اُڑا رہی تھی اور اُس نے اُس کی آواز کو کچھلے کی کشش میں اور بھی اُونچی آواز میں کہا۔
 ”ہاں کیوں نہیں؟“

”سگڑ“ اُجڑی ہندوستان کی ایک بڑے بس عورت جس کے پاس کرائے کے پے پیسے نہیں تھے سنا رہی تھی۔
 اُنہ نے کوٹ کی حیب میں سے سگڑ کو ڈیا نکالی اور جتنے سے اُس کی طرف پھینک دی عورت نے مکرراتے ہوئے اسے

اٹھایا،
 ”اچھا“ اس کے کندھوں پر ڈپا ہوا سا رچی کا پوٹھریا اُڈاڑے سے بچے سرک گیا اور چولی کے ناف کے اوپر واسے جھٹکے کے دو
 تھک گئے۔

اُنہ کو کچھ جیسے کسی نے جھجھکا ہوا ٹھکڑے اس کے داغ کی سطح پر کھود دیئے تھے۔ وہ ڈھلا سا اٹھا۔ اُس نے میز پر رکھی ماس کو اٹھائی
 نند سے کہا ”اُس کی تیلیاں فرش پر کھینچ لیں اور پھر اُس نے اپنی آنکھیں یوں رجسٹر کے خانوں پر جھکا دی جیسے کسی نے اُس کے پوٹوں میں لکھیں گا۔
 کلاہیں ایک جگہ جمادیا ہو۔
 بائیر اپنے اُستاد کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور وہ عورت فرش سے تیلیاں اٹھا کر جمع کر رہی تھی لیکن اس لاپرواہی سے جیسے
 انہیں جمع کرنے کی بجائے کھینچ رہی ہو۔

اُنہ نے اس کے بعد رجسٹر سے نظر نہیں اٹھائی
 کچھ عرصے کے بعد جب اُس نے ڈرتے ڈرتے نگاہ اُپر کی تو اُس کی رات داخل ہو چکی تھی۔ عورت جا چکی تھی اور برے کی طرح چھیدتی
 ہوئی اُس کی آنکھیں ہار ہو گئی تھیں۔ اُنہ نے غیر ارادی طور پر اپنی گردن کو مٹا جیسے کسی مجسمے جیسے زخم کو سہلا رہا ہو۔
 ”کم بخت“ وہ سادقت رہا کو ڈالا ”اُس نے بائیر کو نالہ کرتے ہوئے کہا۔

اس وقتوں کی لمبی کھنٹی بجی۔ فیس وصول کرنے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ اُنہ نے دینا بھاری اور نوٹوں کو بغیر گنے اپنے رومال میں سٹپا
 اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اُس نے دیکھا فیسوں کے اندراج میں اُس نے بے شمار غلطیاں کی تھیں۔ میزبان غلط تھے اور رقم جمع کرانے وقت اُس نے
 پانچ روپے کم جمع کرانے تھے کیونکہ اُس کی اپنی حیب خالی تھی اور اُس نے فیسوں میں سے پانچ روپے اُس لاجپار عورت کو دیئے تھے۔

جنوبی ہندوستان کی وہ عورت مل گئی لیکن اُس کا چہرہ اُس کے پریشان ہالی اُس کی چھاتیوں کا ابھار اور چمکتی ہوئی آنکھیں تمام
 دن اُنہ کے ذہن میں گھومتی رہیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے جھٹ کی منڈیر پر دوڑے ہوئے چرخ روشن تھے۔ اُس کی کھپ اندھیری کوکھری
 میں سے دوچمکتی ہوئی آنکھیں باہر کھڑی ہوئی دھڑک رہی تھیں۔ جنوبی ہند کی اس عورت کا قصد سارے سکول میں پھیل گیا۔ اُس کے سامنے
 اُستادوں نے اُس سے جی بھر کر مذاق کیا۔ لیکن اس کے باوجود اُسے ایک سکول کا احساس ہو رہا تھا۔ اُس نے ایک ضرورت مند لاجپار

عزت کی مدد کی تھی اندھروں کی طرح اُس سے کچھ وصول نہیں کیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ ایک بجے کی گاڑی میں بیٹھ کر دوسریل دور جا چکا ہوگی ،
راجستھان کے کسی خوبصورت شہر میں ، اطباء وہاں سے آگے جانے کے لیے کرایہ اٹھا کر رہی ہوگی ۔
شام کے چھ بجے تھے ۔

آنند نے اپنے بزنس کے بھاری پان گورانی سے محسوس کیا اندھانتوں میں رکھے ہوئے مدنی کے پلک میں دبی ہوئی دوا کا کڑا پی تھا گا
اور پھر اُس گلی میں داخل ہو گیا جس کی گزشتہ بزنس پوزیشن کی دکان تھی ۔ جس سے اُس کا سگٹ پانی کا ادھا رچتا تھا ۔ اُس کی دکان پر بیسی ایکڑوں
کی قیمت پر وہاں تھیں بریں شیشوں میں جڑی تھیں ۔ بزنس پوزیشن کی دکان خاص قسم کے پائوں کے لیے مشہور تھی جس میں بقول پُرنی تریوں کا دس ڈالنا تھا
نور اور دوا پر واقع دلی شراب کے ٹھیکے سے نکلتا ہوا ہر شخص ادھر سے گزرنا تھا اور تریوں کے دس ڈالنا پان خریدنا تھا دلی شراب کے ٹھیکے
پر اُسے دسے ہر شخص کا پونے کے ساتھ حساب چلتا تھا ۔

آنند پُرنی کی دکان پر آیا ، اُس نے سگٹ کی دوا ، مایچی ، اور تریوں کے دس ڈالے دو پان لیے ۔ سگٹ سگٹ کر جب وہ
واپس بازار کی طرف مڑنے لگا تو اُس کی آنکھیں ٹھیکے کے باہر لگے پ پ اسٹ کے نیچے کھڑی عورت کی طرف اٹھیں ۔ ان جہانے میں ہی اُس
کے قدم اُس طرف پڑے ۔

جنوبی جند کا ایک مروجہ میں بولی پڑے ٹھیکے سے باہر نکل رہا تھا ۔ اور جنوبی جند کی وہی عورت جبکہ آنند نے عیسوں کی رقم میں
سے پانچ روپے دیئے تھے ۔ سگٹ کا دھواں اڑا اُسے ہوئے اُس کا انتظار کر رہی تھی ۔
اما دس کی رات اپنے بھرپور جوہن پر تھی اندھ اُس کی آنکھوں میں الاؤ سنگ رہے تھے ۔

ایمان کی سلاستی

جیلانی بانو

حافظ جی آئے ہیں۔ اماں بی کا ہوتا ہوا سر تھا کہ تقریباً آٹھ سال کے کلن میں گھٹنے ہوئے زتر سے سنا یا۔
 حافظ جی کے آنے کی خبر سن کر اماں بی کا روٹی کی طرح سفید سر اور ڈونگ گانے لگا۔ اپنی اخیر کی ڈوبیہ انھوں نے تکیے کے
 نیچے چھپا دی۔ جمال شریف چوکی پر رکھی۔ اور سفید ٹکڑوں پر سے بتا ہوا پانی پونچھ کر وہ پتنگ پر اپنی چتر ڈٹوٹنے لگیں۔
 آن کا پرنا سلیمہ اماں بی کے ان لڑھے سے چوٹوں کو سخت ناپسند کرنا تھا کہ پچھتر برس کی عمر میں بھٹی بھٹی سے پردہ ہو گیا
 ہے۔ سافنا جی کے آنے کی خبر سن کر چادر ٹوٹی جا رہی ہے۔ یکس ماٹا ہو تو تنگے میں پردے لگائے جا رہے ہیں۔ عورت چل چل کر
 کی طرح سوکھی ناز کی بن جائے مگر خوش فہمی پھر بھی اس کا بیچا نہیں چھوڑتی۔ اب جیلانی جی بچا رہے خود انکھوں سے اندھے کاؤں
 سے پٹ مگر اماں بی آن کا آنا سن کر بڑی اچھلی پڑی جیسے آن کا ملکیتر پسند کرنے آ رہا ہو۔
 سپیم کے بد بدلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ کر اماں بی سمجھ گئیں کہ انہیں فیصحت کی برائی ہوگی!
 عورت پر زور کے تین دن بھی بھاری جرتے ہیں۔ زندگی بھر غیر مرد نے ایک بال نہ دیکھا تو اب تمھاری بہنوں کی طرح مچھاڑ
 منہ بھاڑ، سچائی کھولے کیسے ملکتی پھروں؟
 ویسے بھی حافظ جی تو آن کے دشمنوں میں سے تھے۔ اماں بی کے خاندان اور کھارے کنوئیں والوں سے تو ایک زمانے کی
 عداوت چلی آ رہی تھی۔ اس زمانے سے جب حافظ جی کے سکڑا داوانے اماں بی کے کھڑاوا کی زمینوں پر چری ہوائی تھی۔ بڑھتے
 بڑھتے اس بات میں اتنی شاخیں بھولیں کہ اماں بی کے داوانے حافظ جی کے کسی بزرگوار سے بیچ چوک میں کھڑے ہو کر کہا تھا۔
 آج ہے چارے اور کھارے کنوئیں والوں کے درمیان سارے رشتے ٹاپے بند۔ حرامی ہوگی وہ اولاد جو تمھارے دروازے
 پر جائے؟

یہ بات اس زمانے کے بزرگوں کے منہ سے نکل گئی جب بزرگ یونانی و قتاؤں کی طرح کائنات کی ساری چابیاں اپنے ہاتھوں میں رکھتے تھے۔ ہذا سب نے حدیث شریف کی طرح اس بات کو پیشہ مسئلہ نہ رکھا۔ "تو مرگے ہو گئے۔ ان کی بیٹی کی نہ اپنی دی۔" دیکھئے اس نے۔ "وہ بے ہوشی میں سرکب ہونا ہی پڑا۔" پڑوسیوں سے لڑنے اور ملنے کی روایتیں بھی نبھائی جائیں۔ بچے میں تو ایک آنکھ میں تھپک چھپا کھول رہے ہیں۔ جہاں میں تو ایک دوسرے کی دوستی کو نبھا دیکھانے کی فکر میں ہیں۔ بزرگ بھی اویسی ہی سے ملتے۔ مگر اس طرح کہ بھری جھل میں ایک دوسرے کی دھن کی گ پڑنے سے کہیں نہ چو کے۔

حافظ جی اسی کے پیروں میں تھے۔ وہ تو کہہ کہ اچھے وقتوں کی گھلائی پلائی تھی کہ اس عمر میں بھی لاٹھی پکڑ کے گلی پار کر بیٹھے تھے۔ بچتے دے جیسی آنکھوں پر ٹوٹی کی جھونکی کی عینک لگا کر۔ لوگوں کو پہچاننے کی کوشش کرتے۔

باقی پور میں دشت، زمین اسی طرف الجا رہی تھی اور وہ پھیلنے جا رہے تھے۔ اوپر سے دوسرے تھا کہ ایک پل چین نہ بیٹے بنا تھا۔ ہر وقت دوسری جتنی رہتی تھی۔ یوں کہتے کہ دشتوں کو محل دے کر جسے جہاں رہے۔

گھر آج اماں بی نے انہیں جس بات کے لئے بلایا تھا، اس نے ان کا ٹھنڈا خون کھولا دیا تھا۔ اتنا جوش تھا کہ کہاں تو پٹی سے اترتا دورا ہر تھا یا ایک جانب کسی بچے کا ہوا۔ اسے ایک جانب لاٹھی پکڑتے اماں جی سے ملنے نکل کھڑے ہوئے۔ کھٹ کھٹ کرتے، وہ اندر آئے تو اماں جی کی چھوٹی ہوا آگے بڑھیں کہ ہاتھ پکڑ کے راستہ دکھادیں۔ مگر انھوں نے ہاتھ جھٹک دیا۔

• یہ گھر میرے لئے نیا تھوڑی سی ہے بٹیا۔ میں نے تو اس آنکھ میں کئی ٹونڈا کھیلنا ہے۔"

حافظ جی کی اس بات پر سارا گھر ہنس پڑا۔ کیا یہ بھی کہیں نہ تھے۔۔۔ ایقین نہ آتا تھا۔

"ابھی ہو۔۔۔؟ دو خود کاؤں سے پٹ۔ تھے۔ اس لئے لئے زور سے بولتے تھے کہ دوسرا ہر ابھی سے لے۔ چنانچہ بھری اماں بی نے ان کی بات کا جواب دینے کے لئے جلدی جلدی اپنا پیرلا منہ چلا دیا۔

"سچے ہیں تو کوئی سبب مارا لیا ہے۔ ہمارا تو جیسا مناسب برابر ہے۔ جانے کوئی گھڑی مقرر ہے کہ آہی نہ چکئی؟" انھوں نے ڈگر ڈگر ہنسی ہوئی گردن کر تکتے کے سہائے ٹھہرایا اور باؤ کو نے گئیں کہ پہلے اپنی دائمی کھانسی کا حال سنائیں یا اختلاج کا اپروں پر ورم کی تکلیف بیان کریں یا گھٹیا کاؤکھ سنائیں۔

ہاں۔۔۔ حافظ جی کو لوگوں نے آٹھا کر پٹنگ پر ڈھیر کر دیا تو وہ ایک ہائے کر کے لمبی لمبی سانسیں پھینکے۔

"ٹھیک کہتی ہو۔ ہر قسم لمبی اب گارے آگے۔ اب تو یہی دعا ہے کہ اللہ ستر ایمان کے اٹھائے۔ ایمان مضبوط ہے تو بلی صراط میں پار کر لیں گے۔" اس نے میں ایک نوکر نے حقہ بھر کے مسئلے رکھا اور نے حافظ جی کے ہاتھوں میں تھما دی۔

مگر اماں بی نے ان کی پوری بات نہ سنی۔ کچھ دیکھ کر اٹھانے کی جھنجھک کان میں پڑی۔

"اور کیا۔ میں تو یہ سوچوں ہوں کہ اس قیامتی وقت کو دیکھ کر دل بند کیوں نہ ہو جانا ہمارا۔۔۔؟"

وہ چپکے چپکے انہوں کی ڈبیر ٹوٹنے لگیں کیونکہ جمائیوں کے مارے برا حال تھا۔

• اس کی مصلحت ہے۔ حافظ جی نے اٹھی آٹھا کر اوپر دکھایا اور حقہ کا گھونٹ بھر کے دھواں چھوڑتے ہوئے بولے۔

مردود کی خدائی میں قرآن نے آگ لگا دی تھی۔ مگر یہ مردود تو آسمان پر لگی لگا رہے ہیں۔ دیکھتی جاؤ کیسا فقر نازل ہوگا۔
 بات ختم کر کے وہ یوں چپ ہو رہے جیسے اس قبر کے قفسے کا انتظار کر رہے ہوں۔
 لئے تو کیا یہ قبر سے کچھ کم ہے؟ اماں بی نے اٹھ بچکے اٹھل بھول پر دیکھی۔
 ملاکیاں اپنے منہ سے بڑا مانگ رہی ہیں؟

سافطی جو تک پڑے جتن کی لئے اٹھ سے چھوٹ گری۔ جیسے اس قبر کا پہلا پتھر ان پر آن کر رہا ہو۔ یہ تو اماں بی صفوان
 پر چوٹ کر گئی تھیں۔ ابھی وہ ایک ہی چوٹ سے سنبھل رہے تھے کہ اماں بی نے پتھر اٹھ کر شروع کر دیا۔
 اب کہاں گئیں وہ آؤ بچی ناکیں جو اپنی ضد میں آکے آڑے آڑے بیل چیر دیا کہ فی نفس لے جو ان ہنسنے لگتے اٹھ رہے
 ہیں۔ مگر اللہ میاں نے ہمیں تو جنیں کیا کیا دکھانے کو باقی رکھا ہے؟

لیکن حافظ جی کو کھانسی کے پھندوں سے کچھ نہ کہنے دیا۔ صرف بے بسی سے اٹھ بلائے رہ گئے۔
 اماں بی سچ چلنے سے بیزار ہو چکی تھیں۔ زندگی کے سارے رنگ تو دیکھ ڈالے۔ میاں پر حکومت کی اور ساس کی مار
 بھی کھائی۔ ایک جوان بیٹے کو اپنے ہاتھ سے گھن پھنایا۔ دو لڑکوں کے سر پر سہرے مارا۔ پھر اسی کے بچوں کو بھی اپنے ہاتھ سے
 ڈولنا بنایا۔ اوبھین واماہوں کی آؤ بھگت کی۔ تیس برس ہونے کو سہاگ کی چوڑیوں پر پتھر گرا۔ زندگی کی ہر کڑواہٹ بھی گھونٹ
 گھونٹ کر کے پینا پڑی۔ اب وہ سارے عملے کی اماں بی کہلاتی تھیں۔ آئیگیا ان کے نورانی پیرے کو دیکھ کر ٹھٹھک جاتا۔ انجین سلام
 آکے ان کو دعاؤں کا منتظر رہتا۔ لوگ کہتے تھے، اماں بی اگر کسی کو دل سے دعا دیں تو وہ ضرور پوری ہوتی تھی۔
 سید چاندی سے باؤں میں بھیجی، پھر اٹھ کر لے کیسی جھڑیاں اماں بی کے صبر و استقامت کی گمانیاں کہتی تھیں۔ ان کے پیرے
 پر ڈوبتے سورج کی خوبصورتی تھی۔

اب تو وہ وی آن لگے تھے کہ وہ سارے گھر کے لئے گرم دودھ بن گئی تھیں، جو نہ نکلا جاتا تو ان کے گھس پڑتی۔ ان کی
 بک بک جھک جھک سے سب بیزار لگے، مگر کوئی ماننے یا نہ ماننے وہ ہر بات کو اپنے نہ مانے سے لاکے دیکھتی تھیں اور غصت
 بھیجا کرتی تھیں۔ نواسوں تو ان کے خون میں تو تیر پھر ملاوٹ تھی۔ ان کے اپنے بیٹے پھلیاں بھی اماں بی کے کئے کو جھڑب کی
 پڑھتے تھے۔ شاید اللہ میاں کے ہاں ان کی عمر کے حساب کتاب کے کاغذ چوسے لے گئے تھے اور وہ بس جتنے جارہی تھیں۔
 اب اسی بات کو لے کر سات پشتوں سے ہوتی چلی آتی تھی کہ کھارے کنوئیں والوں سے رشتے ناٹے نہیں ہونے۔
 مگر آج اماں بی کے ناخلف پوتے سلیم نے طے کر لیا تھا کہ بہاہ کرے گا تو حافظ جی کی نواسی غزالہ سے، اور دونوں کے
 ان بابیہ رشتہ کرنے کو ہنسی خوشی راضی تھے۔

اماں بی نے سنا تو سر پٹینے لگیں، چیخ چیخ کر سارا گھر سر پٹا اٹھا لیا۔ اپنے بیٹے کے بازو میں لٹک گئیں کہ پینے انجیر پڑ
 میں ڈال آئے۔ پھر کھارے کنوئیں والوں کی بیٹی اس چوکھٹ پر چڑھ گئی۔ اماں بی کا بیٹا ابھی حال ہی میں پونسیبیری سے واپس آیا تھا
 گھر میں آن پڑا تھا۔ ریشا پڑھنے کے بعد خاندان کو سنا رہے اور پرانی روایتوں کو نبھانے کا شوق اکثر جاگتا ہے۔ مگر چلتی ہوا
 کے آگے ہند میں ہند سے جاسکتے۔ یہ بات کچھ ترس کی اماں بی نہ سمجھ سکیں۔ لیکن ایک ریشا پڑ پروفیسر تو سمجھتا ہے!

ایس ہر کر اماں بی نے حافظ جی کو بلا بھیجا۔ وہ سارے محلے کی اماں بی نہیں تو حافظ جی بھی اپنے خاندان میں تہرک کے حصہ پر سکے ہاں سولے بزرگ تھے۔ بیٹوں، بیٹیوں، پوتوں، پڑپوتوں کو ملا کے بیٹھتے تو تعداد سونک پہنچ جاتی تھی۔ وہ لوگ خرموان پر ویسی سوراگروں کو لپٹنے سے بچا بچتے تھے۔ دُنیا جانتی تھی کہ اماں بی کے سکرٹ واداکے کوئی لکڑو لودا وٹرن پر رشک لاوے کہیں سے آئے تھے۔ اب وہ اپنے منہ سے سید کہیں تو دُنیا کو مانتا ہی پڑتا۔ ویسے دل کا حال کون جانے کہ کس کیفیت کی مری تھی۔ حافظ جی کا بس چلتا تو دیدہ بھٹی چٹکی کٹی خزانہ کو زندہ گاڑ دیتے مگر خزانہ پڑاؤن کے علاوہ کاجی بس نہ چلتا تھا۔

وہ کوئی ناکھ پچی تو بڑی ہے۔ سلاکڑی پاس کر چکی ہے۔ اپنا بڑا بھلا سوچ سکتی ہے۔
حافظ جی نے داماد کی یہ بات سنی تو چکرا کے رہ گئے۔ کیا لڑکیوں کے پاس بھی دامخ ہوتا ہے! وہ بھی اپنے بڑے بھلے پر غور کرتی ہیں!

آنھوں نے لائٹ سنہائی اوو چلے اماں بی کے پاس۔
جب سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہوں تو اترا ناکیسا! مگر اماں بی تو کانٹوں بھری مچاڑی کی طرح انھیں پھٹ گئیں۔
ایک تو کھانسی کے پھندے۔ اوپر سے اماں بی کے زہر میں بچھے ہوئے جملوں کے لئے موزوں الفاظ کی تلاش۔ حافظ جی تیز ہوا میں کانپنے والے کپڑے کی طرح لرزنے لگے۔

”میں جانتا ہوں تمھاری سب چالیں۔ وہی زمینوں کا انتقام لے رہی ہو۔“ اگے یاد رکھو۔ خود ہی قبر میں پیر لٹکائے۔
لیکن اماں بی نے اتھڑاٹھا کہ اُن کی بات بچہ میں کاٹ دی۔
”ارے عاڑ بڑے آئے قبر کے خدا سے ڈرانے والے۔ پہلے اپنی اُن گھنڈیں کو تو روکو کہ برصغورم بچوں کا راستہ گھیرتی پھرتی ہیں۔ اُن کے لئے بھی تو اللہ نے کوئی سزا مقرر کی ہے۔ تمھوں نے تمھاری سنیو۔ وادی میں کو لک ملی ہے۔“
”میرے۔۔۔ میرے۔۔۔ میری نواسی کو کچھ کہا تو۔۔۔ تو۔۔۔“ حافظ جی اتھڑے اٹھ کے اٹھائے سے بات پوری کرنے لگے۔ کلمات رچکے تھے۔ مگر یوں اماں بی کی طرف چپ پھیریاں دینے والے مخالف وکیلوں سے پاؤں توڑی پڑا تھا۔

”مٹے ہے۔۔۔ بڑے آئے اونچی ناک والے۔“ غصہ کے مارے اماں بی کی سانس پھولنے لگی۔
”سب جانتے ہیں تمھاری بھوپچی کے کہ قوت۔ کون مانے کیا عیب تھا کہ ٹھیکہ لے کی مانگ ٹوٹی تھی۔“
”اور تمھارے۔۔۔ تمھارے۔۔۔ حافظ جی غصہ کے مارے تن پھٹنا گئے۔ اتھڑاٹھا کہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے کہ حقہ کی چلم گر کے ٹوٹ گئی۔

”بس بس رہتے دو۔ میرے عیب کیا گنو گے تم میں نے اپنی ناک اونچی رکھنے کے لئے اپنے آپ کو خاک میں ملا دیا ہے۔“
عورت سے بحث میں کون مرو جیتا ہے کہ حافظ جی جیت جاتے۔ ان کی رگوں میں جھار جھار خون شان شان کرنے لگا۔ جی جیام روتا تھا اس بد زبان پوس بڑھیا کو اتھا کے کلر کی طرح چٹک دیں۔ یوں بھی عورت کی زبان کے سلسلے مرو ایک ہی ہتھیار استعمال

ہیں کھنگارہ کے آیا کرو۔
ریاض نے سنا تو یوں روکھڑا کے پلنگ پر بیٹھ گیا جیسے ٹانگیں ٹوٹ جاتی ہوں۔ اب اس میں کیا رہا تھا جسے اٹھا کے
میاں سے لے جاتا۔ ————— جب چار دھندل کر آم کا ہوا اگا۔ ہے تھے تو ریاض نے اسے اپنے آنسوؤں سے سیراب
کرتے ہوئے کہا تھا۔ ————— اگر تم جاؤ تو نہی میں زندگی بھر یہاں رہ سکتا ہوں اور پھر مٹی میں سنے ہوئے ہاتھ جھٹک کر
اس نے ہاتھ دقت کیا تھا۔ ————— سوچ لینا۔
”نہ پھر مت جاؤ۔ یہ بات اس نے ایسی دلدوز چرخ کے ساتھ کہی جو فیصدنا عرش کو چلا گئی ہوگی۔ مگر اس کے لبوں
کو نہ ہلا سکی۔

پھر اس نے کچھ نہ سوچا۔ ————— کیا لڑکیاں بھی سوچا کرتی ہیں!
پھر ایک دن گلی باجوں سے گونج اٹھی وہ سارے محلے والے نہی کی برات دیکھنے نکل آئے، جو ریاض کے گھر میں
ٹھہرائی گئی تھی۔ ریاض بھی گلی میں آکے آتش بازی دیکھنے لگا۔ کسی نے ایک انار کو رکھ کر انکارہ دکھا دیا۔ انار پہلے، داسا
مسکرایا اور پھر ہنس پڑا۔ اس کے فتنوں کے سناٹے چاروں طرف چمک رہے تھے۔ پھر وہ ٹوٹے تاروں کی طرح
اندھیرے کو گھمرا کر کے ڈوب گئے۔ چاروں طرف میا میاں چھا گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر اس انار کو اٹھانا چاہا تو ہاتھ
جھل گیا۔ اور وہ بڑی دیر تک اٹلگی کپڑے سی سی کرنا پھرا۔
اس دن بھی نے اٹھا۔ چا اٹھا سوچا کہ اس کے سہرے میں آنسوؤں کی لڑیاں گندھ گئیں۔ ودار کے وقت وہ اٹا
سے لیٹ کے خوب روئی تھی۔ اماں کی میں سچ بچا آم کا پڑ چھوڑے جا رہی ہوں۔ —————؟
اس دن سے ریاض نے لڑکیوں کی چوٹی پکڑ کے جھولا جھلانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ لڑکیوں کو دیکھتا ہوا انکارہ سمجھنے لگا۔
لڑکیوں کی شکل دیکھ کر اسے بے نام سناوت ہوتا تھا۔ جیسے بچوں کو انجانی چیزوں سے ہوتا ہے۔
اس نے وزیر قرآن شریف غفر کر کے محلے بھر سے حافظہ جی کا خطاب پایا۔ پھر جھوم جھوم کر گلستان بوستان پڑھ ڈالی
وہ بلا کا ذہن تھا۔ اسے پڑھانے والے بھائی ”انا ماسر علی تک کہنے لگے کہ ریاض بے حد ذہن ہے۔ وہ کوئی سبق کوئی بات
نہیں بھول سکتا۔
”کیوں نہیں بھول سکتا۔ —————؟ وہ فحش ذہن ہو کر مولانا کی صورت تکسے لگا تھا۔ چاموں تو بہت سی باتیں

بھلاؤں

وہ گریخ ہونک کر میدان میں اُتر آیا تھا مگر مولانا ٹال جئے۔ ————— اچھا اچھا چلا آگے پڑھو۔
پھر وہ نصف بن گیا اور دنیا بھر کی قسموں کے فیصلے منٹوں میں کر ڈالے۔ پھر ایک دن محلے والوں کو شہنائی کی جھنوں نے
گلی میں اکٹھا کر دیا۔ وہ سہرا سبھا لٹا ہوا گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور کسی نے پھر ایک آتش بازی کا انار چلا دیا۔ اچانک اسے اپنا
جنگلی میں سوزش محسوس ہوئی۔ پھر یہ آگ بھڑکی کہ اس کے بس بس کرنے پکڑوں میں لگ گئی اور اس کا دم گھٹنے لگا۔ اور وہ
روکھڑا کے گھوڑے پر سے گر پڑا تھا۔ مگر اس کی ریشمی گڑیا سی ولوں نے اس کے جی پر ایسے ٹھنڈے پھائے رکھے کہ اس پر

خود کی سی چھا گئی تھی۔ اس طرح اس نے بڑے امن و سکون سے زندگی گزار دی۔
 گرمیوں کی دو پہروں میں وہ اپنے بیٹے بیٹیوں کے ساتھ آرام کھانے بیٹھا تھا تو ننھی کے ہاں سے آئے ہوئے آموں سے
 اس کے دانت میں ایسا درد اٹھتا کہ ریٹس سائے بدن میں پھیلنے لگیں۔ اس پر لڑکے پھل کیسے کھٹے نکلتے۔ ۹۔
 اور ننھی کبھی برسوں میں میکے آتی تھی تو رام کے تنے سے پیٹ جاتی۔

وہ اے اماں جنہیں کیا بات ہے۔ اکثر خواب میں دیکھتی ہوں کہ جیسے ہیں ہوں اور کھڑی اس ام کو لگ لگا رہی ہوں۔
 خراب کا نام سنتے ہی سب سروں پر پلو ڈال کر قبلہ رو ہو بیٹھتے۔

”اولیٰ اللہ نہ کرے“ اماں کہتی تھیں۔ یاد ہے ساجدہ ننھی کنوا اپنے میں اس پیر کو بچوں کی طرح چاہتی تھی۔
 ”بھرون بھر میرا جی ڈر باؤد بار ہوتا ہے۔“ وہ کہے جاتی۔ ”کبھی بچوں پر غصہ آتا دیتی ہوں کبھی ان سے لڑتی ہوں۔“
 بھاسے چکے بیٹے کو شکر مجھے دیکھتے رہتے ہیں۔

پھر جب وہ بیوہ ہوئی تو ہمیشہ کے لئے اس گھر میں ان بس تھی۔ تب ایک دم اسے اپنی زندگی کا احساس ہوا تھا۔ اس نے
 اپنے بچوں کو سمجھا یا کہ کھارے کنڈیوں والوں سے ان کا کھانا پڑنا بے حیلہ آ رہا ہے۔ اور ان کی وجہ سے اسی نے زندگی کی ہر شے اس میں
 کبھی کوڑا ہٹ پی ہے۔

اور دریا ضحیٰ حافظ جی سے دیکھ بنا۔ دیکھ بنا۔ دانا بنا۔ دوا بنا۔ اور سب مرحلوں کو طے کر کے پھر اس محور پر آئے
 نکلا۔ محلے والے پھر اسے حافظ جی پکارنے لگے۔ وہ صرف اسی مصروف کا۔ لگتا تھا کہ محلے کے بچوں کو قرآن شریف پڑھا ہے۔
 یا کوئی ماں اپنے ننھوں مرادوں کے بچے کو لاتی تھی کہ حافظ جی اسے دعا دیں۔ اس کی عمر بھی حافظ جی کی طرح لاکھ دو سو ہو جائے۔
 حصے پر بیٹھے تیس کے والے گھاتے مئے وہ اس دنیا کی ہر چیز کو گالیاں دیئے جاتے تھے۔ کہتے ہیں ایمان کی سلامتی کے لئے
 اس کی رضا پر راضی ہونا ضروری ہے۔ یگو وہ جانے کیوں کہی ہے دل سے اللہ کا شکر ادا نہ کر سکے۔ نماز پڑھتے ہیں وصال بیٹھے
 ادف فط سہلے کرنے کی عادت بڑھ چالے میں بھی نہ گئی۔ وہ رات رات بھر جاگ کر توبہ کرتے گھنٹوں سجدے میں بٹے ناک دگرتے
 دنیا کے سارے مزے تو چکھ ڈالے۔ پھر بھی دل سیر کیوں نہ ہوا۔ جیسے وہ زندگی بھر ایک گلاس ٹھنڈے پانی کا انتظار کرتے رہے
 ہوں۔ اور جھجھلا کے وہ تیس پک دیتے۔

”بورڈ سے تو سبھی ہوتے ہیں۔ مگر اب ایمان کی طرح ناک پر غصہ کسی کے نہیں دکھا ہوتا ہے۔“ ان کی بہو ماجہ جی کہتی تھی۔
 ”اوں ہوں۔ بڑھ چا ہے بیٹیا گئے ہیں۔“ بیٹا مال دینا۔ یا پھر کہیں شامت کی ماری غزالہ سانس پھٹی اور وہ غصیا کے
 دوڑتے۔ ”ہم پر بھی جوانی آئی تھی۔ مگر تمھاری طرح کتے نہ بنے۔“ انہوں کی طرح شرافت سے۔ ”انھوں نے بڑے
 فخر و غرور کے ساتھ بات شروع کی مگر ختم کرنے سے پہلے جان ہی ختم ہو گئی۔“ اور کھانسی کے پھندے۔۔۔ توبہ ہے۔۔۔
 اللہ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ انھوں نے انتہائی تشکبب بخش اور اذیت ناک لہجہ میں کہا۔
 پھر افسرین کی پیٹنگ سی آگئی اور کئی گھنٹے ان کے درمیان سے گزر گئے۔ اس طرح کہ وہ دونوں آنکھیں میچے جانے کہاں کہاں
 کی سیر کر آئے۔

اچھا قاب چلوں —؟ انھوں نے چونک کر یوں کہا جیسے کچھ حراسوں میں آگئے ہوں۔
 "کہاں جاؤ گے میٹھر۔" مگر پھر اماں بی کو یاد آیا کہ یہ بات آج کہنے کی توڑ تھی —!
 "تو میں نہیں کیا کہہ رہی تھی۔" —؟ وہ کچھ ماسخ پر ہاتھ رکھ کے سوچنے لگیں۔ خیالوں کا وہ اژدہام تھا جیسے لادو کہ
 آسم پر بورد آیا تھا۔
 "اب کہنا کیا ہے۔" — حافظ بھی رزدتے ہاتھوں سے لالچی ٹٹولی کر اٹھنے کا ارادہ کرنے لگے۔
 "اب ہم تم کیا کر لیں گے کہہ کر۔" — بات کتنے کتنے وہ دیوں کے جیسے کسی در دیں ترپنے والے کو دوا یاد آجائے۔
 "میں تو کتنا ہوں کہ ڈالو بیام ان حوامیوں کا۔ خواہ غواہ غلط غمازیں پڑھا کر ہی گئے۔" — ایسا تو سلامت رہے گا
 منوسوں کا —؟

انسان اور صلیب

صادق حسین

”اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟“ پادری، مٹی کی انجیل کے سستا یسویں باب کی چھٹی آیت پڑھ کر گھر کے لیے اُٹھا، اُس نے خطبہ گاہ سے سامعین کی طرف دیکھا، اُس کی نیلی پٹی، آنکھوں میں آنسو چپکے اور چھڑکانا ٹائٹس بارہ نفلوں کے جملے سے فصاحت و بلاغت کے جتنے اُبل پڑے۔ پادری کا لکھا ہوا اندازِ بیان سحر چھپکنے لگا۔ اُس کی مادقار، پُر خلوص۔ اور دقت ایگزادانے کیسا کے دردِ دل اور پرکھیر و وہ کی پرچھائیاں چھپلا دیں۔

عبادت گراہوں کی غلو و صحت کافی بڑی تھی۔ محدثی رنگ و رنگ کے سائے اور عمدہ ساڑھیاں زیب تن کئے سر پہ چاہئے۔ اپنی اپنی نشستوں پر بہت گورٹش بھی تھیں۔ مرد و عورتیں سر تھے اور لڑکچہ لڑکیاں میں بوس، ہر شخص کے ساتھ ٹولیک پر انجیل، تیس، مناجات اور عام دعاؤں کی سمجھتی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ خطبہ گاہ کے، میں باب دیوار کی گناہ مباحہ تھیں۔

تھا جس پر سفید حروف میں آج کی عبادت کے لیے منتخب منہات کے حوالے درج تھے۔ قرآن گاہ کی پاک میز پر چینی کے گلدازوں میں لکھنے چھل سب کے تھے۔ اُن کے وسط میں پیل کی صلیب چمک رہی تھی۔ اُس کے دائیں بائیں متعدد انوں میں روم قبائل میں جو تھیں۔ ہر نظر میں۔ حراب کی کھنچ پر لیسج ٹھیک کی مختلف رنگین تصویروں میں ہوتی تھیں۔ جن کو آفتاب کی بڑھتی کرنوں نے ہر سرور دشنی و سکر نودا کر دکھا تھا۔ پاک میز کے کچھ اور سرور و خانوں کی ٹولی دو حصوں میں بٹا کرتے۔ سینے سے چھوٹی مٹی۔ عورتیں دائیں جانب مرد اور صلیب پر دار لٹخیز لٹکا بائیں جانب۔ اور غور نواز۔ دیوار کی طرف منہ یہ جب چپا چپا بٹھا تھا۔ اُن سب کے لباس ہر فن کی مانند سفید تھے۔ پادری کے ڈھیلے ڈھالے کونے اور اوپر می جیسے کی طرح۔ اور وہیڑو کے سر کے بالوں اور اہود کی مانند وہ پر دھیسر ڈیوڈ کی نور دشنی میں غصہ چٹھا تھا اور اس دقت آخری صوف کے وسط میں بیٹھ کر غلط کے ایک ایک لفظ کو نہایت فائدہ سے سن رہا تھا۔

بندگی کی فضا میں تمام حیروں پر سجدگی چھائی ہوئی تھی۔ فرد و کے دل کہہ دروازے پر کئی غیبی ماتھ و تنک دینے لگا۔ تن تن کر کانپ اٹھا۔ من میں کا گوشہ گوشہ بیدار ہوتے لگا۔ دلوں کے پٹ خود بخود کھلتے گئے۔ مسز فریڈرک نے جیسے نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو مٹتے ہوئے اپنے دل کا دروازہ نیم داکیا ہوا اور اُس کی نگاہیں کہہ ہی ہوں۔ یہ پٹ پور سے کھل گئے تو یہ بھی دیکھا جھوک مر جائے گی۔ میری منہ بول بہن کا دروازہ دار کوں کرے گا، مسز فریڈرک کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ربیکا ابھی تک

حضرت سے منہ کھولنے اپنی ماں کے ہیٹ کو دیکھ رہی تھی۔ زردی مائل تینگوں کا ہیٹ جس کے گھیسے پر کلافتیا لگا ہوا تھا۔ رہسکا نے
 حیرا، بادرمی اور اپنی ماں سے سر پر ہیٹ زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اور سب کچھ دیکھ کر وہ اپنی ماں سے بیسیوں باتیں پوچھنا چاہتی
 تھی گولہ کھ لے۔ سے زرد رہی تھی۔ اس لیے کہ گرجے میں اُسے سے پہلے اُسے ماں نے گھر پر اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ معبد میں بات
 نہیں کیا کرتے۔ رہسکا کے پاس ریٹارڈ وارنٹی ثبت بنا بیٹھا تھا۔ اُس کی نگاہیں پادری پر گڑی ہوئی تھیں۔ کرنل کے چہرے کی لکیروں میں
 آفسروں کے قطرے قطرے قطرے خرا خرا گڑاؤں کے کوٹ کے کارپر گڑھے تھے۔ رہسکا اُن آفسروں کو گن گن کر تازہ تازہ دیکھا ہوا تھی کہ
 بس دھڑلے لگی۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ دھنچہ مسز فریڈرک نے اپنے دل کے کوارٹیر کراٹینان کا سانس لیا اور
 یوں کرتے ہوئے اُسے اپنی مبارک پردوس یاد آگئی جو ہر وقت کھیا پر لٹنے لیٹنے کھالتی رہتی تھی۔ اُس کے گمذمی چہرے کی ملاحظہ اب
 فقہ پارینہ نہ کی تھی۔ جب وہ پہلے پہل مالا بارے آئی تھی تو محلے میں اُس نے تذکرے ہوا کرتے تھے۔ اُس وقت وہ ایک باغ وہاں
 قسم کی رنگی تھی اُس کی جوانی بھر لہو تھی اور باقی مصری کی دلیاں۔ وہ نہایت معمولی سفید ساڑھی پہنا کرتی تھی مگر اس قسم کے کہ
 اُس کے شعلہ بدن کا ہلکین دو بالا ہر جانا۔ وہ اپنا جوڑا ایک مخصوص انداز میں بنا کر اُس میں سفید کھیروں کی دینی بانہا کر تھی۔ اور
 جب وہ سینہ ناں چلتی تو اُس کے ایک ایک سے جوانی کو اکھنڈ کر دے بھڑا اور دیکھنے والوں کی آنکھوں کو چکا چوندی سی آہانی
 وہ طیارم کے علاوہ انگریزی بھی لکھ لکھتی تھی۔ چنانچہ خورے ہی دلوں میں اُسے ایک غیر ملکی نسیم میں ملی فون اور پیرٹ کی ملازمت مل گئی
 جس کچھ تو وہ پہلے ہی تھی اب اُس کی پکے ٹیک میں ہلائی تیزی آگئی۔ کوئی سینہا کی دعوت دیتا تو وہ مسکرا کر قبول کر لیتی۔ کوئی ریسٹوران لیجانا
 پاپنا تو وہ خوش خوشی ساتھ پر لیتی۔ اس پہلی کھل میں دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی جوانی بدل اذقت واصل گئی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ
 گئے۔ بدن کی نوپس اور خطوط اپنی آب و تاب گھو کر ویران ہو گئے وہ ملازمت سے برطرت کر دی گئی۔ اب وہ اپنے دوسرے میں کھیا
 پر پڑی دن رات کھانتی رہتی تھی۔ مسز فریڈرک ابھی تک نہیں جانتی تھی کہ اُس مبارک کے ماں باپ کون تھے لیکن یہ کوئی اچھے کی
 بات تھی، شہر کی وہ گمذمی اور تاریک تھی، جس کے دونوں طرف ڈوبے سے بنے ہوئے تھے۔ ایک ایسی بستی تھی، جس کی گھٹی بڑھتی
 ابواہی کے ماضی پر اجنبیت کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ سورج نکلے ہی مرغ مرغیاں دہروں سے نکل جاتے اور دن بھر
 دن دننا چمک کر رات کو لٹ اُتے۔ مسز فریڈرک نے کوئی پانچ سال پہلے وہاں ایک دورہ کر کے پر لیا تھا اُس وقت رہسکا
 پادری برسوں کی محبت میں تھی۔ اُس روز سے کہ آج تک کسی نے مسز فریڈرک کو نہیں دیکھا تھا اس طرح اُس کی مبارک پردوس کے
 ماضی پر بھی دھند چھائی ہوئی تھی۔ ہاں مسز فریڈرک اتنا ضرور جانتی تھی کہ اُس گھنڈری مبارک نے ایک رات اپنا جسم بیچ کر اُس کی لالچ
 رکھ لی تھی۔ مسز فریڈرک چوری کو بھیک مانگنے پر ترجیح دیتی تھی۔ اُس دن وہ عین از کتاب جرم کی حالت میں کپڑی لٹی تھی۔ پچاس روپے
 ختم کر معاملہ دایا جا چکا تھا، مگر اتنی رقم اُس کے پاس ہوئی تو وہ ماننا ہیڈ میں جلا آبریکا کو گود میں اٹھا کر ہسپتال لے جانے کے بجائے
 کسی اچھے ڈاکٹر کو گھر پر بلوا لیتی۔ جب مبارک کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اُس نے اپنے دوسرے میں ہر اُس جگہ کی تلاش میں جہاں سے
 نقدی شے کا امکان تھا۔ اُس نے کچھ رنگے کیٹے کیے پیچے سے سینے۔ چینی کے گھڈان کو الٹا تو چویناں، ورنیاں اور انکیاں تھیں سے
 ہر اُڑپس۔ پرس سے روپے روپے کے پانچ نوٹ ملے۔ سب ملا کر دس روپے بنے ابھی چالیس کم تھے۔ مبارک سوچے سمجھے
 بغیر سینہ ناں کر سیدھی ہونٹوں سے اُسے پاس چلی گئی اور دس دس روپے کے پانچ نوٹ ہاتھ میں نکالے اُسے پانچ نوٹ لٹ آئی۔

بات کی بات میں دس دس کے پانچ نروں نے کسی کام نہ بند کر دیا۔ کوئی اچھی انگلی شہر کا چمک گئی۔ اُس کے بعد ملہار نے چپکے سے پپلے روپے کے پانچ نوٹ اور ریز کار می بیسکے کے پیسے کے پیسے رکھ دی۔ شام کو کبھی چوٹی کر کے اُس نے اپنے چوڑے میں سفید کھیلوں کی دینسی باندھی اندازہ جیسا چاہتے ہی وہ پانچ نوٹوں کے چر بار سے پر حلی گئی اور رات بھر وہیں رہی۔ دوسرے دن اُس نے سارا قصہ منظر فریڈرک کو سنایا۔ اُس دن سے منظر فریڈرک اُسے اپنی منہ بولی میں سمجھنے لگی اچھی اور اب چوری کر کے اُس دو راڑ کو کرتی تھی۔ تریکا کا اور اپنا پیٹ پالتی تھی۔ اور آج وہ برسوں کے بعد گرجے آئی تھی، اپنی منہ بولی میں کی درازی مگر کی دعا مانگنے کے لیے۔

اور یہ مقدس کام پر وہ اور پر سے نیچے تک پھٹ کر دوڑے ہو گیا اور زمین لرزی اور بڑھانی تڑپ گئیں۔

پادری کی اکوان کے چور بھانے نے سر ہٹھکن کے باطن میں ناظم برپا کر دیا تھا۔ ایک دہلا پڑا آدمی جس کے بھاری بھاری پیروں اور سرخ سرخ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک چڑھی ہوئی تھی جس کے دائیں ہاتھ کی دھڑکی آنکھوں کی بڑی سگریٹ کے دھڑکن سے پیل ٹپکی تھیں جس کی آنکھوں کے نیچے سو جن نمایاں تھی۔ گالوں کے ڈھیلے اور مزہ جیسے ہونے گشت سے اُس کے سن والی پر سود و سود کی چھاپ لگا دی تھی۔ یہ تھا شہر میں جو منظر فریڈرک کے بائیں طرف بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے ہونے میں اُس کی اہلیہ سبز ہٹھکن کے بیٹھی سر پر پھلدار کپڑے کی ٹوپی کی توئی تھی جس کے ہونٹ اور رخسار لپ اٹھک اور وہ ج کی ڈرائنگ سے جانب موصوم ہر سے تھے کو ہٹھکن جاتا تھا کہ اس صوفی سر جی کے نیچے خوف ناک زردی کا تسطی ہے اُس وقت سر ہٹھکن کا جس پیا دہ تھا کہ باؤنڈ اپنے گن ہوں کا اعتراض کو لے۔ اپنی رفیقہ خجیات کا ہاتھ چوم کر کہنے کو اب میں شراب پی کر کچھ کمی نہیں بیٹھی گا۔ ہر سال بچپن کے پاداش میں تھے تھو کریں نہیں ماریں کہ سر ہٹھکن نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور پھر اپنے آنکھوں کو دیکھتے ہوئے دلی ہی دلی میں سوچنے لگی۔ برتن باغ ہاتھ کر یہ ہاتھوں کا یہ حال ہو گیا ہے وہ لیے لیے ناخن جن پر میں کوئی نہیں لگا پا کر مٹی کی گھنٹا اب اس قدر حد سے ہو گئے ہیں۔ میں بازار سے سودا سلف لاتی ہوں۔ کھانا پکاتی ہوں۔ بکریوں کو چیر نکلیں مار مار کر چھانسل گاتی ہوں۔ بیانی دھوئیں کی نذر ہوئی جا رہی ہے۔ بچوں کے کپڑوں میں پیوند لگانے لگاتے انگلیاں دکھائی ہیں۔ مر جانا کتنا آسان ہے۔ سر کے جینا کتنا مشکل ہے۔ پھر اُسے وہ دن یاد آیا کہ جب پہاڑ پر ایک چھوٹے سے گڑ بھرت گرجے میں اُس کا تہاج پڑھایا گیا تھا۔ اُس نے اپنے دامن سے ہاتھ سے ہٹھکن کا دھانا لیا کہ خدا دم دیں کیے چھپے چھپے کہا تھا۔ میں روزی سیکھ تھ جانے میں کہ اپنا شوہر ہونے کے لیے قبول کرتی ہوں تاکہ خدا کے پاک حکم کے موافق آج سے اُس کے حب تک موت ہم کو جدا نہ لگے۔ جتوئی اور بڑائی، نگلی اور بھالی، بیمار می اور تندرستی میں تجھے اپنا بنا لئے لکھوں، تجھ سے محبت رکھوں۔ تیری خاطر کروں اور تیرے حکم میں رہوں اور اس کا میں تجھ سے قول دہر کر کرتی ہوں۔ اُس قول و افراز کا نشان ایک چھلٹا تھا جواب بھی ہر طرف سے اپنے بائیں ہاتھ کی چوٹھی انگلی میں ہنکھا تھا۔

سبز ہٹھکن کے پاس زو جان کلاڑ بٹھا ہوا تھا اور کلاڑ کی ساتھ والی نشست پر اُس کا دوست روزنڈ۔ کلاڑ کی نگاہیں سب سے اچلی صف میں بیٹھی ہوئی دور دور کی گرمیوں کا طواف کر رہی تھیں۔ روزنڈ کھٹے دروازے میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ پھولوں کی کیا ریلوں پر جو بن آیا ہوا تھا۔ اس بنشٹی رنگ کی سلی کی چھلپ اڑان ہوا کے خاکے میں رنگ بھر رہی تھی۔ درختوں کے پس منظر

میں بیٹا تھا، آسمان خداوند نے چھپا ہوا تھا۔ زندگی بچاؤ کی چھلکاؤ سے بٹ کر اس سنوں کی طرف مڑ گئی جس پر مصلوب میری کی تصویر آویزاں تھی۔

”تو نے اپنی صلیب اور پیش میت خون سے ہمارا اندر دیا۔“ رولڈ نے بے اختیار دقت انگیز لہجے میں سرگوشی کی۔ کلاؤک چوٹھا اُس نے غور سے رولڈ کی طرف دیکھا، اور پھر اُس کی نظریں دودھ تھی کے باپ پر جم کر رہ گئیں، جس کی دولت اور محنت دونوں تان رنگ تھیں۔ دودھ تھی کا باپ بلیک کورس میں کامیاب کی تھا اور کلاؤک کا کھلم کھلا لٹکا اور آوارہ کستا تھا۔ نہ جانے کیوں دودھ تھی بھی اب اُس سے کئی کئی تھی خدا جانے اُس نے تمام عہد و پیمان کیسے کسوں بھلا دیئے تھے۔ یہ سوچتے ہوئے کلاؤک نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کی طرف دیکھا جو بلیک کورس کی دوزخ ڈر ایک لائن، بائیں ڈمب اور دوسری بھاری بھاری ٹینوں کی سرورنگ کرتے کرتے سخت اور کھردری ہو گئی تھیں۔ آج پھر اُسے شدید احساس ہوا کہ اگر وہ تمام عمر اسی رفتار سے محنت کرتا رہے تو بھی وہ ایسی ایک کار نہیں خرید سکتا۔ یہی چار کاروں دودھ تھی کے باپ کے پاس تھیں۔

نہ ہندوؤں میں مرمیوں یا بدستور مل رہی تھیں۔ خطہ کا وہ سب کا اندر رسل بہ رہا تھا۔ وقت کی جانوں سے ٹکراتا ہوا کبھی طغان بن کر، کبھی نیلی نیلی و کستور کا دیرین کر، کبھی لہروں کی بے قرار سی بکرا کبھی اتھاہ بکرا کبھی کاراز بکر۔ اور بھڑوں کا گلہ۔ چپ چاپ اس رہا تھا۔ اُن کی کوئی دس بھی تھی۔ رینڈ کیا ڈنڈر بھی تھا۔ میکے کے پلٹ بھی تھا۔ ہوا ہی جانوں اور شیراضل بھی تھے اور ناول نویس کو شش بھی۔ ٹوسی کے الی سینکڑوں الاد رسل رہے تھے گزشتہ کل اپرین تھیں۔ دوپٹی دینے کے بعد اُس کا بند بند ٹوٹ رہا تھا۔ لوجوان اکبر کا کٹر افسردہ اب بھی اُس کی نگاہوں میں پھر رہا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور کھنکریا لے بالوں والا اکبر اُن کے دل کا پریش ہوا تھا۔ سرسبز کے کمال جا بک و سنی سے اکبر کا سیدہ پھر اُس کے دل پر جما ہوا امر اوٹا رہا تھا۔ اکبر چند گھنٹے بے ہوشی کے عالم میں رہا تھا۔ ایکسجی اور خان کی ملک پہنچی رہی تھی۔ پھر اکبر بوش میں آیا تھا۔ اُس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ مگر ایسا تھا اس کی کوئی محسوس ہوا تھا جیسے جارج پھر زندہ ہو گیا ہو۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور کھنکریا لے بالوں والا جارج ا جو ایک خوبصورت شام کو سندھ کے کنارے کنارے تیر رہا تھا کہ ناگاہ مروجی کی فٹار نے اُسے ہمیشہ کے لیے توسی کی نگاہوں سے اوچل کر دیا تھا۔ پرائش کے بعد جب اکبر کے کانپتے ہوئے ہاتھ نے توسی کے ہاتھ کو چھوا تھا تو توسی کی ٹھنکی ٹھنکی آواز اُس آنکھوں میں سترن کی شبنم حفر غور سے لگتی تھی، پھر اکبر کو روتا ہوا ہاتھ اُن کی آن میں جسے ہر سرخ کبلی پر پڑا تھا اور توسی کو بلیں لگا تھا جیسے اُس کا سارا بدن شل ہو گیا ہو۔ جیسے خارج دربار ہو گیا ہو جیسے اُس کی آنکھوں کی شبنم کو واردات کے دھکتے ہوئے انگاروں نے اپنے اندر جذب کر لیا ہو۔ توسی نے سر جھکا کر دعا مانگی تھی ”خدا تبار ہی روح کو جین سکا کرے“ اور پھر اکبر کا چہرہ سرخ کبلی سے ٹوٹا ہوا کپڑا پر مل گیا تھا۔ آج وہ سکون قلب کی تلاش میں گرجے چلی آئی تھی۔ اس لیے کہ آج اسپیشل وارڈ کے کروہر سارن میں اکبر کے بچائے ایکسٹری زندہ والا سماج لیا ہوا تھا جرنیل میں خواتین لیا اور ساتھ ساتھ منڈی کے بھادو بڑا ہوا تھا اور آج پادری کے خطبے کا افتتاحی جملہ جیسے توسی کے دل کی پکار تھا اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کا جسم زندہ ہے گو اُس کی روح صلیب پر لگی ہوئی ہے۔ اس کے ہنٹ چپ ہیں مگر اُس کا دل میری کے الفاظ و مسوا رہا ہے۔ اسے میرے خدا! اے سیکر خدا!

تو نے مجھے کہیں پھنسا دیا۔ اُس نے سوچا جا رہا تھا کہ سب کچھ میں چھپ کر رہے ہیں اور اب کبھی لاش کو اُس کے عزیز و اقارب اُس وقت
 یہاں پہنچتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ بھی نہ سکی۔ میں تو ایک نرس ہوں۔ مرخصیوں کی خدمت کو ناؤ میرا فرض تھا۔ اگر کسی کو کیا معلوم تھا کہ ایک دن اب کب کب
 تک ایک نرس کو اُس کا ایسا سچا کاغذ پڑا پڑا ٹکڑے ملے گا۔ دیکھ کر ظاہر یہ ظہور ہو رہی تھی کہ اُس کے دل کی دنیا میں ایک
 دلی کی سی کچھ گئی تھی۔ اُس دن دلی کی دینے کے بعد جب وہ اپنے غیث میں پہنچی تھی تو اُس کی نرس میں ایک نئی نئی زندگی اُٹھ اُٹھ اُٹھ رہی
 تھی۔ اُس نے اپنے پر سے ایسی کھال کر لیں لیں کہ وہ اُس کی روشنی میں بار بار دیکھا تھا۔ اُس نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ ایسی کچھ خط و
 پس جو کہ زندگی ہے۔ اُس کے دل نے اس قدر کیا تھا کہ اب کب کب زندگی کا گھر اُٹھ اُٹھ گیا ہے۔ اُس نے انسان کو بہت دیکھا
 ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اُس نے اپنے میں اپنا چہرہ دیکھا تھا۔ چہرہ بالوں میں کھنکھ کی تھی۔ سارے مٹی کی جلدوں کو درست کیا تھا۔ انور کی گردش
 تیز ہو گئی تھی۔ رخسار پر بڑی ہی گئے تھے۔ اور چہرہ آرم کر رہی تھی۔ وہ کسی داؤی جنت میں گم ہو گئی تھی۔

پادری کی آواز پر ستر گونج رہی تھی۔ عبادت گاہ میں نے بیٹھے تھے۔ فناک آگئیں دیکھ رہی تھیں۔ گداؤں کی سمجھ
 ہے تھے۔ اُس کی زہد و نازک انگلیوں نے فاطمی رنگ کا پرس ختم رکھا تھا۔ اُس پرس میں اب کب کب کا پانا ہوا ایسی کچھ تھا۔ ایک
 اُس کی خیال کیا کہ اب کب کب آواز دو اور وہی ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک دن اب کب کب نے جہان میں آواز میں اُس کی بنایا تھا۔ گورنمنٹ
 نگہ بردار دست تھا۔ فادات میں اُس نے اپنی جان دے کر میری جان بچائی تھی۔ اُس کی کھلی ہوئی دلی جیت کو مجھے چاہا کہ
 کر پکارتی تھی۔ اب دلی جیت کو کر کے اُس میں شادی ہو لے والی ہے۔ اس لیے میں جلد از جلد اچھا ہو جانا چاہتا ہوں۔ میری
 بھتیجی اور میری بھائی میری راہ ہم کر رہی ہوں گی۔

اُس کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ انسان کی خدمت کرتے کرتے لپٹ چکے ہو۔ جیسے وہ سروں کے زخموں پر پٹیاں
 باندھتے اور صحت مند ہونے کے لیے اُس کے جسم کے زخموں سے نڈھال ہو گیا ہو اور اب وہ سرخ کپڑے اور کراپیشیل دار کے کمرہ فبرمات میں
 آگئیں موند کر لیت جانا چاہتی ہو۔

مرسر فریڈرک نے آنکھوں کے کونوں سے اُس اور اُس عورت کی طرف دیکھا جو بھی اچھی اندہ داخل ہوئی تھی اور اب فرش پر
 رکھے ہوئے گدے پر گھٹنے ٹیکے، ہاتھ جوڑے، ڈیک پر سر جھکا کر، اُنہیں دیکھنے، دیکھنا رہی تھی۔ مرسر فریڈرک اُس عورت
 کو جانتی تھی۔ وہ مرسر جیمز تھی جس کا اکوٹا بنایا دوسری جنگ عظیم میں مارا گیا تھا لیکن مرسر جیمز کبھی تھی۔ میرا بیٹا زندہ ہے۔ وہ کل تک لڑ
 اُسے لگاؤں کے سینے پر بہا رہی کے تھے ہوں گے۔ وہ اُسی طرح پاؤں زمین پر مار کر مجھے سلام کرے گا۔ وہ ہر روز ریلوے اسٹیشن کے
 چھانک تک جاتی تھی اور ٹکٹ چیک ہر روز ایک ہی جواب دیتا تھا۔ مائی اس گاڑی کے تنہا رہتا تھا۔

دفتر بیکارڈش پر کھڑی ہو کر سامنے ڈیسک پر پڑی ہوئی مقدس کتاب کے اوراق اُٹھنے لگی۔ مرسر فریڈرک نے دیکھا
 کے شاہی پر ہاتھ رکھ کر ماتھے پر ہل دالے۔ دیکھا پھر قرینے سے بیٹھ گئی۔ مرسر فریڈرک کی نگاہیں پادری کے دابے ہاتھ کا لہجہ
 کرنے لگیں۔ پادری کا دابہ ہاتھ آواز کے آثار پر حاد کے ساتھ کبھی عروسی، کبھی آغوش، کبھی ترچھے انداز میں حرکت کر رہا تھا۔ اُس کی
 انگشت شہادت کبھی دائرے بنا رہی تھی اور کبھی نصف دائرے۔ ہاتھ کی ان حرکتوں میں ان گنت ساعتیں، گھنٹے، دن اور راتیں، بیسے
 سال اور صدیاں گردش کرتی معلوم ہو رہی تھیں۔ دیکھا کے پاس بیٹھا ہوا بڈھا کرل اپنا پرلا منہ کھلے پادری کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ریکاڈھے کرلی کے کتوں اور گھٹے کے بھڑیاں پڑے ہوئے گوشت کو خود سے تک دی تھی۔ بدستے کرلی کے دل کے صبر میں مناجات کے وہ اشارہ گرج رہے تھے جو عطا شروع ہونے سے قبل عبادت گزاروں کی جماعت نے سرود خوانوں کے ساتھ مل کر گائے تھے، امن، آسودگی، اور محبت کا کیت۔ ردِ عمل کے طور پر، میدان جنگ کے ہولناک واقعات خود بخود بڑھے کرلی کی آنکھوں میں پھرنے لگے۔ آج پھر لاکھوں بھڑیاں ہوئی آنکھوں پر ایسا نشان بن گئیں۔ آج پھر لوہی سرخ ندیاں وحشت برساتے لگیں۔ کسی کارروائی میں کامیاب تھا۔ آج پھر ایک عورت کی وہ وحشت آنکھیں اُس کی آنکھوں کے بوسیدہ چھروں میں جھانکنے لگیں۔ وہی عورت جو انطور کے چھپے ٹوڑتے توڑنے آئے، لاکھ کرختیاں لگتی تھی۔ اُس کی بھڑیاں نہ تھیں، لیکن اور مارلی کے پیرڈن کے سائے میں چوری بھینس۔ یہ برسوں پہلے کی بات تھی۔ دنیا کے ایک اجنبی حصے کا ناقابلِ زاموش قصہ تھا۔ جب قتل و زنا کے سہا بدوں میں مرست کی ایک انمول کرن چمکی تھی۔ جب ایک گوری سماہٹ نے سرسبز و ساداب دادی سے طلوع ہو کر اُس کی روح کے گوشے گوشے کو منور کر دیا تھا۔ آج پھر اُس معصوم بچے کے ننھے ننھے ہاتھ اُس کی نظروں پر چھنے لگے جسے وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

سربلٹ کے رخساروں پر پاؤں اور رُوح کی موتی تہہ پر بہتے ہوئے آنسوؤں نے ایک ڈیڑھ میٹر بھی لکیر بنا کر حلقہ کی زد کو ناش کر دیا تھا۔ ستر ہلکتی دھنکلی کا تیریں ڈوب کر آنے والے کس کے خواجہات کا تردد بھر لیا تھا۔ فوجان کھارک کی نگاہیں پاوری کے چہرے پر سے ہٹ کر پھر اٹھ اٹھ گئیں۔ جدھر ڈور دھکی مچھی ہوئی تھی۔ سورج کی روپہلی کرنیں روشندان پر سے سر کر ڈور دھکی پر ترچھی ترچھی پڑ رہی تھیں۔ اُس کے زشے ہوئے بالوں سے مرمری گردن پر سائے اور روشنی کا جین امتزاج پیدا کر رہا تھا۔ ردِ عمل کی بانٹ سے رنگینہ کیاؤنڈر کے کانوں پر اُگے برسنے لیسے سیاہ بالوں کا طنن دیکھ کر ہاتھ مار دینا پچھن پین۔ رنگینہ کیاؤنڈر کو دیکھ کر روبرو کیا کرنا تھا۔ جب وہ سیانا ہوا رنگینہ کیاؤنڈر کے کانوں کے بال دیکھ کر کہنا کرنا تھا۔ اب جو وہ فوجان ہو چکا تھا تو وہ رنگینہ کیاؤنڈر سے ڈرتا تھا۔ اُس پر ہنست تھا بلکہ اُسے دیکھ کر کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتا تھا۔ احوال تو وہ یہی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ رنگینہ کیاؤنڈر کیوں کہتے ہیں اس لیے کہ رنگینہ کیاؤنڈر کو ایک بیکر تھا جو ڈبل روٹی، بند پیسری، عام کیک کے علاوہ دینا پچھن پین، برتنڈے اور کس کس تک بہرہ فرخت کرنا تھا اور شام کو شراب پی کر آدمہ کتوں اور فٹ پاڑی پر سرنے والے بھکاریوں اور مزدوروں میں باسی ڈبل دیاں بانٹتا تھا۔ اور جب کبھی آندھی لگتی تھی۔ درخت جھرمٹے سکتے تھے۔ نیلیاں بجاتی ہوئی ہوائیں تیر تیر پڑیں کی چھتیں اڑنے جاتی تھیں تو رنگینہ کیاؤنڈر سمٹ کر گلی کے کھڑے پسر اہو کرنا تھا اور ہر اہرہ سے مخاطب ہو کر کہتا تھا۔ لائف بلیٹ باندھ لو طوفان آنے والا ہے۔

پاوری کا چہرہ روشندان سے آتی ہوئی سورج کی کرنوں میں درخشاں نظر آ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے نیلے دھل کر چمک رہے تھے۔

بیکارے پائلٹ دوسری صف میں ٹیپ ہوا تھا اُس کے کانوں میں غول غول کی آوازیں مسلسل گونج رہی تھیں۔ بعض اوقات تو اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے اُس کے کانوں کے پردے چھٹ جائیں گے۔ جب وہ ہوائیں اڑتا تو یہ غول غول کی آوازیں طیارے کے کچن کے شور و غوغا میں غم جو جاتی لیکن اپنے ہوائی اڈے پر واپس آ کر جب وہ طیارے سے باہر نکلتا تو یہ آوازیں بھڑکی کی عسات کو گھیر لیتیں۔ جب وہ کٹم اُن کے سامنے سے گزرتا تو اُس کے کانوں کا شور و غوغا دوب جاتا اور چھت وادی میں لسی ہوئی سرنما کی آواز کی "سرن ٹھول کر اُس کے پٹھے پر سے کانوں میں انڈیل جیتی۔ مکان اسوگی کا چولا پہن لیتی۔ وہ ہونٹوں کا ایک چھڑا سا

زیر بن کر بیٹھی بچتا ہوا اور ستوران میں پہنچ کر موت کا انتظار کرنے لگا۔ زندگی میں ایک لمبی سی کی اس سے لگ جاتی اور جب موت آتی تو جیسے
کے بعد ستوران میں آتی تو وہ کسی کی بجائے بیک سرپ کی فرمائش کرتی۔ پھر جلد ہی جلد کی کھانکھان کر تیز گاتی جیسے کڑھانٹ کہہ کر چلی جاتی
سورنگی، پھر نکاح میں بدل جاتی۔ زندگی کی ایک لمبی زندگی کی کئی بے شمار اربوں کی پہنچ لاتی۔ ایک دن بیکاسے نے بیچ پر کوڑا کا راستہ
دکھایا۔ جتنا سے بڑی خور و غذا وہی سے بیکاسے کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا کر نہایت سنجیدگی سے کہا کہ تم میرے دوست ہو اس لیے
کہ مجھے ڈر لگتا ہے۔ اور آج کل مجھے صرف اسی سہارے کی ضرورت ہے یہ میرے بچاؤ میں اپنی ماں کی آنکھوں کا علاج کر رہی ہوں
جب میری امی کی آنکھیں اچھی ہو جائیں گی تو میں تیس سارے ڈر تو مٹا دوں گی۔ یہ کہہ کر مرنے کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو
نظر پڑنے لگے اور بیکاسے کے کانوں میں اس شدت سے غوغاں ہونے لگی کہ الامان ادا لٹ کر ستوران میں چلا گیا اور دم دقت
میں زیادہ دھکی لی کر گئے ہیں دھت ہو گیا۔

تھنہ کر کے ٹھہرا لے دس بجائے ٹن کی صدا سن کر ریر بکا چو تک پڑی۔ اس کا منہ اسرا دل دھک دھک کرنے
لگا۔ اس نے دلچسپی سے دیکھا۔ اور پھر باؤس ہو کر سو جانے لگی۔ اسکو اپنی تو جھٹی بچنے کی چھٹی ہو جاتی ہے مگر
یہاں تو سب رنگ جنوں کے توں بیٹھے ہیں اور سچ سچ بیکاسے کی پاک عبادت گزاریت بنے بیٹھے تھے۔ بیکاسے کے عقب میں دو صفیں سچ
چھپر کر بیچ کے غمر کی کرنے پر بیٹھا ہوا اس کی سبک دھارت نظر آ رہا تھا لیکن اس کے جلو میں بیٹھا ہوا اس کا پائیر شیر افضل جانتا تھا
کہ سانس کے زل جالوں میں ہر بار چپکا ہے اس لیے کہ جانسن نے اپنی ٹھوڑی دائیں تھیل پر ٹکا رکھی تھی اور اس کے سامنے کی بیکاسے کے
ایک دوسرے کے قریب آئی تھیں۔ شیر افضل یہ بھی جانتا تھا کہ جانسن آج گھر پہنچا مگر اس سے زیادہ دھکی پئے کا اور پھر اسے گھلے سے
ٹکا کر زور و قیلاں روئے گا۔ دقت کی گھڑی کی سوئیاں پورے سال کا چکر کاٹ کر جب آج کے دن پر پہنچی تھیں تو جانسن ایسا ہی کیا کرتا تھا
اور اس باضابطگی میں شیر افضل اس کا ساتھ دیتا تھا۔ دس سال کے عرصے میں یہاں گھر دوڑا دینا اس کے بچوں کی ایرا پھیری کی کامیاب شرکت
میں فرق نہ کیا تھا وہاں روزانہ شراب نوشی، تماشائی اور اس میں ایک دفعہ گرجا جانسن کی وفات تھی جو اس کی دل قائم تھی بعض اوقات
شیر افضل کو اپنی بڑی شرم آتی تھی۔ اس لیے کہ جانسن کم از کم سال میں ایک مرتبہ تو چھوٹ چھوٹ کر زور و قیلاں کی گھڑی نکال لیتا
تھا۔ شیر افضل پر شرب چیکے چیکے آنسو بہتا تھا۔ تین سو بیسٹھ دن کے بعد جانسن کے آنسوؤں کی ندی بہنے کی وجہ تو شیر افضل کو معدوم تھی
مگر اس کے دکھ کا راز دنیا میں کوئی نہ جانتا تھا۔ کب، ریس کدوس، عورت اور شراب کی دنیا سے نکال دو، روز بروز بڑھتے ہوئے
بیکاسے کی لکھنیں، یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو تنہا بھٹاتا تھا۔ لاکھ جانسن کی طرح اس نے بھی اچھی سلی کے کتے، گھوڑے، ببال،
باز پرندے پال رکھے تھے۔ جن کی دیکھ بھال دو ملازموں کے سپرد تھی۔ ان ملازموں کو اچھی خامی تھی۔ ان میں ملتی تھیں پھر بھی وہ بھلائی سے
کرتوں، بیوں اور پرندوں کی خوراک پر اگر غل جانتے تھے۔ بیکاسے پھر عام دعاؤں، مناجات اور کچھ مندرس کی جیسی کتابوں سے کہنے لگی۔
زور دہاں ننگوں کے بیٹ کے سامنے میں دوڑ جاتی ہوئی آگئیں ننگی ہوئی جاری تھیں۔ مگر اور مسر جملیں عین قند تھیں۔ انظر واک چاوری
کے چہرے کی طرک دیکھ دیکھ تھے۔ بیلا بیلا لمبوتر اچھرہ جس پر چہرے کے دیکھ بل رہے تھے۔ آنکھوں کی دہائی نیچیں جس پر پھر کاٹی
کالی بدایاں منڈا رہی تھیں۔ کبھی آہستہ کبھی بلند ہوئی ہوئی آواز جس میں دوڑ چا ہوا تھا مگر فربک کی نگاہوں میں اس کی منڈولی ہنس کا
بیچارہ چہرہ بھرنے لگا۔ کلامک، دودھ کی مرمری گردن پرست لگائی ہمارا کھڑا اپنے گھوڑے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگا ایک

عورت کی درد و شوق آنکھیں پھر بڑھے کرنل کی آنکھوں کے بوسیدہ بھر دو گریں ہی بھانکنے لگیں اس صحرانم کے باندھو اس کی طرف بڑھنے لگے جسے وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ سنسز جھڑولی دل میں پکار رہی تھی "اے خداوند! میری دعا سن، میری سنتوں پر کانی بکھڑاؤ! دعا داری اور اپنی صداقت سے میرا جواب دے۔" رونڈ کھلے دروازے میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ بخشی بخشی دھمک کی تسلی نظروں سے بھول کر چل پھری تھی۔ آسمان کی شفات نیلا ہٹ دھوٹ نظارہ دے رہی تھی۔ چھوٹی کی گاریاں بڑی خوشنما معلوم ہو رہی تھیں، میکا لے پالٹ کے گاڑی میں کوئی "ہیلو میکا" "ہیلو میکا" کہہ رہا تھا۔

ناول نویس کرشن آس پاس بیٹھے ہوئے اسٹریٹ کے چہرے کی گناہیت غور سے مطالعہ کر رہا تھا۔ دکان کے لوگ ایسے بھی تھے جن کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ مثلاً سٹریٹ پر جو کسی سعادت خانے میں بیٹھی اچھا راج تھا۔ پر اس نقاشی مٹر گریز جس کی پوری فرانسیسی زبان میں بکھرتی تھی۔ کارڈسٹ مٹر ہونٹ جس کی کپڑوں کے کوزے میں بت سنے دیا بند ہوتے تھے۔ سیاسی لیڈ مٹر العزیز جس کے منہ سے ہاتھ کرتے میں جھگڑاؤ تھے۔ برائی کرشمہ کے مدد سے جاننے والوں کی طرح اسے جیون داس کہہ کر پکارتے تھے اور اس کا پیدائشی نام تھا جیون داس بی، لیکن ادبی دنیا میں دو کرشن کے نام سے مشہور تھا۔ یہ نام اس نے خود اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس نام میں عجیب دلکشی ہے۔ اس لیے کرشن کا نام لیتے ہی ذہن میں رادھا جیم جیم کرنے لگتی ہے۔ مگر بچوں کی پاٹوں کی بھنگا گونج اٹھتی ہے۔ ایک خوبصورت زندگی کے تصور میں ہی تنائیں پیدا ہوتی ہیں مٹر جیون داس مٹر اور سنسز گریز۔ مٹر جیون داس مٹر العزیز ہمیشہ لکھتے تھے کہ جیون داس کا کوئی مذہب نہیں۔ اس لیے کہ اس طرح کچھ وہ گرجے میں پہنچا ہوا تھا اسی طرح وہ مندر، مسجد، گوردوارہ اور دوسری عبادت گاہوں میں جاتا تھا اور ہمیشہ کہتا تھا "میں خدا نہیں ڈھونڈتا۔ میں تو انسان کی جستجو میں ہوں میں جب کاغذ کا ڈبکا ناؤ بنا کر تالاب کی سطح پر لٹتا ہوں تو وہ تیرتی رہتی ہے۔ میری بڑی کی چھاتی سے جب درد و مح کے قطرے خود بخود ٹپک پڑیں تو وہ جان جاتی ہے کہ بچے کی جہک پکارنے والی ہے مگر وہی یہ جب بڑا ہو جاتا ہے۔ تو اس کی جہک پکار پکار کر دم نہ دیتی ہے مگر کسی کے سینے میں درد نہیں ہوتا۔" ایک ایک کرشمہ کی نگاہ ڈیوڈ فلسفی پر جا پڑی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی جستجو کے کاش پر دھمک نکل آئی ہو۔

ڈیوڈ فلسفی نے چاروں طرف غور و خروائی۔ سامنے بھی ہوئی تو بہ عورت کو دیکھ کر اسے اپنی پڑوسن یاد آگئی جس نے اپنے گھنے بیکر اور کچھ روپے خرچ کر کے کھانسی کا دویہ بنی تھی، اس کے خاوند نے نئی شکر مشین بیچ کر یا ڈریس سوٹ سلوا بایا تھا اس لیے کہ اگلے ہفتے کی شام کو وہ ایک بہت بڑے ہجو کے ہاں کیکل پارٹی پر دعوت تھے۔ ڈیوڈ فلسفی جانا تھا کہ اس ناچنے بنگال کے خط میں منے والوں کی بھرک یعنی دولت پیدا کر کے سیف ڈیپانڈ والا میں دیکھ چھوڑی تھی۔ اب وہ دو کڑے کی ہڈوں کا مالک تھا۔ اُن ہڈوں میں ان پچھ موز دور کام کرتے تھے۔ ان موزوں نے شہر کے باہر اپنی ایک علیحدہ دنیا بسا رکھی تھی۔ جہاں عوام ڈاکٹر منجنے سے ہی بیمار مل بے تھے۔ دراصل اس بستی کے لوگ ہر بات میں غفلت کرتے تھے۔ مذہب کی رکھنا بھی انہیں کے سپرد تھی۔ ذرا سی چمکا پر جان قربان کر دیتے تھے اپنی خوراک میں سماتین کا کوئی خیال نہ رکھتے تھے۔ اس لیے کیرے کوڑوں کی طرح سانس لیتے اور وقت سے پہلے مر جاتے تھے۔

ڈیوڈ فلسفی کو یوں محسوس ہوا جیسے انسان مر گیا ہے۔ یا شاید وہ جاگتا ہے مگر اس کا ذہن صلیب پر لٹکا ہوا ہے۔

اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ پروفیسر ڈیوڈ کے کافوں میں لیوچ کا یہ جید گونجنے والا آس نے
 گہرا کہ وہ آسے میں سے باہر دیکھا، سنہری دھوپ میں، دختروں کے ہنسنے پر کون معلوم ہو رہے تھے۔ ایک معصوم بچہ پلا
 ڈاک جتنے ہنسنے کے تر دیں، خوش پرانسی پائی، ماسے گڑیوں سے مٹی رہی تھی۔ ایک ہر کی شنی پر خاندان کا بھڑا بیٹا ہوا
 تھا، پروفیسر ڈیوڈ نے ٹوئیک پر دیکھی، برفی، بھیل، متدس، دہریں، ہاتھ میں اٹھالی۔ وہ حال کی تید سے تھل کر مستحق کی ایک دلکش دادی میں
 جا پہنچا، آس کے ہنسنے پر ایک عجیب و غریب ہکا بھکا ہٹ کھینے لگی۔

دو ہزار روپے کا چیک

دیوندر اتر

جب میں بس سوار ہوا تو وہ میرے ساتھ تھا۔ مالا کو جب تنگ میں بس کے انتظار میں اٹھنے پر کھڑا ہوا، میرے سوا وہاں دوسرا کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ وہ میرے ساتھ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ اور میرے قریب ہو گیا، نا معلوم کیوں مجھے اس سے کچھ خوف سامع میں ملنے لگا۔

اب تم گھر جاؤ۔ ہے تو اس نے پوچھا۔

”اے!“

”تو نہیں اس پر پار میں گنوارو پیہ ملا؟“

”کس پر پار میں؟“

”پر پار کے پر پار میں!“ اس نے کہا۔

”کیسا پر پار پر پار کا؟ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟“

”یوں ہی مجھ کو!“ اس نے عرض کیا اور میری جیب سے چیک نکال کر میرے سامنے پھینک دیا۔

دو ہزار روپے کا چیک — شاید یہ اجنبی کوئی چیک کتا ہے۔ میں نے سوچا۔ جب میں منگل داس کے گھر سے باہر آیا تو مجھے ایک لمحے کے لئے احساس ہوا تھا کہ میرے ساتھ میرے پیچھے کوئی دوسرا آدمی چل رہا ہے۔ لیکن اس اندھیرے میں مجھے کوئی فائدہ نہیں آیا اور پھر میں اپنے خیال میں اس طرح گم رہا کہ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میرے ذہن میں صرف ایک خیال تھا کہ اس دو ہزار روپے کا صرف کیا ہوگا۔ دو ہزار روپیہ پہلی بار میری زندگی میں اس طرح کیشت آیا تھا۔ میں بٹکے میں رہنا چاہتا ہوں اور میں کار خریدنا چاہتا ہوں۔ میں امریکہ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن دو ہزار روپے سے کچھ ملے نہیں ہو سکتا۔ بٹکے، کار، امریکہ۔۔۔۔۔ اور صرف دو ہزار روپے کا چیک۔ اگر میں منگل داس سے زیادہ مدد پسند کروں گا تو وہ رضامند ہو جانا۔ اس کی عزت کا سوال تھا۔ اگر مجھے سوا ہی کرنا تھا تو زیادہ روپے کے لئے کتنا۔

”میں صرف ایک ہزار روپیہ دے سکتا ہوں۔ منگل داس نے کہا تو۔

”ایک ہزار۔۔۔۔۔ کیا آپ کی زندگی کی قیمت صرف ایک ہزار روپیہ ہے؟“ میں نے طنزاً کہا تھا۔

”بات یہ ہے مٹا! ایک تو تم نے بھولی بھالی ٹپکی کوورغایا“ اس سے پیار کا ڈھنگ رکھایا اور اب۔۔۔۔۔

یہاں رہتا ہے۔

”یہ تو بزدل ہو۔ انٹی لیکچر ٹیل میں پھر کر بیٹ۔“

خاموش رہا، وہ نہ میں تبیں باہر پھینک دوں گا۔ میں فرمایا۔ میں اگلے بس اسٹاپ پر ہی اتر گیا۔ اگر میں بس میں ہی رہتا تو میرے
 ہاتھ اس کا قتل پر جاننا کر نہ تھا اور اسے معلوم ہو جاتا کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ محض انٹی لیکچر ٹیل ہی نہیں ہوں۔
 ”اگر تم رانی سے شادی کا خیال ترک کر دو تو میں تمہیں دو ہزار روپے دے سکتا ہوں۔“ منگل نے اس نے کہا تھا۔
 ”لیکن پیار؟“

”پیار برائی کا اور ہے اسٹرا“

”میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“

”اسی نے دو ہزار روپے دے رہا ہوں، تاکہ تم اس کے بغیر زندہ رہو۔۔۔۔۔ زندگی پیار سے نہیں پیسے کے دم سے قائم ہے۔“
 اور منگل اس نے دو ہزار روپے کو چیک کاٹ دیا اور میں نے وعدہ کر لیا کہ شہر چھوڑ دوں گا اور عمر بھر رانی سے نہیں ملوں گا۔ ماں ٹھیک ہو
 جاسے گی، میں کوئی کا دوبارہ کر لیں گا۔ مگر رانی کے بغیر زندگی یادوں کے بحر میں کی ایک خدا آتی ہستی ہے۔ میرے گرد بھرتوں کا گھیراؤ لگتا ہوتا
 جا رہا ہے۔ میں بھگا۔ میں نے اس بنام سستی میں پناہ لی جہاں شراب اور عورت کے جسم کی لگی ہیں سب بھوت جسم ہو جاتے ہیں۔ میرے
 سامنے شراب ہے اور شراب میں برست ایک محبت اور اس محبت کو کچھ ہوش نہیں اور اس کے جسم اور لباس میں ایک مہم رشتہ باقی ہے۔
 معقم جو چاہو کر سکتے ہو لیکن میرے ہونٹ نہیں کھٹکتے۔ اس مہم سے لباس سے بے نیاز ہوتی ہوئی وہ کہہ رہی تھی۔
 ”کیوں نہیں کھٹکتے۔ میں نے پیسے دے دیے ہیں۔ سارے جسم کے پیسے۔۔۔۔۔ ہونٹوں کے پیسے۔“

”میں پاؤں چلاتی ہوں۔ مجھے ہونٹ مت چھنا۔ میں نے ساری ہونٹوں سے وعدہ کیا ہے۔۔۔۔۔“

میں نے اس کا فقرہ پورا نہ ہونے دیا۔ میں اس کے ہونٹ چھو چکا تھا اور وہ کرنے میں جلیبی رو رہی تھی۔ اس کا سب
 نقشہ خائب ہو چکا تھا۔

”اب تم جو چاہو کر سکتے ہو۔ اب میں واقعی بڑی ہوں۔“

میں اس کے قریب ہو گیا۔ ”کیسی عورت ہے۔“

”میں نے ان ہونٹوں سے وعدہ کیا تھا وہاں کروں گی۔ یہ ہونٹ صرف اس کے لئے تھے۔“

”تم یہ پیشہ کتنی ہو اور پھر بھی۔۔۔۔۔“

”دل نہیں بیچنے سے جسم بیچنا کم گناہ ہے۔“ وہ عورت بولی۔

”دل بیچنے سے جسم بیچنا کم گناہ ہے؟ یہ کیسا اخلاق ہے۔“ میری جیب میں دو ہزار روپے کے چیک میں سرسراہٹ ہوئی۔

”خاموش رہو۔“

لیکن وہ چپ خاموش نہیں رہا۔

”بدلتی اور عجیبی کا نیا فلسفہ۔“ چیک نے تسخیر ڈالتے ہوئے کہا۔

”یہ چلو تم ہر۔۔۔ بد معاش۔“ میں غصہ میں بولا۔ میں نے چیک کو جیب سے نکالا اور پرنسے پرنسے کر کے کٹر کی سے باہر پھینکا۔
 ”مجھے معاف کر دو سائی۔“ میں نے اس عورت سے کہا۔

”یہ لاشم رانی نہیں اختہری ہے۔“
 ”ناموس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، جب تک کہ عورت کا دل ایک ہے۔“ میں یہ کہہ کر نیچے اتر آیا۔
 ”بچہ دی اجنبی کھڑا تھا۔ وہ اپنی نگاہیں اتناقب کر رہا تھا۔ وہ مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کی نگاہوں سے نکال کر نکل جانا چاہتا تھا۔
 ”وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ میرے قریب آگیا۔ میں زور سے جھینپا چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھ میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ
 میں چیک کے پرنسے تھے۔ وہ سکڑا ہوا اور میرے گلے سے پٹ گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کوئی اجنبی نہیں، بلکہ میرا سنا نا پہچانا میرا امرا ہے۔
 وہ میں تھا!

انسان، اس کا گھوڑا اور خدا

ابراہیم سعید

پینشنر محمد ارشد بخش نے اپنے سب سے بڑے، براہیم کے سوا باقی سب کی مثالی اپنے اہل و عیال کو دی تھی۔ لیکن جب چھوٹے بڑے کے لیے مناسب رہنے کی تلاش میں مصروف تھا تو غربت نے اسے، چاکلہ، آدرا چاکلہ، کیونکر ابراہیم سے سب سے زیادہ پیارا تھا اس لیے باپ کی موت کا غم اس پر بھاری کر ڈالا۔

اپنے گھر کے دوسرے افراد کے مقابلے میں ابراہیم تنہا پیدا اور بڑا ہوا تھا۔ اور استاد کی مانند حساس جو تنہا اس چھوٹے بچے پر بھروسہ تھا۔ وہ مناسب ذیل نعل پہناتا تھا، چمکدار، چھریا جیم، سرکس کے کھلاڑیوں کی مانند اس کے چہرے سے سرانیت نکلتی تھی جس کے باعث سکول میں اس کے ہم جماعتوں نے اسے اس کی چھریا جانی دیکھ دی تھی۔ جب بڑوں نے اسے حد سے زیادہ مذاق کرنا شروع کر دیا تو وہ اس کی تاب نہ لا سکا۔ ان کی چھریا جانی علیحدت اختیار کرتی چلی گئی، اس لیے ابراہیم کو پڑھانی پھر زنی پڑی۔ یہ کسی حد تک بہانہ بھی تھا کیونکہ اگر وہ اپنے گھروالوں سے اس بات سے میں شکایت کرتا تو وہ ضرور اس کا تہہ باب کرتے۔ اس میں بہر حال کوئی شک نہ تھا کہ جو فی ہند کے سکولوں میں ایسی باتیں غیر معمولی نہ تھیں۔ اس کے والد مرحوم نے تو پہلے ہی جانب لیا تھا کہ اس کے چھینے نیٹے کو فشی حاکم کو نیک غذا کوئی شوق نہ تھا۔ جو اس کی والدہ کی خواہش تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا دل شوقی علوم حاصل کر کے ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے دفتر میں فشی یا فیر بھرتی ہو جائے۔ وہ خواب فوجی ملازمت سے شک آگئی تھی اس لیے بیٹے کی تعلیم جاری کر کے چھوٹی۔ ابراہیم دل ہی دل میں رسالے میں بھرتی ہونے کا ارادہ کر چکا تھا۔ جب ماں کے کان میں اس کی بینک پڑی تو وہ اس کے خلاف کیڑا سپر ہو گئی۔ اس نے کھلے بند دل اعلان کر دیا کہ جب تک وہ زندہ ہے وہ بیٹے کو ہرگز موت کے منہ میں سرھینے کی اجازت نہ دیگی۔ اور اس وقت ابراہیم کی عمر کیا تھی۔ یہی کوئی چودہ پندرہ برس۔ اور لا کا خاندانی عقیدے اور رسم کے مطابق شادی کی عمر کو پہنچ گیا تھا۔ باپ کی بھی ایسی یہی آخری خواہش تھی۔ غیر مترقبہ موت کی وجہ سے یہ شرمندہ تعبیر نہ ہو سکی۔ باپ کی الم ناک موت پر ابراہیم کو تنہائیوں میں اور بھی زیادہ غرق ہو گیا اور ماں کی پیشامانی برصی چلی گئی۔ کسی کے کچھ نہ بھانے کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ماں کے علاوہ بھائی بہنوں کا بھی نہیں۔ سب شادی شدہ تھے۔ ان کے گھر آباد تھے اور وہ اپنے کاموں پر مامور۔ انہوں نے ابراہیم کے دل پر سے غم کا راجہ کم کرنے کے لئے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے کہا۔ کہ شاید اس طرح فضائی تبدیلی سے اس کا دل بدل جائے، لیکن وہ نہ ملا۔

یوں ایک برس گزر گیا لیکن ابراہیم باپ کی موت کے صد سے بے حال نہ ہو سکا، نہ ہی اس کی آنکھوں سے کوئی آنسو ٹپکا۔ نیتنا اس کے بڑوں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ اس طرح باپ کی روح کو بھی تسکین ملے گی اور بڑے کے دل کے زخم بھی مندمل ہو جائیں گے۔

چنانچہ ایک برس بعد بڑی شدت سے مناسب رشتے کے لئے تلاش شروع ہوئی۔ یوں تو حیثیت ملتی ادب بیاہ بھی ہو سکتا تھا لیکن مرحوم کی وصیت کے مطابق خاندانی ہونا ضروری تھا۔ اس کے نزدیک بیوی کی حیثیت پاسبی کی تھی، شہرہ کی انسر کی۔

ابراہیم کے مسئلے کی کئی ایک باتیں تھیں۔ شہرہ کی شہرہ جی کی ایک فریب دہ شام کے وقت حب مہول، دیر سے ٹھہرا رہی کہ تو اس کا مزاج جلد ہوا تھا۔۔۔۔۔ وہ خلافت قبول خوش تھا۔ لیکن اس لیے نہیں کہ اس کی والدہ نے اسے صبح اٹھاتا بتایا تھا کہ وہ اس کی عنقریب شادی کرنے والی ہے اس کے بعد اس کا جوگی چاہئے۔ نہ ہی اس لیے کہ اس کے لیے نہایت خوبصورت اور سبقتا شہرہ لی گیا تھا۔ لیکن جب اس کی ماں نے اس سے زینہ والی ہو کر تعریف میں بات کرنی چاہی تو ابراہیم کا چہرہ یک دم اتر گیا اور اس نے قدرے توقف کے بعد اسے جواب دیا۔

”اماں! بہتر ہو گا اگر آپ جاننا وین سے میرا حصہ مجھے دیدی۔“

یہ جواب سنی کر ابراہیم کی والدہ کو یوں عرس ہوا جیسے کسی نے اس کے سینے کے سامنے ٹوپ دکھا دی ہو۔

اس نے بڑی جلدی اپنے اوصان بال کرتے ہوئے جواب دیا۔

”بیٹا! تمہارا حصہ میرے پاس محفوظ رکھتا رہے۔ تمہاری امانت ہے۔ یوں تو جب چاہو گے۔ لیکن۔۔۔ شادی۔“

”نہیں ماں۔“

تو چہرہ تیس ایسی کوئی چیز کی ضرورت ہے جس کے لیے اتنی رقم دیکار ہے؟

”میں ٹھہرا، بگڑا، غریب، ناپا، بچا ہوں۔ لاہور میں چلاؤں گا۔“

اس جواب سے ماں نے یوں عرس کیا جیسے اس کے سر پر بم پھٹا ہو۔ وہ ایک ثانیہ کے لیے چکرائی، پھر محبت کر کے چارپائی کی پٹی پٹھ گئی۔

اب ابراہیم اسے سہارا دے رہا تھا۔ وہ اسے کندھوں سے پکڑ کر بتائے جا رہا تھا کہ اس نے کیا کیا۔ نہایت خوبصورت ٹھہرا تاؤ رکھا ہے۔ جس کی مثال

فوجی دہلی اور سندھ نام لکھ کر دے۔ یہ بھی نہیں لی سکتی تھی۔ وہ اس کے لیے نہایت عمدہ سا زاد شہزادہ لڑائی ناگو خود سے لگا۔ ایسا ناگہ جس

پر تو بادشاہ بھی بیٹھا پسند کرے گا۔ یوں وہ ٹھہرے کی تعریف میں قید سے لگا لیا۔ مال سر جھکائے انہیں سنتی رہی۔ بیٹے کی ذالہ بکت دیکھ کر

اس کی آنکھوں میں خوشی کے مارے اتر چکے پڑے اس نے اٹھ کھینے کو سینے سے لگا لیا۔ اور آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کا دل اندر

ہی اندھ بیٹھا بھی جاتا۔ اس خیال سے کہ پکا نام کس طرح روشن کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

کچھ اٹائی! لیکن محتاحت پر تعیاب ہوئی۔ اگر اس نے بیٹے کی اس سے پہلے فرمائش کر لیا تو اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا

”اور شادی؟“

”وہ بھی کروں گا۔ لیکن پہلے۔“

”خدا تمہیں خوش اور سلامت رکھے بیٹا، اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو۔۔۔۔۔ چند روز میں تمہیں تمہارا حصہ دیدوں گی۔“

یہ کہتے ہوئے ابراہیم کی والدہ اس کے سر پر ہاتھ پھرتے ہوئے، بھاری بھاری قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

تیسرے روز جب دو ٹھہرے کام کاج سے فائدہ ہو چکی تو اس نے بیٹے کو اپنے پاس بلایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ابل رہے تھے اس

نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تین ہزار روپے کے نوٹ ابراہیم کے ہاتھ میں دے دیئے۔ ابراہیم نے حسرت آمیز لیکن منجھ جہ بات سے اپنا حصہ

دھولی کیا۔

دراپھنا، ابراہیم اس میں بھی کچھ چوڑائی کر رہا تھا۔ وہ تمام انداز میں ریشی، شریخ رنگ، دلفریز اور ہاؤس میں جگہ اور بچنے ہوئے تھا۔ نیچے شکار سر پر ایک خاص شکاری کچھلی جو اس کی گل سے اٹھ دیتی تھی۔ سلطان بازار میں اپنے ہاؤس اور گھر میں پٹے کھنگر مل کر سر پر کئی کھنٹی کی غائب کر رہا تھا۔ اس کے مار سنگھ کے بیچ کھلے ہی کیا۔

ابراہیم کے بیشتر محلے داروں کو اس کی سنجیدہ شریخی پر تعجب ہوا۔ وہ کچھ کو اس کی اس حرکت پر غصہ اور سختی ہو کر اس نے خاندان کی ناک کٹ ڈالی تھی۔ لیکن شہر میں ابراہیم اور سلطان ضرور صریح تھی یہ سننے والی توڑا جاندار نکلا تھا!

فیصلیہ سے اپنے کاروبار کے رازوں سے واقفیت حاصل کر کے ابراہیم اب اپنے خواہ کو عمل حاضر ہونے کے لئے۔ وہ بڑے ہانے کے لیے۔ تیار ہو گیا۔ اس کی گل نے فیصلہ سے درخواست کی کہ چند روز کے لیے رشتے کے ساتھ لاہور رہے اور اسے کام کے نیشب و فرستے علاقہ متعارف کر دے۔

لیکن سنانی صبح ابراہیم نامی جگہ جاتا شہر نے بنگلہ اس کا آبائی شہر، جہاں وہ خود پیدا ہوا تھا۔ جہاں اس نے پرورش پائی تھی۔ اس شہر کو چھوٹے وقت اس میں عجب دوا اور دوا کر گیا۔ لیکن اس میں نہ تو درد تھا، نہ میں، نہ غم، اس نے وہ بارش کر اٹھارہ سال کو دیکھا تھا کہ وہ اس کی نظروں سے ابھرنے پر گیا۔ سلطان کا سرخ سر ہلکا ہوا اور اسے اور اٹھ اٹھ جاتا تھا۔ اس کے قدم بھی نئی دنیا میں بڑی بے تابی سے لگے بڑھتے جاتے تھے۔ مدخل جہاں تھے سلطان ابراہیم کی سزائی کھینچے لگ گیا تھا۔ اس کی آواز پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ اس کے اشارے پر مڑ جاتا۔

جیر۔ سلطان! میں تیرا چل میرے دوست! ہم اپنی منزل سے دور نہیں۔ ایک نئی دنیا تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ یہ نہیں اس کی سیر کر دے گا۔ ابراہیم نے سلطان کو غلط کر کے ہونے کہا۔ اور جواب میں یوں غصہ ہو کر اس نے ہنسیا ہو۔

بے دہے دے! پاس بیٹھے ہوئے فیصلہ کیا۔ وہ لاہور جا رہے تھے، وہ سفر میں کہیں ٹر جاتے۔ کہ سلطان تھکے لگنا نام نہیں تھا تھا لیکن ابراہیم آرام آرام سے جانا چاہتا تھا۔ پانچویں دن وہ لاہور پہنچ گئے۔ وہ شہر جس کے متعلق انہوں نے کئی قصے سنے تھے، جب وہ در جہاں آدھا گھر کے مغربوں کے پاس سے گزرے تو شہر کی بکیا صاف دکھائی دینے لگیں۔ اور اسے راد کی اپریست، شاہی مسجد کے پاس سے شہر کے مرکز کی طرف، جہاں سے سڑکی کی لہریں اٹھ اٹھ کھائی اور جس جگہ تھی۔ اور جوانی دولت سے یقین اور پاس رقص و سرود میں کھو جاتیں۔

جو نئی سلطان کے انہوں میں کوئی لہری پڑی، وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ وہ اپنے کچھ پائل پر ایسا تہہ ہو گیا۔ اور جب وہ بھیڑ میں سے گزرا تو اسے مسدود دیکھ کر، شور و غوغا سے کھلا اٹھا اور اپنے کچھ پائل تانگے کے پچھلے تختے سے اڑنے کا۔ اس پر مینا نیچے اتر اور اسے ہانک سے پکڑ کر پیدل جوڑ میں سے لے کر چلا یا۔

شہر میں ہر ایک کیا صدمہ ہوتا ہے! کیوں! ایک شہر نشین سے فقر کی آواز سے پرچھا۔ یہ میرا منڈی کی شہر مغنیہ و ساحرہ غمناک خود شیدائی تھی۔

ان۔ ہم ابھی ابھی پٹی سے آ رہے ہیں؟ فیصلہ مردانہ وار جواب دیا۔ لیکن اس کی نظریں گھڑے سے کچھ الٹی اور کچھ ان سے گھٹنے پر جاتی ہیں اور واپس لوٹ آئیں۔

نہیں خوبصورت گھڑا اور ہانڈ ہے! اپنے دیس کا ہے۔ تم میں سے ہانک کو ہے؟ خود شیدائی تبشیر نظروں سے ابراہیم کو

اس لیے کہ اس نے ستر ہی صاحب کو خوش نہیں کیا کبھی یہ الزام بھی اکر کہ وہ بڑا کام کر دیتا ہے۔
 "ارے میں تمہارا یہاں کیا کام قسم قسم کی برائیوں کا سوا یہاں تو تم تو ایک چکر میں بھی اتنے روپے کا سکتے ہو
 اتنے ہم سارے دن ہیں ہمارے پیٹ پر کیوں لات مار تے ہو۔"

ایک سی پیش کرتے
 گھڑتے پانچ بھول گئے کہا
 گھیا دھکا لٹکے والے اس پر تبصرہ کرتے۔

اب ابراہیم کا اپنی ہرجا بھگت سے متعلق ذکر تھا اس کا کسی اچھے دوست پر تو جتنا امکان تھا اگر کچھ نہیں تو چاہی اسے اپنی جگہ سے ہٹ جائے
 کیسے سنی بھا دیتا۔ اور ابراہیم نے بھی قسم کھا دی تھی کہ وہ کبھی کسی کی سنبھل کر نہیں کرے گا۔ اس کا نتیجہ بھی اس نے بھگت تروخ کو دیا۔ آئے دن جرمنا۔ اور
 پہاڑی۔ وہاں وہ گناہ فریضہ کرتا تھا۔ اس لیے اس نے ستر بھی کو اپنے چند محسوس آدمیوں پر مبنی ممبرے ورنہ گھر تار ہے۔ سدا ان کو آرام دینے کا سولہ
 اُسے سے ہٹ کر اس جگہ دیا جاتا تھا۔ اس طرح اس کی رہنمائی نہ ہوتی تھی۔ سواری حاصل کرنا قدرت پر چھوڑنے سے لڑا تے اس نے اس کی سات
 روپے ہوتے جن میں سے سارے تین چار روپے تو سلطان کی خدائ کے لیے درکار ہوتے اس کا پناہ کھانا پینا اور دوسرے خرچ اخراجا اٹک
 سرکاری فری سواریاں اٹک۔ اس صورت میں بھی اس کا اتنے دن چلا ان ہر جگہ۔ وہ سفارش ڈلو اتنے سے رہا اس جہان بھی ادا کرنا پڑتا
 اسنے پانچ سات روپے میں براہ کرم کر کھلائے۔ جرمنا دے نہ دے کھائے، پیئے کا خرچ پورا کرے۔ ساڑو سالانہ کی مرمت کرانے۔ گھر بھیجے
 کیا کرے اسے جب یہ بڑے گھر سے کی خوراک کا تھا کہ اس کی قسم کی کمی واقعی نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ جب گھر سے مال کا روپوں کے لیے خطا آتا
 لڑا سے نہ صرف اٹک کر بلکہ صحیح حالات بھی بنانا ممکن تھا۔ کیونکہ وہ پانچ چھ ہفتے تک لڑا سے مقرر تیر ماہ پچاس روپے بھیجا رہا تھا۔ دو مہینے سے
 تندر دوانے کا اس پر فرض بھی چڑھ گیا تھا۔

"ارے یا۔" تم بھی بدھو برا کل بدھو برا سونے کی کان ہوتے ہوئے اسے استعمال نہیں کرتے۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو اس مال کے
 کے درپہ اب تک شاندار بڑی کھڑا کر لیا ہوتا۔ کم از کم ہزار روپیہ ماہوار اس میں سے یہ اکڑنا کلو خاں، تندر کا مالک، ابراہیم کے فقر و غصے پر
 تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

ابراہیم اب اب تک سواریوں کی طبیعت اور تعاضد خانے کی سی پانچ بی بی نہیں ہوتی تھی لیکن ان کے کوئی لٹھ بڑے کا تندر و رشقی تھا
 نقد واد۔ داد و شائبش۔ تندر۔ تندیسی داد و دہن سننے پر بھی خوشی سے بھولا نہ سکتا۔ اور ادھر سننے میں آیا تھا۔ اس کی سگائی بھی کی ہر کچھ تھی
 اس کے دل ہی دل میں یہ یاد کے ہیں اٹھتی کہ اس نے اپنے ماپ کی آخری خواہش۔ شادی۔ پوری کرنا ہے۔ اور یہ کہ اس نے اسے دھوکہ دیا تھا۔
 آٹھ۔ بعد اسے ایک منفعت بخش کام ملا تھا۔ ایک سیٹھ کی لڑکی کو گھر سے سکول پہنچا اور وہاں سے گھر واپس لانا۔ یہ کام مشکل آدھ
 تھنے تھا۔ اس کے لیے اسے ساتھ روپے، ہوا، روپیہ ملتا۔ لیکن بڑا اپنے فرائض سے بکدر و شہ جوئے کے بعد تو وہ خدا کا شکر ادا کرتا۔ کہ اس کی
 سواری کو کوئی حادثہ پیش نہیں کیا تھا۔ کیونکہ تانگے والے اس معاملے میں کافی بدنام تھے۔ وہ مذکورہ رقم براہ ملنے ہی اپنی والدہ کو گھر مٹی آروڑ
 کے درپے بھیج دیتا۔ لیکن چار مہینے بعد اسے سیٹھ نے اچانک جواب دے دیا۔ اُسے سیٹھ سے استفادہ کرنے پر بھی اس کی وجہ محسوس
 نہ ہوئی۔ لیکن اسے نوکر سے پتہ چلا کہ لڑکی کا مذکورہ طریقہ کسی آدمی کے سے مصافحہ ہو گیا تھا جس کا نتیجہ سیٹھ اور اس کے خاندان کے لیے

ہذا کی گامٹ بنا چاہتا تھا۔ اس لیے بیٹھنے سے چندا کہیے کسی دسک شریج۔ یقیناً سلا سیٹھ کی اپنی گلی سے شروع بنو لاد دیوال کے دیو عروج کر بیٹھا تھا۔

کسی مات جب وہ سانسے گیرونج کے تریب چھاؤنی سے واپس آ رہا تھا۔ سلا سیٹھ کی باگی تھتے سے ہاند سے اندر وہ گلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ حیات میں متفرق تو کینیم دجوش سوامی نے اسے آواز دے کر ٹانگوں کو کیا۔ ابراہیم نے پچھلے آواز سے انکار کرنا چاہا کیونکہ وہ دس بجے کے بعد کبھی سوامی دیا کرتا تھا لیکن اس نے غصے سے کہا کہ یہ عادت بد ہونے لگی۔ سوامی نے شراب پی رکھی تھی اور وہ شرک کے میں درمیان لڑکھڑاتی ہوئی آکھڑی ہوئی تھی۔ اگر سلطان اسے دیکھ کر پہنچے تو غصے سے انداز میں ہنساکر خطرے کا اہلام دیکر ابراہیم کو میدان زد کر دیتا تو وہ ایک معزز راہ گیر کو لاپرواہی سے تھک چلانے کے باعث مار ڈالنے کے جوہر میں جیل خانے کی ہوا کھاتا نظر آتا۔

وہ نیم دجوش سوامی اب ٹیٹھ کی پھلی سیٹ پر دراز تھی۔ اس کے منہ سے بدبو کے ٹپے نکل رہے تھے۔

• سیرنی رات کیا دیکھتے ہو۔ میں ہاش۔ میں ہوں۔ جوش میں۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔ ایسے جیٹھ کی تلاش تھی۔ رات۔۔۔۔۔ کے وقت۔۔۔۔۔ سیر کرانے کے لیے۔۔۔۔۔ ریش۔۔۔۔۔ عیش۔۔۔۔۔

• صاحب!

•۔۔۔۔۔ لو۔۔۔۔۔ ایدوانس۔

سوامی نے "بشتہ آتھ سے اپنی بیرونی جیب میں سے ایک چرم شدہ پانچ روپے کا نوٹ نکال کر ابراہیم کو کھاتے ہوئے کہا۔

• سیر کرادو۔ خوش کروں گا۔ خوش!

• کس جگہ کا صاحب؟ ابراہیم نے تشریف نہ لیا بلکہ ایسے میں پرچھا۔

• کتنی دور سے کام کر رہے ہو؟

• کوئی ایک سال کے۔۔۔۔۔

• تو پھر کیا سیر کا مطلب۔ نہیں جانتے۔

• یہ جو اب سن کر ابراہیم چونک پڑا۔

• تم فٹ کلاس مانگے والے۔۔۔۔۔ سوامی نے جیب میں سے جانی واکر کی بوتل نکال کر منہ سے نکالتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

• مولوی۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔

اس پر ابراہیم اپنی سیٹ سے اچھل پڑا۔ اس نے ایک لحظہ کے لیے باگیں کھینچ لیں لیکن پانچ روپے کی اس نے اسے اس حرکت سے باز رکھا۔ اس کا جی چاہا کہ سوامی کے منہ پر چاک دے ماسے۔ اسے ہر طرح کے لاکھ کو خوش نہیں کرنا چاہیے تھا کیا؟ اس نے سرچا۔ اس سوامی سے تو وہ اس رات پچاس ساٹھ روپے کا سکھاتا۔

• اپنے مٹنگے۔۔۔۔۔ اور آسمانی گھوڑے کی تزیین ذکر۔ یہ ہم لوگوں کے لیے ہے۔۔۔۔۔ ہم۔۔۔۔۔ سوامی نے جانی واکر کی بوتل پیسنے سے تھکتے ہوئے کہا۔ اس سے اس میں تشراب جھلک کر کھنس کے کپڑوں اور منہ پر جا پڑی۔

•۔۔۔۔۔ سوامی نے شراب کی خوشبو سے سرشار ہو کر بولے۔

وہ انہیں نہ کیے حالات میں متفرق تھا اس کے دیوے اندر جی اندر گھوم رہے تھے، جیسے وہ منڈے میں ناشترہ دیکھ رہا ہو۔ جب اس نے انہیں دیکھیں تو اسے یہ دیکھ کھیرت ہوئی کہ رات و صبح کی طرح کلاؤڑ ہو چکی تھی۔ چھٹیاں چڑیاں و قصاں تھیں۔ یہ ان کی چھپا ہٹ سے سرور تھی۔ سلطان جھوک گئے مارے اپنے حضور نام سے فرشتہ کھرج رہا تھا۔

جب براہم ٹوکر تیار ہوا تو اسے تھوڑی دیر کے بعد مسدود کہا گیا۔ ان کے لئے ہڑتالی کو دی گئی تھی۔ کارپوریشن نے ان کی یونین کا کراسے بڑھانے کا مطالبہ کیا اور یونین نے مزید فیصلہ کیا تھا کہ جب تک یہ پروٹسٹ نہ ہو ہڑتالی جاری رکھی جائے گی۔

یہ خبر براہم پر لائے گئی تھی کہ اس نے ان دنوں روزمرہ کا خرچ مشکل پر آکر تھا۔ اس وقت اسے بول عرصہ ہوا تھی۔ اس نے اس معاملے کو اس پر اتنے بڑے شہر میں دینی اور مددست نہیں۔ لیکن اس کے لئے راستہ مسدود تھا۔ زیادہ ٹوکر اسے مسدود کر دیا تھا۔ اس کی خزانہ نقد لانا تھا اس کے لئے اسے ہڑتالی کے دور میں وہ آدھا درجہ مل سکتی تھی۔ باقی رقم اس پر اپنا معاملہ اس کا وہ دیکھتا تھا۔

سانہ لڑا بہت شرمین ہے، اگر ہڑتال کے دنوں میں اسے قرض نہ کھلایا تو لڑاؤ کا ہو گا۔ آج پاؤں پر دے گیا ہے اتنی پھرے جاؤں گا۔ ضرور اے کلواں نے ہڑتال پر تبصرہ کرتے ہوئے، دراجیم کے ارے میں اپنی بیوی سے کہا۔ رات واپس آئے ہی ابراہیم نے اُسے پاؤں پر دے دیے تھے۔

ان دو گول کوادھار زدے کرخو، بھر گول مرنا ہے۔ رکھی: کل خان نے خوش ہو کر ابراہیم
 بیس روپے ہی تو تھے اس کے ذمے۔ کیر نکو وہ دوسرے نانگے والوں سے متباہے ہیں بہت کم کھاتا ہے۔
 ضرور کسی اچھے خاندان کا ہے۔ اُدھاری کوئی بیٹی بھرتی تو میں تو اسے اپنا داماد بناتا۔ کل خان ابراہیم کو دیکھ کر
 لہجہ میں کرتا۔

خیر ابراہیم کو سلطان کے لیے خوراک امداد قرض ملی گئی اور اپنے لیے کھانا بھی لیکن اگر حالات مختلف ہوتے تو سلطان کو مجبور کر دینے کا خیال آتے ہی وہ کاپ اٹھا پھر سوچنے لگا کہ اس نے اپنی یہ درگت تو خود بنائی تھی۔ اس کی جیب ہی تو ہر مذموم ذمہ میں تیس روپے ہونے چاہیے تھے وہ اس وقت کام آتے۔ اس کی کلاس کے ٹیچر کے واسے کتنی عیش کرتے تھے۔ منہ دہ دیکھتے تھے۔ شراب پیتے تھے۔ اور مفت دین جی بھی کرتے تھے یا اس کی اسٹورنگ کٹ جائے گی؟ وہ پہلے کی نسبت بہت لاغر ہو گیا تھا جیسے بیمار ہو کر ہیں وہ دوسری کلاسوں سے تھوڑا سا بہتر تھا۔ اس کا ناگ نہ پھٹا۔ اسے دانا کہ ہر روز ضرور دے مرقہ اور انیس کرفی پڑتی تھی۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جو زندگی بھر اپنا ناگ نہیں بنا سکتے تھے۔ کئی بیمار تھے اپنے جانوروں امداد پون کا خرچ

اور پھر تال جابر کی تھی۔ اس سے سلطان کو آرام مل رہا تھا۔ لیکن یوں کہ کب تک ہم چلیں گے۔ کب تک تودہ شاہی سواروں کی قس کی دہ اس کا

ابراہیم اسی ادھر بن رہا تھا کہ کبھی تجسس اُٹانے اُسے پوچھا دیا کہس نے ہاڑ سے پرچھا۔

کیا براہیم خان کو یہ انکیاں رہتا ہے؟

ابراہیم چونکہ نابالغ تھا۔ نیز کیونکہ اس سے بہت کم لوگ ملنے آتے۔ اور یہ آواز بھی تو غیر مألوس تھی۔ وہ بے بسی سے مابہر آیا۔

شدت سے کہنے لگے، باز اس وقت قبرستان کی مانند غمراش اور بے جان سا دکھائی دیتا تھا۔ جب دونوں منزل مقصود پہنچے تو ابراہیم نے اس مقام پر ایک - چشتی نظر ڈالی جس میں اسے داخل ہونا تھا۔ مس خورشید بگم،

" غم نہ تھے جیسے حرف میں لگا ہوا اس کے ہاتھ پر ایک بردہ لگا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد ابراہیم نے اپنے آپ کو دادی انگلیوں کے سامنے کھڑا پایا اس نے یوں غمراش کیا جیسے اس کے منہ پر پیسے والا کالا ٹکڑا گیا ہو۔ وہ دیکھ کر اسے متحالی کی مانند اپنی طرف کھینچ رہی تھیں وہ منکرائیں۔ لب کھلے۔ مخاطب کو ایسا غمراش ہوا جیسے وہ غمراش باتیں کر رہے ہوں اس نے دیکھا کہ وہ واقعہ ہے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کے لیے اشارہ کر رہی ہے۔ چرأ سے یکدم نہائی دیا۔

"بہن میں را گھڑا ناگہ سب پند ہے۔"

ابراہیم اس بات پر ولی ولی میں خوش ہوا۔

"کرائے کے لیے نہیں۔ پرائیویٹ استعمال کے لیے ہونا چاہیئے۔ خورشید کے پاس بیٹھا ہوا وہی شخص، یسین، جو ابراہیم کے کرتا تھا، گویا ہوا ابراہیم یہ بات سن کر اٹھ بیٹھا۔

"خفا کیوں ہوتے ہو۔ جی جاتے اے تو دکان خورشید نے یسین سے کہا۔

"لائے۔ اپنے دھن کے برتنے ہوتے تم۔ سے ہم خطبات تھوڑی کر سکتے ہیں یہ ہم غریب آدمی ہیں تم ہم جیسی سواروں کو کب

پہچھ گئے۔ جب تم چائے ڈال گئی خورشید اور اجنبی ابراہیم سے اور اصرار کرکے باتیں کرتے رہے۔ اور جھکائے بیٹھا رہا۔

"یہ شرمیلا ہے۔"

"وہ خدا تمہیں نہیں کرنا چاہیئے۔" خورشید کے ہاتھ نے نفردیتے ہوا کہا۔

"بتنا جو برقم نے اس چوری تیار کرنے پر خوجہ کیلئے اس سے تو کوئی اور کار بار کر لیتے اس نے قدرے توقف کے بعد بعد کلام جاری

رکھتے ہوئے کہا۔

"تو تمہارا کیا مطلب یہ ہے کہ جو چیز اس نے اتنے شوق سے بڑائی ہے اسے بچ ڈالے؟

خورشید نے یسین سے پوچھا۔

اور کیا تم نے جو کہا تھا مجھے ایک عمدہ گھڑا ناگہ چاہیے۔ اپنی سیر کے لئے۔"

"نہیں کہہ کر ابراہیم واپس جانے کے لیے اٹھا۔

"آئی جلدیوں خفا ہو گئے یہ جو تمہارے نفع نقصان کا خیال رکھنے کے لیے بیٹھا ہوں۔

"یسین! خبردار اگر ایسی بات کی!

"میں اس کی چیز اس سے چھینا تو وہی بول پیسے ہوں گا۔ مثلاً یسین نے اپنی واسکٹ کی اندر دلی جیب میں سو کے نوٹوں کا بندل نکالا

کر سامنے رکھتے ہوئے کہا "تمہاری قیمت دوں گا۔"

لیکن تم یہ مانگہ خریدنے پر کیرن مقرر ہو، خورشید نے پوچھا
اس پر ابراہیم نے اس کی طرف دیکھا، ایک لمحہ سے لیے جواب میں خورشید نے آنکھیں جھپکیں اور وہ مکرادی اور اسے مانگہ سے اشارہ
کیا کرتے کرتے۔

”میں اسے مصیبت سے بچانا چاہتا ہوں۔ یہ کام بڑا مشکل ہے۔۔۔۔۔ اور ہر سال۔۔۔۔۔ اسے اس کا جو خرچ کیا ہے اس سے ڈیڑھ
گنا اپنے کو تیار ہوں!“

”نہیں میں اپنا گھوڑا کاکھی قیمت پر نہیں بیچوں گا“ ابراہیم نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
”اچھا جی، تمہاری مرضی خورشید کساد می نے جواب دیا۔

”پھر پھوڑا خورشید نے اسے مانگہ مارتے ہوئے کہا: کوئی اور ضرورت کر لیں گے۔“

اس نے تھوڑی دیر کے لیے خاموشی اختیار کر لی جیسے کسی شے کا حل سوچ رہا ہو۔ پھر لکھت گریا ہوئی۔

”یہی ہے تم نے میرا دل درجہ کی چنی ہے۔ لیکن لاڈ نہیں مانتا۔ تو پھر ماہوار اسے کرائے کی بات ہو جائے۔ صبح شام ڈیڑھ دو گھنٹے میر
دیر کے لیے!“

ابراہیم کے چہرے پر سرخمی کی لہر دوڑ گئی۔

”اچھا، اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو یہی سنی ہو گا یہ دیکھو کہ بھی اپنا پٹرا کروا دے تو۔۔۔۔۔

”کیوں کر ابراہیم، منظور ہے؟ اس نے اب ابراہیم کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس میں نامشکوئی کی کیا بات ہے۔“

”گفتا ہو گا؟“ ابراہیم نے پوچھا۔

”ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار، خورشید نے جواب دیا۔

”ڈیڑھ سو ڈیڑھ سال میں اتنے کرائے سے ایسی چوڑی مٹی ہے۔ اچھا جانی! اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو۔۔۔۔۔

”کیوں جیسی غافل نہ سے؟ اب تو ہل کر دو“ یسہی نے ابراہیم کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

ابراہیم نے دوزن کی طرف کیے بعد دیگرے تھانے گاہ تک بھاگ کر اگلی سے فرش پر اوڑھے سے بنائے گا۔

”جیسی بڑے شرمیلے ہو۔ تو کیا میں بھی دھن کی طرح سے ملے کدوں“ خورشید ہنسنے لگا۔

ابراہیم مکر اڑا اس نے گڑھی کے پلے سے منہ ڈھانپ لیا۔

”واہ میرے جانی! یسہی نے اسے منہ سے گانے کا گوشہ بکرتے ہوئے کہا۔

”تو پھر لاؤ ایڈوانس! وہ بلا۔

”گفتا؟“ خورشید نے پوچھا۔

”یہی۔ ایک مہینہ کا۔ آج کل ہر سال ہے۔ نہ معلوم۔۔۔۔۔“

”تو پھر اپنی جیب سے دے دو، حساب کر لیں گے۔“

اتنے ہی نہیں اپنے پیچھے آئے ہوتے ایک نانگ کی کھڑائی دی وہ سر پٹ بھاگا آ رہا تھا پانے کی طرح جیسی وہ لک کے پاس سے گزرا تو ہر ایم ایک پلٹنے کی طرح جھپٹا۔

”ارے کتے..... اس..... کو گال لے جا رہے ہو، تجھے پٹمگ گئے ہیں۔“ دیکھیں آج تیرا بھی گدہ۔ جلا کے ایک لے ابراہیم نے چونک کر گردن ہڑتے ہوئے دیکھا وہی ایم۔ ایل۔ اسے قہارے اس نے شرکے نشے میں چڑکھتا ہوا پیشتر خورشید کی جھلک کے سامنے آ رہا تھا بیس انگ چلا رہا تھا۔

”خبردار اگر گالی دی“ ابراہیم نے بڑی تندی سے گرجا کر جواب دیا۔ پیٹ چاک کروں گا؟ اور اس نے گال خلی میں سے بغیر ہتھکا سٹوہ چاک نکال دیا اسے گھما کر حریف کے بند پر دھکے مارا۔ اس نے کینٹ یا علی کا فہرہ نکال دیا اور سلطان کی باگیں ڈھیل جھینڈ دیں۔ اب فضا میں بیک باندھے، تیزی سے توڑیں چھٹنے کی آمادہ بند ہوئی۔ شرک کھل، سنان بعد لمبی غمی۔ اس وقت ابراہیم کو فقط یہ خبر تھی اس کے ہاتھ میں باگیں تھیں۔

”اگھ، جھپکے کے عرصہ میں ایک شدید سادہ اڑتا چلتا دکھائی دیا۔ گرجتا ہوا شعلہ! رومی میں سلطان کے منہ سے آتش کمر لے نکلتے اور دھند میں تحلیل ہو جاتے۔ وہ پیسنے میں شرار، سنہری دیبا کا دیوتا صوم ہوتا تھا اب ابراہیم نے دیبا کے کنارے کچی شرک پر پہنچ کر اسے روک دیا ایک گھنے ذخیرے کے قریب، جہاں سے وہ یا کبھی ڈالاک ماند رہیگا ہر اگھ ڈالاکھا دیتا تھا۔

”شاباش؟“ خورشید نے اسے نظروں اندر سے داد دیتے ہوئے کہا اور فرط انسا ط سے جیسے سے اس کی گردن کے گرد پانا بند

محال کر دیا۔

”اس نے مجھے گالی دی غمی!“

تمہنے بھی تو کچھ کہہ نہیں کیا۔ اب بیس سے ہر شیارہ زور رہنا۔ وہ ہمارے خلاف ہو گیا ہے۔

ابراہیم نے اس کا ہاتھ آہستہ سے گدی سے ہٹایا۔ اس وقت اس کی نیگروں آگھ کی کتیاں پھیل رہی تھیں خورشید پر داخل سی جھائے

جا رہی تھی۔

”میں اسی شدید دل کی کہ اس بندہ کو انے کا بند ریت کروں گی۔ غم نہ کرو۔ تمہارا کوئی بال نہک۔ بیکانہیں کر سکتا۔“

سلطان کی مانند ابراہیم کا چہرہ بھی پیسنے میں شرار تھا اس کے تھمتاتے چہرے پر اس کے نظروں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ اسے اپنا چہرہ اس کے قریب لاتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ اب شہوت آمیز سنی سن دی اس سے شرمتے دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی۔ ابراہیم گھبراہٹ میں پہنے ہاتھ کی پیشک پنا مند پر چھنے لگا خورشید نے اپنی چوٹی سے گمے نیلے رنگ کا مدال نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس وقت رات کی رانی خوشبو سے ملک اٹھی۔

کتنے بہادر ہو۔ مجھے آج پتہ چلا۔

مدال دیکھ کر ابراہیم پر فیصلہ دکر سا کر اسے یاد لے۔ خورشید سرکھٹ ہوئی گدی پر سے نیچے اڑائی۔ ابراہیم جلدی سے

دوسری طرف سے اٹھ گیا، بعد ازاں بنایا۔ ابراہیم اس کی پشت پر تھپ تھپا، پھر اس کی گردن تک پہنچا، گھڑے سے اس کی طرف منہ مٹھا۔
ابراہیم نے اسے اپنے شانے سے لٹکایا۔
- شہناش، شہناش -

دوسری طرف سے خود بخود گھڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتا ہوا تھپ تھپا، ابراہیم کے پاس ہانکھڑی ہو گئی، اندر اپنے رد مال سے جو ابراہیم نے
پہنے سے نکال کر دیا تھا، اس کا منہ پرچنے لگی۔ ابراہیم اس کو کھینچ کر ہٹا دیا۔ - گھڑے سے کیا؟
خود بخود گھڑے پر دھند سی چھائی دکھائی دیتی تھی۔ ابراہیم اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اس کا ہاتھ پرکھو
آہستگی سے ایک طرف کھینچتے، جسے دوسری طرف اس کے منہ میں ڈال دیں، وہ بلا درد اس کی طرف پھینچتا چلا گیا۔
قندھ کی چوہ بدتر تھی، جھانپ کر اس کی سرسراہٹ کی، آواز پیدا ہوئی۔ اسے سن کر دونوں ایک دوسرے سے چونک کر اٹھ ہو گئے، جیسے شتم

ہو گئے۔ جو دھند میں دو گھڑے سے اٹھ ہو گئے۔
ابراہیم اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا تیر کی تانے کی طرف لپکا، سلطان خضے سے زمین پر پاؤں مارنے لگا، اس کے کان کھٹے ہو گئے۔
دوسرے طرف ابراہیم اپنی کمر کی کتے سے ایک لہلہا سا چاقو نکالتا دکھائی دیا، کان کھل کر دھند سے لپکا۔ خورشید جھانک کر گھٹنے کی اوٹ میں
ہو گئی، اس نے رنبد قہر اٹھا کر اپنے گرد بیٹھ لیا۔ گشت خرمہ حریف اس سے کھم کھم جوتا دھند پانی ڈر کے مارے نیچے کھڑا تھا۔

- وار۔ اس منہ کی کڑ! بر۔ ابراہیم۔ ایل۔ اسے سیلو کا بن چھو تھا۔
نیش کے کرانے کی آواز سنائی دی، اندر جھانپ کر اس کی جھانک سائی دیا۔ سیلو کے نیچے پیچھے تھا۔
خود بخود ابراہیم آدھ گھنٹہ بعد آہستہ آہستہ ٹانگے پر والیں جاسے تھے۔
- بڑا جیلا نکلا، نیش کی تہمت چلی جی جی گئی -
- اچھا لا چاہا ہے!

خورشید سے جملے داروں نے یہ ماجرا سن کر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔
اس کے چند روز بعد ہی ابراہیم کی نیش پادنی سے منہ پھیر ہوئی، کمر کو اب وہ اکیلا تھا اور اس کا ہاتھ کھل گیا تھا، اس لیے خاصہ صدمہ
کا مقابلہ ہوا۔ جس میں جہاں اسے بھی چند قسم کے دواں نیش میدان چھوڑ کر جھانک گیا۔ ماری نے آخر کار وار بھی اٹھا دی تھی۔ اور اب ابراہیم
برآمدہ دم دھم پھینک رہا تھا۔ اس نے اپنی شادی کی تاریخ خود مقرر کر دی تھی۔ ملک آزاد ہونے کے دو دن بعد۔ اس کے ماتھے پر ایک چاندنا
زخم بٹا تھا، وہ اب بڑھ چکا تھا۔ وہ اب بڑھ چکا تھا۔

اس نے تیر کر لیا تھا کہ شادی کے بعد خود تیر کی ملازمت چھوڑ دینا اور تمام تر کام اپنے بل بوتے پر کرے گا۔ وہ اب بڑھ چکا تھا
دلت کو سر میدان کی خواہشات پوری کرنا، جس میں معروف و غیر معروف، سیاسی و غیر سیاسی لوگوں میں شامل ہونے، حتیٰ کہ جھانک آزادی کے لیے طوفان برپا
چلا گیا، جو کہ بعد ازاں اپنی اہل ماپ پر مرحوم کی خوش پوری کر سکے گا۔ اس نے شہر کے مغرب کی اہل اندک ایک سے تا ایک تیریں کرتے دیکھے تھے
شہر کے مک کے کرنے کی آزادی کے لیے جوس نکالے جا رہے تھے۔ اس کے لیے زیر کھش اور جنانات جذباتی حیثیت رکھتے تھے، ملک
کے کسی سے ہی اسلامی حکومت کو قیام نہیں دیا، اپنی ڈگر پر کسرت چلا گیا، تو اسی پیشے سے دلتی کا سکتا تھا۔ روز اور دن کی طرح فاقے مڑتے

وہ آزاد کیا۔ خود مختار اسے کسی ملک کو دھرم نہ بہر صرت روزانہ مقررہ رقم نہیں ادا کرنی تھی خواہ وہ اپنے پٹے، اوسھارے کر، ملک تھام کر لیا ہی نہ ہو۔ وہ اپنی اس سلطان اور شاہی شہدہ پرستے کی صورت میں ہرگز گھر و خانہ اور کچھ اڑن کی شکل بنا کر داشت کر سکتا تھا۔

یہاں سی ملات پر نشان کی ہوئے تھے۔ ملک میں ابتری میں کمی تھی اور میں حسین شروع ہوئی کہ اسے پاکستان کا سلطانہ پرورد کیا گیا تو ملک میں دھندلہ ہو گیا۔ خون خواہ ہو گا۔ تر کی ہو گی۔ دوسری طرف یہ کہ اسے کیا گیا تو اس کے تانے بچ نہایت ہر حال میں ہو گئے۔

ایک وقت یہ پڑھا کہ اس نے خلی کو کچھ اڑن نے بھی اپنے اپنے مانگوں پر بٹھا کر ملک کی جگہ سے گاڑ دیئے آزاد کیا کی آمد آمد تھی۔ خلی اس سے معذور و معسر تھی۔ کالو کسے اسے ملک۔ مہا سہا۔ تمام ہا ریاں۔ ملک سول و سر میں اجلاس منعقد کر رہی تھیں۔

اسی انھیں براہیم صرت ایک بات بگو پایا تھا۔ کہ اس وقت اس کے پاکستان میں معسر میں تھے گا۔ اس سے پہلے اس نے راجہ پندی اور ملک کے دوسرے حصوں سے قبل عام کی خبر لی تھی۔ جلا تیا ز بندہ ہو گیا۔ سکو اس نے ملک پر چڑھا کرتے تھے۔ اب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے تھے۔ معسر سول، عورتوں، مردوں اور بچوں کے خون سے عورتوں کی صحت دمی سے۔ جلد جگہ عورتوں کے پرندہ صحت کے کچھ خبروں اور انھوں نے ابراہیم کو یقین دلا دیا کہ آزادی قریب قریب آ رہی تھی۔

اس کا ہر دم آزادی پہنچا۔ یہ شکر کی اور ایک نامور شہر، طوفان سے پہلے سورت سے میسر تھی۔ اس کی یونین کے ہر حال سے شاہ تھی اس کا اس پر کیا اثر ہو گا۔ سو سرتا۔

اور جب لاہور کے پاکستانی کا شہر زردیٹے کا اعلان ہوا تو وہاں سے غیر مسلم آبادی نے ہجرت کرنی شروع کی۔ اس سے شہر میں اکثر لوگ بچھڑا کھوئے۔ اور اڑن کا کیا باب کھلا۔ اس شہر میں جو زندہ رہے۔ ان ملک و کھیل کو اور رہائشیوں اور فیشن اور بیل جول کی آماجگاہ تھا۔ اب آتش فشاں کے میں تبدیل ہو گیا۔ ہندو اور مسلمان اور اہل حق رہے تھے۔ کوئی شکار کوئی شکاری۔ . . . آزادی سے اپنی حیثیت لینا شروع کر دی تھی ایک طرف نہ جانتے آباد کی بجائ رہی تھی۔ دوسری طرف بہت سی ہندوستان سے آ رہی تھی۔ . . . اس کے بعد جو آزادی آئی پاکستان میں صحت و جو دیں۔

شہر پاکستانی جھنڈے اور جھنڈوں سے مزین کیا گیا۔ اب براہیم کی شادی میں دور روز باقی تھے۔ اس نے گھر لکھا تھا کہ تیار ہیں وہ جس آزادی کو کچھ کر آئے گا۔

شہر میں آتی ماندہ زخموں اور استقام جو غیر مسلم ملان کر۔ جہاں جہاں وہ ان کے تھے چوہہ مارتے۔ مرگے کے گھاٹ انارنے کی تلاش میں تھے۔ اس طرح مسلمان اپنا انتقام لے رہے تھے۔

شہر میں اس کی کیاں قائم کی گئیں جو کوئی کو گزشتہ واقعات کو بھول جانے اور فداوات کو ختم کر دینے کی یقین کر رہی تھیں۔ ایسے دن کے لیے ابراہیم نے سلطان کو اچھی طرح نڈلا دھلا کر اس کے سپردی پر سرخ رنگ سے ملی حوت میں پاکستان زندہ باد لکھا دیا۔ اس نے اس کے سا پر جگہ جگہ پاکستان کی جھنڈیاں گاڑ دیں۔ اور خلافت معمول قبل از وقت کام پہل پڑا۔

اس کے سامنے کوچہ اڑن نے اور خاص طور پر خورشید نے خبردار کیا کہ شہر میں کشت و خون ہو رہا ہے اور اس میں مخالف فرقوں کے کچھ کوچہ ان بھی دھرے جا رہے ہیں اس لیے وہ آہل تر اس دن باہر نہ نکلے یا جلد از جلد واپس آ جائے۔

"میں جن دیکھے گا۔ ہمد سے شہر میں اب نہیں کوئی کیے گا۔ اللہ مالک ہے! گمراہ میر کرنے کے لیے مہل دیا۔ وہ نادانستہ۔"

غیر مسلم علاقوں سے گزرنے کا شہر لاچک بکھاتا رہا۔ سلطان دیرال شریح کے لہر سے دھریں کے غبار اٹھنے ہی سے اس کے اندر کسی شخص کی موجودگی کا اس پر برتا تھا۔ نہ کوئی فوجی لاپرواہی کا آدمی ہی اس پر گستاخاں کرتا دیتا۔

مستقیم ایک جاچ اس پر کسی مکان کی صحبت سے غائب ہوا۔ لیکن وہ بھی نکلا۔
یوں شام ہو گئی دھریں کے باعث دھند لگا اور بھی گھر لگا اور ہیبت رکھانی دینے لگا۔ کسی طرف سے عرصہ بعد آوازوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ سلطان کی نگاہ۔ کلاب کی آواز کے ساتھ ساتھ ہم چھٹے، کوئی چلنے اور اللہ اکبر یا ست سری اکال اور سری تمبا دیو کے نعروں کی آواز سنائی دینیں۔ ہر ایک کو وقت گزر گیا احساس نہ ہوا۔ وہ خوشی سے جھولا رہتا تھا کہ پانچ کھربوں کی لاپرواہی کی سیالیان بھی ہیں۔ اس نے گھر کی طرف ناگہان مڑا۔ وہ بڑی جوشی شاہ عالمی کی طرف رہے روڈ کی طرف پلٹا گیا سڑک کی قبیلان گل برتی گئیں۔ وہ وہ جاکس ہو گیا۔ سلطان کے کان بار بار کھڑے ہو جاتے اور وہ اس کے ہانے سے رکتا۔ اس نے خطرہ محسوس کر کے اسے مڑا اور ایک گلی میں سے گزر کر جلد گھر پہنچے کے لیے چھوٹا راستہ اختیار کرنا چاہا۔

اس وقت اس پر اسرار آوازیں آتی سنائی دیں۔ وہ چونکا۔ اس نے دیکھا کہ دھریں دار دھند میں سفید بھرت نامہ دھریں دھند اور بھٹ رہی تھیں۔ وہ غیر مسلم آبادی میں کھٹا تھا کہ اب ہر گاہے سودھا بازار تنگ تھا۔ اس نے سایوں کے پاس سے سرپٹ کر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتا سرسری، اسخ ہوئی تھیں۔ اس نے سڑک کے پار ایک لمبی چوکی کی گلی گرتی دیکھی۔ اس پر اس نے "یا علی" کا نعرہ لگایا اور سلطان کی بالکونی میں چھڑ دیں۔ وہ دیشیانہ طرز پر مینا یادہ پھلے پاؤں پر کھڑا ہو کر منہ زور سے ادھر ادھر مار کر پاؤں پیسے رکھتے ہوئے سرپٹ بھاگا۔

حملہ آوروں کی آوازیں بلند ہوئیں۔
وہ دیرال کستانی گھوڑا ایک آواز فضا کر چیرتی ہوئی سنائی دی۔
"یا علی" ابراہیم نے جواب دیا اور بڑی سرعت سے اپنی بیٹ کے پیچھے سے چھرا نکال تختے سے چپٹ کر بیٹھ گیا۔
گھڑے سے نکل کر ایک ہی جیت میں چلا لگا۔
ٹانگہ ٹرنے کی آواز آئی۔

ہجوم کا نعرہ بلند ہوا۔ سلطان ناگہان گھٹسا بھاگا تھا تھا۔
کوئی بکیر نہ نکلی۔

پہچھے ہاتے ہو گیا۔ کی آوازیں سنائی دیں ناگہان گھوڑا راستے میں آتے حملہ آور۔ دل کو دھکتا آگے جا رہا تھا۔ اب صرف بازار کی کڑھڑانی رہ گئی تھی اس کے بعد محل سڑک کے پاس کم آبادی شروع ہو جاتی تھی۔
لیکن ابراہیم نے اپنا دیکھا کہ بہت سے لوگوں نے ایک طرف کھڑا کھڑا اور حلیل کر سڑک کے آ پار کھڑا کر دیا۔ اس کے ساتھ ایک فاتحہ قہقہہ بلند ہوا۔

اب کیسے نکال کر جاؤ گے؟
سلطان کی ناگوں سے خون ہر ہاتھ اور اس زندگی سے بھاگتا تھا کہ اگر ناگے سے جتنا ہوتا تو گٹے سے کبھی چلا لگا ہوتا

ابراہیم نے ہزار تنگ بونے کے باوجود اسے گنہگار کے پاس قہر میں ہی جگہ میں سے گزرا، رخ کے لیے اس کا رخ اور موڑا، اگر تاکہ چلنا چود
جو کوئی آدمی اس تنگ جگہ سے نکل جاتا تو اس کی کوئی پروا نہ تھی۔ لیکن وہ ایک طرف بجلی کے جیسے اندر دوسرے طرف گڈے میں دھمکے
پھنس گیا۔

ابراہیم کی گفت و شنید کو وہ اس نے سوچا کہ کھول کر اس پر ٹیڑھ کر جائیگی۔ لیکن ایک کونے میں سے سات آٹھ آدمی تواریں
سنتے اور دیکھتے ہیں ان کی طرف پکچھ مٹائی دیتے۔

سلطان مالک انداز میں ہنساتے ہوئے پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور وحشیانہ طور سے اور اور حرکات جبراً ہر نکلنے کی
کوشش کرنے لگا۔

اب چاروں اطراف سے حملہ آمد پلکے

ہر امین خالی فائر ہوئے۔

ابراہیم ہاتھ پیرے والا ہاتھ فضا بلند ہوا اور سلطان کی گردن میں تین چار ترسہ گھپتا دکھائی دیا گھڑے کی گردن سے خون کا
فوارہ چھوٹ پڑا۔

وہ زمیں پر گر آیا۔ ابراہیم اس کی گردن سے لٹا جرات پیچے آ رہا۔ اس نے گھڑے سے پہلے دم توڑ دیا۔

”پاکستان زندہ باد“

حملہ آور مل بکے قریب پہنچ کر فہرہ لگایا

بچنے چراغ

رام لعل

ساتھیں داس شام کو چھ بجے گھر لوٹا تھا مائدہ اور پریشان سا، سائیکل کو ڈروڑھی میں دیوار کے ساتھ لگا کر اندر پہنچا۔ ہر آدمی میں اس کا بیوی کا ہاتھ پانچے آگے بہت سارے نسلیم بکیرے انہیں ایک بڑی غالی میں کاٹ کاٹ کر رکھتی جا رہی تھی۔ علاوہ کو دیکھ کر وہ مسکرا دی گھر میں کی مسکراہٹ دوسرے ہی لمحہ بجھ کر گئی۔ خداوند کی طرف حیرانی سے دیکھا اوروں کا چھپا۔ تیریت تر ہے۔

ساتھیں داس ایک لمبی جوں بکھر کر نکلتی کی گانٹھ کھولنا ہوا سیدھا کرے کے اندر چلا گیا۔ کوٹ اور پتلون اتار کر کرسی کی پشت پر ڈال دئے اور ایک رنگدار تھپاندہ کر آرام کرسی میں وحسں گیا۔ اتنے میں اس کی بیوی بھی اندر آگئی۔ شعلہ چھری سمیت۔

”بتایا نہیں بات کیا ہے؟“

”بات وہی ہے کئی نئی تقریر ہے۔“ ساتھیں داس نے ایک لمبی سانس چھوڑ کر کرے کی پرانی چھت کو گھورا۔ دوسرے دیکھ کر کھلیا

چھت کے بوجھ سے ہر وقت گر پڑنے کے لئے تیار نظر آتی تھیں۔ کرے کے وسط میں دیوار کے اندر سنگ دروازے کا ایک کتبہ نصب تھا جس پر سیاہی حروف میں ”لکھا لکھا ہوا تھا۔

”آج پھر عظیم کے دفتر کی خاک چھانی ہے۔ دفتر سے دو گھنٹے کی چھٹی لے کر گیا تھا وہاں لیکن لگ گئے پورے چار گھنٹے۔“

”پھر؟ کچھ طامکان کی مرمت کئے تھے؟“

”سناک اکتے ہیں ایک ہفتہ بعد آؤ۔“

”بتایا نہیں سردیوں کی باتیں شروع ہو گئیں تو مکان گر جائے گا؟“

”ان کی بلا سے ان کے نزدیک ایک دیر جی کتبہ تو ختم ہو جائے گا۔ اگر سارے کے سارے بے کے نیچے آکر وہ لگنے تو عظیم تو نہیں دینا پڑے گا گورنٹ کرا“

”اندھیر ہے باطل اندھیرا اگر کچھ ملنے کی امید ہو تو اپنے پاس سے ہی کچھ جمع کر لائیں۔“

”کیا بھروسہ دفتر کی کارروائیوں کا اٹھتے ملتے بھی سال دو سال تو گزر جائیں گے۔“

اس کی بیوی اس ایک پلنگ پر بیٹھ گئی۔ بولی: آج تھا کہ اس اور اس کی بیوی آئے تھے بیٹے کی شادی کا کارڈ دینے۔

”اچھا“

”آپ تو تھے نہیں۔ میں نے بھی مناسب نہیں سمجھا کہ کہنا سنا، بس کا روٹ لے کر رکھ لیا۔ جانے سڑا نے کہاں لکھ دیا ہے۔“

اس نے سرگھبرا کر سڑا کو پکارا:

”سڑا۔۔۔ ایٹھ سڑا!“

کہیں سے ایک بابیک مٹی کا نواز سنا دی تا آئی تاجی! اور پھر پاؤں میں پہنے ہرے ریشم کے پیراں سے شپ شپ کی آواز سنیا کرتی ہوئی مجلس میں ایک شخص کا سنا نرم اور فخم تھا، سولا کرے کے اندر آگئی۔ باپ پر نظر ڈالی تو مسکاتی ہوئی اُس طرح گئی کہ کبھی کسی کی پشت پر پڑے ہرے باپ کے پیرے دیکھے تو انہیں اٹھا کر دیوار پر لٹکانے ہوئی بولی: "کتنے تاجی!"

"وہ کارڈیگماں ہے تروک کی شادی کا، جو آج دوپہر کو دے گئے تھے۔"

”یہاں رکھا تو ہے؟“ وہ ہلکے کرہ ہوا پر بھیجی ہوئی ایک تصویر کے پیچھے سے ایک سفید چوڑا سا غافل نکال لائی۔ ساتھیوں کو
چند لمحوں تک کاٹھ پڑھنے میں غور ہوا۔ اس کی یہی شگفتہ کاچھلکا دھیرے دھیرے اُٹارتی ہوئی بولی: ”کیا خیال ہے؟“ حاجی کے شادو میں اس
”جی نہیں چاہتا۔ تم ایک انہوں نے ہمارے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے اسے دیکھ کر یہ کڑوا دینا ہی نہیں چاہئے تھا۔“ یہ کہہ کر
ساتھیوں نے اس کے اپنے ٹھنڈے سفید کلین شیز ہجرے پر اپنا ہاتھ پھیرا۔ اس کی انگلیاں ٹھوڑی کے نیچے پھر سے نکلے ہوئے سفید بالوں کو
کھانے لگیں۔ ادھی اٹھی ہوئی ناک ابد بچے ہوئے ہونٹوں سے اس کی سخت ناراضی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ اسی طرح نکلے ہوئے اور گستاخی
جوئی آواز میں بولا۔

”اسی مکان کا قصد لے لو۔ ہماری آلات منٹ کیسٹل کرانے کی ٹیٹا کرو اس نے کتنی کوشش کی اور تڑپ کوشش کی مگر ناپاکیوں کا یہاں نہیں ہوا۔ ہمارے ساتھ ایسا حامد از رویت اختیار کیا جوتا اس نے قوا آج ہم دونوں ایک دوسرے کے کھتے قریب ہوتے آیا وہ ہم نے ایک بائیر سے سامنے اپنی مرلا اور اس کے زلوک کا بھی ذکر کیا تھا“

میرزا اپنا نام سونکر باہر نکل گئی۔۔۔ سرچھو کر۔۔۔ راجا رسول کے صحن پہنچ کر مقررہ جگہ تک پہنچی وہاں سے نہیں دیا۔ واپس سی

میں ڈوبی ہوئی ایک لڑکا چال چلی تھی بس!

[illegible]

اس پر بھی کبھی مل نہیں بیٹھتے۔ ایک دوسرے کے ساتھ تلم کھڑی ہمدردی نہیں دہکتی؛ یہ کہہ کر سائیں داس کی ہمیں نے پنا کاٹن کھجایا۔ اطمینان نہ ملانے کاٹن میں سے طوائف جھکا تاہا کر کاٹن کے صدام کو اٹھیں سے سہلانے لگی۔ اس کے کانوں میں کنارے کنارے کئی سودا خ تھے۔ کسی زمانے میں

اس کے کان سے یہ سب باتیں سن کر وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے غم و غصہ سے اس کی ہڈیاں ٹوٹنے لگیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے
 گاؤں میں صرف ایک ایک جگہ پہنچا تھا۔ اس کے غم و غصہ نے اس کی ہڈیاں ٹوٹنے لگیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے
 گاؤں کے لوگوں کو اس کے لئے یہ سب باتیں سن کر وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے غم و غصہ سے اس کی ہڈیاں ٹوٹنے لگیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے

کہیں یاد دہشتوں میں گپ ڈھار ہے ہوں گے باہر
 وہ باہر چلی گئی۔ ساتیس داس سوچتا رہا۔ انھیں بند کر کے، ٹھاکر داس کے ساتھ اپنے تعلقات پر غور کرتا رہا۔ گذشتہ دس سال پہلے
 نے اس شہر میں مقیم رہتے تھے۔ وقت بڑھ کر اڑھائی لگا تھا۔ دیکھتے دیکھتے دس سال گذر گئے تھے۔ تب وہ دن کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔
 آج جسے وہ شہر کی شادی کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ ٹھاکر داس بچے کی بارات لے کر تین سو میل دور ایک مدہ سے شہر جانے کا سوچا۔ اس کا سوچا کہ
 سفر چھ دن کا ہوگا۔ ساتیس داس کی بات بھی ہوتی ہے۔ ساتیس داس کے کانوں میں چند آوازیں آئیں۔ انھیں کی آوازیں، جس نے کی آوازیں۔ اس نے
 انھیں کھل دیں۔ سرائی کا دیکھا۔ صحن میں کچھ ٹھیکڑیاں اس کی بیوی کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ وہ بھی گھبرا کر اس کی بیوی نے اندر بھاگ دیا۔
 ”ٹھاکر داس کی ٹھیکڑیاں آتی تھیں۔ آج ان کے ہاں گانا بولنا ہے۔ میں نے کہہ دیا میرے توجہ ڈول کا دور رہتا ہے سڑا
 کو بھیج دے گی۔ یہ کہہ کر وہ پھر روٹی میں جا بیٹھی۔

ساتیس داس پھر سوچ میں پڑ گیا۔ بالکل ڈوب گیا۔ سڑا اگلے سال ملی۔ اسے کمرے کی۔ اگلے سال اسے پروڈنٹ فٹنر سے
 قرض لینا ہوگا۔ کیم کارو پیر جانے تک نہ گئے گا۔ اس کی شادی ضروری ہے۔ لیکن اس کو نظر دیا تو اسے یہ مکان کیم کے عوض مل جاتے گا چار ہجڑے
 بڑے کمرے ہیں۔ ایک بڑا دالان کا دالان صحن ہے۔ کسی بچارے سلمان کا مکان ہے۔ وہ بھی پاکستان میں کسی بندہ کے مکان میں اپنی عزت اُبرو
 سینے رہ رہ رہا ہوگا۔ اسے کئی کئی غم ستاتے ہوں گے۔ اس کی کچی کچی ٹھیکڑیاں ہوں گی۔ وہ بھی اپنے لوگوں کے بدلتے ہوئے رویے کی شکایت کرتا
 ہوگا۔ سب دن ہوتے ایک سال امیبتیں بادلوں کی طرح زندگی کے آسمان پر بچھا جاتی ہیں۔ بادل برستے ہیں اگر جیتے ہیں، ٹھاکر داس جیتے ہیں،
 لوٹ جاتے ہیں۔ اڑتے اڑتے کہیں کے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ مصلح صاف ہر جاتا ہے۔ ہر طرف دھوپ پھیل جاتی ہے۔ جل نقل دھرتی
 کو زندگی کی آغوش بچھنے، تخلیق میں مدد دینے، نئی فصلیں، نئے پھول، نئی بہاریں، ساتیس داس انھیں بدلتے ہوئے دیکھ کر، انھیں نیم واکر کے
 دیوار پر لگے ہوئے اللہ اکبر کے کتبے کو دیکھا۔ اسے دیکھنا ہی رہا۔ سیاہ جلی حروف ابھر کر اس کے قریب آکھڑے ہوئے۔ اس کی آنکھوں کے
 بالکل سامنے آ گئے۔ پھر ایک دوسرے میں گھس گھس کرنے لگے۔ سب حروف مل کر ایک لمبی کیرن بن گئے۔ اونچی سیدھی کیرن۔ زمین سے اڑ کر
 آسمان تک پہنچنے والی کیرن۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ڈھلک پڑے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ بند کرنے دیوار پر ایک
 اس کے کانوں میں پھر کچھ آوازیں آئیں۔ بولنے اور چلنے کی، اس نے آنکھیں کھل دیں، ہفسر پچھڑا لے، سڑا دھاک کر کے دیکھا۔ اس کے دونوں
 لٹکے چلے آ رہے تھے۔ بڑے بڑے سفید مسکراتے ہوئے، خاص انداز سے ہلکے پھلکے ہوتے بال، غنوں سے اونچی اونچی پتھروں میں
 ڈھلکے۔ پیچھے پیچھے سڑا لٹی، ماں کی طرح تپاں اور اونچی، پھر لدا کر پ کی لمبی تھیں کے اوپر ٹہری ٹھیکڑیاں کی کوئی پہنے اور سہرے بالوں
 کی لمبی چوٹی کا لٹکے گر دیکھتی ہوئی۔

”پتا جی! اہم تر لوگ کی بارات میں جا میں گئے۔“

”لوں تباہی، ہم سرور جانیں گے۔ نہیں گئے تو ترک اراض ہو جائے گا۔“

سرلا بھائیوں سے آگے چل کر باپ کے پاس پہنچی۔ آرام کمرے کے بازو پر۔ ساتیں داس کی قمیص کاٹن بند کرتی ہوئی تپاؤ میں لپی جاؤں گی۔ راجی بھئیے ساتھ سے نیہ جانے کی نہیں۔ آپ جانتے ہیں دویری گنتی گری۔ دست ہے اگلاس فیوٹی ہے۔“

ساتیں داس نے سب کی طرف انکار کے طور پر دیکھا اور صبراً آواز سے بیوی کو بکار کر بول۔ ”لو اور سنو یہ سب کے سب بات میں بھائیوں کے پیسے وہ لوٹ بھیجی، انہیں ساتھ سے نیہ جانیں گے نہیں۔“

اس کی بیوی نے۔ ”ہیں ستہ جواب دیا۔ ان کا قوماغ خواب ہے۔“

”نہیں۔ تباہی! ہر ضرور جانیں گے۔ شادی کے بعد سے صحت علمی دیکھیں گے۔ یہ شہر ہم نے سچ تک نہیں دیکھا۔“

”اگر یہ واقعہ ہی کرنا ہے تو دیکھ کھی چلے جانا، اگر میں کی بھینچوں ہیں۔“

”نہیں تباہی! میری سب فریڈنا جاری ہیں۔ تباہی ملنا۔“

”اچھا اچھا! اب یہاں سے جاؤ۔ سوچیں گے الٹی ڈکٹی دن پڑت ہیں۔“

”کہاں کئی دن پڑے ہیں؟ پرسوں بارات جاری ہے شام کی گاڑی سے۔“

”بیٹا! ان کے ساتھ ہمارے تعلقات ایسے نہیں ہیں کشادی بیاہ میں سب کے سب شریک ہیں۔ وہ بھی کہیں گے کیسے جتنی نہیں۔“

”اس کی بیوی بھی رسوئی میں روٹی پکاتے پکاتے ہنس کر بولی۔ ”جی پرانی اتنی ہے۔“

مینور بیکہ ایس ہو گئے۔ کھانے کے وقت بھی سب اُٹاس تھے پھر سے ٹکائے بیٹھے تھے۔ نہایت ہی بے دلی سے کھانا کھا رہے تھے۔ چوس سے انگلیوں کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ ڈھوکا بج رہی تھی، گنگوہر بھنگ رستہ تھے۔ کوئی ڈک ٹاک ایک کر گری تھی۔

”من ڈولے پراٹن شہر سے دن کا گاڑا دے!“

گمانے کی آواز سن کر تینوں بچوں کی نگاہیں بار بار اپنے ابا کی طرف اٹھتیں اور پھر ایک دوسرے سے مل کر جھجک جاتی تھیں۔

سرلا کے لئے یہ درجہ راج کر فواز گنا، ملٹی مشکل ہوا جا رہا تھا کہ جانے اسے دیکھوں کی گانے کی محفل میں جانے کی اجازت ملتی ہے یا نہیں! لیکن اہلک اس کی اس نے یہ کہہ کر اس کی ماہوسی خوشی میں بدل دی:

”کھانا کھا کر داد پر کسے؟ ہاں چلی جانا۔ سرلا!“

سرلا کھانا اسی دم ختم کر کے جلدی جلدی پانی کے دو گھنٹہ صحن سے نیچے اتار لی باہر بھاگ گئی۔ یہ تھم اور اٹشک بھی جلدی جلدی اٹشک باہر چل دئے۔ ساتیں داس نے پوچھا: ”کہاں جا رہے ہو؟“

”تو جواب دیا۔ الٹی آئے ہیں تباہی ازرا ترک لوک کے ہاں کچھ دست جمع ہیں، ملی کر لوٹ آئیں گے۔“

ساتیں داس عقد بھر کر پھر کرے میں آ بیٹھا۔ صبح کا اخبار سامنے رکھ لیا۔ اخبار کا ایک اودھ صفحہ وہ روزانہ رات کو اسی وقت پڑھنے کے لئے صبح چھوڑ دیتا تھا۔

اس کی بیوی بھی رسوئی کے کام کاج سے فرصت پا کر اپنے بستر میں آگئیں۔ ہاتھیں تیل کی شیشی میں غرق کر کے گرم کر کے لاتی تھی انگلیوں پر تیل لگا لگا کر گھٹنوں پر لٹے گی۔

[illegible]

ہے تو میں نے اس کو پسند کیا۔
 "جی ہاں، میں اس کو پسند کرتا ہوں اور اس کی خوبیوں میں کہ ماہر اور ان کے چہرے میں۔ اس کی بیوی نے بھی اپنی بات
 میں مدد کی۔ میں نے اس کو پسند کیا۔
 پھر میں نے اس کو پسند کیا۔
 میں نے اس کو پسند کیا۔

[illegible]

ہے وہ ہمارے کو بھی تھکاتے ہیں؟

ہے ۱۱۶ ہمارے کوئی شک نہیں۔
 بیوی کا نام بھی کرنا نہیں، اس کی بیوی کے چہرے پر بھی برقی پیدا ہو گئی، اس نے گھٹنوں پر ابھی ابھی اس کی بیوی سے ملنے کے لیے

[illegible]

جب تک میرا کئے گا نہ کسی اور کی ساری دنیا میں اس کا طرفہ ہے۔ چنانچہ ایک عیسائی

آواز نے فی ہند بول دیا۔ اس نے اخبار پھر اپنی طرف سے کیا اور حجت کو نہ دے گا۔ البتہ وہ جس کی ضرورت ہو یا تاکہ اس کے کانوں میں ایک عیسائی

[illegible]

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے تعلق پر کوئی حیرت کا شکار نہ ہو۔
میں ان کی یہ سیاق و سباق دیکھ کر
بہت ہی حیرت منور ہوں۔

بھلاؤ میں کمر بند ہے دلی سے
بھلاؤ میں جس نے تے کھاویں نہ جانے

مینڈا ٹھوہرا چوڑا سب سے بڑا ہے

سائیں داس نے اپنا بیکارگ طرف راہ دیا۔ گتے کی کہنے اس نے بڑھوں سے کہا کہ یہی ہے۔ اگر وہاں سے گھر کے سامنے

میں نے کہا کہ میں اس کے لئے تیار ہوں۔ اس نے کہا کہ میں اس کے لئے تیار ہوں۔

یہ سب باتیں اس کے گہرے دل میں جھلک رہی تھیں۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اس کی تلاش میں لگے ہوئے تھے۔

ہر ایک سے یہ کہیں گے کہ میں نے ان کو گورنمنٹ سے بڑا ان کو ریور کے کانوں سے سنا کرتا تھا تو وہ چھتوں پر سوئے ہوئے چائے پر کی ہیں۔

چانک سہ ماہی، اس کو یاد آئے۔ اس کی بیوی مراد کو بلا کے لئے نئی ہوئی تھی۔ ابھی تک لوٹ کر نہیں آئی تھی کیا اس نے رشتہ ختم کر دیا ہے؟ اور وہ جانتی۔ اس کی مانند اپنے آپ کو چند لمحوں کے لئے بھول جاتی۔

ہوا کس کی تھی؟ وہ کبھی شرمیلی تو حیران رہ جاتی۔ اس کی مانند اپنے آپ کو چند لمحوں کے لئے بھول جاتی۔

میں پانی بھر سیدی اداں ماتی
تینٹی ہر دے دلی حیات
بھادیں جانے تے بھادیں ناں جانے
مینڈا ڈھول جمانیاں مانے

پر آواز محض آواز نہیں تھی کوئی بخشش تھی، نہیں طاقت تھی جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی، اسے پکار رہی تھی، صدا دے رہی تھی اور
دے رہی تھی۔ جسے جرنے کی دعا۔ اس کے سامنے اپنے دل کی کیفیت بیان کر رہی تھی۔ چاندنی رات میں کونہ میں پر جا کر پانی بھرنے کے بدلے
اس سے ملنے کی التجا کر رہی تھی۔ اس کی جوانی کا واسطہ دے دے کر اسے بھاری تھی۔ اسے یاد تھا تیس کٹے اور طویل مال گزر جانے کے
بجائے جو دسے وہ ایک ایک طویا تھا۔ حشر اور اضطراب میں گھسی ہوئی ایک ایک کیفیت اس کے دہری میں زندہ تھی۔ اپنی چھٹی صدا انگیزی
اور شدت کے ساتھ۔ وہ کیسے بھول سکتا تھا ان کیفیتوں کو اور آہستہ سے اٹھا۔ تھک کو اچھی طرح کس کر کر کے گرد باغدا۔ بغیر کھائے بغیر کوئی
آواز پیدا کئے وہ ہرے ہرے قدم رکھتا ہوا صحن میں سے گزرا۔ چڑوس کی دیوار کے پاس پہنچا۔ اندھیرے میں دیوار کے ساتھ بنے ہوئے تندہ
ٹھٹھا۔ اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ ایک کڑی کے صندوق میں سے کوٹھڑی کے صندوق کو تندہ کے اوپر رکھ دیا اور پھر سنبھل سنبھل کر اس کے کمرے
پر کھڑک کھڑا ہو گیا۔ اس کا سوچا اس کے اوپر کل سکتا تھا۔ وہ جھانک کر دیکھ سکتا تھا لیکن اس نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ سر جھکا کر گانا سننے پر
اٹھنا کی۔ گانا جو اس کی روح کی پیاس کو بجھاتا تھی تھا اور بھڑکا جی۔ وہ دیکھ لیتی نہیں سکا کہ کون عورت تھی وہ اس کی طرف کانوں میں مچھاس
پھکنے والی آواز سن سکتا تھا۔

اتنا اسنے تے مای ساڈا وٹھے
کالی راتیں بدل پانکڑے دل دھڑکے
بھادیں جانے تے بھادیں ناں جانے
مینڈا ڈھول جمانیاں مانے

وہ تندہ کے اوپر رکھے ہوئے صندوق پر کڑوں جیٹھا سن رہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی روشنی بھی بجھا کر آیا
تھا۔ لیکن گیت کے سحر کو ان الفاظ اس کے سامنے جیسے ایک سیس پر دے پر فلم پیش کر رہے تھے۔ برقی راتوں میں کڑی سے لگ کر اپنے محبوب
کا انتظار کرتی ہوئی حسینہ آدھ کب روٹے گا؟ بلاشبہ معاش اس کے محبوب کا اس سے کب تک بچا رکھے گی؟

میں اسنے تے مای مینڈا وٹھے
مینڈا کلا پیسا دل اوہرے
روت ملنے دی۔ ڈھول جانی

ڈھولک کی آواز تیز ہو گئی، تال بدل گیا، گنگھو وٹھ کے چپنا کے اور عورتوں کے قہقہے بلند ہو گئے اور ایک نئی آواز اور ایک نیا گیت غبارِ گلشن لگا
تینٹی مائے تان مینڈی مای
کچے چٹکے تے ادب نہ راسی

دکھ کر تینہی ہاں ڈھول جانی
ساڑی گل آویں تینہی مہربانی

قتیلوں کے حوض کے درمیان ہلیوں کا شعلہ سنی سناٹا جیلا تالیوں جو ایک خاص حال پر بجائی جا رہی تھیں اور سائیں داس کا دل زو
نور سے بھرک رہا تھا اپنے علاقے کی گیت محن کو خوشی اور خوش سے !
اس رتبہ ایک نئی آواز گونجی !

ساڑی کنہاں تے ٹٹیں پھیلاں
تیشی ماں دیاں روکھیلیاں
آہناں گھر تیاہم — ڈھول جانی
ساڑی گل آویں تینہی مہربانی

ہر بار آواز مختلف تھی۔ ہر بار نیا تھا۔ ہر بار مزاج اور حقیقت سے بھر پور۔ زندگی کی ساری سہائیاں ساری تلخیاں ان ہر بار میں
بھری ہوئی تھیں۔ سناج، گانے اور قتلوں کے نسلے ایک دوسرے کو کوسا جا رہا تھا۔ گے اور شکایتیں کی جا رہی تھیں۔ یہ مقصد کسی دوسرے
زور سے حاصل کرنا مشکل تھا۔ یہ صرف گیتوں کی مدد سے ہی ہو سکتا تھا۔ گیت جو ایک قوم کی خاصیت تھے گیت جو ایک قوم کا مزاج
تھے ایک خاص علاقے کی صدیوں کی روایات، تہذیب و تمدن کے حامل تھے۔ سیکڑوں پہلے کا طے فاصلے اور دور دورہ گزارندوں کی صورتیں
بعد اشدت کو کے گیت سینوں کے اندر محفوظ کر کے یہاں تک لائے گئے تھے۔ کتنے بھائی، کتنی بہنیں، کتنے بچے گنو اگر کبھی اس عزائے کو
ٹوٹنے سے بچا لیا گیا تھا۔ آج دیکھ کر کتنی حسرت دہو ہے، اور حیران تک پہنچنے کا کوئی متعزز نہیں ہے۔ لیکن ان کی بادشاہ کا عین ان کی سر
اور گئی سینے کے اندر محفوظ ہے۔ نئی نسل کے لڑکے لڑکیاں حیران تھے۔ وہ اس زبان کے جس میں گیت کہے گئے تھے، محاوروں اور چٹھاؤں
سے آشنا نہیں تھے۔ محبت، سادگی اور خلوص اور عین سے لالہ زبان کا محافظ کوئی بنے گا، معاملات نے انہیں نئی سرزمین پر پیدا کیا۔ بولنے
اور سمجھنے کے لئے نئی زبان دے دی۔ ان کے آباد اجداد کا آنا بڑا سرا پایا ہے کہ ماں باپ کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ تیس سے پچاس برس
تک کی عمر کی عورتوں کی چھتھری ٹولی پھر گیت نہیں گائے گی۔ یہ غم خاموش ہو جائیں گے۔ یہ نال ٹوٹ جائیں گے۔ یہ چراغ بجھ جائیں گے۔
ایک ایک کر کے ماسے چراغ !

سائیں داس کے کانوں میں اچانک اپنی بیوی کی آواز آئی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بالکل بے اختیار سا ہو کر دیوار سے ٹکرا کر
اس بات کی ہوا گئے بغیر کہ اس کے چہرے پر خوشی پھڑکی تھی۔ اس نے عورتوں کے جہیز میں اپنی بیوی کو چھوڑ دیا، اور حیران رہ گیا۔ وہ باقی
عورتوں کی طرح سر کے پہچوٹوں کے آئینہ میں، منہ ہانر سے جوڑوں کو دیکھ کر ناچ رہی تھی۔ گارہی تھی :

میں رنھے تے ماری میڈا حال تے
لگا آویں بدلاں دی بھال تے
مٹ گئی دی — ڈھول جانی
ساڑی گل آویں تینہی مہربانی

اس نے دونوں ہاتھ دیو کے اوپر رکھ دیئے۔ اس کو جی چاہا بڑی کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک بول دیا جی نکاتے ہوئے
 کہ اگر ناک دیکھنے کے لئے بہت سارے لوگ میں میں جھوٹے لئے مٹا اس کے بازو کو کسی نے پھرا اور دوسرے ہی لمحہ اس نے اپنے
 ہاتھ دیوار کی اس طرف لٹکا کر اس کو کسی چیز کے مہارے اکبر سے پوچھے دیکھا۔ تھا کہ اس سے دیکھ کر زور سے ہنس پڑا اور بولا۔
 کہ کوئی یاد اور چراغ آج۔ بڑا لطف آ رہا ہے۔

ساتھ اس نے ایک لڑکے کے لئے توقف کیا۔ تھا کہ اس کو گھوڑا اس کی آنکھوں میں پکڑتے ہوئے غلوں کو پرکھا جسے اپنے ہاتھ
 کے جذبات اکبر سے لوگ گیت اور لوگ ناک اس کے دل کی انتہائی گماشتوں میں سے کنگال کر اس کی آنکھوں میں لے آئے تھے بائیں دایں
 سکرٹھیا اور ہاندوؤں پر بدن کا سارا بوجھ ٹال کر بدن کو اوپر اٹھایا اور اچک کر دیوار پر چڑھ گیا۔ تھا کہ اس کے کندھے پر اپنا بازو بٹھوڑا
 اور بے اختیارانگے سے لگا گیا۔

بھٹو پانی کھڑی میں دوں

نمبر خانہ وڑی راتوں

دسٹن ڈسے غریباں توں

وے بڑا کھٹا !

بھٹو توری رکھنا

یہ دیکھا تو تھا کہ اس نے پتے ہوئے ساتیں اس کو اپنے بوڑھے مگر مضبوط بازوؤں پر اٹھا کر دیوار سے اپنی طرف آ کر لیا۔

ایک رات

ڈاکٹر شفیق

کارپوریشن کے رہائے تھا اپنے کمرے کی طرف ہی۔ اس صبح صبح کے بعد اس کے ماتھے پر پسینہ جھلکا رہا تھا۔
 "جیسے ہی انہیں کوئی ضرورت تھیں ہے۔" آپا اس کے کمرے کے دروازہ پر گئی مگر ہی تھی۔
 کوئی ضرورت نہیں۔ چل جاؤ۔" پچھت کر کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔

نہیں ہی نے آج بڑا اشتہار کرایا۔ جبکہ کے بارے بڑا حال ہے۔" برابر کے کمرے سے اس کی ماں کی آواز آئی۔ اس نے بیڑا ہر کر اپنے کمرے کا
 دروازہ بند کر دیا اور سینڈل انار سے لیٹر بستر میں لیٹ گئی۔ ٹیل لمپ کے سرخ شدہ سے نکلتی ہوئی روشنی میں اس کا چہرہ ہنسنا ہوا اور اندر مگر منظر آ رہا تھا۔
 "بے بی! کھانا میز پر لگا ہے۔ سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" آیا ہوسے ہوسے دروازہ کھٹکنا ہی تھی۔
 کدو کو میں پیسٹریڈ کے پیالے سے کھانا کھا آئی ہوں۔ اس نے کرٹ بدلتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد کہہ دو کہ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔
 مجھے کوئی ڈشرب نہ کرے، وہ قہر بانیج پڑی۔ وورڈی بے چینی سے کدو میں بدلتے لگی۔ پھر کدو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سینڈل انار کا گالین پھینک دیتے
 اور کھانے پر یوں ہی پکھنچ کر کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"بے بی! آج بہت جلدی سوئے چلی گئی۔" بند دروازوں سے دھم دھم آوازیں آرہی تھیں۔
 کیا بات ہے؟ کیا آج خدا نخواستہ طبیعت خراب ہو گئی ہے؟
 "بہل کے معلوم تو کیا جائے"

"نہیں سب آج بہت کم ہمت بڑا دروازہ آرام سے دھم دھم لگے گی۔" بچہ ہی توجہ جلدی غیباً گئی۔
 سب آوازوں کو مکث طاری ہو گیا۔ بس کی کبھی وقت پیلوں اور پچھل کے آپس میں کوئے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد

کھل سکوت چھٹکا۔

بس یہ اگر کوئی ہی کا ہی ہو گیا۔ اسے نہات مل جائے گی۔ اس نے اپنی پتی کی انگلی کو چھوتے ہوئے سوچا۔ کتنی سوچیں تھیں کجنت کی آنکھوں

میں بغیرنی۔ اذہ! اس نے ڈسکر سے ایسی گرم گرم جھیلیں کر کر ڈالا۔

سورجی ہو جے۔ کوئی ضرورت نہیں۔" آپا سنے سے پہلے اپنا آخری فرض انجام دے رہی تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے دروازہ
 بد انگلی سے کھٹکنا۔ وہ بالکل چپ پڑی رہی۔ اس وقت وہ بالکل برداشت نہ کر سکتی تھی کہ آپا اس کا سر سہلا سہلا کر سلاتے۔

”اتھ کر تھکتے تھے تو بہانہ کر کے کسی کو سونپ دیا جاتا تو سب کی کہیں گے، گھر سے گھر سے پاؤں دھو کر تھیں ہی جیڑی سے دھو کر غائب ہو جاتے۔ کہہ کے ہاتھی چھو کر گانے کے بعد وہ بستر پر لیٹ کر کھینچ کر لے جاتا اس کے بعد وہ دوا کر دیا کہ یہاں کی دوا کے لئے اس کے بل بوتے پر ایک دوا بھی لکھی ہوئی ہے جس کو وہ اس کے گھر سے بھیج دے گا۔“

”جی ہاں، ذرا اسے چھو کر دیکھو۔“

”گوہر والی میں کہہ دے گا سر کیا ہے تو یہ ایک چھوٹا سا گھونٹ پی لیں۔ تو یہ کہیں کوڑی سے میرا کوڑا اٹھا لیا گیا اس لئے بڑا سنبھلتا ہوا میز پر پڑے ہوئے مانی کے ذہن کا تھکا کر ٹیک مانی منہ میں ڈھالی۔“

”تو نہیں جانتی جی ہاں! اس کو ماہیت میں تمنا کنوں ہے۔ ذرا دیکھو تو جس سب کچھ بھول جاتا ہوں۔۔۔۔۔ میں جس کا دھبہ بھی بھول جاتا ہوں۔“

اس کی آنکھوں میں ہنسنے لگا ہے تھے، گھر سے جی ادا ہو کر رہا ہے۔ باہر غریب ہے۔ یہ سات سچوں سے اس پر خاندان میں چلا آ رہا ہے اس میں کسی غریب کو فدا خاں سے کم نہ ہو گا۔ یہ کہہ کر جاتی ہے ایسی حرکت کی ہے، بھلا ایسا ہو سکتا ہے تمہارا دماغ ہے جی۔“

”تم نے کہا تو سنی ہے؟“

”کوئی سمجھتا ہے۔ ایک بھلائی پر ایک راجہ عاشق ہو گیا وہ وہ اسے محل میں سے آیا۔ مالک چاہا کہ اس فقیر کی میں دایر میں دال بات یہ کہ اسے گروہ اپنی خاتون سے باہر نہ آئی۔ جب تنہا ہوتی تو محل کے طاقتور میں روٹی کے ٹکڑے رکھ رکھ کر مانگتے، دے مانی، خزانہ برا بھلا کرے گا۔“

”لاش میں راجہ چمکے جی۔ میں تو خود ہی بہت سے طاقتور خواتین اس میں روٹی کے ٹکڑے سہا دیتا۔ وہ نشہ میں برابر روئے جا رہا تھا۔“

”خدا کرے، تو بڑا بھلا جان تم کتنے باگلوں پر وہ اس کے آندہ پر پھینچے گا۔“

”گھر پر لوگ کیسے ہر تے ہیں جی۔ یہ دل میں اس طرح کیوں چھو جاتے ہیں۔ جب وہ میرے سامنے آتی ہے تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں اگلے ہی صبح میں وہ جاؤ گئی ہے جی۔“

”تم ایسا غصہ کرتے ہو گے۔ مجھے تو وہ بالکل حیرت نظر آتے ہیں“ اس نے بڑے غور سے سر ہٹھا کر اس دلت سے اپنا سلاخونڈ یاد آ رہا تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ اپنی ساری املاوت بھل کر ایک غریب انسان کو اپنا سب کچھ سپرد کرنے کی اس ایک حیرت سی روح اس کے اندر پرورش پانے لگے گی۔ وہ دے دے اسے غور بھی ہو جائے گی۔“

اس نے دیکھتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے مٹایا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جس کے ہاتھ گھڑت پڑے مگر اس کی کڑواہٹ کے خیال نے اسے چپ چاپ رہنے دیا، خیالات کی جگہ غم کے لیے جاری تھی۔

”کتنے ہیں کہ اتنا میرا خاندان جس کے بچوں کے پڑنے سے ملک چاندی کے تلوں میں ڈھلتے، کہنے والے یہ بھی کہتے کہ یہ دولت خدا کی دین نہیں تھی بلکہ خدا کے ہاتھ میں لکھیزوں کے عشق کے خیمہ میں تھی۔ اس وقت سے بزرگوں نے تقسیم دینا شروع کر کے اس وقت کے اس سے دولت بڑھاؤ کے عمل پر چڑھے جاتے۔ غریبوں سے باطلہ رشتہ دیکھا جائے تو خاندان کی سادگی ختم ہو جائے گی۔“

”بچوں کی آیاؤں کو ہدایت کی جاتی کہ انیس راجہ اور فقیر کی کمانی سائیں۔ لڑکیوں کو بے بی اندازوں کو چھوٹے صاحب نام سے بچا دیں اور ان کے سامنے ستر بچا کر کے بات کریں۔ اہل تمام و ایتروں کے باوجود نہ جانے کیا بات تھی کہ جوان جوان لڑکے الے جھکے ہوئے سردوں کو ضد یا ضد یا کر اپنے ہاتھوں

ہے اٹھتے اٹھتے ہمارے ہمارے بزرگوں کی تیز نظریں غزوات میں اور سر ہر جگہ جاتے۔ وہی سرکشی گئی تھی توڑ کی تھی۔ بچپن کی نسیم حدوں کو چھٹا دے چکی۔ رڑوں کے ساتھ دس پانچ تھے وابستہ ہو جاتے اور بس روکیاں بھی اور سر جھانک لیتیں دل میں کہیں کہیں کوئی ٹھانسی پڑھتا جیسے وہ سسے گھر جا کر وہ لٹ کے مریم سے اچھا کرنے کی کوشش کرتی۔ چاندنی راتوں اور برسات کی درجہ میں بی بی آہیں جھرتی کھی کھی کرنے کھلوان میں چھپ کر حد افسر بہا لیتیں اور پھر ٹھیک آپ کے انبار میں پھر سے کوشش کرتے بناتے ہم نے کسی حرکت میں شریک ہونے چاہا نہیں مگر اس آٹھ صد بھائیوں کی بہن اور مال باب کی بے حد لاڈلی بیٹی نے تو قسم ہی ڈھا دیا تھا۔ ادا اپنے کئے پر ذرا بھی شرمندہ نہ تھی۔

ابھی ابھی ڈاکٹر کے پاس سے واپس آئی تھی کچھ دن سے طبیعت گری گری ہوئی تھی اسے شب بھی بڑا کو امتحان سر پر ہے۔

اس نے جسم میں خون کی کمی ہو گئی ہے مگر جب ڈاکٹر نے اسے کچھ اور ہی بتا دیا تو وہ تھک دی دیر کے لئے ہلکا کر رہ گئی۔

”جو اس صحت کرو! میری ابھی شادی نہیں ہوئی“

”مکلی ہے میں غلطی پر ہوں آپ کسی ٹیڈی ڈاکٹر کو بھی دکھالیں“ ڈاکٹر اس کی بد نظمی نہ کیا۔ ٹیڈی ڈاکٹر نے بھی یہی کچھ بتایا اور بڑی راز داری سے یہ بھی بتا دیا کہ پانچ سو ہاتھ میں رکھ دے تو اس وبال سے نجات مل جائے گی۔ وہ اس وقت کچھ سوچنے کے لئے تیار نہ تھی۔ کار میں ٹھیک کر یہ بھی اپنی کو بھی میں آئی اور نیکر کچھ کیا ہے پھر نہ کر کے پڑ رہی۔

خیالات کی چکی اسے پستے چلی جا رہی تھی۔ اسے ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ پھر بولے دل ملا جا رہا تھا۔

”جیسے تم سے محبت ہے“ غریب انسر سر چھٹا جا رہا تھا۔

”پھر کیا ہو سکتا ہے۔“ وہ تازہ ہونے کے باوجود غرور سے سر جھٹکتی۔

”ہوئی“ وہ ہنٹ چبایا، ”تمہارے سینہ میں دل نہیں اور اگر ہے تو سونے جا نہ لایا ہو اسے۔ سارے احسانات سے پاک“

”جھپک ہے نا؟“

”دل تو گشت کا بنا ہوا ہے۔ گزرا ج کل امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہے وہ اسے پھر کد لطف اٹھاتی۔“

”تم لوگ ہمیشہ امتحان کی کیفیت میں مبتلا رہتی ہو۔ اتنا ذہن ہوتا ہی نہیں جو غلطی اور پاس ہونے کا فیصلہ کر سکو۔“

”کیا قصور؟“ میں ہیں وہ غصہ سے سرخ پڑ جاتی مگر اسے ذرا بھی پروا نہ ہوتی۔ اس کے اسی انداز پر تو اس کا دم جاتا تھا۔ روز اس نے تو جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہاں توڑ کے اس کی ماں میں ہاں ملاتے تھے۔ اسے دیکھ کر سو سو دفعہ کرسیوں پر اٹھتے بیٹھے۔ اس کی ایک ایک بات پر وہ اس کے غم کو لگاتے۔ پھر بغیروں پھر بغیروں کئے تو سر پر پتیلوں کو لگا لگا دوں اور لباسوں کے ٹیسٹ کی بات کرنے۔

”تم نے اچھے تو لگتے ہو ہر شکر۔“ ایک دن امتحان کی ضبط کے باوجود اس کے منہ سے نکل گیا۔

”مگر کیا؟“ وہ اسے بے حد مگر ہی نظروں سے دیکھنے لگا۔

”کچھ بھی نہیں۔ اب پڑھنا چاہیے۔ اس کے خاندان میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ کبھی نہیں وہ اپنے خاندان کی امداد کے چاند پر انکس لاوارغ نہیں لگنے دے گی اس کے لاؤں میں سارا خاندان سرگرمیاں کرنے لگتا۔

”تمیں مجھ سے محبت ہے“

”تھیں نہیں! قطعاً نہیں! اس نے بڑے استدلال سے کہا۔ مگر وہ اپنے آپ سے کس طرح مجھٹ بولتی۔ اس کا خیال سامنے کی طرح

ساتھ نکلتا۔

اس دن گھر کے تمام لوگ دوزخ میں شریک ہونے کو غم ہی چپے گئے تھے مگر وہ امتحان کا ہماڑ کر کے نہ گئی۔ اس دن وہ داد اس تھی۔
 اپنے مکر کی ساری روشنیوں بکھا کر کھانے پر پاؤں اٹھائے چپ چاپ بیٹھ گئی۔ اس دن ماسٹر کے انتظار میں اس نے پہلی بار اپنی دعوت چھوڑ دی
 تھی۔ اور جب یہاں سے اُکرا سے بتا باگ، ماسٹر صاحب دُعا مانگ روم میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں تو اس نے پہلی بار اسے اپنے ہی کمرے میں
 بلا لیا۔

”نہرو میں اندھیرا کپڑوں کو رکھا ہے۔ وہ دروازہ کھول کر کھڑا ہوا۔
 ”اُباؤ اندر آج مجھے روشنی بڑی لگ رہی ہے۔ وہ ٹوٹا ہوا آگے بڑھا اور دروازہ کے پاس ہی پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔
 ”آج سب لوگ ایک دعوت میں گئے ہوتے ہیں۔

”تم کہیں نہیں گئیں۔“

”میرا جی نہیں چاہا۔“

”روشنی کرو۔“

”نہیں! اس کا رونے کو جی چاہ رہا تھا تم میرے پاس آکر بیٹھ جاؤ۔“

”نہیں۔“

”ہاں! ہاں! پھر وہ اس کے پاس آیا۔ اندھیرے میں جذبات کتنے چھیلے ہو جاتے ہیں۔ وہ بچے انکو کی طرح اس کی گود میں گر پڑی۔
 میں تمہاری ہوں، میں ہمیشہ تمہاری رہوں گی۔ وہ جیسے نشے کی حالت میں سچ بولنے لگی تھی۔ پھر اس کا دماغ سن ہو گیا۔ کان گنگ پڑ

گئے۔ وہ کہہ کر اسے کچھ بھی مدم نہ تھا اور جب وہ ہوش میں آئی تو اپنے بستر پر پڑی تھی اور سارے بدمعاش روشن تھے۔

”سوجاؤ ابل کھل میں آگے۔ وہ پردہ سر کا کر آہستہ سے دروازہ سے نکل گیا۔

”کوئی نہ بدلت تو نہیں بے بی“ کیا پردہ کے پاس کھڑی اسے ذرا غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ گھبرا گئی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ مجھے نیند آرہی ہے میں پڑھتے پڑھتے تھک گئی ہوں۔“

اس رات وہ صبح تک جاگتی رہی۔ وہ رات بھر اس کے سنسنے ترچتی رہی وہ اسے نہایت اچھا لگتا ہے وہ اس سے ہمیشہ ملتی رہے گی
 وہ اسے بھولے گی نہیں۔

”گر.... گر.... گردہ اس کے ساتھ زندگی کیسے گزار سکتی ہے۔ ناممکن.... ایسا تو کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہاں وہ اس سے ملتی رہیگی
 کوئی اعتراض نہیں کر سکے گا۔

”دوسرے دن جب وہ آیا تو بہت خوش تھا۔

”تم میرا ساتھ دو تو آج ہی تمہارے والد سے کہوں۔ تم نے میرا ننھا سا گھر دیکھا ہے نا اب میں نے وہاں بہت سے کلاب کے

پردے لگائے ہیں۔ میں اسے تمہارے لیے اور بھی اچھی طرح سجا دوں گا۔ خواہ کے علاوہ میں زیادہ سے زیادہ خوش ہو کر دوں گا۔ اور....

اور.... تم بولتی کہیں نہیں؟

میرا تھارے پہلے کافی بناؤں، میرے پاس بیڑ ہے۔ اس نے ٹیل لمپ دوختن کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں تم میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“ ڈھٹے نشہ سے رداہم ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اسی کے چھوٹے چھوٹے سرو دھات لہنے باغوں میں چھپا لیٹے۔ صدمات یاد ہے نا؟ اب اسی رات کی یادگار میرے سبب میں پردوش پانے لگی ہے۔

”اوہ! ————— وہ جیسے خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ ————— اب تم کہیں نہیں جا سکتیں، تم میری ہر ہم صبح ہی شادی کر لیں گے۔ کیا میرا یہ فیٹ اس ڈاکیمنٹ میں کوئی اس میں رہ سکتا؟ وہ اس کے شانے سمجھوڑنے لگا۔

”مگر وہ صرف ایک رات تھی، میں تم سے ساری زندگی محبت کر سکتی ہوں۔ تم مجھے کتنے اچھے لگتے ہو، میری شادی ہو چکی۔ مگر میں تم سے ملتی رہوں گی، صبح مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے مجھے دکھ تو براگھر میں مجھ کو ہوں ہمارے گھر اسے میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی غریب کی جگہ دے دی گئی ہو؟

”اب تم اپنے گھر جا سکتی ہو اس کی آواز میں سخت تسلیم تھا اودھ انھیں بند کر کے کچھ سوچ رہا تھا۔
”میرا تم کو اس محبت کا بدلہ دیکھو کہ صرف اس لیے کہ تم ہمارے کیوں مجھے اچھے لگتے ہو۔ اس نے بڑے غرور سے گردی اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”کمرے میں ایسا سا اچھا لگیا جیسے یہاں کی ہر چیز موت کی نذر ہو گئی ہو۔ اس وقت زمانے کہاں سے اس کے ذہن میں پہنچی اہل کا ایک نصیرا ادا کیا۔ وہ بھی ڈانپنے ایک غریب کا سبیل سے محبت کرنے لگی تھی مگر وہ تھا کہ وہ ہمیشہ اس کے اٹنے کی طرح اگر اہل صاحب الی نے اسے انھیں میں اہل نصیرہ دلانے کا وعدہ کیا تو ان کی اس کی جوتیاں سہمی کو تارنا۔

”وہ ————— وہ بہتر پڑا تھا کہ بیٹھ گئی اور اپنے اٹھ اور گئے سے میرے بڑے زیور اتارنے لگی۔ ————— محبت کے بدلے میں میں تم کو ہمیشہ بہت کچھ دیتی رہوں گی۔ یہ سب تم سے سکتے ہو۔“
”نکل جاؤ۔ ————— وہ صبح پڑا اور اسے بہتر سے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ ————— نکل جاؤ میرے گھر سے ————— زید پر اس میں ٹھونس کر اس کے دھتے میں پڑا دیتے۔

ذیل کی زندگی تم لوگوں کو درامند لگاؤ تو سر پر چڑھنے لگتے ہو۔ وہ پھر کر اس کے ہانے کھڑی ہو گئی۔ ————— یہ فیٹ۔ اس سے زیادہ اچھی جگہ تو میرے ذکر رہتے ہیں اور تم چاہتے ہو کہ اس جگہ میں تمہارے ساتھ اپنی قیمتی زندگی گزار دوں، اپنے خاندان کے سہرا کا مالک لگا دوں، ذرا اپنا منہ دھو کر پھر محل کے خواب دیکھنا، تمہارے لیے یہ کیا کم محنت کی بات تھی کہ میں تم سے محبت کرنے لگی، وہ اسے صحت سے دیکھتی رہتی وہ دراز سے سے ہر نکل گئی۔ وہ بازوؤں میں نہ پھیلنے لگا تھا۔

پوچھت چکی تھی، صبح کی تھکائی ہوئی لادیزنی سے آڑی جا رہی تھی۔ اس کا منہ آسمانوں سے دھل کر خندا پڑ چکا تھا۔

کھلی کھڑکیاں

ہاجرہ سرد

کہہ دو۔۔۔ پتیا میں پچاس سال کی صدیاں بھر کے آدمی۔ مغربی لباس۔ فٹ چاکٹ مارچی، موٹے نرم کے چٹے، مدبڑے سے پہنچے
میں سوچے سوچ کر اپنے اندر وہ گھر بیٹھنے کے عادی۔
نسرین۔ دو بل بلی پچیس سالہ بیری۔ نئے زمانے کے مطابق لباس اور شکار۔ جلدی جلدی بحث کے انداز سے بولنے کا عادی۔
خالہ جان۔ کھڑا قاتل کا بڑی خاتون۔ ٹیچہ پھیر کر لیتی ہیں۔ لیکن پاؤں چبانے کے لیے سڑ مسلسل چلاتی جاتی ہیں
اختر۔۔۔ نسرین کی بھینس والی شیردانی میں جو کس شاعرانہ چٹائی وصال اندھ کھجور سے بال۔

رہو وہ اٹھا ہے تو ایک معمولی سی خوب نگاہ سامنے ہے وہ نئے لکڑی کے ٹیگ۔ ٹیگول کے درمیان ایک تپائی ہے۔ تپائی پر کتا بول کا
دھبہ۔ ایک گھاس اور موٹر جھنکے کا سالن بھی اس پہ ہے ایک کونے میں کھٹے کی میز اور ایک کرسی میز پر بھی کتا ہیں ڈھیر ہیں ڈھیر لیگ
ٹیل، بلیں، مددازے کے قریب ہے۔ اور کپڑوں کی الماری دائیں دروازے کے قریب — ایک فالتو تپائی اور ایک آرام کرسی سامنے
کی دیوار کے قریب ہے۔

نسرین بہتر میں نیم دروازہ کچھ سرچ رہی ہے۔ دوسرے بہتر خالہ جان دو شاہ اور مے ٹیجی پانڈا ان کھولے چھالے کتر رہی ہیں
کمرے میں شام کا اندھیرا ہے۔
خالہ جان۔۔۔ اے، لیکن کھڑکی میں کیا گھر دہری ہو پڑی — دونوں وقت لیستے ہیں روشنی کر دو —
نسرین۔ ابھی تو سورج ڈوب رہا ہے۔ روشنی ہے کافی
خالہ جان۔ روشنی ہے۔ لا مہربا کی انہیں ہونے والی ہیں۔ اور یہ کوئی کھڑکی بھی بند کر دو۔ —
کیا بھر بھر رہا رہی ہے۔

نسرین۔۔۔ ریزاری سے کھڑکی بند ہو تو میرا دم گھٹا ہے
خالہ جان۔ اوئی بیری۔ تم سے تو بہرات کا کھرا جواب ہے۔ لا۔ ذرا اگر بیٹھی ہوں صاف کہہ دو کہ اٹھ کر پہل جاؤں۔

خالہ جان:۔۔۔ ارے میری دہلیزی ہے رات جاگے ہو گئے۔ نہیں تو ٹھنڈ لگ گئی ہوگی۔ کھڑکی حدرات دہان کھلی رہتی ہے۔ آؤ نقل بولنا
پڑھ کر پھونک دوں۔

ڈاکٹر نور:۔۔۔ جی زیادہ درد نہیں۔ (بیزاری سے) آپ تو چائے بنا دیتے۔
خالہ جان:۔۔۔ (حیران ہو کر) وہی ابھی تو کھانے کو کہہ رہے تھے چائے سے انکار تھا۔ اب چائے کو کہتے ہو۔ آؤ ابھیوں بناد دوں نہیں کہیں
مرد دانا آؤ تو میں دہا دوں۔ (دھتکتی ہیں)

ڈاکٹر نور:۔۔۔ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس میں آرام کروں گا۔ اس وقت۔ (اس طرح ٹھہرتے رہتے ہیں)
خالہ جان:۔۔۔ (قریب جا کر) پتھکس کا ہے۔ زیب کا تو نہیں؟

ڈاکٹر نور:۔۔۔ (خفا جلدی سے) جب میں دھک دے گا۔ خطا زیب کا تو نہیں۔ سر کا وہی خطا ہے۔
خالہ جان:۔۔۔ (پریشان ہو کر) کوئی سر کا جی کم ہے؟ اس لیے تمہاری صورت تڑی ہوئی ہے۔ کیا بات ہے؟

ڈاکٹر نور:۔۔۔ (دروغ کر) کوئی خاص بات نہیں ہے خالہ جان۔ آپ ٹھوڑے بیٹے۔
خالہ جان:۔۔۔ (دوبارہ چپک پر بیٹھتے ہوئے) میں تمہاری ٹھوڑی کر دیں گی تو کون کرے گا۔ زیب بڑھاپہ لھکتی ہے کہ نور جانی کا خیال
رکھئے آپ کے سوا ان کا کون رہ گیا ہے۔

نفسرین:۔۔۔ (سخاوت سے منہ بنا کر) بے چارہ زیب! (نور نور سے سلامیاں چلاتی ہے اور رخا کر طرف سے منہ پھیر لیتی ہے)

خالہ جان:۔۔۔ (ایک دم بڑا کر) دیکھا نور میاں۔ یہ حال ہے۔

ڈاکٹر نور:۔۔۔ (سر ہلکا کر) خالہ جان میں چائے پیوں گا۔

خالہ جان:۔۔۔ (پکارتی ہیں) ارے نواب۔ ارے نواب۔

ڈاکٹر نور:۔۔۔ (لمبی سانس لے کر) میں کچے ٹوٹھ کی بنی ہوئی چائے پیوں گا خالہ جان لگتا آپ بنا دیں تو۔

خالہ جان:۔۔۔ (سر ہلکا کر) تو یہ کھریاں میں چلی جاؤں میاں سے۔

ڈاکٹر نور:۔۔۔ (پریشان ہو کر) میرا مطلب ہے چائے۔

خالہ جان:۔۔۔ ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔ چائے۔ اچھا تم دلہن کو میری دوج سے کچھ دیکھنا۔ بچہ ہیں۔

(پاؤں اٹھا کر کھڑکی میں) وہ مجھے جرجا رہیں کہیں۔

نفسرین:۔۔۔ (خفے سے خالہ جان کو کھڑکی سے دیکھ کر) ڈاکٹر نور خالہ جان کے جانے کے لمحہ جلد ہی سے ورداؤ بند کر لیتے ہیں اور پھر دہشت

پہنچا ہوا ہے۔ نہتے قدوں سے نفسرین کے چپکے پاس آکر اسے نور سے دیکھنے لگتے ہیں)

نفسرین:۔۔۔ (طنز سے) نہیں دیکھتے ہوئے بس سنا کر آج سر شام کیسے میاں تدمر رہے فرمایا؟

(بال جھٹک کر دوبارہ دہان کہتے ہوئے) کیا آپ بھند کرے میں خالہ جان کی فریاد سنی گئی تھی۔ خالہ جان کے لیے جو نصیحت

بنیاد پروردہ سنا دیتے اور میرے سلسلے میں جو بوجہ ہو وہ مجھے عنایت کیجئے۔

ڈاکٹر نور :- (بجھا ہوا پاپ بھٹکتے ہوئے) نسرین زبان کے ہر لہجے کا دکھاؤ۔

نسرین :- (منہ زنی آہستہ) واقعی یہ وقت یہ حال؟ آپ جیسے عالم فاضل کے سامنے میری کیا مجال۔ لیجئے میں چاہوں
میں جیسا کہ ناخون پر سرخی کا رنگ لگی۔ آپ پھر شہد مع لیجئے۔ مریض ہے خالد جان کی اہمیت۔ مٹھنے سے
ڈرینگ بل کے سامنے بیٹھ جاتی ہے)

ڈاکٹر نور :- (مضرب آواز میں) نہیں مریض پر بلا ہے۔ (بجھا ہوا پاپ) دوسری میں ہمارے نسرین کو تیز نظروں سے گھورتے ہیں
اور پھر کھڑکی کے قریب جا کر ہر جھانکتے ہیں۔ نسرین بے تکلفی سے
بیشی ناخون پر سرخی لگاتی رہتی ہے)

ڈاکٹر نور :- (سیدھی گئی) میں ایک بات پوچھ سکتا ہوں نسرین گیم؟ ذرا رک کر کہہ سکتی ہیں کھڑکی بند کرنے کے مشورے پر اس قدر
جلال کر لیا ہے؟

نسرین :- (اسی طرح سرخی لگاتے ہوئے) اور کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ نے بھی خالد جان کا علاج حفظانِ صحت کے اصول
نہیں پڑھے۔ وہ جو غالباً قیرے باجوتے درجے میں پڑھائے جاتے ہیں؟

ڈاکٹر نور :- ہوں۔ خوب!! (جیب سے) جس حال کو آپ سلگاتے ہیں اور پھر ایک دم نسرین کے پیچھے کھڑے ہو کر جیب سے
غلاف نکالتے ہیں) میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ خط کیا ہے؟

نسرین :- (بے ہوشی سے) آپ نے ابھی خالد جان کو بتایا تھا کہ سہ کار سی ہے۔ آپ کہتے ہیں ہے دوبارہ دیکھ لیجئے۔
(ڈاکٹر نور خط کھل کر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہاتھ کو دور سے جا کر پھر جیب سے دوسرا خط نکال کر پہلے چٹنے
کی جگہ نکالیتے ہیں)

ڈاکٹر نور :- (پڑھتے ہیں) القاب ہے۔ جان قنات۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

نسرین :- (بیز چوکنے اطمینان سے) قطعی غیر سرکاری القاب ہے۔ تو سنئے

ڈاکٹر نور :- ہوں۔ خوب۔ (چند قدم بے تابی سے ہستے کے بعد بھٹکتے ہوئے) اسے محبت نامہ کہا جاسکتا ہے۔ کیا
خیال ہے؟

نسرین :- (اسی اطمینان سے) جی ہاں! تو ہے۔ یعنی آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ بھی کسی کی "جان قنات"
ہیں۔ خیر میں ہی سہی ایک دم مگر عفت سے) آپ مجھے اپنی تصنیف دیکھ کر کیا سمجھائے گئے ہیں۔ میں تو
میسے بھی آپ سے کوئی امید نہیں رکھتی۔ ہم دونوں کو الگ الگ زندہ ہیں۔

— کیا فی منہی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر نور :- (خط کو منہ میں ڈال کر پشت پر ہاتھ مار دیتے ہوئے) اس کے بعد میں منہ نہیں دوٹھکا جاسیے تھا۔ بھی یہ تصنیف مکمل

نفسین: یہ ہے سچی ہے! مجھے دھڑکنے لگی۔ (بستر کی طرف بڑھتی ہے جیسے اب مدد کر لیت جائے گی)
 ڈاکٹر نور: یہ تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اداں۔ واقعی۔ (دڑک کر) مدد ملے تو یہی بلا کر کہہ کر جاتی ہو کہ مجھے کوئی نہیں چاہتا
 وہی سانس لیتے ہیں، تم مجھ نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔

نفسین: ... بستر کے پاس کھڑے ہو کر جھٹکا، آپ نے پھر چاہت کا قصہ چھیڑا؟ آپ کے منہ سے یہ باتیں بڑی عجیب سی نکلتی ہیں۔
 (اداس ہو کر) بڑی عجیب سے کوئی دودھ پیتا بچہ آٹھ کر یا منی کا سہل کرنے لگے۔

ڈاکٹر نور: (اداس) اس کے قریب آکر عروج نظروں سے دیکھتے ہیں، اور کچھ کہو۔
 نفسین: (ڈاکٹر نور کو کھڑے ہونے اذاز سے دیکھتے ہوئے) ایک بار جب میں چھٹی سی تھی تو مجھے ایک ساغر ہوا۔
 سفید ہوا تھی اس لیے بڑے کمرے کا سارا سامان نکال دیا گیا۔ میں چلتی چلتی وہاں پہنچ گئی۔ (رنگ کر سوچنے)

گنتی ہے!

ڈاکٹر نور: پھر کیا ہوا؟
 نفسین: میں نے اتفاق سے آٹاں کو پکارا۔ آواز کی گونج میں نے دوسرے کمرے میں

آٹاں۔ مجھے یہ بازگشت کا احساس پہلے مرتبہ ہوا۔

ڈاکٹر نور: اچھا تو اس سے تمہارا مطلب کیا ہے؟
 نفسین: میرا مطلب ہے کہ محبت کی بازگشت بھی خالی دلوں اور خالی کردوں ہی میں ہی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر نور: (پاپ دوبارہ سسکا کر حشرات سے) خالی دل۔؟ خالی کمرے؟
 نفسین: جی ہاں۔ تو آپ کے کمرے میں تو کتا ہیں، سی کتا ہیں ہیں۔ دیواریں ٹیک ڈھکی ہوئی۔ (بے اختیار منہس کر) دل

میں ہی کتا ہیں۔ یہاں تو آپ اپنی آواز کی بازگشت نہیں سن سکتے۔

ڈاکٹر نور: (دھیسے ہوئے اذاز سے) تم کیا کیا کیا؟
 نفسین: (چونک کر طرے) کچھ بھی نہیں۔ ایک چھینری یوری۔ جو اکیلے پڑی تھی ہے! پڑھتی ہے۔

ڈاکٹر نور: (میں نہیں کہہ سکتا) وحدت سے سوا اگر میرا مطلب تھا کہ تم ہو بڑی شاذ ہوتے۔

نفسین: (پہلا ٹو جھٹک کر خالص بیویانہ اذاز سے)۔ شے؟۔ میں شے ہوں۔ مجھے شروع ہی سے صدم تھا کہ آپ

مجھے اذاز تک سمجھنے پر تیار نہیں۔ (بستر میں جا کر بیٹھ جاتی ہے اور ہنسنے لگتی ہے)

ڈاکٹر نور: میں تمہارا مسترت ہوں نفسین کیم۔ میں جانتا ہوں۔ اگر تم دکیل ہوتیں تو ڈاکٹر کوئی اور قانون کو باعث ہری کرالیتیں۔

یہ تو ہونی تمہارے زہد بیان کی تعریف۔ اگر تم ادکار ہو تیں تو نہ۔

نفسین: (دوسلا بیان بدل کر غصے سے) تو؟

ڈاکٹر نور: تو تم بھی ادکار بھی ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اتنی دیر سے بڑی اچھی ایکٹنگ کر رہی ہو۔

نسرین :- پنج کر (کیا مطلب ہے آپ کا۔ میں یکنگ کر رہی ہوں۔

ڈاکٹر نور :- (بغیر توقف دیتے طنز سے) میں جانتا ہوں تمہاری انگلیک کے مدد بھی کلاٹ دیکھوں۔

نسرین :- (دون اور سلاخیاں پنج کر) دیکھتے مدد ہوتی ہے۔ آپ کو میرے بارے میں اس قسم کی بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔
آج آپ کو کیا بر گیا ہے۔ میں یہاں سے چلی جاؤں؟

ڈاکٹر نور :- میں آج بھی یہی انگلیک کے کلاٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ (ان توروں سے منظر) (خفا سے کہنے) "جان مٹا"
نسرین :- (دہشتناک صبح کے عالم میں اجنبی میں جائے جان مٹا۔

ڈاکٹر نور :- اس کے آگے کھلے۔ "تمہارے کمرے کا کھلا ہوا دروازہ دیکھ لے ایک دعوت ہے کہ میں معذرت ہوں۔"
اس کا کیا مطلب ہے؟

(نسرین ایک دم ڈاکٹر کو مسمری کا سہارا لے لیتی ہے)

ڈاکٹر نور :- کھلے ہوئے (دیکھنے کی تشریح بھی کر دو) — چپ کیوں ہو گئیں؟

نسرین :- (اپنے آپ کے انداز میں) تو میں — تو میں ایسی ہوں؟ — ایسی! —

ڈاکٹر نور :- گو یہ تم ہی نہیں جانتی تھیں۔ ٹریڈی پرسکیاں لیکر دیتے ہیں نسرین بیگم۔

نسرین :- (ایک قدم آگے بڑھ کر) تو میں — (ایک دم چھوٹ چھوٹ کر رونے لگتی ہے)

ڈاکٹر نور :- (پاپ ہاتھ میں پکڑ کر ہنسنے ہوئے) مجھے نہیں معلوم تھا کہ خالہ جان سے جو روٹ ڈاکٹر کیاں بند کرنے پر بھگڑتے ہوئے

ہیں، وہ کس لیے — میں نے خالہ کی باتوں کو کبھی اہمیت ہی نہ دی — ابھی تم نے کہا تھا کہ صحت کی بدولت خال

دون ہی ہیں تو کبھی ہے۔ مگر تم نے یہ نہ کہا کہ تمہارا دل (دوسروں سے بھرا ہوا ہے) —؟

(نسرین تڑپ کر سر اٹھاتی ہے اور کمرے میں ہر طرف دیکھتی ہے)

ڈاکٹر نور :- (دور پیچھے کے ہاں) اگر اسے پاؤں ہاٹ کھول دیتے ہیں۔) یہ رہا حفظانِ صحت کا پہلا اصول جو تم نے شاید سچے

درجے میں پڑھا تھا کیوں نا — مگر صاف ہوا سے ذہن بھی پاک ہو سکتے ہیں؟

(نسرین بے بسی سے سر اٹھا کر ڈاکٹر نور کی طرف دیکھتی ہے) صاف ہوا کے باوجود قتلہا چوک تو دریا ہا ہے — (نسرین

کی طرف آتے ہوئے) تم چپ کیوں ہو۔ بیوقوفانہ توں کے پاس نکل کی کی نہیں ہوتی۔

نسرین :- (تڑپ کر) میں — میں بیوقوف ہوں —؟ (فیصلہ کن انداز سے) آفسر پونچھ کر کھڑی ہو جاتی ہے)

ڈاکٹر نور :- (حقارت سے) یہ گویا کلامس ہوا دار کا ری کا۔

نسرین :- (غصے سے) آپ کر (کی آپ پڑھے کئے لگوں کی زبان میں گنگو نہیں کہہ سکتے؟

ڈاکٹر نور :- (دکاش میں ڈھکا کھانا ہوتا — تو تم یہ مطالبہ کرنے کے لیے زندہ نہ ہوتی۔) تم جانتی ہو، جب میں نے یہ خاکھولا

تو جسے پہلے میرا کیا ہی جا یا —؟ تم اخبار میں جرائم کی خبریں پڑھنے کی شریفین ہو — کچھ گئی ہو گی۔

نسرین :- تو میں — میں — کچھ نہیں کہہ پائی اور ڈاکٹر نور کی طرف سے پیچھے مڑ لیتی ہے۔

ڈاکٹر نور:۔ روایت دہا کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم ایسی ہو، درہم مجھے سب سے بھی حاصل کر سکتی۔
 نسیرین:۔ (شعیاں بھیج کر مڑتی ہے) میں نے آپ کو حاصل کیا؟ آپ نہیں چاہتے تھے مجھے؟
 ڈاکٹر نور:۔ میں نے تو انہیں ایک قسم میں جوڑ کر بھیج دیے تھے کیا تھا۔ مجھے تو یہی بیکار آدمہ کا علم تھا۔
 نسیرین:۔ (ہزٹ کاٹ کر) مجھے بھی تم پر ترس آیا تھا کہ بیچارہ بڑھا۔
 ڈاکٹر نور:۔ کون! — میں بڑھا — تم نے یہ سمجھا تھا۔ کو تم میری آرٹیں —

نسیرین:۔ (بیچ کر) چپ رہو۔ بس۔ مجھے کچھ یاد ہے۔
 ڈاکٹر نور:۔ (ایک دم دھم سے ڈر کر یکن شدت سے) یہ تم میرا فیڈ سوارچی جو تم کو کئی چالاک بھی ہو تاکہ دنیا کے سامنے
 پیشی لگھاؤ کی پھر وہ تم نے مجھے چھوڑ دیا۔ کیوں؟
 نسیرین:۔ (بے تحاش بیچ کر) نہیں جانتے۔ ایک اشتہار دیا دیکھو شہر میں کہ آپ کچھ بڑے ہیں۔ مجھے ذرا برابر
 پڑا نہیں۔ (ایک دم پھر دوسرے پرے) ہاں میں ایسی ہوں۔ مجھے ابھی چھوڑ دیتے۔ یہی اللہ! (روتی ہے)

(روتی ہے)

ڈاکٹر نور:۔ جوت کہ چھوڑنے کے لیے اس کے گلے سے زنجیر تو نہیں اتاری جاتی۔ تم آزاد ہو۔
 نسیرین کی طرف سے پتہ پڑا کہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نسیرین ٹھاکر کا کھٹکتی ہے ایک آدمہ اٹھاتی ہے اور پھر نور سے
 (دوڑتی ہے)

ڈاکٹر نور:۔ (نفرت سے) نسیرین کی طرف مڑے (حٹ کر توکتے بھی خوشی سے بھاگتے ہیں۔
 نسیرین جھک کر لپکا کھلتی ہے اور پھر آفسر پتھر کو مضبوطی سے چل کر پتھر کی الماری کھول دیتی ہے۔ اور اپنے کپڑے نکالنے
 لگتی ہے۔ خالہ جان انداز میں صورت احوال کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کچھ نہ سمجھ کر)

خالہ جان:۔ اے ہے کہ خبر پھر ٹھنڈی ہو آ رہی ہے۔ یہ مرنی کٹر کی پھر کیوں کھول دی گئی۔ ایک۔ نور میاں کے سر میں درد ہے
 اس پر سے یہ ٹھنڈی ہو اب کسی کو خیال ہو جب نا۔ کیوں دہی؟
 ڈاکٹر نور:۔ (بھٹکا) خالہ جان کٹر کی میں نے کھول دی ہے۔ میرا دم کھٹ رہا تھا۔

خالہ جان:۔ (حیران ہو کر) تمہارا دم کھٹ رہا تھا۔ اوپر سے چائے پوگے سردی لگ رہی ہے زکام نہیں ہو جائے گا۔
 ڈاکٹر نور:۔ بہت پی خالہ جان میں چائے نہیں پریں گا اب (کھٹکی کے قریب جا کر کھڑے ہو جائیں۔)
 خالہ جان:۔ (سر پر دوپٹہ ڈال کر ان کے پیچھے جاتی ہیں) اب کیا کہوں کسی کی سمجھ میں کچھ آتا ہے یا نہیں۔ ہر ایک کا دم کھٹتا ہے کھٹکی
 بند ہوتی۔ اب کیا کہوں میں کسی سے۔ کھٹکی کھلی ہو تو میرا دم کھٹتا ہے۔

ڈاکٹر نور:۔ اب کھڑکیاں بند ہیں خالہ جان۔

خالہ جان:۔ تو ابجو بند کر دو، سارا سامنا ہوتا ہے یہاں کا۔ وہ موٹھو رہا ہوگا۔

ڈاکٹر نور:۔ (چومک کر) کون؟

خالہ جان :- اے ہی سامنے والے ٹھکرا مرادھا حاکم سٹ۔ راج ہے گھڑ، مرد تو ناک میں دم ہے۔ جب دیکھ گھڑو مارا ہوتا ہے۔ (شرما کر) میرا بس چلے تو یہے نکالی لوں۔ مارے ٹھکرا کھڑکیاں اسی رخ پر کھلتی ہیں۔ داسا سنا ہوا میرا اور گھڑو سے پٹ پٹا کر دیکھنے۔

ڈاکٹر نور :- (جبرانی سے) خالہ جان — یہ کچھ ہے؟
خالہ جان :- (پریشان ہو کر) اب جانے دو۔ اس لیے تو کتنی زحمتیں مضرت اُجائے گا۔ بس ٹھکرا بند کر دو۔ کیا غمہ کسی سے جھگڑا مول لینا ٹھیک نہیں۔

ڈاکٹر نور :- رفور آؤم کر کسی پر جیسے گر جاتے ہیں) میرے سر میں سخت درد ہے۔ مجھے جانے دیجئے جدی سے۔
(خالہ گھبرا کر چلی جاتی ہیں ڈاکٹر لڑکیاں۔ لمبے آنکھیں بند کیے جھپٹتی ہیں۔ اور پھر جلدی سے سنبھل کر بیٹھ جاتے ہیں۔
نسرین بڑے عزم کے ساتھ جلدی میں سے اپنے کپڑے نکال نکال کر بستر پر ڈھیر کر رہی ہے۔ وہ ادھر دیکھتی بھی نہیں)
ڈاکٹر نور :- (کھٹکھٹا کر) رکی۔ پی۔ سنورینی —

نسرین :- میرا نام نسرین ہیگ ہے، ڈاکٹر نور اللہ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی
ڈاکٹر نور :- (کھپائی ہنسی پیش کر) ام۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی کے آگے بریکٹ میں جو منی جی ہے۔ وہ تو تم جھول ہی گئیں رہتی
نسرین :- (ناکھی بے زحمتی سے) میرا نام رہتی نہیں
ڈاکٹر نور :- (ناکھی کے قریب آئے ہوئے) مجھے صاف کر دو۔ دراصل خط کچھ اس قسم کا تھا۔ میں نے سمجھا تمہارے نام ہے۔

نسرین :- (انکھ بھری) صاف کس بات کی۔ (کپڑے تھمہ کرنے لگتی ہے)
ڈاکٹر نور :- (اس کے ہاتھ سے کپڑے لینے کی کوشش کرتے ہوئے) آؤ بیٹھ کر چائے پی لو۔ اب تو تمہیں خالہ جان کے بارے میں اندازہ ہو گیا کہ وہ کتنی نیک دل اور سادہ ہیں۔ خدا ان کا جھلا کرے کہ —
نسرین :- (بات کاٹ کر) انہوں نے انجام بخیر کروادیا۔ (تلمی سے ہنستی ہے) ہم خود اپنی ذات کے ساتھ کتنے بے بس اور احمق معلوم ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر نور :- (احتم اور بے بس!) — یہ بھی نہیں کہا جاسکتا رہتی — بیچھونا ساز کے ایک سرے سے نذر نہیں بنتا۔

نسرین :- (تلمی سے ہنسنے لگی) تو خالہ جان کو کچھ شکر کہ یہ مجھے اپنے فتنے کا — بیچارہ ہی خالہ —!
(خالہ جان اندارتی ہیں ان کے پیچھے لڑکھانے کی رے لیے داخل ہوتا ہے اور بڑے میز پر رکھ کر لٹ جاتا ہے)

خالہ جان :- میرا کیا ذکر ہو رہا تھا۔
ڈاکٹر نور :- (کھٹکھٹا کر) ہم آپ کی تعریف کر رہے تھے۔
خالہ جان :- (جھلا کر) کی تعریف؟ میں نے کیا ہی کیا ہے۔ بس چائے بنوائی ہے۔

فرسٹر: اے اللہ! کچھ کہہ دے، اسے قریب آکر، پہنچے تو بہت کچھ کہتا ہے۔ باکپ نہیں ختمیں۔ عجیب سی جانی ہوں۔ (فرسٹر چمکا کر ہنس رہا ہے۔)

ڈاکٹر نور: وہ بڑی عجیب لڑکی ہے، اس کی والدہ جان —
فرسٹر: کونوں کے بل ٹھیک کر سہی کے پتے سے پھرے گا بنا مارا کیس ٹھیک کر کا لیتی ہے۔ ڈاکٹر نور: کہہ جاتے ہیں اور خالہ کو مزہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نور: آخر تیاں گھڑتے نہیں۔ وہ رات سے پہلے گھڑتے ہی نہیں۔ رات ٹھیک نہیں خالہ جان! (ادھر ادھر دھرتے ہوئے) میں گھر سے پھر نہ جاکر عمر ہے۔ استعجب ہو کر! فرسٹر: دیکھ لیا کر رہی ہیں اس وقت؟ ایں۔

ڈاکٹر نور: (گھبرا کر) کپڑے رکھ رہی ہیں۔
خالہ: دو تیریں بھی دیکھ رہی ہوں۔ گوالاری کیوں خالی کر رہی ہیں۔
فرسٹر: الماری میں جگہ نہیں رہی ہے۔

ڈاکٹر نور: خالہ جان آج اٹھ سے کاروبار پکا دیکھتے بہت دن سے آپ کے ہاتھ لاسالی نہیں کھایا پریشان ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فرسٹر: ان کی کیفیت دیکھ کھڑی ہو جاتی ہے،
فرسٹر: یہ سانس نہیں آتا۔ مگر آپ ہا کر پچا پتے کیڑہ چاہتے ہیں آپ اس وقت یہاں سے چلی جائیں۔
خالہ: کیا کہہ رہی ہے لڑکی! — میں میرے ہاتھ لاکھا کسی کو کیا پسند آئے گا۔ تم تو بڑی بچا نے وال ہو نا۔

فرسٹر: اب آپ پچا نے وال کا انتظام بھی کر سکتی ہیں
خالہ جان: (گھبرا کر) آئیں۔ دیکھ رہے ہو زردیاں — میرا تو فیصہ بچا بڑا گیا۔ اختہ کسی لالہ ہوتا تو کیوں ایسی باتیں سناتا پڑتیں۔
ڈاکٹر نور: (ہاری ہاری دونوں کی طرف دیکھ کر) خالہ جان آپ تو میرے لیے سالہ پکا دیجئے۔

ادھر یہ فرسٹر — ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ (فرسٹر کے پاس جا کر) خدا کے لیے کپڑے کل ٹھیک کر لیا اس وقت آرام کرو — خالہ جان خدا کو کہہ سے سائیڈ ان لانے کو بھی کہہ دیجئے

خالہ جان: (پرامان کر) اگلے وقتوں میں کوئی بات کرنا ہوتی تھی تو روگ بڑی کو ٹھکتے تھے۔ اب بڑی کو ٹھکتے ہیں —
ادھرتی میں جا رہی ہوں۔

ڈاکٹر نور: (بھپاپ منہ میں دبا کر ہکھلائے ہوئے) ارے خالہ جان — بات نہیں خالہ جان مل جاتی ہیں ڈاکٹر نور فرسٹر کی طرف بڑھتے ہیں)

ڈاکٹر نور: (بڑا گڑبڑا کرتے ہوئے) خالہ جان کے سامنے اس قسم کی باتیں مناسب نہیں رہی۔ دیکھو اپنے جھکڑے خود چکانا چاہتے ہیں۔
فرسٹر: وہ تو چپک گئے۔ آپ ہی آپ —
ڈاکٹر نور: مجھے خدا نہیں ہوتی تھی — میں نے صفائی مانگ لی۔

فسرین :- (تبسم غلامی کہیں) — وہ خطا میرے ہی نام تھا۔
ڈاکٹر نور :- اور خالہ جان جو کہ وہی عین۔

فسرین :- (تیزی سے) انہیں بھی خطا مہی ہوئی ہوگی — مرنے کا زیادہ ڈھا ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ جوان عورت کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ خطا میرے ہی نام تھا مجھے لیتی ہے۔

ڈاکٹر نور :- (یقین دہانے پر) چلو یوں ہی سہی — غور جن تو قائم ہے۔ مگر میں سامنے والے گھر کے بڑے کو اپنی رفاقت کے لالہ نہیں سمجھتا۔ آؤ اب چائے پی لو۔ مجھے ایک کچر مہی تیار کرنا ہے۔ اور کہیں آرام کی ضرورت ہے۔ آؤ اب۔ قصہ ختم (چائے پیالوں میں اڑھلچھلے ہیں)

فسرین :- (کپڑے سوٹ نکالیں مگر جہاں تھے ہرے) میرا جی نہیں چاہا۔ وہاں سے چائے کو — میں اب جانا چاہتی ہوں۔
ڈاکٹر نور :- (ہنس کر) اس خطا کے پیچھے جانا چاہتی ہو؟ وہ تو مجھ سے بہت زیادہ بڑھا ہے۔
فسرین :- (کھڑے انداز سے) نہیں۔۔۔ دنیا میں جوان لوگ بھی ہیں۔

(فسرین سوٹ کین جھڑو کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور عزم کے ساتھ چل کر ڈاکٹر نور کے سامنے جا کھڑی ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر نور اس کا ہاتھ پکڑنا چاہتے ہیں فسرین انہی سے پیچھے ہٹ جاتی ہے)

فسرین :- (سجیدگی سے) میں جا رہی ہوں۔
ڈاکٹر نور :- میں نہیں مانے دوں گا۔ (محبت سے اسے دیکھتے ہیں)

فسرین :- (ڈاکٹر نور کی طرف سے پٹھہ ٹوڑ کر) میرے گھر میں کوئی ذخیرہ تو نہیں ہے۔
ڈاکٹر نور :- (اٹھ کر فسرین کے شانے پر کھڑے ہوئے) غصے کی باتوں کو دہراتے نہیں۔ یاد کرو چار سال کے ساتھ میں تم سے جب غصہ ہو جس آگے یا کچھ نہیں کہا؟ میں نے وہ باتیں کبھی نہیں دہرائیں۔

فسرین :- (زور سے) خود کو الگ کرتے ہوئے (زبان احساسات کی تابع ہوتی ہے۔ احساساتِ زبان کے غلام نہیں ہوتے۔ یہ ہے جو کچھ کہا ہو گا سچ ہی کہا ہو گا۔

ڈاکٹر نور :- تم نے ایک لمحہ جھکاتے ہوئے کہا کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ مگر میں نے یقین نہیں کیا۔

فسرین :- (اتراؤں سے) اب یہ تو نہیں کہ بات کوئی کیلی ہے جو زبان پر سے اٹھائی اور سمجھوڑے سے کسی کے ذہن میں ٹھونک کر اتار دی۔ اپنے یقین نہیں کیا تو اس میں ہیرا کیا ضرور — میں نے آپ سے کبھی محبت نہیں کی۔
ڈاکٹر نور :- کیوں؟ (سننے لگتے ہیں)

فسرین :- اس لیے کہ محبت احساسات کا تبادلہ ہوتا ہے — آپ نے بھی مجھ سے کبھی محبت نہیں کی۔
ڈاکٹر نور :- (خاموش ہو کر) میں نے نہیں چاہا بھی ہے۔

فسرین :- آپ اپنی لائبریری میں بند ہو کر مجھے چاہتے رہے — وہاں بیٹھ کر آپ میرے لیے میں زور و غرض نہ مانتے تھے۔
(مگر یہ دونوں ہاتھ لڑکھڑکھ کر ڈاکٹر نور کو گھورتی ہے)

ڈاکٹر نور :- اس کی طرف سے (مگر) میں تمہاری طرح اپنی بات نہیں کہہ سکتا، بلکہ کہنا نہیں چاہتا۔ تم جانتی ہو میں تو بڑا سنی جیسے منکر
مصلحتوں کا اسکار ہوں۔

فسرین :- تیز ہو کر کہنا نہیں چاہتے تو سننے کے لیے کئی مرد بولے ہیں ایک بات کہتی ہوں، شاید آپ کے کام آئے۔ دیکھئے !
(حریب اگر حضرات سے) عورت مرد کے تعلقات دو اور چار کا فارمولہ نہیں۔

ڈاکٹر نور :- (جھٹک کر) ابھی تو تم نے کہا تھا کہ عفت احساسات کا تبادلہ ہے۔ اب تم دو اور چار کے خلاف ہو گئیں۔ کہیں پاؤں تو
ٹھکانا۔ یہ کیا کہہ رہا ہے میں بحث۔

وزیر خراج کر آئے چائے پی لو۔

فسرین :- (اذیت سے سر جھٹک کر) جناب، بات یہ ہے کہ یہ چاہتے اور چاہے جانے کی خواہش ہو ہے :- یہ تو بس نئے
نچے کا خواب ہے جس کو وہ خود بیان نہیں کر سکتا۔ سمجھے آپ؟ شاید یہ بتانے کے لیے میں نے ہر مثال غلط دی۔

ڈاکٹر نور :- (مسکراتے ہوئے) یہ تو غلط تسلیم کی۔ اسی خوشی میں اب چائے پی لو۔
رہائی اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہیں)

فسرین :- (اٹھ کر میرا جی بچ ہی رہنے کو چاہ رہا ہے۔ چائے کی پیشکش مسترد
اپنی اپنی تھوڑا مڑا کر اڑتی ہے) مجھے اپنا مارا سامان اکٹھا کرنا ہے۔
(ڈورینگ کیل کی طرف بڑھتی ہے)

ڈاکٹر نور :- (دھمتی سے) بس کو یہ تیار۔ پگلی ہو گئی ہو۔
فسرین کو شازل سے پکڑ لیتے ہیں تو فسرین ہنستا :- طبعی طور پر خود کو چھڑا لیتی ہے اور سسکیاں لے لے کر رونے لگتی ہے۔
ڈاکٹر نور :- (دراگھ کر) کیا جنم ہے۔ تم کیا چاہتی ہو؟ (فسرین سر اٹھا کر بخیر و خوش نظرد سے انہیں دیکھتی ہے اور چھڑا لاتی ہے) بستر پر ٹپک جاتی ہے)

فسرین :- میں جانا چاہتی ہوں۔ (دو چرے دو چرے) میں نے یہ چار سال جنم ہی گزارے ہیں۔ جنم جہاں صرف، اذیت ہے۔ کوئی
امید نہیں۔ کوئی حق نہیں۔ (دو دھتکتے ہوئے) پہلے میسجے پاس کتنے خواب تھے میں نے زندگی کو کیسے کیسے رنگ دینے
تھے۔ مگر یہاں صرف سفید کاغذ اور سیاہ جوہر ہیں۔ یہ رنگ بھی تو میرے ذہن سے نکلے۔ آپ اپنے کمرے میں بند پڑھتے بیٹے
لیکن وہ جو شادی سے پہلے آپ کہتے تھے کہ تم کتنی قابل ہو، میں تمہاری قابلیت کو اور نکھاروں گا۔ شاید میں ام۔ اے کے
سلسلے میں آپ کی ممتی نا۔

ڈاکٹر نور :- (دراگھ کر) تو میں نے تمہیں ام۔ اے کے کرنے سے منع کیا؟
فسرین :- اپنے ہمیشہ راتوں کو مجھے اپنے آئندہ پروگرام سے آگاہ کیا۔ آپ نے کیسی نہ پوچھا کہ تم کیا کرنا چاہتی ہو۔
ڈاکٹر نور :- (دل دھاتی) بات تم سمجھ کر کہہ دو۔ مگر تم نے بھی تو ہمیشہ میرے کام پر ہاک جھوٹاں چڑھائی۔ اب مجھے اتنی فرصت کہاں
کہ رات دن تمہارے ساتھ۔ کے ہنگاموں میں کھویا رہوں۔

فسرین :۔ (ہنسنے پر بے اندازہ) آپ کو اتنی عجیب و غریب دیکھتے ہیں کہ مجھے نظر بھر کر دیکھتے ہیں کیا کہوں۔ میں کیا کہوں۔ مگر میں کہوں گی وہ بچہ جابج گھومتا اور براہی جاتا ہی مجھے دیکھا رہا ہے۔

ڈاکٹر نور :۔ (دھکتے ہوئے) ہوں۔ تو گویا حوریں ہیں چاہتی ہیں کہ انہیں رات دن ملتا رہے۔

فسرین :۔ (دھکتے ہوئے) ساتھ ساتھ انہیں جانتی۔ شاید۔ شاید۔

ڈاکٹر نور :۔ (دھکتے ہوئے) ایسا ہے۔ اس کی تم ہی نہیں ہوئی میرا بھی ہے۔ تم میرے لیے کبھی نہیں دیکھتی۔ میں نے تیس اپنی طرف کھینچے ہیں کہ کبھی تم کو ملتا تھا ایک سنجیدہ نہیں کی صورت پر تم مجھ سے محبت کو دیتی۔ میری دیکھیں میں دیکھتی ہوئی۔ سیر جانے دال اتوں کو مجھے شکایتوں کی عمارت نہیں۔

(ڈاکٹر نور ادم کرسی پر بیٹھ کر پائپ سلگاتے ہیں)

فسرین :۔ (چکر) جی ہاں میں نے تو رات دن آپ شکایتیں ہی کیں۔ (ادھکتے ہوئے) میں نے تو کئی شکایت نہیں کی کبھی۔ اختر اگر بتا کر تا کہ نفل بھر ایسی تھی۔ نفل ڈالنے کی پدوشی خوب تھی۔ کنگھوں سبزہ زاروں اور آتشاواؤں کی باتیں۔ شاعروں کے کامیاب شعر۔ دنیا جہاں کی دیکھیاں۔ اختر مجھے کتنا بھگتا کہ میں اس کے ساتھ چلیں۔ وہ کہتا کہ۔ ڈاکٹر نور پائپ منہ سے نکال کر سائت سے مڑ جاتے ہیں)

فسرین :۔ (نرم خواناک اور دہریں) وہ کہتا کہ بورت کی زندگی عین وہ تھی تو ہوتی ہے۔ مگر میں نے ایسا کبھی نہیں سچا۔

ڈاکٹر نور :۔ (کھٹے ہوئے) فسرین کے قریب آتے ہوئے پائپ سے اشارہ کر کے) یہ اختر۔ یہ اختر کتنا غلام ہے۔ میں پوچھتا ہوں اسے کیا حق تھا کہ تیس ساتھ چلنے کو کہتا۔

فسرین :۔ (سہارت سے) آپ کو یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ کوئی مجھ سے بھدروں کی کہیں رکھتا ہے؟

ڈاکٹر نور :۔ (غضبناک ہرک) بھدروں۔ یہ بھدروں ہے۔ نالائقی ہے وہ تو۔ اس نے آج تک اپنی مال کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اسے تو وہ۔ میں اس سے پوچھتا ہوں۔

فسرین :۔ (منہ بنا کر) ہنسنے والا ہے وہ! آپ کو بہت زیادہ بھدروں ہے۔ بس اب قدم ختم کیجئے۔

ڈاکٹر نور :۔ (دھکتے ہوئے) ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے ہیں۔ میں کھٹے دیتا ہوں۔

(ڈاکٹر نور زور سے کرسی کی گھٹک کر ایک ٹیل کے پاس بیٹھ جاتے ہیں۔ جب سے قلم نکالتے ہیں۔ ایک لمحے)

فسرین :۔ (دھکتے ہوئے) میں جواب بے مدح و تشویش کے ساتھ اپنے کپڑے سرٹاؤں میں جھار رہی ہے۔ تیزی سے کاغذ پر کچھ لکھتے ہیں اور مٹی سانس لے کر اٹھ جاتے ہیں۔ دو ایک قدم اضطراب کی کیفیت میں ہستے ہیں پھر آرام کرسی پر بیٹھ

کر دوسری پیالی بنا کر چائے پینے لگتے ہیں۔)

ڈاکٹر نور :۔ (ایمان کے ساتھ آرام کرسی سے ٹیک لگا کر) میں نے کھدیا ہے کہ میں تمہاری خوشی سے تیس چھڑا ہوں۔

اپنا کاغذ اٹھا۔ تم آزاد ہو۔

فسرین :۔ (شکر) میں جو مٹی کو بھر دیا میں دلی کی۔ دلیاں جانے سے کم از کم ایک نامہ تو ہوا کہ اپنے عورت کی طرف کا اختر

کیا وہ اپنے ہونٹ کا حق ہے (کیا وہ اپنے ہونٹ کا حق ہے) اب ہائے تمنا سے وہاں سے کھنکھانے لگی ہے۔ اس لیے دنیا پر گنگو
ڈاکٹر نور، بد بختی کے ساتھ سرین، اب ہائے تمنا سے وہاں سے کھنکھانے لگی ہے۔ اس لیے دنیا پر گنگو
مناسب نہیں۔ (پاپ کا ایک ٹیل کش کے رجحان کی طرف دیکھتے ہوئے) میں تمہارا بہت مہربان ہوں۔ جو فیصلہ میں خود کرنا چاہتا
تھا اور اپنی وقت فیصلہ کی کمی کی وجہ سے نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تم نے کر دیا میں اس وقت خود کو جیسا کہ تمہیں سنا کر رہا ہوں
جیسے میرے لیے ہار کی جوتی پر سے گرنے کی سلسل کیسٹ آج ختم ہو گئی۔

نسرین: وہ ایک ڈونڈہ جھٹک کر تہہ کرتے ہوئے ایہ فیصلہ آپ کب سے کرنا چاہتے تھے؟
ڈاکٹر نور: (دھڑکنے کے ساتھ) شادی کے تھوڑے عرصے بعد سے۔ تم بھی تھیں کہ میں تمہاری نفرت کو پہچانتا تھا۔ میں جب
کبھی تمہارے قریب آیا تو تم اپنی جھانٹ چھائی، مگر ہمیشہ مجھے جھڑکیاں دیں۔ میں بے پروا تھا۔
نسرین: (دور سے سوتھیں لگاؤ لگتا ہے) میں بھی بچہ نہ تھی۔ آپ جب اپنے کاموں سے تھک کر چور ہو جاتے تھے
میں سمجھتے تھے جیسے میں ایسپر کی ایک ٹیکہ ہوں۔ محض اسباب کو مکون سمجھنے والی۔ کتنا خوف ناک تصور ہے یہ ایسپر
کا ایک ٹیکہ ہونا۔

ڈاکٹر نور: (پھر پھر اپنا سپر گھنٹوں اور بانوں کے حلقے میں چھائی تھی) (پھر پھر اپنا سپر گھنٹوں اور بانوں کے حلقے میں چھائی تھی)
ڈاکٹر نور: (بہت شائستگی سے) سرین، یگم اب مجھے ان باتوں سے دلچسپی نہیں۔ لوگ اپنے پیاروں کے مرنے کا ذکر ان پر ایک
نظر ڈالنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ پھر انہیں نفرت کے جواز سے۔ بس میں تمہارا ممنون ہوں۔ تمہارے مرنے کے پٹے
نسرین: مجھے ہر ایک روپے نہیں چاہیے۔ آپ میری چار سالہ اذیت کی قیمت دیں گے؟
ڈاکٹر نور: تم ہر کچھ کرنا۔ نہیں ویسے بھی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ
نسرین: (بات کاٹ کر ادھی آواز سے) کیونکہ میرا کوئی قریبی عزیز زندہ نہیں۔ میں شادی سے پہلے بھی تو اپنوں کے بغیر زندہ
تھی۔ شادی کے بعد بھی اپنوں کے بغیر زندہ رہی۔
ڈاکٹر نور: (جانتے جانتے گھنٹا اٹا کر) میں نے ویسے ہی کہا۔ (چونک کر) اے تم نے آج نام کی چالے تو پی نہیں
بناؤں؟

نسرین: (شکر یہ دے دیجئے۔ مجھے ابھی بہت سی چیزیں باندھنا ہیں۔ دیکھئے اپنی خال جاں سے کہہ کر بڑے جہیز کے برتن
پھالنگو اور پچھتے۔

ڈاکٹر نور: (پہلیاں میں شکر گھڑتے ہوئے) اچھا میں اتنی لمبوں کا (نسرین کو چائے دیتے ہیں)
نسرین: (دیکھتے ہوئے) وہ اپنے غسل خانے میں جو مرد بادی لٹا اور صابن دانی ہے نا وہ بھی۔ (جہانے کا گھٹ بھرتی ہے)
ڈاکٹر نور: وہ۔ اس کا کیا کردار؟ (حیدرانی سے سرین کو دیکھتے ہیں)

نسرین: (دو جہیز میرے جہیز کی چیزیں ہیں نا
ڈاکٹر نور: (مسکرتی ہے) اچھا۔ اچھا۔ میں لے آتا ہوں (جاتے ہیں)

اس دوران میں نسرین ہاتھ میں پیالہ اٹھا کر چائے کے گھونٹ بھرتی ہے اور کہے ہیں اور مرادھر مگر کم کر دیکھتی ہے۔ میز پر سے کچھ کبابیں اٹھا کر اپنے پیٹ پر چھینکتی ہے۔ چائے کی پیالہ رکھ کر کھنے والی میز پر کٹا ہوا میٹھے سے جا دیتی ہے۔ خالہ جس بستر پر بیٹھی تھیں، اس کا کچھ جھٹک کر دوبارہ رکھتی ہے اور بستر کی سرسٹیں مٹاتی ہے۔

نسرین :- (بڑبڑاتی ہے) اب بستر پر بیٹھی ہیں چار روپیٹ لیتی ہیں اپنے غرارے ہیں۔ بیٹھے تک کی تیز نہیں۔ ڈاکٹر ڈرلر ایک ہاتھ میں ڈنڈا دوسرے ہاتھ میں صابن دانی اور منہ میں پائپ دہانے اذاتے ہیں نسرین چوکنکتی ہے اور چھینکتی اذاتے سے پرہیزی کا ہاتھ سے لے کر اپنے سرٹ کیس کے قریب رکھ دیتی ہے) ڈاکٹر ڈرلر بیل سے ذم کی ہرنی ایک تصویر نکال کر نسرین کی طرف بڑھاتے ہیں۔

نسرین :- (ایک دم پیچھے ہٹ کر) ارے۔ یہ میری تصویر! (بے دردی سے اپنے پیٹ پر چھینکتی ہے) ڈاکٹر ڈرلر :- (گھبرا کر) ارے! اثر نہ جانے۔ (تصویر اٹھا کر دیکھتے ہیں) اچھی تصویر ہے میں ابھی اپنے کمرے میں گیا آ رہا نظر آگئی ہیں نے کمارہ نہ جانے پیالہ بڑی اچھی تصویر ہے۔ کب بکھووائی تم نے؟

نسرین :- (بے پروائی سے) اب دیکھی آپ نے؟ چار سال سے رکھی ہے آپ کے کمرے میں۔ ڈاکٹر ڈرلر :- اچھا۔ خوب۔ میں نے بھی خیال نہیں کیا۔ (تصویر کو غور سے دیکھ کر) اس میں تم بہت یدھی لگتی ہو۔ نسرین :- (مخارج اذاتے سے) دیئے تو میں بہت میٹھی ہوں نا؟ خیر۔ (تصویر ڈاکٹر ڈرلر کے ہاتھ سے لے کر بے پروائی سے میٹل پیس پر رکھ دیتی ہے)

ڈاکٹر ڈرلر :- (تصویر اٹھا کر) ابھی رکھو۔ پھر پھول جاؤ گی۔ نسرین تصویر سرٹ کیس میں چھپک دیتی ہے اور پھر ڈریسنگ ٹیل کے قریب جاتی ہے۔ دراز میں کھول کھول کر آئینہ علم چیزیں نکال کر دیکھ کر دیتی ہے۔ پھر گداں سے پھول نکال کر ڈال دیتی ہے اور گداں اٹھا کر سرٹ کیس میں رکھ دیتی ہے۔ دوبارہ ڈریسنگ ٹیل کی طرف چھینکتی ہے اور کچھ نہ پا کر سرٹ آتی ہے)

نسرین :- (میسرے بڑبڑاتی ہے)

ڈاکٹر ڈرلر :- (بیل میں ابھی خالہ جان سے کہہ دوں گا۔)

(ڈاکٹر ڈرلر میز پر سے گلاس بیکرڈش پر لگے ہوئے پھول اٹھا کر اس میں ٹھادیتے ہیں اور اسے ڈریسنگ ٹیل پر سجا دیتے ہیں)

نسرین :- (الارمی کی طرف ہمارا) یہ دیکھ لیجئے۔ آپ کی سب چیزیں جوں کی توں ہیں

ڈاکٹر ڈرلر :- (دو ایک ساڑھیاں اٹھا کر حیرت سے) یہ ساڑھیاں۔ یہ میری ہیں

نسرین :- (بے پروائی کے ساتھ) آپ کی دلائی ہوئی ہیں نا

ڈاکٹر ڈرلر :- (دو تین ہنسن لگا دینیں) — (ہنستے ہیں)

نفسرین :- (جلی کر) خالہ جانی سے اس سلسلے میں مشورہ لیجئے گا، ان کے اپنے گھرنے کا کوئی ڈاکیومنٹ ہو سکتا ہے کہ سہ ماہی گھر کی قیام جلاتی چرے گی۔
 ڈاکٹر نور :- (سینڈ ہورک ہاں)۔ اچھا۔ تمہارا مطلب دوسری شادی۔ وہ تو سوچو گا۔ دراصل سرت کی تلاش انسان کی قسمت میں ازل سے لکھی ہے۔

نفسرین :۔ (وجہ نہ دیتے ہوئے الماری میں سے اپنے فبے ڈیاں نکالتی ہے۔ اس میں فبے کے ٹپے بھی ہیں۔ وہ ڈبے کھول کر دیکھنے لگتی ہے)

نفسرین :- یہ آپ کا دیا ہوا روج۔ اور یہ میٹگی کی انگوٹھی۔ (یہ دونوں چیزیں اٹھا کر ڈرائنگ ٹیبل پر ڈال دیتی ہے)
 ڈاکٹر نور :- (برسج اٹھا کر) روج۔ کیسا روج؟

نفسرین :- آپ نے دیا تھا مجھے

ڈاکٹر نور :- میں نے؟ کب دیا تھا؟

نفسرین :- ایک بار جب ہم نائش کی طعنہ مانتے تھے وہاں خرید اٹھا آپ نے۔ (میسے کٹ پر لگا دیا تھا۔ اسی دن تو اپنے شادی کے لیے کہا تھا۔ بھول گئے۔

ڈاکٹر نور :- (رو روچ ڈرائنگ ٹیبل پر ڈال کر) ہوں۔ نہیں تو

نفسرین :۔ (ڈبے سرٹ کیس میں رکھتے ہوئے) بعد میں سرٹ کیس میں رکھتے ہیں (ہماری طعنہ سے میٹگی پر جو انگوٹھی آپ کو دی گئی تھی۔ وہ کہاں ہے ڈاکٹر نور :- وہ ہے (انگلی میں انگوٹھی دیکھتے ہیں)

نفسرین :- تو لایئے

ڈاکٹر نور :۔ (انگوٹھی اٹھا کر دے دیتے ہیں۔ اور پھر الماری کے قریب جا کر پچھے خانے سے نفسرین کی سنہری سینڈل لیں

اٹھا لیتے ہیں)

ڈاکٹر نور :- (سادگی کے ساتھ) یہ بھولی جا رہی ہو۔ پھر چیزیں لینے کے لیے چکر لگاؤ گی۔

نفسرین :- نہیں اٹھ سہیل سے سینڈل لینے آنا تو مشکل ہے۔

ڈاکٹر نور :- (نکدہ مند ہو کر) اٹھ سہیل۔ گراؤ تم کو اچھی جا رہی ہو۔ وہاں جا کر کیا کرو گی۔ میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ وہاں کی آپ دہرا تمہارے لیے مناسب نہیں ہو گی۔

نفسرین :- (سرٹ کیس دھاگہ بند کرنے کی کوشش کرتے ہوئے) اب دہرا ہی تو سب کچھ نہیں وہاں کام کروں گی۔

نفسرین :- ہٹو۔ سرٹ کیس تم سے بند نہیں ہو گا سب چیزیں بے شکے پن سے ٹھنڈی دی ہیں۔
 (دور لگا کر سرٹ کیس بند کر دیتے ہیں)

نفسرین :- پھر وہاں غومان ہے۔

ڈاکٹر نور :- غومان؟ ان حضرات سے اور تمہارے دلوں جانے سے کیا تعلق ہے۔

نسرین :- فی الحال تو کوئی نہیں ہے، مگر دیکھئے، ماہرست کی تلاش تو انسان کے نصیب میں ازل سے ہی لگی ہے، غرضان بے چارہ! کاجک
 زمانے میں نہیں، اس کا زوش تک نہ لیتی تھی۔

ڈاکٹر نور :- ہاں وہ میرا شاگرد رہا ہے۔ کافی ڈل (Dull) لڑکا تھا۔

نسرین :- یہاں کوئی دل بھی نہیں۔ ایسے بار سے مجھے دیکتا تھا۔ جھانڈل آدمی یوں کسی کو دیکھ سکتا ہے؛
 ڈاکٹر نور :- خیر تھا۔ خیال ہے۔ مگر اگر اچانک آج وہ رہا۔

نسرین :- (دانتہ جھٹک کر) جہ آج وہاں آیا ہے۔ پھر اضر بھی کراچی میں رہنا چاہتا ہے
 ڈاکٹر نور :- (منکر منہ پر کر) نہیں یقین ہے کہ —

نسرین :- (رات کاٹ کر) میں کیا بات نہیں کہہ سکتی۔ آخر میرا کچھ نہ کچھ خیال ضرور رکھتا ہے۔ دیکھئے، یہاں وہی غما جو میری دیکھ بھری
 زندگی پر لڑتا تھا۔

ڈاکٹر نور :- (پشت پر ہاتھ باندھ کر) سنتے ہیں نسرین اٹھ کر ایک اور سوٹ کیں پگ کے نیچے سے کیسٹ کر نکالتی ہے۔ ادگنا میں
 اور بقایا چیزیں اس میں بھر دیتی ہے۔)

نسرین :- (ڈاکٹر نور کی طرف دیکھ کر بغیر) خدا جانے سے کب آجائیں گے۔ گاڑی کا وقت ہوا جا رہا ہے۔ اگلائی کی گھڑی
 دیکھتی ہے)

ڈاکٹر نور :- میں خالہ جان سے کنا بھول گیا۔ کوئی بات نہیں گھر گئے تو —
 نسرین :- (گواہ کر) خوب۔ وہ گئے تو کوئی بات نہیں۔ میں کہاں کی تاروں میں بوفور آرتن خرید کر جمع کر دوں گی۔ مجھے بھی تو رکھنا

پکانا ہے

ڈاکٹر نور :- (زرمی سے) ارے میں تمہارے بتوں پر قبضہ ٹھہرا سنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ خالہ جان کو معلوم ہوا تو کہ خواہ غما
 باتیں بنائیں گی

نسرین :- یہ سب تو معلوم ہونے کے لیے ہی ہے۔ وہ تو بڑی خوش ہوں گی۔ ان کے اپنے گھرانے میں لڑکیوں کا کافی اشاک
 ہے۔ — اچھا ان کی اپنی بیٹی زینب بھی تو ہیں، آپ کا انہیں خیال بھی بہت ہے۔ بچاری ہر خط میں آپ کے لیے
 محرمہ می کا اظہار کرتی ہے۔

ڈاکٹر نور :- (بے دھیانی سے) ان بہت محبت دار لڑکی ہے۔ بے چارہ ہی بد نصیب ہے بیوہ ہو گئی۔

نسرین :- (منہ بنا کر) یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ اب نصیب کھل جائیگا زینب بی کا۔

ڈاکٹر نور :- (اسی بے دھیانی سے) شاید — شاید

(نسرین مہری پر چڑھ کر اپنا بستر لپٹنے کی کوشش کرتی ہے)

ڈاکٹر نور :- (اس کی طرف جھپٹ کر) ارے کیا کرتی ہو کہیں جھکا دیا آجائے گا۔ ٹھیکرو میں ہاندھتا ہوں۔ (گھٹنوں
 سے خوب دبا کر بستر لپٹنے میں) دیکھ رہی ہے کہیں؟

نسرین :- (ادھر ادھر دیکھ کر) رتی کہاں ہے یہاں — آپ اپنا برڈال مے دیتے ہیں واپس مجر اودوں کی
(دوسرے بستر پر سے بھی نکیہ اٹھا کر چھپکتی ہے) یہ نکیہ بھی میرا ہے
ڈاکٹر نور :- (بستر چھوڑ کر) شوق سے۔ (نکیہ ہاتھ میں اٹھا کر) یہ نکیہ تو میرا ہے؟
نسرین :- (نکھر کر) تو میں جھوٹا دل ہی ہوں۔ یہ دو نکیے میرے بھینز کے بستر میں آئے تھے۔
ڈاکٹر نور :- (چھا رکھ دو یہ بھی) —

نسرین میری کے نیچے سے برڈال نکال کر فرش پر پھینکتی ہے۔ ڈاکٹر نور سیلفے کے ساتھ بستر اس میں جھپکتے
ہیں۔ نسرین ٹھکن سے کمر کمر جھپکتی ہوتی ہے)
ڈاکٹر نور :- (شفقت سے) لمبا سفر ہے جاؤ دوست لیٹو —
نسرین ٹھکن سے جھپکتی بستر کی طرف جاتی ہے اور لیٹ جاتی ہے۔ نکیہ : ہاں اٹھ بیٹھی ہے)
نسرین :- ذرا اپنا والا نکیہ دیکھئے گا۔

ڈاکٹر نور :- پھر بستر میں باز مٹنے سے روکنا ہے گا۔
نسرین :- آپ پارسل کر دیجئے گا۔ ویسے بھی آپ کا نکیہ جتنے بٹے کچھ وقت لگے گا اور آپ کو سخت نکیہ رکھنے کی اب عادت
نہیں رہی
ڈاکٹر نور نکیہ نکال کر نسرین کی طرف اچھال دیتے ہیں۔ نسرین ایک منٹ کو انکھیں بند کر کے چپ چاپ پڑی
رہتی ہے۔ پھر ایک دم اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے)
نسرین :- میں نے کپڑے تو بدلے ہی نہیں — میں کپڑے بدل لوں (اٹھ کر ایک نسرین کی ساڑھی اٹھا کر دوسرے دروازے
کی طرف بڑھتی ہے)

نسرین :- (ایک دم پٹ کر ڈاکٹر نور کو دیکھتے ہوئے) ارے —
ڈاکٹر نور :- کیا ہوا؟
نسرین :- میں نہیں چھوڑ سکتی۔

ڈاکٹر نور :- (پریشان ہو کر) کہنے نہیں چھوڑ سکتیں — اب تو
نسرین :- (بیکہ بھینز کے نیچے کشتی — جو آپ کے کمرے میں پڑے ہیں۔ وہ مجھے بے انتہا پسند ہیں۔
ڈاکٹر نور :- اچھا کشتی؟ واقعی بہت آرام دہ کشتی ہیں۔ میں پڑھتے ہوئے انہیں سر کے نیچے رکھنا تھا۔
(مسند ہی سے) میں ابھی لاتا ہوں۔ (بستر چھوڑ کر) اُٹھتے ہیں اور دیا پٹ جھکنے ہوئے باہر چلے جاتے ہیں)
(نسرین آہستہ آہستہ دائیں ہاتھ کے دروازے میں چلی جاتی ہے — اختر اُڑتا ہے سامان بندھا دیکھ
کوچہ گنا ہے)

اختر :- اے بھائی کہاں میں بھی؟

نسرین :- (خند سے) اُئی ہوں اختر بیاں
اختر :- اچھا۔۔۔ بھائی صاحب! کتنی ہی گئی آپ کے ساتھ بیچھاٹے کی۔۔۔ ماں گیا آپ کی طاقتوں کو کیسے دامن کرنا
افیس؟

(نسرین نے اپنی ہنسنے بیدگی سے اندازاً جانتی ہے)
اختر :- کتنے دن کا وہ دوا گم ہے؟ آپ کے بیڑ بھر جائے گا۔ خیر آپ ارکا۔ (اواس جونے کی کوشش کرتا ہے)
کل جا رہے ہیں آپ لوگ؟

نسرین :- (نسرین نے تنگی کے سامنے ہار مارنے درست کرتے ہوئے) میں اکیلی کر اچھی جا رہی ہوں۔
اختر :- اکیلے۔ (انہیں بھانپ کر) بھائی صاحب! بجز آپ کا ایک قدم تو اٹھانیں۔ خواہ عرصہ مانا ہے مت بھے
نسرین :- (خجک بٹھے ہیں) بٹھے جانے کا کیا سوال ہے۔۔۔ سدا ختم ہو گیا۔ میں تمہارے بھائی سے الگ ہو گئی ہوں
اختر :- (حیرانی سے پتیل کر) ارے۔۔۔ ج : (آپ نے۔۔۔ میرا مطلب یہ ہے جس دین کا آپ سے آپ کا تاج ٹوٹ گیا۔
روپوشان ہو کر رہتے ہیں)

نسرین :- (گھڑ کر) اختر۔۔۔ تم نے پھر انہیں کتاب کہا؟ میں نے نہیں کتنی دفع منع کیا ہے۔؟
اختر :- (بھائی۔۔۔ آپ بھی آپ؟۔۔۔) (خندتا ہے)

نسرین :- (کات کات کر) تم خوش کروں ہو رہے ہو؟۔۔۔ (نور سے اسے دیکھتی ہے)
اختر :- (اشتیاق سے اسے دیکھتے ہوئے) آپ کو کبھی احساس نہیں ہوا

نسرین :- (بے ترجمی سے) کس بات کا؟

اختر :- (کہیں اس انہم پر اپنی خوشی نہیں دھا سکتا۔۔۔ میں کل ہی اپنی جائیداد کا مندر شدہ بحیرہ فروخت کر دوں گا۔

(خواہناک نظروں سے دیکھتے ہوئے) ایسے پاس زندگی کے کتنے بہت سے پردہ گرام ہیں۔ (نسرین کے پاس آکر)
کیا آپ؟ آپ؟

نسرین :- (بات کاٹ کر) کیا تم مجھے ایک تاجہ منگوا دو گے۔۔۔ (بڑی کوشش سے ایک سون گیس اٹھا کر دوسرے
سون گیس پر رکھتی ہے)

ڈاکٹر نور :- (اند آتے ہیں) سردی میں تانکے پر جانا چھک نہیں۔ عورتیں چلی جانا (اختر کو دیکھ کر جھجکے ہیں اور اسے سخت نظروں سے
دیکھتے ہیں) (اگر سے کہو کہ ہم صاحب کا کھانا کھائے گئے ہیں پھر پھر اختر سے یہاں کھڑے ہو آنا خیال نہیں کہ یہ بھوک کی سفر کریں گی)
(اختر خوف زدہ ہو کر چلا جاتا ہے) ڈاکٹر نور کئی بستر میں جاکر ہر حال پسیتے ہیں نسرین اللاری کے پاس جا کر اپنی بات مانڈ
سایاں ترقی ہے اور پھر دوسرے خانوں میں کپڑے اٹھاتی ہے۔)

نسرین :- (دور سے) آپ کی سب چند قسین ہیں۔ یاد رکھئے گا۔ دھرتی قسین بہت کھو دیتا ہے غار جہاں کے کھرانے میں بٹھنے
کھنے کا رواج تو ہی نہیں۔ (اندھ آپ ہی اپنے کپڑے کو دیکھتے ہیں) گا۔

فسرین : دیز ہر پاؤں چھٹے تھے، مجھے عجب نہیں۔ حرام ہے مجھ پر یاں کا کھانا۔
(آنسو پڑھتی ہے)

ڈاکٹر نور : درود اڑے کے پاس جا کر) اختہ — اختہ۔
(اختہ پریشان سا انداز ہے)

ڈاکٹر نور : (خنگ لیکن تھکا ہوا انداز سے) اختہ ؟
اختہ : ہر ہلکا سا جھٹکا۔

ڈاکٹر نور : یوگیم سرین کے ساتھ کراچی تک جاؤ۔ اگر فسرین کراچی جا کر کے کٹم واپس جاؤ۔ تو فوراً واپس آ جاؤ۔ (راٹلی کے نشانی سے زور دیکر) اور اگر نہ کے تو دیں رک جاؤ۔ اور اس کا خیال رکھنا۔ سمجھ گئے؟

اختہ : (پیکو کی بھائی صاحبہ)۔
ڈاکٹر نور : (اسی انداز سے) میں خارا جان کو سمجھا دیاں گا۔ فسرین یہاں نہیں جائے گی۔ جاؤ گریج سے ٹر ملو۔
اختہ : بھائی صاحبہ
ڈاکٹر نور : جاؤ۔

(اختہ چلا جاتی ہے۔ فسرین کھڑی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نور اس کے پاس آ کر اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھتے ہیں اور پلنگ پر سے اس کا کوٹ اٹھا لیتے ہیں)

ڈاکٹر نور : کوٹ پہن لو۔ (فسرین حرکت نہیں کرتی تو وہ کوٹ اس کے کندھوں پر ڈال دیتے ہیں)

ڈاکٹر نور : (اسے تھک کر) دو میوں دی ہی ہو۔ تمہیں کچھ قسم کی نگرانی کرنا چاہیے۔ روپے میں ہر ماہ ہفتہ وار ہوں گا۔

فسرین : جو جہنم میں جاتی روپے بڑے آئے بھیجے واسیہ۔ آپ کے رشتہ اتنا تو نہ سلا کر بروچ اپنے پاس بیٹھنے دو۔ آپ کو معذور ہے کہ یہ بروچ مجھے کتنا پسند ہے

(مذہب پرانی فادر لکھ کر دتے ہوئے) بڑے آئے بھی دانا۔ اب وہ زینب اگر اس کا سنیاس کرے گی۔ خدا امانے پاؤں میں گائے گی کہ کائنات میں پھٹنے لگی۔

ڈاکٹر نور : (ریشم سے بُرائی کن لاجول دلا) — خود ہی تو چھٹک دیا بروچ۔ (بروچ اٹھا لیتے ہیں)

(نوم بڑا) دیکھو ایک بات کہوں۔ آئندہ زندگی میں اس چڑچڑے پن کو چھوڑ دینا۔ دوسروں کو ہمیشہ ہنسیت نہ بھاکو۔ (بروچ اس کے کوٹ پہ کادیتے ہیں)

ریشم سے ٹوٹے اس کی آواز آتی ہے۔ فسرین چلی کی دلچ بھینا مارا پنا تھوڑا سرٹ کیں اٹھاتی ہے اور بوجھ کے لئے ڈاکٹر نور کے کمرے میں جاتی ہے۔ ڈاکٹر نور اس کے پیچھے بڑا سرٹ کیں اور بستر اٹھا کر چلتے ہیں۔ ایسی خالی رہ جاتا ہے۔

چند لمحوں بعد فسرین اپنا سرٹ کیں اٹھائے شکل انداز آتی ہے اس سے پلنگ کو خالی مہری پر گر کر نند زور سے سکے گئے ہیں۔ اس کے چند لمحوں بعد ڈاکٹر نور خالی آتہ واپس آتے ہیں اور حیران کھڑے رہ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر نور : میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے فرمایا ہے کہ کیا ہو سکتا ہے ؟

تفسیر : یہ دوسری بات ہے ڈاکٹر نور کی بات دیکھ کر سسکیاں لینے پر آئے، انا تو تہذیب کے اختر ہوں۔ دیکھ رہا ہوں کہ میں اتنا بڑا
سوت کیس اٹھائے ہوئے ہوں۔ یہ نہیں کہہ کر اسے آکر سیٹھ لگاتے سے لے لے۔ بدترین کیس کا۔

ڈاکٹر نور : اچھا، میں اسے دانا چوں۔ تم چلو کیجیو۔

تفسیر : یہ اس طرح کیا نامہ ہے کہ آریب کا سکا جاتی۔ ذرا تہذیب نہیں۔ میرا جی پر اس سے تھپڑ مارتا۔ بدترین کیس کا
میں تو بیت ہے ہماری خالو جان کی۔ میں ایک منٹ کے لیے ایسے بدترین کیس لکھتا ہوں کہ میں نہیں رہ سکتی۔ (اٹھ جاتی ہے)

ڈاکٹر نور : چلو تم اس کے ساتھ دجاڑ اکیلے چلی جاؤ۔ (سر پر ہاتھ پھرتے ہیں)

تفسیر : (داندہ سے دوتے ہوئے) اکیلے؟ اتنے دن ہو گئے باہر گئے۔ اور اب اکیلے جاؤں (سر گھٹنوں پر رکھ کر)
میں آپ کو سیٹھ لے دیتا ہوں۔

ڈاکٹر نور : اب اگر اس کے قریب مسہری پر بیٹھ کر اسے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں اور تفسیر ان کے کندھے پر سر رکھ کر
آلوہانے لگتا ہے۔ خالو جان کی آواز باہر سے آتی ہے)

خالو جان : اے میں نے کہا وہ انڈوں کا سامن تیار ہے۔ (اندھا کریمچے پشتمے ہوئے) اللہ تو بکھر کی پاؤں پاٹ
کھلی ہے۔

(ایک دم پردہ گر جاتا ہے)

سامع

کنہیا لال کپور

جی ویلے وہ ایک کم نام جزیرے کی ماحول سے واپس آیا تھا۔ بہت آدمی رہتا تھا۔ بات تو نہیں مٹی کرے اس جزیرے کی یاد وہ کر آتی تھی۔ کچھ گروہ جزیرہ اس قابل ہی کہ تھا کہ اس کی زیارت دوبارہ کی جائے کوئی بڑا اصول سا جزیرہ تھا۔ کانہا لال کا نام "اردو واقعہ خادہ بحر اٹھالی" میں۔ وہ ایک کچھول دھند کے ساتھ اس جزیرے میں گیا تھا۔

یہ بیچ بے کو اس جزیرے میں رہنے والوں کے طور پر عجیب و غریب شبہات کے طور پر وہ چائے پانی کی بجائے سرفہر کا عرق پی پیتے تھے۔ معاف کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے کان اینٹھتے تھے۔ کرٹکے اور فیض پہنتے تھے۔ نہتے وقت روتے اور عبادت کرتے وقت نور زدہ سے پہنتے تھے۔ یہ ایسی باتیں تھیں جنہیں دلچسپ کہا جاسکتا ہے اور جنہیں سننے کے لیے لگوں کو چٹاب ہونا چاہیے تھا۔ لیکن قسمی سے جب بھی اس نے کانہا لال کا نام لیا تو کسی مجلس میں کیا اسے سخت مایوسی ہوئی۔ اولاً "کانہا لال کا نام" کانام سن کر ہی سامعین قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔ نہیں تو کسی نے ذرا چمک کر کہا۔ "بھائیو! اس کو تم وہاں کیا گئے ایک دم BORE ہو رہی کروٹے جب دیکھو کانہا لال کا نام۔ کوئی نام کی بات کرو۔"

کئی بار اس نے مرتبہ لکھ کر کانہا لال کا ذکر چھپرا لیا۔ لگوں نے تو سب سے اس میں دھپ لینے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ایک دفعہ چند شاعروں کے درمیان بیٹھے ہوئے اس نے کہا۔ "آپ شاید نہیں جانتے کہ کانہا لال کا نام نامی نام شاعر نثر میں شاعر کی کرتے ہیں۔ اور وہ بھی چند گئے تھے موضع حیات پر شاگرد بن گئے۔ جیگاڈو سب سے بڑا شاعر اس شخص کو کھانا بنا دے جس نے گیدڑ پر سب کھانا لٹکایا تھا۔ میں آپ کو گولا گولا کی ایک نظم سناتا ہوں۔ گیدڑ کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔

_____ لئے گیدڑ۔ اگر تجھے شب عزیز نہیں آتی۔ تو تو مارنا کا ٹیکہ کیرا نہیں لگا لیتا۔ اسے گیدڑ اتنے ندرست۔ مت

چلا۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ تیرا بڑا سا پیچھا چھٹ جائے

اور اسے گیدڑ۔

اور کچھ شاعر نے اس کی بات کاٹ کر کہا تھا۔ "خدا کے لیے رحم کرو ہمارے ال پر کہیں بول کرے پڑے ہو اور اس کی محنت دل ہی دل پر۔ وہ کئی تھی۔ کہ گیدڑ والی سادھی نظر وہ شاعروں کو نہ دے سکا۔

اس طرح ایک دفعہ سننے ویکوں کا ایک نسل ہی کہا۔ "آپ شاید نہیں جانتے۔ کہ کانہا لال کا نامی وکیل کو۔ "نپا۔ کنہا لال ہے۔"

جس کے لئے۔ ”دیکھ سب مجھ سے بڑے مالک اور بڑے کھانا کھانے والے ہیں۔ میں نے خدا فیصلہ کر لیا اور گواہ کر دیتے ہیں۔“

جس کے لئے.....“

اس پر بیک دیکھنے والے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”وہ آپ کو باپا“ کہا جاتا ہے جس کے معنی ہوتے ضرور

مکمل ہونے والا۔“

اس دن کے بعد اس نے سول بایا تھا کہ کسی میں کانا کانا کا ذکر نہیں کرے گا۔ بلکہ دیکھ دیکھ آدمی کے ساتھ بات چیت کرنے کی کوشش کرے گا۔ ایک دن ٹرک پر چڑھتے ہوئے ایک فیر نے اس سے پیسے کا سوال کیا۔ اس نے فیر کی جھلی پر ایک ٹکڑی کا بیک سودہ کانا کانا اس سے لیا تھا۔ دیکھتے ہوئے لڑا۔

”جانتے ہو یہ کس ملک کا بیک ہے“

”نہیں جانتا۔“

”کانا کانا کانا کانا بیک ہے جانتے ہو یہ ملک کہاں واقع ہے۔“

”نہیں جانتا۔“

”بھرا کابل میں۔ جاپان سے تین ہزار.....“

”جی ہر گز۔ لیکن غریب پروری میں تو پیسے کا سوال کیا تھا۔“

ایک دوکاندار سے صاحب خریدتے وقت اس نے کہا۔ ”کانا کانا میں صاحب نہیں ہوتا۔ دراصل میں اس کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ عام طہر پر دوک ایک سال کے بعد مانتے ہیں۔ عجیب ملک ہے۔ وہاں دوکاندار کو ”جیو“ کہتے ہیں۔ جس کے معنی ہوتے

.....“

دکاندار نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا ”اچھا تو آپ کو کرن صاحب چاہیے“

ایک بار باغ میں سیر کرتے ہوئے اس کی ملاقات ایک ضعیف آدمی سے ہوئی۔ اس نے سرجا۔ روتھ اچھلے۔ اس سے فائدہ اٹھا جاتا ہے۔ ادب بجالانے کے بعد اس نے کہا۔ ”بڑے میں آپ کی کیا عمر ہوگی۔“

”پنہو سال۔“

”کانا کانا میں کسی شخص کو ساٹھ سال کے بعد مذہ رہنے کی اجازت نہیں۔“

”کانا کانا کانا کیا ملا ہے۔“

”ملا نہیں۔ صاحب۔ ایک بڑا عجیب جزیرہ ہے۔ بھرا کابل میں جاپان سے.....“

”اچھا بڑا۔“

”لیکن کیا یہ عجیب بات نہیں کہ وہاں ساٹھ سال کے بعد کسی کو مذہ.....“

”تو کیا اسے چھ ماہ کی عمر پر چڑھا دیا جاتا ہے۔“

”جی ہاں۔“

”بڑا بے ہودہ ملک ہے“
”جی نہیں۔ بے ہودہ نہیں۔ دیکھئے نا۔ اس قانون کا یہ فائدہ ہے کہ....“
”جی رہنے دینے بزرگوں کے ساتھ ایسا بے رحمانہ سلوک!“

”سینے تو آپ لے پوری بات ترستی نہیں“
”صاف دیکھئے۔ میں ایسی فضل باتیں نہیں سنا کرتا“

”اچھا جب یہ جو بھی کوئی خاص کامیاب دربار تو اس نے ایک اور تدبیر سرچی۔ کانا بانا کانا سے وہ اپنے ساتھ چند شکاری کے لئے لایا تھا۔ وہ اس نے اپنے کمرے کے ایک کونے میں رکھ دینے سے اس کا خیال تھا کہ جب کوئی ملاقاتی اس سے ملے گا تو ضرور ان پر نظر دوڑانے کے بعد اس سے شوق برال کرے گا۔ بات چیت چلے گی۔ لیکن اس کے سب اندازے غلط ثابت ہوئے اکثر ملاقاتیوں نے ان کی جانب دیکھا تک نہیں۔ ایک آدمی نے دیکھنے کے بعد فرض کر لیا کہ کسی کمار کی سے اس نے اپنے چند خزانے عیسے خرید لیے گئے ہیں۔ ایک دن اس نے ایک ملاقاتی کی طرح ایک عیسے کی طرف مڑ دلا کر اسے مرنے سے جانتے ہوئے کہ کمار کا بھرتا ہے۔“
”کسی بندر کا معلوم ہوتا ہے“

”اورے نہیں بندر کانٹیں۔ یہ کانا بانا کانا کے شہر فلسفی۔ مومو کو کو“ کا ہے۔“
”پتہ“

”مومو کو کو بڑا پہنچا ہوا فلسفی تھا۔ اس کے خیال میں انسان کی سب سے بڑی کمزوری عورت نہیں۔ ایفون ہے۔ خود۔ مومو کو کو“
”ہر مذہب سے چھ ماٹھے ایفون کیا کرتا تھا۔ ایک دن جب اسے ایفون ملی۔ تو جانتے ہوئے اس نے کیا کیا“
”شاید خود کشی کر لی“

”نہیں خود کشی نہیں کی۔ وہ ایک پرست کا پودا بڑا اور پتلی سمیت کھا گیا۔ لیکن جب اسے....“
”اچھا یا کوئی اور بات کہو۔ یہ کس کا ذکر ہے بیٹھے“

”میں نے سب زیادہ افسوس تب ہوتا تھا جب بات چل چکے کے بعد درمیان میں رک جاتی تھی۔ مثلاً ایک انڈیا کو اس کا ایک اخبار نویس دوست اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا اس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”آپ شاید نہیں جانتے کہ کانا بانا کانا میں لوگ اخبار پڑھنے کے لیے نہیں آگے جلائے کے لیے خریدتے ہیں۔“
”لیکن وہ اخبار پڑھنے کیوں نہیں“

”ان کا خیال ہے کہ اخباروں میں سیکنڈل کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔“
”یہ تو کوئی معقول دلیل نہیں“

”اپنا اپنا خیال ہے۔ اور ہاں ہاں سب اخباروں کا نام ایک سا ہوتا ہے یعنی ”رگڑ رگڑ“ جس کے معنی ہر ٹپے....“
”کچھ بھی مرنے۔ کوئی کام کی بات کہو“

”اور ایک۔ دن تو اس کے ساتھ ایک عجیب سا نوٹیش آیا۔ اس کا ایک دوست جو پچیس تین سال کے بعد واپس آیا تھا۔ اس سے ملنے

کے لیے کیا جس نے سر ہا کہ وہ ضرور کانا کانا کے کچھ حالات تھے پر عائد ہو گا۔ اُس نے ابھی تیس ہی باغی تھی۔ کہ اُس کے دوست نے سکرانہ کیسے باغی تھے اُس کے فرائض کی۔ بڑا چٹک چٹک ہے۔ اور پیرس! پیرس! وہ دلی کا شہر ہے۔ ہر رات شب برات کا دوجہ رکتی ہے۔ اور نشت رات کو باغی تھے ایک ہر تھے ہیں۔ گلیاں بڑی پراسدور، بولی دھنوں کی گج جھلٹے جاتے ہیں۔ دیوے ایشیڈن پر پرستان کا دھوکا برتا ہے شوک اتنی سات شہادت کو ہاتھ لگے میل ہو جائیں۔ ریاست دان معاملہ فہم ہو دھکتے والی۔ شراب، آہ ظالم کو پاشراہ نہیں۔ ایک تیز چھری ہے کہ کوئی تلی جھانے ڈھیرہ ڈھیرہ

ہو دو دھکتے کے بعد جب اُس کے دوست نے پیرس کا تیکہ ختم کیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ ایسے شخص سے کانا کانا کا ذکر کرنا بے وجہ ہے کہ حماقت تھی۔

جب اُس کا ہر وہ بیکار ثابت ہوا تو وہ کھو یا کھو یا مار بیٹھنے لگا۔ اُس سے انسانوں سے وحشت سی ہونے لگی۔ یہ کیسے لوگ ہیں۔ انہیں اپنے سوا کسی چیز میں دل چسپی نہیں۔ صرف روٹی کمانے کا دھنڈلا کے دل دماغ پر سوا ہے۔ کانا کانا کا ذکر نہ کرے اپنے ساتھ کتا برا ظلم کر رہے ہیں۔ وہ جتناں ہاتھوں کے متعلق سوچتا اُس کی اداسی میں اتنا ہی اضافہ ہوتا۔

ایک دن اُس نے اپنے کو ضرورت سے زیادہ اداس پایا۔ اُس نے ایک ڈاکٹر کی دکان کو رخ کیا۔ اتفاق سے ڈاکٹر کے پاس ایک مریض بیٹھا ہوا تھا جب وہ دوائے کو نصحت ہوا تو ڈاکٹر نے کہا: "فسدہ رایتے۔ آپ کو کیا شکایت ہے؟"

"ہر وقت اداس رہتا ہوں"

"وجہ؟"

"بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔"

"شکایت کب سے ہے؟"

"جب سے کانا کانا سے لڑا ہوں"

"کانا کانا کانا۔ یہ کسی ملک کا نام ہے کیا؟"

"جی ہاں۔ ایک جزیرہ ہے۔ بحر الکاہل میں"

"جاپان سے کتنا دور ہے؟"

"کوئی تین ہزار میل"

"آپ وہاں کس سلسلے میں تشریف لے گئے تھے؟"

"ایک پھول دند کے ساتھ گیا تھا"

"آپ نین کار ہیں؟"

"مستور ہوں"

"تو خوب سیر کی؟"

"جی ہاں۔ ایک مہینہ رہا"

• ڈکیا کی دیکھا وہاں اپنے •
 • بہت کچھ بڑا عجیب جزیرہ ہے •
 • جہیں بھی کچھ بتائیے •
 • وہاں ڈاکٹر نہیں ہوتے •
 • ڈاکٹر نہیں ہوتے تو پھر تو رگ بیمار پڑتے ہیں۔ وہ علاج کس سے کراتے ہیں •
 • چنانچہ انہیں معلوم ہے کہ علاج کرنے والا کوئی نہیں۔ اس لیے وہ بیمار ہی نہیں پڑتے •
 • اچھا کرنی اور بات بتائیے •
 • وہاں کانڈی کے دوازے نہیں ہوتے •
 • تو لوگ اندر کس طرح آتے ہیں •
 • کھڑکیاں پر ہوتی ہیں •
 • اچھا اور کیا دیکھا •
 • وہاں بچے کی پیدائش پر ماتم نہایا جاتا ہے •
 • وہ کہیں •
 • وہ کہتے ہیں کہ ہر نیا کو اپنے ساتھ نئی مہبتی قلبیت •
 • بہت خوب۔ اچھا میں آپ کیلئے دو اتار کر دوں۔ باقی باتیں •
 • وہ اپنے دیکھے۔ اب اس کی ضرورت نہیں •
 • ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ آپ ہر وقت اس رہتے ہیں •
 • جس شے کی کمی ہے اس کو اس رکھی غی۔ وہ مجھے لی گئی •
 • وہ کہہ رہے تھے •

• سامع! •

ڈاکٹر اس کا منہ کھینچنے لگا۔ لیکن وہ چپکے سے آداب عرض ہے کہ کہہ دو کہ وہ سے باہر چلا گیا۔

برائے وزن بیت

امجد حسین

یہی طرح سب شمار ہوگے ایسے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی شخصیت میں کتنی چیز ہے اور اپنی شخصیت کا وزن درست رکھنے کے لئے
 وہ حسب ضرورت اور ہدف پر مختلف نظائر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بعض حضرات کو یقین ہوتا ہے کہ جب تک وہ علی قسم کی برکھیں نہ بٹھائیں
 ان کی حجاز شخصیت وزن سے خارج رہے گی۔ چنانچہ اپنی شخصیت کی اس ضرورت و شوق کو پورا کرنے کے لئے وہ اپنی برکھوں کی ایک ہلکے دست
 کرنے ہیں اس سنگ رسی پر چلتے ہیں کہ اپنی برکھیں ان کا سوا بیعت ہیں اور ان کے عمل کے ساتھ ساتھ اگر کوئی چیز اتنا تک جاسے گی تو وہ
 ہی برکھیں ہیں۔ نہایت کیسوی سے ان کی ہوش اور مخالفت کرتے ہیں انہیں کہتے ہیں انہیں کہتے ہیں ہوشور کہتے ہیں ہوشور کہتے ہیں
 ہیں۔ انہیں یہ خطہ رہتا ہے کہ اگر ان کی برکھوں کا ایک ہلکے ہوشور سے دوسرے ہوشور ہو گیا یا بیجا ہو گیا تو ان کا وزن قائم نہ رہے گا جس کی وجہ سے
 ان کی شخصیت میں کتنی چیز جاسے گی جو سلی سے دور نہیں ہو سکے گا۔ جب میں کسی کو سنا ہوا توں کی برکھیں دیکھتا ہوں تو مٹا کھے نہ بال آتا ہے
 کہ اگر کوئی خطہ شورت ہی سے ان کی برکھیں ٹوڑے یا بل صفا پڑے یا اسے تو ان کی شخصیت کا وزن کچھ ترنزل ہو جائے ایسے
 ہی میں طرح کوئی کسی کہتی ہے کہ محمد نکالے یا بٹے سے عباس سے میں سولی پھوڑے مجھے آہلی کے اس جگہ کا اعتراض کس قدر
 معلوم ہوتا ہے جس نے ایک اجلاس میں شروع کیا تھا کہ ایران میں ایک اجنبی مٹا ہے۔ صدر ایران کے پوچھنے پر اس نے اس اجنبی کی
 حرف اٹھو کیا کہ وہ ہے اجنبی اسے تو ناکا ہلائے۔ صدر ایران نے عرض کو بٹھا دیا اور ٹانٹ دیا کہ وہ شخص نکل رکن ہے ہلاک
 ایران کا وقت ضائع نہ کریں۔ لیکن وہ رکن اس کا عرض پر قائم رہا اور اس نے کہا کہ میں مان نہیں لگتا کہ یہ شخص وہ رکن ایران ہے جس کا
 نام جناب صدر نے لیا ہے۔ گزشتہ اجلاس کے آخری دفعہ اس ملک کی بڑی بڑی برکھیں تھیں لیکن اب وہ غائب ہیں۔ اور
 اس رکن کو بغیر انھوں برکھوں کے تعزیری نہیں کہ سنا۔ لہذا ایران میں اجنبی سے بہت ہنس میں مل گئی لیکن تھی گی۔
 بعض حضرات کو اپنی شخصیت کے سکتے کی وضاحت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا اور وہ اسے دور کرنے کے ہوش میں اپنی برکھوں
 کے انھوں کو وضاحت سے زیادہ بڑھا دیتے ہیں جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ نہ صرف برکھوں کا اپنا وزن غیر حقیقی ہوجاتا ہے بلکہ ان کی تمام تر
 شخصیت بھی توجہ ہوش سے خارج نظر آتی ہے۔ یہی حال ترکہ ہلاک بھی ہے۔ بعض حضرات انہیں ہوشور میں رکھنے کے
 قابل ہوتے ہیں اور ان کے ان کی شخصیت کی منفیت کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور ان کے ساتھ چھوٹی بڑی برکھیں اور ہوشور ہی ہوتا ہے انھیں
 ہوشور کا پتہ نہ معلوم ہوتا ہے۔

پہلی وہ جگہ تھی جہاں فریاد ہو سکتا ہے لیکن بعض ماہرین فن نے اسے بھی نظر انداز کیا ہے اور میرے پاس کوئی سند تو نہیں تاہم میرا خیال ہے کہ متاخر کے کبھی کبھار کوئی بھی جگہ جاتی ہے اور حسن بڑھ جاتا ہے۔ شکل کے طور پر بھی جاپانی حسن میں دیا مضرت تو پایا ہی جاتا ہے۔ لہذا اعتبار یہ خیال رہیں نے اپنی بیوی سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا، درست نہیں کہ اس متاخر سے تمہاری شخصیت کے وزن میں بیوی نے اپ لٹک کے لپ کے دو وزن ہونٹوں کے باؤ سے ہمارے کٹھے بغیر چٹک کے میری طرف بکھا اور میرے فترے کا وزن وہ بھی ساتھ ہو گیا۔ جس نے پیار بھرے انداز میں نام ہو کر کہا کہ تم سے مراد میری پیاری اہم معروف یا خاص بیوی نہیں بلکہ اہم کردہ والی کوئی یا کچھ اور صورت جوائی ظاہر و شخصیت کا سنگتہ دور کرتی ہو۔ تمہاری شخصیت تو کسی اعتبار سے موزوں بھی جا سکتی ہے۔ میں تو ان خواہش کی بات کر رہا تھا جنہیں اپنی نسوانی شخصیت کو موزوں رکھنے کے لئے بالوں کے ارکان کو ٹانے بڑھانے پڑتے ہیں، قمیصوں کی بکھرے ہوئی پٹری ہیں، لپھر کوئی گھر مرامی کرتی ہے، کوئی موٹر چلاتی ہے، کوئی ہوائی جہاز اڑاتی ہے۔ واضح رہے کہ میں یہاں نقطہ ضرورت شہری کی بات کر رہا ہوں، بیشک کی ضرورت کی بات نہیں کر رہا۔ پیشہ میں شخصیت کا کیا کام۔

کبھی آپ نے غور فرمایا کہ شخصیت کا سنگتہ دور کرنے کے لئے کیا کیا کام ہیں؟ اپنی روحانی شخصیت کو موزوں بنانے کے لئے لوگوں کو شکلوں میں سمیٹ کر دیکھنا چاہتا ہے اور وہاں سر کے بل یا ایک ٹانگ پر ساروں کو کھڑے ہو کر اپنے بالوں کو انٹوں میں تبدیل کرنا چاہتا ہے اور جب جا کے روحانی شخصیت کے مصروف کی صورت نظر آتی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ جب تک وہ ننگے دھڑکے نہ گھر میں پھرے ان کی شخصیت کا سنگتہ دور نہ ہوگا اور بیچاروں کو کوڑا لگاتے جاڑے میں بھی ننگے دھڑکے ہی رہنا پڑتا ہے۔ جسمانی شخصیت کو موزوں کرنے والوں کو دیکھیے۔ خوراک کی قلت اور ناشائے خوردنی میں ملاوٹ اور ان کی گرانی کے باوجود انہیں منہ بند رو دھ، کھلی ابادام وغیرہ کھانے پڑتے ہیں، ان کے جسم کو کھانڈے کی بے شمار کھمب فٹ مٹی اور لاتعداد تیل کی بوتلیں بھرنے پڑتی ہیں۔ وہ اپنےادھر سے سویرے کی میٹھی نیند حرام کرتے ہیں اور اس وقت جب ہم ایسے بہت الوجود خواتن لیتے ہیں وہ اپنے جسم کو بھر جڑ میں ڈالتے ہیں اور اس طرح ساروں کی امانت اور ریاض کے بعد کہیں ان کی جمالی شخصیت کا سنگتہ دور ہوتا ہے۔

میرے بے شمار بزرگ ایسی شخصیت کے اکا ہیں جس کی وجہ سے ہزاروں لوگ ان کے ماتحتوں کو چمتے ہیں اور ان ماتحتوں کو انکھوں سے لگاتے ہیں۔ ان کی طرف پیٹھ نہ لگانا سمجھتے ہیں۔ ان کے برابر بیٹنا گستاخی خیال کرتے ہیں۔ ہمارے ایک ایسے ہی عزیز کو واقعات سے ظاہر ہونے لگا کہ ان کی شخصیت میں سنگتہ وارد ہو چکا تھا ہے اور انہیں خدشہ ہو چکا کہ شاید یہ وزن ہی سے خارج ہو جائے۔ یہ ان کے لئے بجا طور پر زندگی اور موت کا سوال تھا اس لئے کہ ان کے پاس کوئی معقول الاٹمنٹ بھی نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس فرضی مسئلے کو دور کرنے کے لئے طرز کا استعمال شروع کر دیا۔ وہ صبح سویرے وطنیہ کے وقت اپنی چادر کی بگل میں اسے روشن کرنے لگے۔ اور اس دوران میں کچھ غیر معمولی آوازیں پیدا کرنے لگے۔ البتہ ایک روز ذرا مشکل پیدا ہوئی تھی جس روز ان کی ٹارچ کا بٹن اڑ گیا لیکن وہ اسی روز اس گاؤں سے کوچ کر آئے تھے جہاں ان کا ٹیڑھ تھا۔ ایک اور صاحب بھی تھے جنہیں ایسا ہی خطرات لاحق ہوا تھا وہ وہ چند ماہ کے لئے نیر میں چلے گئے تھے اور جب نیر دار ہوئے تو برقیہ قند کو کھجور کا ایک بوتل، ایک خد خود پیچھا کے آئے اور برقیہ قند سے کہا کہ بیت اللہ شریف کی زیارت کے بعد آپ کے چہرے پر زیادہ نور آگیا ہے۔ جب تک وہ پوش رہے تھے ملی ٹوٹیں گریں کا استعمال باقاعدگی سے کیا تھا۔

آپ ایسے حضرات سے آشنا ہوں گے جن کی سیاسی شخصیت کو وزن اس وقت تک درست نہیں ہوا تھا کہ وہ وزیر بن جائیں اور جب بھی ان سے وزارت چھینتی ہے تو وہ اپنی شخصیت کو مروجہ بحر سے خارج تصور کرتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جس طرح ریل گاڑی کے ٹرے کے اوپر چلتے چڑھتے سے آخر جانیں یا بسے۔ پورٹ کا اخبار بند ہو جائے یا اخبار بند نہ ہو جائے یا غبارے میں سے ہوائی جہاز۔ یہ حضرات اپنے عوام کو لکھتیں دلائے ہوئے ہیں کہ وہ سیاسی شخصیت کے ایک ہیں اور ان کی شخصیت اس وقت تک کہ وزن سے خارج رہے گی جب تک لوگ انہیں اپنے محنتی روٹ کا حقدار نہ سمجھیں گے۔ چنانچہ ان کے لئے انہی کرتے ہیں کہ اسے کوئی نام کو یہ اعتبار حاصل ہے کہ میری سیاسی شخصیت میں کتنے پیرا کرو یا اسے منوں رہے دو۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں اپنی عوامی شخصیت وزن سے خارج معلوم ہوتی ہے۔ اور اس وقت تک خارج رہتی ہے

جب تک کہ اسے قانون کے تحت نھر بند نہ کئے جائیں، ان پر عوامی استیشنوں میں داخل ہونے کی پابندی دھماکہ کی بجائے۔ لہذا کی زمان بندی نہ کی جائے۔ اگر ایمان کی شہرہ آزادی پر حملہ کیا جائے جو نسلی ان پر پتلا ہوا ان کی شخصیت کا وزن درست ہو گیا۔ میں نے یہ چاہا ہے ایسے عوامی شخصیت کے ماکول کو سکتے کے عالم میں بقیہ اور پریشان حال یا باج ہے جو محض حکام کے عدم تعاون کی وجہ سے اپنی شخصیت کو مرزوں نہیں کر پاتے کسی حضرات تو اس غم کو برسوں اپنے سینے میں دبائے رکھتے ہیں اور اس مسئلے میں خفاشی اقدامات کی بھی مشق کرتے رہے اور کچھ عرصہ زیر زمین بھی بہتے رہے جس کے عرصہ دوران وہ دن میں ایک بار کافی باؤں آئے اور فقط دو گھنٹہ کی گفتگو کے بعد فوراً رخصت ہو جاتے کوئی دوست نکلتا ۔ صاحب ایسی بندی بھی کیا ہے کچھ دیر کئے تو معذرت چاہتے اور راز دارانہ انداز میں کہتے ۔

پھر سہمی۔ ان دنوں زیر زمین ہوں "گرمیا مار زندہ صحبت باتی" ان دنوں انہوں نے اپنا تعلیم بھی بدل لیا تھا۔ سخت قسم کی موٹاپے رکھ لی تھیں، اور سر ٹھٹھا لیا تھا، ہر وقت دھوپ کا چشمہ لگاتے رکھتے تھے مطلب یہ کہ ان کی حیرت انگیز تقریریں۔ ان کو پوشیدہ سرگرمیاں اخفیہ رابطے، زیر زمین جاننے یا متعلقہ جیسے کا رد و بدل۔ تمام کی تمام کاوش ایریکاں کنی اور کسی نے یہ سکتے دور کرنے میں ان کی مدد نہ کی۔ آخر تک اگر انہوں نے اپنی شخصیت کی یہ بحر ہی ترک کر ڈالی اور کسی بحر کی تلاش میں غرق دنیا میں پیسے گئے جہاں وہ بغیر کتنے کے سکھ کی زندگی بسر کرتے ہیں ۔

یہ ایک صاحب کو جانتا ہوں جن کو بیخیال ہو کر ان کی شخصیت اس وقت مرزوں نہیں ہرگی جب تک وہ ادب میں نام نہ نہ کر دیں۔ نام کے سلسلے میں ان کی کوئی خاص شرط بھی نہ تھی۔ معزز نام پیدا ہر یا بازاری نام اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ دلچسپی فقط اس بات میں تھی کہ نام ہر سہی کیسا بھی ہو ادب میں سب چل جاتا ہے۔ وہ سید پکڑنے کے حوالے سے کہا کرتے تھے ”نام میں رکھا ہی گیا ہے۔“ ہم نے ادب میں لوگوں کو بدنام بھی پایا ہے۔ بدنام بھی ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا۔ یہ بھی تو کسی ادیب ہی نے تو کہا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ ادب میں اپنے نام کو کسی نئے قسم کے ادب سے وابستہ کر لیں۔ وہ چاہتے تھے کہ گھڑ مارا کہ مٹی کا نعل، کیہ مارا کہ پیڑی، از بخیر مارا کہ دھاک کی طرح ان کے نام کے بارے کو ادب بھی چل نکلے جو ان کے اٹھ جانے کے بعد ان کی یاد کا در اسے نام ان کے پس ماندگان کے کام آ سکے۔ بقول شخصے وہ ادب کی تخلیق میں کمی کے باعث ادب میں زیادہ اناج کا کٹاؤ ”قسم کی مسم کا آغاز کرنا چاہتے تھے“ تاکہ ادب کی دہرائیں آسکے۔ چنانچہ اسی کوشش میں انہوں نے ادب کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیا اور اس سلسلے میں انہیں ادب میں کسی ایک شکل نظر آئی۔ کہیں انہوں نے ادب کے ادب کا ڈھیر پایا۔ کہیں انہیں ادب کے ادب کی زندگی گزارا۔ اعلیٰ کہیں یا ادب ،

کچھ سہانا ادب، مجامعی ادب، تجزیہ کی ادب، مصورت ادب، اسلامی ادب، پاکستانی ادب، ادب برائے شہسوار، ادب برائے امریکہ، ادب برائے انہیں مکتی مکتی مکتی نظر آئے، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی نہ پائی جو ان کے نام کے بیچ کے شے زعفران جواد جس میں ان کے نام کا پورا گلاب ہو، جو کبھی درخت بن سکے جس کی ٹھنڈی سی چھاؤں میں بیٹھ کر ان کے دل سے نیرے ادبی چرچہ کی گلی نکلیں۔ بالآخر وہ اپنی شخصیت کا مسکنہ دور کرنے کے لئے ادب کی نئی قسم کی طرح تلاش میں کیا یہ ہر گز جسے ادب برائے ادب سے موسوم کیا گیا جو مناسب کثرت استعمال سے برائے نام ادب بن گئی۔ اسی ادبی قسم کی رعایت سے وہ اپنے ادبی مکتے میں پہلے برائے نام ادب مشہور ہوئے اور برائے نام ادب دماغ کے لئے۔ دروغ برگشتہ راوی ان کی شخصیت کی بڑی کافی رواج پا چکی ہے اور ان کا نام نامی تاریخی ناول مارکر ادب کے مفسوب ہے جو فی زمانہ مسکنہ بند ادب تصور ہوتا ہے اور کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے۔

ایسے لوگ جن کی شخصیت غیر موزوں ہوتی ہے آپ کو زندگی کے ہر شعبہ میں مل جائیں گے۔ سرکاری افسرانہی حاکمانہ شخصیت کو اکثر اپنی شخصیت پر سے خدو جی پاتے ہیں۔ بعض افسروں کا خیال ہے کہ جرنی ان کے اومان کے ماتحتوں کا درمیانی فاصلہ کم ہوا ان کی شخصیت کا وزن بگڑنے لگا۔ جن جنوں یہ فاصلہ بڑھے گا ان کی شخصیت کا وزن درست ہوتا جائیگا۔ مجھے ایک افسر کے ملاقات کا موقع ملا۔ بقول ان کے انہوں نے اوزان حقیقی اختیار کر رکھے ہیں اور اس معاملے میں کسی قسم کے تصرف کے قائل نہیں۔ انہوں نے مسکنہ کی برکت سے نجات پانے کے لئے چند اصول وضع کر رکھے ہیں جن پر عمل کرنے سے وزن میں خلل آنے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ میں عادتاً سب ماتحتوں سے انگریزی میں بات چیت کرتا ہوں۔ چڑا سی سے اردو میں گفتگو کرتا ہوں اور گھر پر ہی کر پنجابی بولتا ہوں۔ دفتر کے اوقات میں مسکمانا اخذہ پیشانی سے پیش آتا، ایسے زحاف استعمال نہیں کرتا۔ ہمیشہ کھرج میں لوتا ہوں اور مدہم سروں میں بات کرتا ہوں تاکہ ماتحت پھولی پٹ نہ سمجھ سکے۔ میں نے اپنی میز اور بیرونی دروازے کا فاصلہ زیادہ کر رکھا ہے تاکہ ملاقاتی کو اپنے اور میرے درمیانی فاصلہ کا احساس رہے اور میرنگ آتے آتے اس فاصلہ سے آگاہ ہو جائے اور اس باضیہ بھی ہو جائے۔ جب کوئی میرے کمرے

میں داخل ہوتا ہے میں بغیر نظریں ملائے کہتا ہوں۔ چلے آؤ۔ جوں؟۔ اوں۔۔۔ تم جاسکتے ہو۔۔۔ یہ فراخ دلانہ گفتگو کا نمونہ ہے۔ ورنہ خاموشی داخل ماتحت کے لئے اشارے کا کام دیتی ہے۔ یہ بھی اسی صاحب کا اہول ہے کہ ماتحت کے روبرو مسکراؤ مبادا وہ کچھ افسر مہربان ہو گیا ہے۔ ان کے خیال میں ایک بار سو مسکرا دینے سے ایسا مسکنہ پڑتا ہے جو سال بھر کے لئے پیشانی پر ٹنگیں ڈالنے سے بھی دور نہیں ہوتا۔ ان کے استعمال شدہ نسخے کے مطابق حاکمانہ شخصیت کے وزن کے بنیادی ارکان میں گردن کا تناؤ بھی ہے۔ گردن کی سختی کا یہ عالم ہونا چاہئے کہ وہ کبھی دیکھیں باتیں نہ کرے نہ دیکھیں سوائیں باتیں دیکھنے کی ضرورت ہو تو پورے جسم کو گھمایا جائے تاکہ گردن میں جھک ہوئے کا شائبہ نہ ہو۔ وہ فرمایا کرتے ہیں کہ حاکمانہ شخصیت کے اوزان کو مقصد سے پاک رکھنا ہر جگہ کون کا کام ہے۔

کاروباری لوگوں کو اپنی شخصیت کا مسکنہ دور کرنے کے لئے پھر ایسا مین دین کرنا پڑتا ہے جسے ٹر پینڈوں نے بلیک مارکٹ کا نام دیا ہے حالانکہ نام کا تمام کاروبار اب دن کے وقت ہوتا ہے۔ یہ کاروباری لوگ اپنے اوزان میں بڑے بڑے اچھوتے زحاف استعمال کرتے ہیں۔ مجھے ایک صاحب کے بارے میں علم ہے جو دفتر سے کپڑا خرید کر لاتے

اور آئے ہیں اپنی بیوی کے ساتھ وہی کپڑا ایک آنر فی روپیہ کے منافع پر فروخت کر دیتے۔ بیوی اپنے بیٹے کو وہی کپڑا دے دے تو آنر فی روپیہ کے منافع پر بیچ دیتی۔ بیٹا وہی کپڑا اپنی بیوی کو چار آنر فی روپیہ کے منافع پر دے دیتا۔ گھنٹہ بھر کے بعد وہی صاحب جو شر سے یہ کپڑا خرید کر لے جاتا ہے وہی ہو کر اپنے بیٹے کو دے دیتا۔ بیٹے کو دے کر چار آنر فی روپیہ کے منافع پر بیچ دیتا۔ وہ آنر آئے تو آنر فی روپیہ کے منافع پر اپنے سر کے آنر فروخت کر دیتی۔ مکان میں جب وہ کپڑا فروخت کرنے لگتے تو غائبین دیتے کہ ایک روپیہ آنر آئے تو گھر کی خرید و علف اٹھانے سے کون مرعوب نہ ہوتا اور وہیں آنے کی گز کا منافع دے کر کپڑا خریدے جاتا۔

کیا یاد آیا۔۔۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو لوگوں کی شخصیتوں کے اوصاف و عادت کرتے ہیں اور ان کے ذہنی سکے دے دیتے ہیں۔ ان غیبی سکنتوں کی نشان دہی وہ ایسے ہی کرتے ہیں جیسے کان میں سے میل نکالنے والا تھیلی پر میل کی گولی کا دوسرا لوگوں کو مل جاتا ہے۔ ذہنی سکے دے کر کرنے والا میری شخصیت کا وزن درست کرنے کے درپے ہے حقائق میں اس سے بار بار کہہ چکا ہوں کہ یہی کوئی شخصیت ہی نہیں، اس کا وزن کیا معنی؟

توشب آفریدی چراغ آفریدیم!

(ایک فینسٹی)

سلام (مچھلی شہری)

(ایک ایسی موسیقی سے غایکہ کا آواز ہوتا ہے جس سے عالم حریت کی نایندگی جھٹکتی ہے۔
پس منظر میں واضح اور گہرے قدموں کی آہٹ)

انسان : (گوا چوٹ کر) :
نقاب فکر و خیال اٹھا رہا ہے کون؟
بزرگم خاص میری ہمت آور رہا ہے کون؟

(موسیقی کی ایک پڑیلا لہریزی سے ابھر کر فوراً ہی ختم ہو جاتی ہے)

انسان : (حیرت گراشتیاق کے ساتھ) :-

کس نے پھیرا مرے احساس میں یہ ساز حیات ،
فکر کو کس نے کیا مائل پر واز حیات ؟
(پھر ایک متلاطم موسیقی جو سمندر کی موجوں کی طرح ابھرتی ہے اور فوراً ڈوب بھی جاتی ہے)
کس نے محسوس کی میرے دل سوزاں کی ترنم ،
کس سمندر کو مری پیاس کا احساس نہوا؟
وہی تخلیق کا بندہ ، وہی عزم پر واز
کون یہ میرے خیالات کا عکاس نہوا؟
(اب قدموں کی آہٹ قریب تر ہو جاتی ہے)

کچھ پریشان ہے الجھا سہے، افسردہ ہے،
ذرا مہم بھی تو نہیں اس کا سبب اے انساں!
تنگی و امن افکار کے با وصف تجھے،
اس قدر خواہش پرواز ہے اب لے انساں!

نیچر:

انسان : (بے تاب ہو کر) :-

کون ہے — کون ہے — کس روح کی آواز ہے یہ؟
کون ہے — کون مرانا مستہ پرواز ہے یہ؟
کون ہے — کون ہے — کس روح کی آواز ہے یہ؟

نیچر:

باد و ایں شعلہ آواز ہوں میں،
خالق جذبہ پرواز ہوں میں،
اے میرے شیشہ تخلیق کے عکس قیاب
ہمہ فہم ہوں، ہمہ ساز ہوں میں !!!

انسان :

اور اس ساز کو آہنگ دیا ہے میں نے،
تجھ کو انداز دیا، ڈھنگ دیا ہے میں نے،
اپنے سانسوں کے حیریں تار کبھی نذر کئے
کبھی انگشت کی مضرب سے جھیرا ہے تجھے
جب بھی اُٹھی ہے میرے دل میں کوئی موج بہا
خود ہی توڑا ہے تجھے خود ہی بنایا ہے تجھے۔
دامن ارض پر پُرجز تیں اہل، کیا ہوتا؟
میں نہ ہوتا تو تو راہِ ازل کیسا ہوتا

نیچر:

جہاں رازِ بک آب و گلِ آفریدم،
تو ایران و تاتار و زنگِ آفریدی
تیرا آئینہ دیدی نہ سالِ چمن را
قفسِ ساختی طائرِ نغمہ زن را
تو شبِ آفریدی، پیراغِ آفریدم
سفالِ آفریدی، ایاغِ آفریدم
بیابان و کسار و راغِ آفریدی
خیابان و گلزار و باغِ آفریدم

انسان :

من آفم کہ از رنگ، آئینہ سازم
 من بدم کہ از زہر، توشیشہ سازم
 باش اسے خود سرد، خود بین و خود آرا انسان
 مادر گیتی کی ہے آنکھ کا تارا انسان
 تیرے تیرا تیرا لہجہ، تیری آواز ہے اور
 یہ تو کسے کہ میرے ہاتھ میں اباز ہے اور
 تیرے نغمے کا تصور تیرا یہ جن خیال
 کچھ نہ سوتا نہ اگر چھیرتے ہم اپنا رباب
 اے نغماتی اندل! خالق بزم عالم
 تیرے بر لب کو بھی درکار تھی میری مضراب
 آن سنا گیت ہی رہتا ترا حسن تخلیق
 میں اگر اس کو نہ دیتا کوئی رنگ بیتاب
 تجھ کو معلوم ہے، دنیا بھی تخیل تھی مرا
 اس تخیل کو دیا رنگ حقیقت میں نے
 تجھ کو معلوم ہے، پایند اہل ہے دنیا
 میرے نزدیک تو جاوید کنول ہے دنیا
 ہم اسے آج بھی ویرانہ بنا سکتے ہیں
 اور ویرانے کو ہم پھر سے سما سکتے ہیں
 خیر دیکھیں گے ترا غم، ترا جوش عمل
 عزم آدم ہی سے روشن ہے بے شکاں مشکل
 (پس منظر سے) ذرا فاصلہ کے ساتھ :-

اپنی مومن مست فؤل پہ اتنا نہ مچل

(اور بھی دور سے جاتے جاتے)

جا بھائیں گے نہیں ہم تے خوابوں کا کنول

(اسی وقت روح ارتقا کا نغمہ اُبھرتا ہے)

نغمہ

مرے پھول کی مک لے، مرے ساز کی صدا سن

جو ازل سے نغمہ زن ہے، ہوں وہ روح ارتقا سن

نیچر

انسان (زمی سے)

نیچر

انسان

نیچر

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

انسان

تو ہی دُور نو کا رہبر، تو ہی اس کا قائل ہے ؟
 تیری منہ نہیں میں آگے اُڑا بیڑہ سوچ گیا ہے ؟
 میری شمع کی خیالے مرے دل کی یہ دُعا سن،
 میرے پھول کی ہلکے، مرے ساز کی صدا سن
 جو ازل سے نغمہ زن ہے، ہوں وہ روح ارتقا سن
 (نغمہ ختم کرتے ہی روح ارتقا، ہم کلام ہوتی ہے)

روح ارتقا :

تو خود ندائے وقت ہے اے آدمِ حسین !
 جو کچھ سنا ہے تو نے نہ کر اس کا کچھ لیتیں
 تو خود حسین، تیرے خیالات بھی حسین
 انکار بھی لطیف ہیں، جذبات بھی حسین
 ہے تیرے دم سے رشکِ ارمِ محفلِ زمیں
 تو خود ندائے وقت ہے اے آدمِ حسین
 (وہی نغمہ میں منظر سے پھر اُبھرتا ہے)

نغمہ

میرے پھول کی ہلکے، مرے ساز کی صدا سن
 جو ازل سے نغمہ زن ہے، ہوں وہ روح ارتقا سن
 میرے شمع کی خیالے مرے دل کی یہ دُعا سن
 مرے پھول کی ہلکے، مرے ساز کی صدا سن
 (نغمہ ختم ہوتا ہے)

روح ارتقا :

(انسان سے پھر ہم کلام ہوتی ہے) :-
 کیوں ہو غرقِ فکر، کہو کیا ملال ہے ؟
 آواز جو سنی تھی، اُسی کا خیال ہے
 تعجب ہے کہ تم، اور فکرِ مستقبل میں ڈوبے ہو
 ملاطم سے اُبھر کر دامنِ ساحل میں ڈوبے ہو
 میں یہ سوچتا ہوں (جملہ پورا نہیں کرتا)
 انسان :
 روح ارتقا : (جملہ پورا کرتی ہے) :- کہ فردوس گیتی
 اُسی طرح ویراں کہیں ہو نہ جائے

یہ تلمذِ آدام کا تابندہ حاصل
 افق کے دھندلکے میں پھر کھونہ جائے
 (پھر عرصہ افزا اور نرم ہنسی کے)
 نظر تو اٹھاؤ، مری سمت دیکھو،
 مری روئے تاباں کے اس آئینے میں
 تم اپنی حقیقت کو پہچان لو گے،
 مری بات مانو، مجھے اپنا جانو،
 تو پھر اپنی عظمت کو بھی جان لو گے!!
 بتا ارتقا! تیرا پیغام کیا ہے؟
 یہی — یعنی تو عہدِ نو کا خدا ہے!
 (پھر دُک کر دُکار کے ساتھ)

انسان
 روح ارتقا:

تم ہمیشہ ہی قدرت سے لڑتے رہے،
 فتح پاتے رہے
 آگے بڑھتے رہے
 تم نے افلاک کی چال کو ٹوک کر
 جائزہ انجم و مہر و مد کا لیا
 صبح کو یہ بتایا کہ وہ صبح ہے
 رات کو یہ بتایا کہ وہ رات ہے
 زلزلے آئے — (ذرا سا رکتی ہے اور پھر)
 اور یہ زمیں ہل گئی،
 آسمان کا نپ اٹھا
 بام و درخود سے سمار ہونے لگے
 نوکِ عجبر و لاچار ہونے لگے
 کھیتیاں،
 وادیاں سب لرزنے لگیں،
 پیڑ اپنی جڑوں سے اکھڑنے لگے
 اور کھسار آپس میں مکر لگے —

اور بیتے میں چھٹا جو آتش فشاں
 بجلیاں ڈگمگائیں،
 بادلوں کی گرنے لاپنے سی لگی
 اور سمندر سے لاوے اُبلنے لگے
 سیل آتش میں انسان بہنے لگے
 کوہ و صحرا تو کیا،
 مسکراتے ہوئے باغ جلنے لگے

(ذرا روک کر)

یہ تمھاری بھٹی ہمت کہ ہر حال میں
 ہر مصیبت پر قم فتح پاتے رہے

(ذرا روک کر)

دل میں تخلیق کی موج اگر آگئی
 تم نے دھرتی کے پیچھے سجائے محل
 اور چٹانوں کے مغرور سینوں میں بھی
 قم نے تعمیرِ یوان و مندر کئے
 سرنگوں قم نے کسار کو بھی کیا،
 قلعوں کی بغاوت پر فارغ ہوئے
 اور صحرا کو کاشن بداراں کیا
 موج لائے بہاراں کو قصاں کیا
 قحط آیا تو قم سینہ ارض پر
 کھیتوں کی بہار جواں بن گئے۔
 قم و بادوں پہ بھی فتح پاتے رہے
 اور تیمار دار جہاں بن گئے
 قم بہر حال آنکے ہی بڑھتے رہے،
 ہر مصیبت کے طوفان میں گلے رہے
 جبرِ قدرت کو نیچا دکھاتے رہے

(ذرا ٹوک کر نرمی سے)
آج دل میں یہ کیا موجِ علم آگئی،
کیوں اچانک یہ افسردگی چھا گئی؟

انسان: (فلسفیانہ عزم کے ساتھ ڈوک ڈوک کر)۔
میں فسرودہ نہیں
میں تو جو ششِ تجسس سے بے تاب ہوں
میرے دل میں ہے اک شعلہٴ جستجو
اب ستاروں کی دنیا کی ہے آرزو
آج مجھ میں نیا جو ششِ پرواز ہے
جاننا چاہتا ہوں کہ ہے "چاند" کیا
کہکشاں کیا ہے
اور اس کا کیا راز ہے؟

میں فسرودہ نہیں
ہاں مگر کچھ کمی خود میں پاتا ہوں میں
سوچتا ہوں کہ وہ کون سا راز ہے
جو ابھی بس میں انسان کے آیا نہیں
نکھر مضطرب ہے پرواز کرنے کو پھر
فاش قدرت کا ہر راز کرنے کو پھر

روح ارتقا: (چلتے ہوئے)۔۔

آمرے ساتھ آ،
آدم مضطرب! آمرے ساتھ آ
قابلِ فخر ہے تیرا یہ حوصلہ
آمرے ساتھ آ

(آواز ڈوب جاتی ہے منظر ختم ہوتا ہے)

دوسری کڑی

شیطان کا کورس

شیطان :

اے اے — اے

میں شیطان ہوں

مردوئے نسلِ انساں ہوں

میں شیطان ہوں

اے اے — اے

اے اے — اے

لقب شیطان ہے میرا

فریبِ ایمان ہے میرا

گنہِ ایتنان ہے میرا

میں وہوں گا اس کو پھر دھوکہ

اے اے — اے

اے اے — اے

میں شیطان ہوں

مردوئے نسلِ انساں ہوں

میں شیطان ہوں

ابھی معصوم ہے آدم

وہی بچپن کا ہے عالم

میں شعلہ ہوں، وہ ہے شبنم

میں شیطان ہوں

مردوئے نسلِ انساں ہوں

میں شیطان ہوں

۱۱ — ۱۱

۱۱ — ۱۱

(شیطان کے کہنے ہی فوراً روح ارتقا قبول پڑتی ہے)

روح ارتقاء: دیکھنا، آج نہ انسان کو سمجھنا مصوم
شیطان: (خاص تیرے): یہ تو ہو جائے گا کچھ روز میں تم کو معلوم
(ذرا روک کر)

میں اس کو زبورِ مخرب سے سجاؤں گا
اور اس کی قوت و عظمت کے گیت گاؤں گا
میں آج نامِ خدا خود زباں پہ لاؤں گا،
اور اس کو اس کے "خداوند" سے ڈراؤں گا
یہ جوش و عزم کی آواز روک دوں اس کی
میں چاہتا ہوں کہ پرواز روک دوں اس کی
(پھر انسان کے قدموں کی آہٹ سن کر)
اور ہر ہی آنکھ دیکھو وہ پیکرِ خاکی

(روح ارتقاء شیطان کو جلدی جوابے تی ہوئی انسان کی طرف مڑتی ہے)

روح ارتقاء: (شیطان سے): اسی کے دم سے ہے فردوس، بزمِ دنیا کی
روح ارتقاء: (انسان سے): تمہارے دم سے ہے فردوس، بزمِ دنیا کی
انسان: (گویا چونک کر): کون تم — ارتقاء!

تم کہاں کھینچ لائیں مجھے

وہی میرا اس جگہ سخت بے چین ہے

پاسکو گئے یہاں اپنے گیتوں کی لئے

(ذرا سا وقفہ پھر ٹینک کی آواز ابھرتی ہے)

دیکھو یہ ٹینک میں،

خود تمہاری ہی قوت کا اک معجزہ

(ہوائی جہاز کی آواز)

اور دیکھو یہ ببار پٹیا رے ہیں

خود تمہارا ہی اک جوہرِ غنیمت!

روح ارتقاء:

(راکٹوں کی آواز)

اور راکٹیں یہ !

اب تو بارود کرو،

تم ہی عالم کی کشتی کے ہونا خدا !

(آوازیں بند ہو جاتی ہیں)

انسان : (جوش میں) : فہم گل بارودل شعلہ فشان بخشا ہے

واقعی تم نے مجھے عزمِ جواں بخشا ہے

روح گیتی : (بڑی نرمی سے) : روحِ تخریب کی ساتھی ہے یہ ۔ اک دھوکا ہے

انسان : (اپنے آپ) : کس کی آواز ہے یہ دل جو مرادھڑکا ہے ؟

روح گیتی : (ذرا پاس آکر) : روح گیتی ہوں میں تیری ہی امیدوں کا جہاں

روح ارتقاء : (چلتے ہوئے) : اس کی باتوں میں نہ آسے انسان !

میں حقیقت ہوں ترا عزمِ جواں !

روح گیتی : (اور بھی آگے قدم بڑھا کر) :-

تو جو عاقل ہے تو دیوانہ کسے کہتے ہیں ؟

تو حقیقت ہے تو افسانہ کسے کہتے ہیں ؟

(پھر انسان سے منات کے ساتھ)

میرے پاس آؤ، دکھاؤں تمہیں تصویریں چند،

کن اندھیروں میں ہیں ڈوبی ہوئی تصویریں چند،

تم نے جب ہوش سنبھالا تو نہ میں دیراں تھی

(ذراڑک کر)

ٹھیک ہے تم نے اُسے جُمن دیا، رنگ دیا

بڑی خاموش سی تھی، چُپ سی تھی تاہید زمیں

تم نے بے شک اسے اک ساز دیا چنگ دیا

اور وہ دُور بھی آئے کہ زمیں مسکا تھی،

(ذراڑک کر)

تم نے بجنے کا اسے طور دیا، ڈھنگ دیا۔

تم نے جب پیار سے گلشن پہ اٹھائیں نظریں،

(ذراڑک کر)

پھر اُن مسکانے لگے —

تم نے جب پیار سے کھیتوں کی بہاریں دیکھیں،

کھیت خود گانے لگے —
(اس وقت ایک نغمہ ابھرتا ہے)

نغمہ

موس کا تے کھیتوں میں ہے دھرتی کی مسکان،
دیکھ کے یہ گیہوں کی بالیں تارے بھی حیران،
موس کا تے کھیتوں میں ہے دھرتی کی مسکان۔
گھن گھن کرتے بادل آئیں، پھم پھم بولے پائل
ہو جاتا ہے ان کھیتوں میں پت جھڑ کا من گھائل
خوش ہو کر آکاش بھی دیکھے انسانوں کی شان
نغمہ مسکاتے کھیتوں میں ہے دھرتی کی مسکان،
دیکھ کے یہ گیہوں کی بالیں تارے بھی حیران
(کورس ڈوب جاتا ہے روح گیتی کی آواز پھر ابھرتی ہے)

مرد و عورت مل کر،

عورت :

مرد :

مرد و عورت مل کر،

روح گیتی : (بات جاری رکھتے ہوئے) :-

تم نے جب رقص کی دیوی کی طرف دیکھا
پائلیں گونج اُٹھیں —

(رقص کا تاثر)

بات جب عظمتِ تعمیر کی سوچی تم نے،
”تاج“ ابھرنے لگے،

”ابرام“ فلک بوس ہوئے،

”ایلو را“ اور ”اجنتا“ کی بھی تشکیل ہوئی۔

(ذرا روک کر)

جلوہِ حسنِ خود کے یہ جسیں تر پہلو،

یہ جسیں پوششِ ضیا بار، موعظہ پہلو

نازشِ غفلت اور اک میں تم ناز کرو

ہاں، مگر عہدِ جنوں کا نہ اب آغاز کرو

(پھر پیار سے)

اس طرح فطرتِ چالاک کی باتیں نہ کرو

یہ وہیں خوب ہے افلاک کی باتیں نہ کرو

(رُک جاتی ہے)
صوت و گلش! تو مرا عزمِ حین ساز نہ چھین
سر پھرے! نہ ہر گیتی کی یہ آواز نہ چھین
روح ارتقا: (اچانک پاس آکر): تم میری بات مانو! میں روح ارتقا ہوں
روح گیتی: (وقار سے): میں مادرِ زمیں کی آواز دلِ مُربا ہوں۔
ارتقا: پھر کہہ رہی ہوں انسان! میں روح ارتقا ہوں
تم میری بات مانو۔

روح گیتی: (اب زہی سے): اے جانِ ہر دو عالم!
تم میری بات مانو،
ارتقا: (اصرار کرتی ہوئی): تم میری بات مانو،
تم میری بات مانو۔
روح ارتقا: (ذرا رُک کر حوصلہ دلاتے ہوئے):

چلو اب چاند کی دنیا کی ہم تم سیر کر آئیں
انسان: (جوش میں): ہمارے راکٹوں کو حکم دو، گزروش میں آجائیں۔
اگر قدرت بھی حائل ہو تو ہم غلطیوں کیوں لائیں
نشانِ عظمتِ انسانِ فلک والوں میں لہرائیں
(س وقت ایک راکٹ فضا میں اڑتا ہے)

(وقفہ، جسے انتشار کی نمائندگی کرنے والے ساز سے پورا کیا جائے)

تیسری کڑی

(ادھر دھرتی پر پہلا مکالمہ ابھرتا ہے)

(ایک بچہ رورہی ہے)

سائینس وال۔ (اپنی بیوی سے): بات کیا ہے؟
اسے کیوں نیند نہیں آتی ہے؟

بیوی : یہ تو چپ کرنے پہ کچھ اور بھی چلتی ہے
 بچی : (روندھی اکاڑیں) : ماں مجھے لوریاں دو

چاند کا اک گیت سناؤ
 روز کی طرح اسے

پھر ذرا دھرتی پہ بلاؤ
 اور پھر مجھ سے کہو

”تم بھی اک چاند ہو“

اب سو جاؤ — ”

ماں مجھے لوریاں دو

چاند کا اک گیت سناؤ — !

بیوی : (میاں سے) : بڑے سائنس کے ماہر ہو تم ہی اس کو سلاؤ !
 سائنس داں : (بیٹی کو چپ کراتے ہوئے) :

چاند اب راز نہیں رہ سکتا

چاند اب راز نہیں رہ سکتا

وہ بھی دنیا ہے ’ ذرا صبح تو ہو لینے دو

ہم تمہیں سیر کو لے جائیں گے

اور کیا کچھ ہے وہاں چاند میں ’

دکھائیں گے — !

چاند کی سیر کو لے جائیں گے

ہاں، مگر پہلے ذرا سو جاؤ

اور ہم چاند کے گیت

اب نہ تمبھی گائیں گے

چُپ رہو، یوں نہ مرا سر کھاؤ

خوب بچی کو قسلی تو نہیں دے پاتے

اور اتنی بڑی دنیا کو یہ سمجھاتے ہیں

” چاند اب راز نہیں رہ سکتا ؟“

(وقفہ ، جسے کسی مناسب سار سے پورا کیا جائے ، پھر دوسرا مکالمہ ابھرتا ہے)

بچی :

سائنس داں :

بچی :

سائنس داں : (جھلا کر)

بیوی :

محبوبہ :

تم تو گل بارِ فضاؤں میں کہا کرتے تھے
زندگی سازِ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
تم تو ان زلفوں کی چھاؤں میں کہا کرتے تھے
زندگی چاند سی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں
(ذرا رک کر)

شاعر :

چاند تو آج بھی روشن ہے سناؤ اگیت
میں ہمہ ساز ہوں تم بھوم کے گاؤ اگیت
جانے کیا بات ہے گیس دور کی آمد سے کہ اب
حسن و الفت کے وہ انداز نہیں ملتے ہیں
گیت ملتے ہیں گٹھنوں تریں ، انیز تریں ،
ایسے گیتوں سے مرے ساز نہیں ملتے ہیں
(ٹھنڈی سانس بھر کر)

ساتھ شاعر کا حسیں چاند نے بھی چھوڑ دیا
عہدِ سانس نے رومان کا دل توڑ دیا
(وقفے کی سبب قافی کے بعد عہدِ سانس کا)

بیوی : (پھیرتے ہوئے) :

فلسفی : (انداز سے) :

بیوی :

فلسفی :

بیوی :

فلسفی :

اک شان بے نیازی سے گئے نا پھر حضور !
"عالمِ تمام حلقہٴ دائمِ خیال ہے ۔!!"
ذہنِ لطیف میں کوئی نازک سوال ہے ؟
دیکھا ، جناب آپ نے سانس کا شباب ؟
آنے کو ہے جہان میں اک تازہ انقلاب ؟
بندہ نواز تھوڑی وضاحت تو کیجئے
مضطرب ہے روح ، جائزہ اس کا بھی لیجئے
(پھر مفکرانہ انداز میں)

اس عہدِ ارتقائی میں اتنا رہے خیال ،
یہ امتیازِ وقت بھی ہے ایک نیک نال
ایسا بھی ایک دور سکون بخش آئے گا
جب عقلِ جیت جائے گی ، دل مکھڑے گا

(دھرتی کے مناظر غم ہوتے ہیں، اور فضا میں اُسی راکٹ کا شور بھرا ہوتا ہے)

پہچانتی کڑی

انسان: (مصنوعی سیارے پر اُڑے اُڑے اچانک گہرا کر)
 جادو ماہ یہی ہے، میں کہوں کیسے یقین؟
 جادو ماہ یہی ہے، میں کہوں کیسے یقین؟
 یہ تو اک عالم ویران کے سوا کچھ بھی نہیں،
 نہ وہ محفل، نہ وہ نغمے، نہ وہ گلہائے حسیں
 آخرش، تم کہاں لے آئی ہو؟
 یاد آتی ہے مجھے وہ مری جنت، وہ زمیں
 تم تو دیوانی ہو، سوداوی ہو
 آخرش تم کہاں لے آئی ہو؟
 یوں ہی بڑھتے رہو، بڑھتے جاؤ
 ابھی آجاتی ہے، ہاں، چاند کی محفل ہے قریب

روح ارتقا:

شیطان: (پس منظر سے براہِ باز بلند)

نہیں، یہ جائے ادب سے انسان!
 جس کا تو عکس ہے وہ جلوہ کامل ہے قریب
 اس کی باتوں میں نہ آئے آدم!
 میں یہ کہتی ہوں کہ اب شوق کی منزل ہے قریب
 انسان: (روح ارتقا سے): چھوڑ دو، چھوڑ دو، میں لوٹ کے جاتا ہوں وہیں،
 وہ مراخلہ بریں، ہاں وہ مراخلہ بریں
 وہ زمیں، ہائے وہ گلہا رزیں — !!

ارتقا:

روح ارتقا: (سوالیہ انداز میں): یہ تیرے حوصلہ و عزم کی توہین نہیں؟
 انسان:
 اپنی دھرتی سے محبت تو کوئی جرم نہیں
 اس محبت سے تو پرواز نہیں روک سکتی!
 روح ارتقا: (ترنم کے ساتھ) تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا

تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
روح گیتی: (قریب آکر) یہی میں بھی کہتی تھی اسے جانِ عالم!
ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں
انہیں بھی سنارو، انہیں بھی کھلاؤ
زمیں پر ابھی گستاخان اور بھی ہیں۔
مرے واسطے، مری دنیا میں شاید
ابھی منتظر کارواں اور بھی ہیں۔
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
روح گیتی:
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

(فضائیں راکٹ کا اڑنا چانک بند ہو جاتا ہے۔۔۔ ادھر دھرتی پر پھر پرندوں اور
سمندر کی لہروں کی آوازیں، پس منظر میں ایک نغمے کی دھن دور سے سنائی دیتی ہے،
گویا ذرا فاصلے پر ایک جشن خیر مقدم ہو رہا ہو۔ اور پھر کیا ایک نغمہ ابھرتا ہے)

نغمہ

ملی جلی آوازیں:
اختر و انجم بدوش،
رقص کرو، رقص کرو
کا کہشاں درکنار
لالہ و گل! رنگ بھرو
کون ہوا جلوہ بار
ایک آواز:
پھر اڑتا ہوا دھرتی کا نشان آتا ہے
دیکھ کر اب وہ ستاروں کا جہاں آتا ہے
کئی آوازیں:
اختر و انجم بدوش
رقص کرو، رقص کرو
کا کہشاں درکنار
لالہ و گل! رنگ بھرو
کون ہوا جلوہ بار
ایک آواز:
مادرِ ارض کے ہاتھوں نے ہویا لاجن کو
پانڈتاروں میں اسے چین کہاں آتا ہے

کئی آوازیں :

اختر و انجم بدوش،
 کاکہشاں در کشتار
 رقص کرو، رقص کرو
 لالہ دگل ارننگ بھرو
 کون ہوا جلوہ بار
 خیر مقدم کو اٹھو، لالہ دگل ارننگ بھرو
 آدم نوزدہ کاکہشاں آنا ہے —

ایک آواز :

اختر و انجم بدوش،
 کاکہشاں در کشتار
 رقص کرو، رقص کرو
 لالہ دگل ارننگ بھرو
 کون ہوا جلوہ بار

کئی آوازیں :

(ایک شاندار موسیقی)

خاکِ مُسَلَّح

جوشِ ملیح آبادی

کہ زیرِ سطحِ مسلح ہے کیا نشیب و فراز
لڑ رہے ہیں بہتانِ دُروں پر وہ راز
وہ آدمی، کہ جو خاکِ کعبہ ساز و دیرِ نواز
اُٹھار ہی ہے زمیں دیدہ و ستار انداز
جہاں ہے ذرہ کچھ اس طرح مائل پرواز
فضائل پر مہر و انجمن ہیں گوشِ برآواز
کہ حُسن، بھول گیا ہے غرور کے انداز
دیارِ ناز میں لوٹے کر ہی ہے مجمعِ نیاز
بجارتِ ہا ہے تحیل، حیرم دل میں وہ ساز
بہرِ نگاہِ کرامت، بہرِ نفسِ اعجاز
ابھی تو ہیں فقط افلاک، فزین یا انداز
کہ دل نہیں ہے رفیقو، محلِ سوز و گداز
کہ خاک پر حرکت کا ہوا ہے اب آغاز
بنار ہی سے متائے زندگی وہ جہاز
میں و خضر کا یہ اختصارِ عمرِ دراز

مجھے خبر ہے، نہ نگہِ اشریکِ راہِ دراز
بزمِ ہنوں نے بناؤت پہ باندھ لی ہے کمر
ہزار شکر کہ تعمیرِ فو میں ہے سرگرم
وہڑک رہا ہے دل طائرانِ سدرہ نشین
اڑی ہوئی ہے تب و تاب چہرہِ غور شید
زمیں پر خشت و خرف نے ڈبل اٹھایا ہے
وہ پانچکھا ہے رُخِ ابرہہ عشقِ مشدوخ
لبِ نیاز پہ روٹن ہوا ہے ناز کا خرف
ہر ایک نے میں پرافشاں ہیں سیکڑوں جبریل
زبے جلالتِ خدامِ عارفانِ جبریل
نہیں یہ منزلِ تمکین، بڑھے چلے یارو
عنبرانِ مافکہ موڑو سوئے خریم و ماخ
بہشتِ عورہ نہ منہ مائیں ثابت و ستار
بصدِ شکوہ پلے گا جو آبِ حیا میں
مری رہِ ابدیت پہ چل نہ پائے گا

نیدیم، جوش کو لے چل کسی بیاباں میں
کہ تاسکوت کے خرم سے چن سکے آواز

جگر مراد آبادی

مجتبٰ زندگی ہی، زندگی سبے	مگر تجھ بن مرے کیں کام کی ہے
وہی ساقی، وہی دریا دلی ہے	وہی میں ہوں، وہی لب لبابی ہے
بہن جاتکھ ہے بربادی دل	مگر کیا حسن ہے کیا دکھتی ہے
عزیزِ بحسِ حسن و عشق ہو جا	یہاں ہر موج، موجِ زندگی ہے
شہیدانِ محبت سو رہے ہیں	مگر روحِ صداقت جاگتی ہے
بائیں جسمِ جنوں، کفرِ محبت	نگاہِ حسن بھی مشتاق سی ہے
ہوا جانا ہے ربطِ شوقِ عریاں	تکلفِ برطرف، کیا برہمی ہے
یہ میخانہ، یہ میخانہ ہے وعظ	یہاں اخلاص بھی ایثار بھی ہے
ہٹو رستے سے اے شیخ و برہمن	مرے دل نے مجھے آواز دی ہے
زمانہ چاہتا ہے زندگی کو	مگر خودِ زندگی کیا چاہتی ہے

جگر کی زندگی ہے اور ترا عینم

جگر کی زندگی کی زندگی ہے

— مشرق و مغرب

احمد ندیم قاسمی

(یہ اشعار میری ایک طویل نظم کا ابتدائیہ ہیں۔
مشرق و مغرب کے تقابلی مطالعے کے سلسلے میں یہ
ابتدائیہ مشرق کے فوری اور اولین ردِ عمل پر مشتمل ہے
اس لئے بجائے خود مکمل ہے۔ آخری حصے کا گریز اس
موضوع کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ کرتا ہے جو میری
اس طویل نظم کی بنیاد ہے۔
ندیم)

گرم ملکوں کا رہنے والا ہوں
برف زاروں سے کتنے ساگردور
ایک چھالے کی طرح، صحرائیں
میرا خاکستری گھر وند اسے
جس کے چٹھے ہوئے کواڑوں میں
جس کی دہلیز کے نشیب کے پاس
فنِ تسمیر کا پرانا پن،
ایک ویرانہ بن کے بیٹھا ہے

چاندنی رات سرد ملکوں کی
نیلی برفوں میں منعکس ہو کر
اپنی کمرؤں کی جھالروں میں چھپی
ایک رومان بن کے آتی ہے
چاندنی رات گرم ملکوں کی
مختصوں کی تھکن کے نشانے
اپنی نگلی کمر پہ لا دے ہوئے
ایک طوفان بن کے آتی ہے

سرد ملکوں میں حسن و عشق کی رو
زندگی سے قدم ملائے ہوئے
آسمان کی طرح، انصاف کی طرح
روز و شب پر محیط رہتی ہے
گھر میں، مسجد میں، یا سہرا ہے
ہر طرف، ہر مقام پر، ہر وقت
جب بھی حسن اور عشق ملتے ہیں
گرم ہوسوں کے پھول کھلتے ہیں

سرد ملکوں میں کتنی گرمی ہے
جسم کی، روح کی، خیالوں کی
گرم ملکوں پر سرد و مژدہ سکوت
ایک آسیب بن کے طاری ہے
سرد ملکوں میں زندگی کا شعور
ایک دڑے کو بھی سوار تاج ہے
گرم ملکوں میں موت کا احساس
ٹھوکر میں زندگی کو مارتا ہے

سرد ملکوں کے رہنے والے دوست
ہیں کھنڈر کے ستون کی مانند
سوچتا ہوں۔ کہ اس خرابی میں
میں اگر بس وہی ہوں جو کچھ ہوں
میں اگر ولولوں کا منہ ہوں
میں اگر حوصلوں کا مرتد ہوں
میرے جینے کا پھر جواز ہے کیا
آخر اس بے بسی کا راز ہے کیا

سرد ملکوں کی وہ پہر کا لباس
ایک ایسی مہین چادر ہے
جس کی پرتوں میں جسم کا سونا
قہقہے ہنسنے کے سہرا ہے
۔۔۔ اور اپنا لباس عریانی
جس پر سوچ، شاعروں کے کوشش
اس قدر طیش سے لگاتا ہے
راکھ کا ڈھیر چھوڑ جاتا ہے

گرم ملکوں میں حسن کی قدریں
کتنی اندھی قدیم صدیوں سے
آگ بھڑکا کے اپنے پسیر کی
اپنے ہی گیسوؤں کا بھی کئے فحش
زندگی کے او اس آنکھ میں
اک الاؤ لگاٹے بیٹھی ہیں
اور اس گرد بار آتش میں
جل رہی ہیں گلاب کی کلیاں

گرم ملکوں کے عشق پریشہ جواں
دھوپ کی چمچ پلاتی نگرہ میں
بل چلاتے ہیں، بیج بوتے ہیں
اور پھر عاقبت کو دوتے ہیں
ان کی محنت پر وجد کرتے ہوئے
موتیوں کے لدے ہوئے خوشے
جتنے بھر پور ہوتے جاتے ہیں
اتنے ہی دور ہوتے جاتے ہیں

سوچتا ہوں۔ کہ میری حالت نہ
 کیا فقط رنگ کی شہادت ہے
 کیا فقط اس لئے حقیر ہوں ہیں
 کہ یہاں دھوپ چلے جاتی ہے
 کیا فقط اس لئے عظیم ہے تو
 کہ تری کھڑکیوں کے شیشوں سے
 جب کہ کن آفتاب کی جھانکے
 برکت اس کی سنسنی اُڑاتی ہے؟

سوچتا ہوں۔ (اے سورج بیتا ہوا)
 چاند میرے گھر میں کھلے سے
 تیرے اداان بن بھی جھانکے گم
 جس نہیں پر میرا ایستادہ ہوں
 نیلے نیلے سمندروں کے تلے
 وہی آجستی پگھلتی جاتی ہے
 اور بن کر ترسے وطن کی زمیں
 تیرے قدموں کو چپتی پاتی ہے

رنگ اور رُست نہیں مدارِ حیات
 رنگ سورج کا ایک زاویہ ہے
 رُست فقط ایک رخ ہے و عمرتی کا
 میرے پھرے کا رنگ میری موصوفہ
 تیرے پھرے کا رنگ برف تری
 تو مری دھوپ کو ترستا ہے
 میں تری برف کے لئے بے چین
 دو مسافر ہیں۔ ایک رستہ ہے



آثر لکھنوی

فقط یہی نہیں حال بلاکشاں نہ کہو
 کسی غریب کا پرسان حال کوئی نہیں
 جہین سجدہ نے گلزار سج دئے کتنے
 خیال دوست کی رنگینیاں بھی شامل ہیں
 یہ کہہ کے شکووں کا عالم نے متدیاب کیا
 جمال دوست نے خود کی ہے اپنی بددوی
 کبھی چمن کا تصور تھا جس سے وابستہ
 تب تہم لب جانان کا ان میں پر تو ہے
 کسی کی چشم سخن ساز کا کرشمہ ہے
 آثر اسے مری رنگینی بیاں نہ کہو

ایک مفلوج دوست

ملوک چند محروم

زندگی تیری گل تر سے سوا شاداب تھی
 آہ بختی دل شکن اس خواب کی تعبیر ہے
 تجھ کو دیکھا ہے انہی آنکھوں نے مانند خزاں
 ساتھ تیرے سیرور یا سیر گلشن یاد ہے
 ناز و نعمت کا پلا تھی وند شعل سے استوار
 پھین لی تجھ سے قصا نے طاقت گفتار بھی
 تیری مجبوری کا یہ خاموش عالم دیکھ کر
 کیا غضب ڈھایا ہے تو نے گردن لیل و نہار
 چارہ گر لاچار ہیں ہمدرد ہیں بے اختیار
 کوئی کر سکتا ہے اس حالت میں کیا تیرے لئے
 روح کو تیری بہ لطف حق تو انانی ملے
 جھیل جائے مٹا کر اس افتاد کو مفرانہ تو
 وہ بہارِ عمر گویا اک پریشان خواب تھی
 بے بسی کی آج تو حیرت بھری تصویر ہے
 آج پاتا ہوں سر پرستہ تجھے کتنا ڈھال
 وہ سماں جب آرزو تھی گل بدامن یاد ہے
 جائے حیرت ہے کہ ہو جائے وہ یوں نار و زار
 آ نہیں سکتا زبان پر شکوہ آزار بھی
 کیا کہوں گزری ہے کیا میرے دل غمناک پر
 ہو گیا شامِ غریباں جلوہ صبح بہار
 دم بخود اہل حیات سرنگوں تیار دار
 پاس سب کے رہ گئی ہے یہ دعا تیرے لئے
 جسم سے پھینپی ہوئی شانِ دل آرائی ملے
 پیکرِ خاکی کو سمجھے روح کا کاشت نہ تو

آدمی تقدیر کے ہاتھوں بہت مجبور ہے

جاننا کوئی نہیں قدرت کو کیا منظور ہے



افقر موبانی

خود ہے مجبور عقل حیراں، پتہ کہیں ہوش کا نہیں ہے
 ابھی سے عالم ہے بخودی کا ابھی تو پر وہ اٹھا نہیں ہے
 نفس نفس اک نئی ہے دنیا، نظر نراک نیا ہے جب وہ
 نگاہ کی پھر بھی انتہا ہے جمال کی انتہا نہیں ہے
 ہے وہ بھی کوئی مجبین سجدہ اٹھے تھکے جو نقش پا سے
 نہ جذب کر لے اگر جنیں کو تھکا راحہ نقش پا نہیں ہے
 ہوا یہ معلوم بعد مدت کسی کی نیند کئی سقم سے
 سقم باندازہ ادا ہے ادا بے تدریجاً نہیں ہے
 ازل سے ہے آسماں غمیدہ، نہ کر سکا پھر بھی ایک سجدہ
 وہ ڈھونڈھتا ہے جس آستان کو وہ آستانہ ملا نہیں ہے
 ہزار رنگ زمانہ بدلے ہزار دورِ نشاط آئے
 جو کچھ چکا ہے ہوا اے غم سے چراغ پھر وہ جلا نہیں ہے
 مرے نظامِ حیات میں کچھ کمی سی محسوس ہو رہی ہے
 مگر تو تم کس لئے پریشاں سوالِ دل کا اٹھا نہیں ہے
 ہمارے آنے کی آرزو کیا، ہمارے خود سے فطرت کا دھوکا
 ابھی چینِ جنتِ نظر ہے ابھی چینِ کاپتہ نہیں ہے
 خوشی ہے زاہد کی ورنہ ساقی خیالِ توبہ رہے گا بکتک
 کہ تیرا نہ خراب افقر ولی نہیں پار ما نہیں ہے



جذبی

ہر وارغ دل میں عکس رُخ نگہ بند لئے
بیٹھے ہیں اہلِ عشق چمن و رچمن لئے

جب ذکر اُن کے شہد لبِ عُشق کا چھڑ گیا
ہم چپ رہے ہیں تلخیِ کام و دہن لئے

ہر خارِ زارِ غم سے گزرتے ہیں اہلِ غم
پر زخمیِ خرامِ نسیمِ چمن لئے

اب کیا بتائیں کیسے بنی کیوں اُجڑ گئی
اپنے خیال میں تھے جو ہم انجمن لئے

بنتی نہیں ہے بات مگر صاحبانِ عقل
پھرتے ہیں ہم سے اہلِ جنوں کا چلن لئے

قطعات

اختر انصاری

افسانہ و افسوں

خدا کو پیارے ہوئے جن کو مدد نہیں گزریں
وہ پیاری رانیں نہ کوٹیں، وہ پیارے فن نہ پھر
فسوں ہے گردشِ دوراں افسانہ گردشِ چرخ
ہمارے بخت نہ پیٹے اہمائے دن نہ پھر؟

تھکن

سردِ تلخی دوشینہ کے امانت دار
خوارِ حسرتِ پارینہ کے امانت دار
تھکن سے چوریہ باز و تھکن سے چوریہ پاؤں
مری مشقتِ دیرینہ کے امانت دار

وقت

پرانے اور نئے کو سمونے والا وقت!
جبیں دہر کے داغوں کو دھونے والا وقت!
اسی کے سلسلہ جبر کے اسیر ہیں ہم
تغیرات کی لڑیاں پرونے والا وقت!

عالمِ سرودا

جنونِ شوق نہ زہنِ سار بے عمل ہوگا
جو عیش آج نہیں ہو سکا وہ کل ہوگا
خوش کہ عالمِ فردا مراد ہے جس سے
ہماری خاک سے تعمیر وہ محسوس ہوگا

عشرتِ خم

دلِ خراب ہے اب تک اسیرِ بختِ خم
نفسِ نفس ہے ابھی تک غریقِ لذتِ خم
ہماری عیش پسندی بھی کیا قیامت ہے
تمام عمر ہے وقفِ عیش و عشرتِ خم
ایک یاد

فلک پہ جیسے ستاروں کی گوہری جنبش
زمین پہ چاند کی کرنوں کی مرمی جنبش
مجھے ہے یاد ابھی تک وہ اپنے بازو پر
تھمادی پلکوں کی تازگی شتری جنبش



عبد الحمید عدم

جس سمت بھی چین میں وہ غنچہ دہن گیا

ہر ہر قدم پر ایک خرابات بن گیا

تھا اس قدر اُسے مری کم کوئی کا خیال

عشر میں میرے ساتھ مرا ہم سخن گیا

ویسے تو بے شمار تھے شیریں کے مدھی

لانے کو جوئے شیر فقط کو بہن گیا

رنگ اڑ گیا گلوں کا تو کوئی کمی نہیں

خوشبو چلی گئی تو دُور چین گیا

ایسے جوان دل سے تنہا اڑی عدم

گلشن سے جس طرح کوئی وحشی ہرن گیا

یہ دور

اختر الایمان

میں اسی طور سے گرداں ہوں زمانے میں وہی
صبح ہے شام ہے گہنائی ہوئی راتیں ہیں
کوئی آغاز نہ انجام نہ منزل نہ سفر
سب وہی دوست ہیں وہی ہوتی ہیں ہیں
پھرے اترے ہوئے دن کی محنت سب
سب وہی قصے شکایات، مہارائیں ہیں،
سب وہی بغض، حسد، رشک، رقابت شکوے
دہم نژاد پر ہے الجھاؤ کی سوگھائیں ہیں،
سب گلی کو چپے وہی لوگ وہی موڑ وہی
یہ وہی سرودی ہے یہ گدھی یہ برساتیں ہیں

زلزلت کی بات ہے یا زہر کہ سب ڈرتے ہیں
کوئی دلدار نہ دلبر نہ ملاقاتیں ہیں
کوئی باشا کش نہیں جینے کی فوجز امتگ
کچھ نہیں سس خیم و اندوہ کی بارائیں ہیں
تنگ دامانی کا شکوہ ہے خدا سے ہر وقت

ہر مرض کے لئے نسخہ میں خباہتیں ہیں
جی الٹ جاتا ہے اس جس سلسل سے مرا
ذہن جاتا ہے کسی نازش غبن کی طرف
یعنی وہ پر تو گل حنا نہ برانداز نہ چمن
ایک پروائی کا جھونکا سا گھنی بدلی سی کیفیت
شادہ نکمت و انوار سحر، راحت من،
رسم دلدار ہے اس سیم بدن کے دم سے
اور مرے دم سے ہے عشاق کا بے باغ چلن

کس کے قدموں کی ہے یہ چاپ یقیناً ہے وہی
یہ یقیناً ہے وہی سر و چین، بنست بہار
کوئی رت اُٹے زمانہ نہیں بدلے گا اسے
جانمن تم ہو؟ نہیں! وہ لب عارض وہ نکھار
نغمی جسم کی، وہ لوج سا، نشہ سا مدام
ایک چلتا ہوا جادو سا نگاہوں کا قرار؟
سچ کہو تم ہی ہو؟ آتا نہیں آنکھوں کی یقین

رسم شہستانِ طرب

قتیل شہنائی

کون یہ ان کے شہستان میں چھپا بیٹھا ہے
اس نے جس شکرِ جہاں پرہ کی فتح لیفتار
دوڑتا حدِ نظر کوئی بھی اپنا تو نہیں
مقصودِ جنگ یہاں سب کا جُدا ہے لیکن
وسو سے دل میں لے سوچ رہا ہے فاتح
چند راتوں کی حکومت کا یہ بیکارِ غرور
اس سے پہلے بھی تو آئے ہیں کئی لوگ یہاں
فتح کے بعد بھی لیکن انہیں تسکین نہ ملی
فاتحِ حسنِ کئی دن سے اسی سوچ میں ہے
کسی قارون کی دولت کے خزانوں کے عوض
آہیں تیز ہوئیں خوف نے گھیرے ڈالے
سر پہ آہنچا ہے شاید کوئی زخوِ غارِ غنیم

کوئی فاتح ہے مگر دل میں ہے گھبراہٹ
اس نے پھر پرچمِ زرِ کار ہے لہرایا ہوا
ایک پرچم کے تلے جمع ہیں سارے اختیار
سب کے ہاتھوں میں چمکتی ہے سنہری تلوار
کس طرح ملکیتِ حسنِ رہے زیرِ نیکیں
چینتی روح کی تسکین کا ضامن تو نہیں
حسن اور حسن کی سرکار پرست بو پانے
آخر کار تہ تیغ ہوئے دیوانے
اس کی بھی موت کا پیغام نہ آ پہنچا ہو
اس کی تذلیل کا ہنسِ گام نہ آ پہنچا ہو
تھر تھراتے ہیں شہستان کے پراسرار دے
ہاتھیں زر کی چمکتی ہوئی تلوار لے

دو خیرِ ملکیتِ حسن کے دربانوں کو
اب اجالوں کے بھی چہروں پہ سیاہی ہوگی
دفن ہو جائے گا یا دونوں میں پرانا فاتح
اب یہاں اور کسی اور کی شاہی ہوگی

قتیل شفائی

ہم ان کے تغافل کو ادا جان رہے ہیں
 اس بات پر کچھ لوگ بُرا مان رہے ہیں
 اے حضرت ناسخ ہمیں الزام نہ دیجئے
 اس عمر میں کچھ آپ بھی نادان رہے ہیں
 رہزن کئی ملتے ہیں رو دیر و حرم میں
 اس خوف سے ہم بے سرو سامان رہے ہیں
 احسان بہاروں کا اٹھایا نہ خنزاں کا
 دیوانے سدا چاک گریبان رہے ہیں
 دیکھا تھا کبھی کوچہ جاناں میں بھی تجھ کو
 ہم نے غم دوراں تجھے پہچان رہے ہیں
 اڑتے ہوئے دیکھے نہیں کیا اپنے لمحے
 اک رات مرے آپ بھی مہمان رہے ہیں



شاد و ساری

وہ جو دعویٰ کریں سوہ جو پروا کریں
 بکھا کے قہیں منگو جائیں۔ دھوکا کریں
 جارہے ہیں کہ عرض تمست کریں
 اب یہ حالات ہیں ہم سے وہ کچھ دنوں
 وہ اگر انجمن سے اٹھا دیں ہمیں
 کون تسلیم کر لے گا۔ فرمائیے
 شیخ صاحب کھاوے کے عادی نہیں
 آئیے آج ہم رہزنیوں کی طرح
 اب یہاں آگئے ہوئے یایوس ہم
 ان بتان ستمگر کو۔ جو کچھ بھی ہو
 آپ سُنستے رہیں۔ آپ دیکھا کریں
 شوق سے آپ اُن کا بھروسہ کریں
 وہ کہیں یہ نہ کہیں کہ ہم کیسے کریں
 دشمنوں کے دکھانے کو پروا کریں
 ہم سے یہ بھی نہ ہوگا کہ شکوہ کریں
 ہم جو اُن کی جفاؤں کا چرچا کریں
 ورنہ قطرہ کو چاہیں تو دریا کریں
 دُور تک رہناؤں کا پیچھا کریں
 کیا تقاضا کریں۔ کیوں تقاضا کریں
 ہم نے سجدہ کیا ہے نہ سجدہ کریں

شاد صاحب یہ نقاد بر نحو غلط

فن شعر و ادب کو نہ رسوا کریں

جاروب کش

مجید امجد

آسمانوں کے تلے، سبز و خرم گوشوں میں،
کوئی ہو گا جسے اک ساعت راحت مل جائے
یہ گھڑی تیرے مقدر میں نہیں ہے، نہ سہی

آسمانوں کے تلے، تلخ و سیدہ راہوں پر،
اتنے غم بکھرے پڑے ہیں، کہ اگر تو چھٹی لے
کوئی اک غم تری قسمت کو بدل سکتا ہے

آسمانوں کے تلے، تلخ و سیدہ راہوں پر،
تو اگر دیکھے تو خوشیوں کی گریزاں سرحد
سوز یک غم سے شکیب غم دیگر تک ہے

زندگی قسم سہی، زہر سہی، کچھ بھی سہی،
آسمانوں کے تلے، تلخ و سیدہ راہوں میں،
جرعہ سم کے لئے عفت لب لازم ہے
اور تو ہے کہ تڑے جسم کا سایہ بھی بکس

تو اگر چاہے تو ان تلخ و سیدہ راہوں پر
جا، بجا، اتنی تڑپتی ہوئی دنیاؤں میں
اتنے غم بکھرے پڑے ہیں کہ جنہیں تیری حیات
قوت یک شب کے تقدس میں ہو سکتی ہے
کاش، تو جیلہ جاروب کے پر نوچ سکے،
کاش تو سوچ سکے! سوچ سکے!

ساقی کے حضور

پروفیسر شورو

ترے ماحول کی مصیبت بھی کتنی غامض ہے ساقی
 کہ ہم پر مستقیوں کا بے سبب الزام ہے ساقی
 مسلم احترام حافظ و خیام سے ساقی
 مگر یاں تو فریب جام و مینا عام ہے ساقی
 یہ رُت، یہ سبزہ و گل، یہ ہوا، یہ ابر، یہ سایہ
 یہاں تو ہر قدم پر دام زیرِ دام ہے ساقی
 اٹھا دوں گر حجابِ جام و مینا تیری نظروں سے
 تو آہنگِ مے و مینا بھی اک کھرام ہے ساقی
 تری چشمِ کرم اس بزم میں رسوا نہ ہو جائے
 خرابش دل چھپا کر مسکرا نا عام ہے ساقی
 کسی کا قلب ٹوٹے خون اپنی آنکھ سے ٹپکے
 شعورِ آدمیت کا یہی انجام ہے ساقی
 سوا ویر و کعبہ میں بھی مشکل ہی سے ملتی ہے
 وہ اک جنسِ گراں انسان جس کا نام ہے ساقی
 بہ نظرِ بخودی نظروں کو دے تکلیفِ آزادی
 حرم سے تکرے تک بغرض اک کام ہے ساقی
 تری محفل میں اپنے ہونٹھسی کر ہم تو بیٹھے ہیں
 مگر پھر بھی ہماری خامشی بدنام ہے ساقی
 وطن سے دور غربت میں یہ اکثر میں نے سوچا ہے
 یہ سورج کی کرن ہے یا سوا دشمن ہے ساقی
 یہ بے مصیبت چپ ہوں، مگر چپ سے بھی کیا ہوگا
 سوا وِ شَب سے کہ نوں تک مرا پیغام ہے ساقی



پروفیسر شوہر

آنکھ نم ہو تو کس بہانے سے
 بات بنتی نہیں بنانے سے
 کتنی نظریں ہوئیں خراب نہ پوچھ
 ایک تیرے نظر جھکانے سے
 بھگ گیا ہر چراغ ویر و محرم
 عشق کا ایک دیا جلانے سے
 وہ محرم میں بھی سرنگوں نہ ہوا
 جو اٹھا تیرے آستانے سے
 ذرہ ذرہ ہے آفتاب بدوش
 تیرے رخ سے نقاب اٹھانے سے
 باتوں باتوں میں روٹھنا اُس کا
 اس بہانے سے اُس بہانے سے
 کوئی اپنا نظر نہیں آتا
 کیا وہ اٹھ گئی زمانے سے
 ہر حقیقت کی ہم نے رکھ لی لاج
 اک فریب مجاز کھانے سے
 جو گزرتی ہے وہ گزرتی ہے
 کون شکوہ کرے زمانے سے
 جو ٹپک جائے آنکھ سے اے شوہر
 وہ چھپے راز کیسا چھپانے سے



غلام ربانی تاباں

اک حادثہ شوق کہ دل بھول چلا تھا
 آیا ہے کبھی یاد تو ہرزحسب ہوا تھا
 تسلیم کہ وہ شوخ پشیمانِ جفا تھا
 کیا جانئے کیا عشق کی غیرت کو ہوا تھا
 وہ سحر اشارات وہ افسون کنایات
 اک وہم تمنا تھا مگر ہوشِ ربا تھا
 بربادیِ نکمت بہ تقاضائے نموہتی
 پھولوں کو مگر باورِ بہاری سے گلا تھا
 شعلہ ساتھ زلفِ لپک جائے تھا تاباں
 ہر لہرِ نظر سلسلہ حُببانِ جیا تھا

○ عبدالمجید حیرت

اور اُسے قیاس و گماں جا رہی ہے الٹی یہ دنیا کہاں جا رہی ہے
 مناد سے آواز نہ نالوس رخصت مساجد سے رسم اذان جا رہی ہے
 کہیں دین و ایمان پہ بھی بن نہ جائے ابھی تو فقط اک زباں جا رہی ہے
 دلاں آ رہی ہے زبانوں میں طاقت یہاں ہم سے تابِ بیاں جا رہی ہے
 بھریدر دہے آ رہی ہے وہ دنیا وہ دنیا کہ تھی مہربان جا رہی ہے
 وہ دنیا جو دم بھر رہی تھی ہمارا ہمیں سے وہ دامن کشاں جا رہی ہے
 خبر بھی ہے اے قصہ آرائے الفت کہاں سے کہاں داستان جا رہی ہے
 بہت دن سے نبض مریضِ محبت تو انا تو کیا، نا تو اں جا رہی ہے
 نہ سر کی چین سے، مقدّر چین کا سنا تو یہی تھا، خزاں جا رہی ہے
 گماں ہی غلط تھا کہ پیرِ معنائ تک ہماری بھی آہ و فغاں جا رہی ہے
 زمیں کی رفاقت سے مایوس ہو کر نظرِ جانبِ آسمان جا رہی ہے
 غضب ہے کہ جن سے امید کرم تھی انہیں کی روشِ دستاں جا رہی ہے

تھیں ناز تھا اس قدر جس پہ حیرت

وہ جنس و فرائگاہ جا رہی ہے

شراب

منیر نیازی

جب رات کا پہلا گھر بنے
 تب اس گوری کی سیج سجے
 اسٹا کا ہلکا پھول کھلے
 پکھڑا ہوا پریمی آن ملے
 میٹھی باتوں کی دھوم مچے
 جلتی سانسوں کی راس رچے
 پھر کام کا زہری بان چلے
 گوری روا رو کر ہاتھ ملے

ایک ملاقات

ظہور نطنز

کس لئے اتنی پشیمان ہو تم!
عمر بھر دامنِ توقیر و فخر
کس وفا پیشہ کے ہاتھوں میں رہا؟

چاند وصل جاتا ہے، مر جھاتے ہیں پھول
ہے یہی فطرت مضطر کا اصول
وقت کی لہر پہ چاہو بھی تو جہتی نہیں وحوال

راگ اور رقص کی اس محفل میں
ہم ہیں کچھ دیر کے مہمان، کوئی بات کرو!
جان پہچان، رکاوٹ ہو اگر
بن کے آنجان کوئی بات کرو!!
میری محبوب، مری جان کوئی بات کرو!!!

کس طرح بھولا مرا خیال کہو!
کس طرح ٹوٹا لگنِ حال کہو!
ہجر کا وصل کا احوال کہو!!
قصہ روز و رات کہو!!

پھر وہی کرب وہی خاموشی،
پھر وہی نگہ پشیمان و حزن!
کچھ تو بولو۔! کہ بھری محفل میں
گفتگو میری پُرا سراد نہ بن جائے کیس!!
اب مجھے دعویٰ توقیر و فاجی تو نہیں! —!!

بکھ گئی ہے میرے سینے میں بھی آگ
میں بھی ہوں اب کسی پہلو کا سہاگ
اے رفیقہ کسی آغوش کی، اب مجھ سے نہ بھاگ!!

عمر بھر دامنِ توقیر و فخر
کس وفا پیشہ کے ہاتھوں میں رہا؟
تم سے اک شب جو شبستانِ وفا میں نہ کٹی!
زندگی مجھ سے بھی زینِ دامنِ وفا میں نہ کٹی!!
دو شہ ہے اس میں تمہارا ہی نہ میری کوئی موصول
وقت کی لہر پہ چاہو بھی تو جہتی نہیں وحوال
اب تو کچھ بات کرو!!



اقبال صفتی پسند

محبت بھوکے آئی کہاں تک
 توے غم سے غم کون مگلاں تک
 کہیں بجلی گئے ہوتا ہے محسوس
 کہ جیسے آتھی آئی آتھیں تک
 حضورِ دوست کچھ کہتا ہے مشکل
 بدل جاتا ہے اندازِ میاں تک
 مرے دم سے فعلی زندگی ہے
 قیامِ کار و اہل ہے کار و اہل تک
 نکلے برقع کا احسان نہ پوچھو
 اچھا ہے جہنم سے آتھیں تک
 فقارہ لکھی دل ہی ہر گھٹ کر
 نہ اٹھا شمع محفل سے دھواں تک
 افسوس دیوار کے سائے سے اقبال
 یہ دیکھو دھوپ آہنچی کہاں تک



آغا صادق

روئے چمن پہ نکھار آج نہیں کل سہی!
 جتن عروسِ بہار آج نہیں کل سہی،
 وہ بھی گھڑی آئے گی رُوحِ سکون پائے گی
 قلبِ تپاں کو تبار آج نہیں کل سہی!
 کشمکشِ انقلاب ہوگی کبھی کامیاب
 خاکِ نشینِ تاجدار آج نہیں کل سہی!
 ماتمِ مرگ و مٹ آج اگر ہے تو کیس
 حمد و وفا استوار آج نہیں کل سہی
 سینے میں دلِ تمام لے صبر سے کچھ کام لے
 دردِ مٹاں آج نہیں کل سہی
 اہلِ خروشِ ادکام آج ہوئے ہوں تو جوں
 اہلِ جنوں کا مگار آج نہیں کل سہی
 غمزدگانِ حیات کل سے نہیں ناامید
 اہلِ ستمِ شرمسار آج نہیں کل سہی
 قطرہٴ شبنم سے بھی لالہ و گل کا خطاب
 زندگی پائدار آج نہیں کل سہی
 اور سہی کوئی دن بارشِ سنگِ ستم
 اہلِ کرم کا پھوار آج نہیں کل سہی
 صادق مجبور کو اتنی تسلی تو ہے
 محفلِ عشرت میں بار آج نہیں کل سہی

ماضی، حال، مستقبل

فارغ بخساری

جو لمحے ماضی کی گردیں کھوٹے ہیں
پہروں ان کی یادوں میں ہم رونے ہیں
جانے کہاں وہ سوئے ہیں

آنے والے لمحے بھی کیا پیارے ہیں
گویا جنت کے دکش نظارے ہیں
ہر ایک آنکھ کے تارے ہیں

جو ساتھ رہیں
ہمراز بنیں، و مساز بنیں
ہم ان کو سدا ٹھکراتے ہیں

حال جو ایک سچا ساتھی ہے ہم سے
ہر لحظہ دکھ درد میں اپنا محرم ہے
اس سے ہمیں رنجیت کم ہے

حال جسے ہم کہتے ہیں اک دھوکا ہے
بیتنے والا ہر لمحہ ہے مستقبل کا سرما
بیت گیا جو ماضی کی جاگیر بنا

دوست ہوں یا دشمن ہوں
جن کا رشتہ ہم سے ٹوٹ چکا
یا جن سے کوئی رشتہ ہی نہیں
ہم ان کے گن گاتے ہیں

ماضی ہی ماضی ہے
مستقبل ہی مستقبل ہے
آخر حال کہاں ہے؟

سہ نخل کی چھاؤں میں

خلیل الرحمن اعظمی

چوڑیاں بختی ہیں، اپنکل کی ہوا آتی ہے
 لمبے لمبے کی زباں پر ہے نئی فصل کا گیت
 ہنس رہے ہیں مرے معصوم سے ننھے پودے
 کوئی گوری لمبے آئی ہے چھپ سکتی گا کر
 رس بھرے ہونٹوں سے انہوں کے اندھیرے
 منزلیں اب مرے پانوں میں کچھی جاتی ہیں
 مجھ سے کتنی ہے مری پیاس یہ جیون بھر کی
 رکھ کے سینے پر مرے ہاتھ کوئی کتنا ہے
 دیکھو اب جاگ اٹھو رات گئی بھور ہوئی
 چل کے پھلواری میں سو بچ کو نکلتے دیکھیں

اب کے جاڑوں میں یہ کس طرح کا آیا موسم
 میری بستی مرے کھیتوں کا عجوبے عالم
 جن کو ملتی رہی اب تک مرے غم کی شبنم
 جس طرح پہلے برستی تھیں یہ آنکھیں چم چم
 اس اندھیرے میں کوئی پھیر دے جیسے سرگم
 جانے کس سمت لمبے جاتا ہے ایک ایک قدم
 اور کچھ اور کہ یہ تشہ ابھی ہے کم کم
 اتنے پاگل نہ بنو خوشی میں آؤ باطم
 یہ سچ کے گجروں میں باقی نہ رہی کوئی غم
 چل کے دیکھیں کہ کالی کھلتی ہے کیسے غم مٹم

میرے بالوں میں سجادہ کوئی نہ سنتا ہوا پھول

چل کے ہاتھوں پر مرے کھاؤ محبت کی قسم



فضا ابن فیضی

کون ترسے مذاق خوشی کے لئے

یہ بھی کافی نہیں زندگی کے لئے

ذوقِ غم کا ہو عرفان حاصل اگر

غم بڑی چیز ہے آدمی کے لئے

ورنہ ہم اور تہمت کش آگئی

ہوش میں آئے تھے بخود کی لئے

ریخِ مستی کے عنوان یاد آگئے

ہم نے کوشش تو کی تھی منہ کی لئے

کون شائستہ رہ گزر چل پڑا

منزلیں خود بڑھیں رہبری کے لئے

پھونکے لئے تپِ عصہ حاضر مجھے

لوگ بیتاب ہیں روشنی کے لئے

زندہ رہنے کی ہمت نہ ہو تو فضا

زندگی موت ہے آدمی کے لئے

میرم نغمہ

نغمہ ملک

شکریں شب بیکل و رنگ یہ مینا کس
چاند کے سینے میں لایا ہے عکس
اس میں ڈوبنا تھا، شرابی سے بیکل و رنگ

منظر خواب قرا ہے گوہر ستر کھلے
پھر سر زخم مرا بھید مرار ان کھلے
میرم نغمہ تری لے میں ہے تویر شفا
سار کے سینہ پر خون میں دلی میں جو میں
مگر کے زخموں پہ کوئی نور کا پھار کھلے
باندھ ہر تار کے اطراف اچھلے کا احصار
مڑکی مڑکی کے چوں بھوکے گلبرگ کھلے
ایک لکھ کو حسرت و تائب و شفا کی تر ہے
عقیدہ فریاد کی جی کھول کے سوا کی کر
ساتھ یوں چھپرے کد اشکوں کو ہاتھ مل جائے
یوں کھلے دل کے قس کی کا گھماں پرتیگر
تیری آواز سے دیکھ کی سائیں میں ملے
نغمہ کی گھل سی گئی ہے تری شریا نواں میں
میسے گلبرگ میں ہو سداں کی بھڑکی میں چکوتو
نرت اس طرح چکوتی ہے مہر نواں میں
نغمہ کہ گھبرا گیا سکول، جلوہ در و نشاط
لب ملک یہ جی استغاثی کے چھڑنے کا گھل
دیکھ کر آنکھوں کا یہ جاگتا سوتا سدا
آگے وہ بس گئی یہ مست بیکل و رنگیاں

تجھ کو سنگیت کی دیوی نے دھلیں دے کر
حسکواتے ہوئے ناؤں کی فضا والی میں
نغمہ کے موزوں سے بجا ہے گون کے انہ
راگ کے ملنے میں سرگم کی گھبراہٹ میں

بار بار خواب کے ہر گام یہ محسوس ہوا
میرے افکار میں پڑے ہیں اجالے کے بھو
راگتی بیلہ سے بھٹی ہے سر ہانے آگے

جیسے بیکے ہوئے سرشار، دوا نے باہل
پیاز سے ٹوٹ کے بدست چلنے سے ہیں
دل میں ہو جاتی ہیں شریبی ہوا میں بیکل
لب احساں یہ چم جاتی ہے کھڑکی کی شفا
نغمہ بن چلتے ہیں گھل میں دھندلے کھجور
برگ سے اچھٹی ہے جب بوند کی پالی جھنکا
پوچھتا ہے گلی چکے سے سیجان کہ
تو کسی سدا کا بچھڑا ہوا نغمہ تو نہیں
کسی مضروب کے سینے کا سترارہ تو نہیں

آنکھوں کی پچھلے کو سنا تا ہے یہ کون
جب فصلان سے ہیں رتے میں گھمائے عرب
ڈوبتا ہے سرور بدلا ہوا نغمہ شب
موجیں مچھلتی کھتا ہوں میں بدل جاتی ہیں

نسبت دروہے کچھ بیش مضراب کے ساتھ
کوئی چپ چپکے بلاتا ہے پس پردہ ساز
مجھ سے یہ کس نے کیا سات سروں کا پردہ
میرے دکھ و دکاہ کون شناسائی ہے
کون غمخوار ہے یہ، کس کی مسیحا جی ہے

ساز پر انگلیاں جس وقت رواں ہوتی ہیں
دل کی دیوار سے سر بھوڑنا پھرتا ہے کوئی
ایسا لگتا ہے بدلنے کو ہیں میرے دن رات
جیسے مٹی مری اکس میں ڈھل جائے گی
قند ہے جیسے مرے حق میں مرا زہر حیات
زندگی گردش در راں سے مل جائے گی

اُمّ یہ مہر کے جئے جانے کی بے سود لگن
محبس دہریں کیا قہر ہے سانسوں کا جتن
بے سبب دل کو لگاں ہوتا ہے جیسے تو نے
میرے اشکوں مری آہوں کا سماں دیکھا ہے
تو نے دیکھی ہے مری رات کی گم گشتہ سحر
میری بجھتی ہوئی نکتوں کا دھواں دیکھا ہے
تجھ پر آئینہ ہے جیسے مرا عروج شباب
تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے مرے زخموں کا حساب

مریم نغمہ تری لئے میں ہے تنویر شفا
تو مٹی خاک کو سودائے پرافشانی دے
رخت ہستی کو منائے گریبانی دے
سم سے بھٹکا ہوں کہاں جاؤں تباہی کو
سیدہ ساز میں چپ چاپ سلا دے مجھ کو
اپنی آواز کے شعلوں میں جلا دے مجھ کو
جی میں ہے کھوئے ہوئے خوابوں کی تعمیر ملے
راگ کی آگ میں جل نہکھنے کی نقد پر ملے

چرخ پر لگتا ہے جب اشرفیوں کا انبار
چوٹیاں کوہ کی سونے سے گھیل جاتی ہیں
کھلنے لگتے ہیں سہراب رواں نیل کنول
صفت صفت بھوڑے چلے آتے ہیں کل کل
خود بخود جیسے کہیں بھیریوں چھڑ جاتی تے
چاند کی آخری کھول کی صدا آتی ہے

کُنچ سر سبز میں آئین خزاں کے ماحتوں
منہ چھائے ہوئے دامان مزار گل میں
سدکیاں بھرتی ہے جس وقت پیسے کی پکا
کیسے قلم حتم کے سنتی ہے ہوائے گزار
پیکر شاخ کے جب زیور گل اُتر آئے
شیون برگ چیدہ سے چمن کو بجا ہے
پو، پھٹے موج نسیم سحری کے مہراہ
متنبلیاں ست رنگی سوغات لئے آتی ہیں
ولیکہ کہ خیمہ نسرین و سن کا انجام
نخس و غاشاک سے گھبرا کے پٹ جاتی ہیں
ایسے ہنگام کہیں باغ کی دیوار کے پاس
زروسی راگ کی آ آ کے کھڑی رہتی ہے
ایک اک پھول کے لٹنے کی کٹھانتی ہے

میں نے کس کس طرح سنگیت کی پوجا کی ہے
آسرا کس کا تھا نعمات کئے امن کے سوا
سوچتا ہوں کہ اگر سحر نہ سہارا دیتا
دوش پردہ خم و نیس کی گرداں باری ہتی
سائس کھڑ جاتی مری تھک کے کہیں سو جاتا
ریزہ آسیدہ شام و سحر ہو جاتا



خاطر حسنہ نوی

فریاد بھی ہے سوعادب اپنے شہر میں
 ہم پھر رہے ہیں ہر باب اپنے شہر میں
 ہاں اب دیارِ غیر میں ڈھونڈیں گے آشنا
 اپنے تو غیر ہو گئے سب اپنے شہر میں
 اب امتیاز دشمنی و دوستی کے
 حالات ہو گئے ہیں عجب اپنے شہر میں
 جو پھول آیا سبز و تازہ ہو کے رہ گیا
 کب فصل گل ہے فصلِ طرب اپنے شہر میں
 جو زندہ زمانہ تھے اب شہرِ یار میں
 کس کو خیالِ نام و نسب اپنے شہر میں
 اک آپ ہیں کہ سارا زمانہ ہے آپ کا
 کہ ہم کہ اجنبی ہوئے اب اپنے شہر میں
 خاطرِ اب اہل دل بھی بنے ہیں زمانہ ساز
 کس سے کریں وفا کی طلب اپنے شہر میں

ذکرِ ستم سے کیا ہوگا؟

احمد ریاض

چنیل صحراؤں میں کب تک پیار کا افسانہ دہرائیں
کساروں میں ہستی جوئے شیر کے غمگین نغمے گائیں
لیلاؤں کے افسور و لیں عذراؤں کے زخم دکھائیں
کو کہنوں کے نوے کھیں رانجیوں کی فریاد سنائیں
کب تک بوالہوسوں کے بڑھتے کاروبار کا رونا روئیں
بچتے چاند سے چہروں اور لب و زحار کا رونا روئیں

ذکرِ ستم سے دل والوں کا صوفِ فضل نے ساڑ دیا ہے
فکر و نظر پر برق گری ہے فہم و خرد نے زہر پیسا ہے
دیوانوں نے اپنے سرتافوں کا ہر الزام لیا ہے
عشق و وفا پر اہل ہوس نے ہر اک ڈھکے مار کیا ہے
ذکرِ ستم سے اب تک ہم نے دار و رسن کا مان بڑھایا
تاجوروں نے پیاس بھائی دل والوں نے غول لٹایا

ذکرِ ستم سے دیکھا انسانوں کے عدد سے دور نہ ہوں گے
جب تک ہم آگے نہ بڑھیں گے راہ کے کانٹے دفن نہ ہو گے
صبا دوں اور گامپینوں کے بڑھنے فتنے دور نہ ہوں گے
چنگیزوں اور پرویزوں کے خویشِ مصدے دور نہ ہوں گے
آؤ ذکرِ ستم سے آگے چارہ جبر و ستم کی سوجھیں
آؤ دل کر صدیوں کی عظمت کا پھیلا دامن نوچیں

آؤ سلگتے انٹ صحراؤں میں جانیں کھونے والو
عشق کی عظمت کے رکھو الو بزمِ وفا کے تند اُجھالو
حسن و مجرت کے متوالو نجد کی بیتی گو د کے پالو
بستی بستی رسوا رسوا مظلومو آشفتمو حوالو

آؤ دنیہ میں زندہ رہنے کا سب کو ڈھب سکھائیں
چند خداؤں کو لگا دیں لاکھوں انسانوں کو جگائیں

شعاع فردا کے راز دانو!

منظر امام

حیات کا قافلہ جھٹک کر یہ کیسی منزل پہ آگیا ہے
 نہ کوئی رہبر، نہ کوئی حیدم
 بس ایک لا آتہا خموشی
 جو تیرگی کی مہیب پلکوں پہ منعقد ہو کے رہ گئی ہے

شکستہ پا، خستہ حال راہی
 اُداس، گم سُم
 خود اپنی ہی سانس گن رہا ہے

شعاع فردا کے راز دانو!
 جو قمرِ زمان و مکاں کی پینائیوں سے آگے
 کوئی کئی رکھزار پاؤ
 تو کاروانِ حیاتِ خستہ کا نام لینا
 شکستہ پا کا سلام لینا

ابھی وفا معتبر نہیں ہے
 جنوں ابھی دیدہ و در نہیں ہے
 ابھی تو ختم سفر نہیں ہے!
 ابھی تو ختم سفر نہیں ہے!!

کوثر نیازی



کب زمانے کی اداؤں کا گلہ کرتے ہیں
ہم فقط اپنی خطاؤں کا گلہ کرتے ہیں

پر پرواز نہیں ہے تو بس نامِ تقدیر!
آج شہبازِ فضاؤں کا گلہ کرتے ہیں،

آگ لگ جائے نہ ان سے ہیں گلشنِ گلشن
باغبانِ میری نواؤں کا گلہ کرتے ہیں

نہ ہوئی ان سے کبھی غیسر کی دروازہ گری
بادِ شہ تیرے گداؤں کا گلہ کرتے ہیں

ہم وہ گستاخ ہیں جو تیری وفا کے باوصف
چند محسومِ جہانوں کا گلہ کرتے ہیں

پہلے پیدا تو کریں ذوقِ سفر اے کوثر!
لوگ کیوں راہِ سماؤں کا گلہ کرتے ہیں



فطرت کا وہ بیانِ وفا یاد نہیں ہے

فریاد کہ دنیا کو خدا یاد نہیں ہے

کیا چیز ہے اللہ سے وہ شوخِ بہتیم

اب ایک بھی ظالم کی جفا یاد نہیں ہے
اب عشق بھلا بیٹھا ہے اخلاص کا انداز

اب حن کو پہلی سی ادا یاد نہیں ہے

کیا مجھ سے ہوئی عرضِ تنہا میں جبارت

گیوں ہو گئے وہ مجھ سے خفا یاد نہیں ہے

صیاد! نہ کہ نغمہ سرائی کے تقاضے

اب مجھ کو گلستاں کی فضا یاد نہیں ہے

بیمارِ عسیمِ عشق کا اللہ ٹھہران

اُس آنکھ کو پیغامِ شفا یاد نہیں ہے

اِس انجمنِ ناز کو فردائے قیامت

اے کوثر! افسر وہ نوا یاد نہیں ہے



جلیل حشی

ہاتھوں میں خونِ دل سے چپکنے لگا قلم
 حالاتِ نو بہار کئے جب کبھی رستم
 پہلے کسی کے ہاتھ سے ساعز تو چھین لو
 پھر اہلِ میکدہ تمہیں کہنے لگیں گے جم
 اس رُت کو کس زباں سے بہا راں کا نام دیں
 ہم روشنی کے پھول کھلا کر سہائے جسم
 جانے کدھر سے اُترتی ہے تجھے رنگِ بو
 ہو ہو گیا خیال کا صحرایِ ارم ارم
 جیتک سنو خنِ دل میں ڈوب لی ہوں انگلیاں
 موضوعِ روزگار کو چھوٹے نہیں ہیں ہم
 ہم حجابِ رنگارِ سحر کے قریب ہیں!
 کیا مُڑ کے دیکھتے ہو، بڑھاؤ ذرا قدم
 کیوں سزنگوں ہو جادو دار و رس میں تم
 یار و تمھارے دم سے آفاق کا ہبسم
 حشمتی ہمارے آگے بایں ذوقِ آذری
 خلوت میں کس نیاز سے جھکتے رہے صنم



جمیل ملک

ہم قوم تے رہے بقا کے لئے لوگ جیتے ہیں کیوں تھنا کے لئے
 اپنا ہونا بھی کیا قیامت ہے ورنہ سر ہی رہے خدا کے لئے
 شاخ دل بے ثمر رہی برسوں فو شگفتہ سی اک ادا کے لئے
 دل نے کیا کیا نہ پیرہن بدلے ایک چھوٹی سی ابتعا کے لئے
 شاہزادوں کی جھولیاں بھریں کچھ رہا بھی ہے اس گدا کے لئے
 کس نے کی تھی تری زباں بندی! ہم تو چپ بختے تری رضا کے لئے
 دل ہے کم سن جھٹک بھی جاتا ہے روح بھی چاہیے وفا کے لئے
 سر پٹختی ہے شاخ شاخ کے ساتھ تیز کانٹے ہیں اب صبا کے لئے
 برق ہے آنندیاں ہیں طوفان ہیں اپنی عمر گریز پا کے لئے

عمر کھوئی جمیل کیوں ہم نے

نگہ زود آشنا کے لئے



احمد ظفر

رات کے سینے میں یہ چاند کا جادو کیا ہے
 دور تک پھیلی ہوئی زلف کی خوشبو کیا ہے
 تم ستاروں میں مسرت کے تمنائی ہو
 چشمِ افسردہ سے ٹپکا ہوا آنسو کیا ہے
 ہم کسی نغمہ بے نام پہ جاں دیتے ہیں
 ایک ہی راگ کی تصویر یہ ہر دُکھ کیا ہے
 پھر وہی شام گزشتہ کا سا عالم ہے یہاں
 ہر نئی صبح یہ آتشِ گیسو کیا ہے
 ہم تو ہر پھول کو اک زخم سمجھ لیتے ہیں
 آپ کہئے کہ سرِ شام لب جو کیا ہے
 زندگیِ جہنِ مسرت کا ہی پینام سہی
 درد ہی درد مگر پہلو بہ پہلو کیا ہے
 ہم نے برسوں والی بتیا کب دیکھا ہے ظفر
 کیا کہیں دشت میں بھٹکا ہوا آمو کیا ہے



ظفر اقبال

دل میں جو زہر تھا آنکھوں سے ہویدا نہ ہوا
 دیکھ سائل سے بھی اندازہ دے دیا نہ ہوا
 ہائے وہ دل کہ ترے عشق میں اُجڑا ہی نہیں
 آہ وہ گھر کہ ترے شوق میں صحرانہ ہوا
 جس سے تو پیار کرے وصل کا اقرار کرے
 آسماں اُس کے جہاں میں کبھی پیدا نہ ہوا
 میں بھی دل میں تے تھوڑی سی جگہ مانگتا ہوں
 مجھ سے پہلے بھی تو اس بزم میں کیا کیا نہ ہوا
 آنکھ اک زخم ہے اور زخم بھی ایسا یارو
 مرہم دید سے بھی جس کا مداوا نہ ہوا
 کبھی تنہائی میں ملتا وہ ستم گزہم سے
 زندگی ختم ہوئی پر کبھی ایسا نہ ہوا
 دل تو گر قی ہوئی دیوار ہے، رکنے والا
 اس کا سایہ کوئی سایہ ہے، ہوا یا نہ ہوا
 آنکھ بھی لنگ ہوئی، ہونٹ بھی خاموش ہے
 درد پھر اس میں عجب کیا ہے جو سوانہ ہوا
 دل کے خوں ہونے کی اُس بت کو خبر ہی کہتے
 مر چلے ہم مگر احباب سے اتنا نہ ہوا



آتش لدھیا نوی

آرزو کا صلا ہے کیا کیسا کچھ
دل ملا، تو ملا ہے کیا کیسا کچھ

زحمت انتظار، درد سراق
عاشقی کی سزا ہے کیا کیسا کچھ

عشق میں جتسیا کیا کیا کی
اور تماشا ہوا ہے کیا کیسا کچھ

حرفِ دل لب پر لکے پھٹائے
ہر کسی سے سنا ہے کیا کیسا کچھ

روقی بزم، زینتِ در و بام
وہ گئے، تو گیا ہے کیا کیسا کچھ

دل کی آتش ذرا سی لغزش سے
حشر اپنا ہوا ہے کیا کیسا کچھ

پانچ پینی نظمیں

مترجمہ: ابن اث

کیسے کیسے لوگ

’بنگ تانگ ہوو‘۔ کی لانگ لگا کر پھیری والا ٹھہرا
گرو کے اک لستے کو نکل کر چل کلا پھر چکے چکے
نیلے آسمان کے نیچے، چتے چتے بھونے پتھیں
بوہنی چکر کاٹ رہے ہیں، آگے تھپے آگے تھپے

ایک جنم کے بونے نے بھی اپنا لباس بیا دیکھا
ترچھی کروں کے جادو پر جی کو یوں بہلانے لگا ہے
’میں اتنا ٹھنگنا تو نہیں ہوں۔ دنیا کیوں مجھ پر تہتی ہے‘
— جانے وہ ابھیلا لڑکا کیسی باتیں سوچ رہا ہے

پنجرہ اک پنچھی کا تھا، ایک بچا راسودانی سا
دم لینے کو بٹل بھر ٹھہرا، ریتیلی سی راہگزر پر
اور اودھ ویران گلی میں۔ ایک ابھیلا اٹھ لڑکا
کیا جانیں کیا سوچ رہا ہے راہ کئے بچوں بیچ ٹھنگ کر

بھات کا ایک پیالا بیچ میں رکھے چند کیرے بیٹھے
ٹھنڈی آہیں بھرتے جاہیں ”جینا راس نہ آئے سائیں“
نیمند میں کوئی بے سندھ لیٹا ہڈیاں بنکا رہا ہے
(جانے اس نے کیا دیکھا ہے سپنوں میں کیا ٹھکیں آئیں)
کسی نے اس کے بالوں میں اک پھول گلابی ٹانگ دیا ہے
جیسے بریلے میدان میں ڈوبتے سونچ کی پچھائیں
(پائٹن چر لن (جدید)

ایک طرف اک مویوں والا، خواہنے میں دکان سجائے
ایک جہاں سے غافل بیٹھا، کھل ہوا چاقو لہرائے
پیسے سونچ کی کروں میں چکیں کیا کیا چیزیں اس کی
اور اودھ ویران گلی میں، اٹھ لڑکا سوچے جائے

۲

جگنو سے

بارش میں تریا یہ دیپ جلے
کبھی بکھڑ نہ سکے

جھکڑ جو چلے

تری جوت دبے نہیں۔ اور بڑھے

اے جگنو جا!

اور نیل گلن کو جا کے بنا کہیں اپنا وطن

اے جگنو جا!

اور چاند کے پاس پہنچ کے چمکتا تار ابن

کوچ

لو سر و اور تیکھی بہنے لگی پورب کی ہوا
لو برف زمیں پر گرنے لگی گالا گالا
تم دل اپنا مجھے سونپ چکے، کیا سوچتے ہو
اب کوچ کریں گے، لاؤ ہات میں ہات تو دو
یہ وقت نہ یونہی بیت چکے، کیوں دیر کریں
اب آؤ یہاں سے دوڑ چلیں، کہیں دوڑ چلیں

اُتر کی ہوائیں پل پل چھین چھین رہی ہیں
لو چھینیں دھاڑیں، برف کے طوفان چیر گئیں
جب دل اپنا مجھے سونپ چکے، کیا سوچتے ہو
اب کوچ کریں گے، لاؤ ہات میں ہات تو دو
یہ وقت نہ یونہی بیت چکے، کیوں دیر کریں
اب آؤ یہاں سے دوڑ چلیں، کہیں دوڑ چلیں

ہاں لو مڑنے کچھ صورت لال نکالی ہے
پر ڈار تو اُڑتے کوؤں کی وہی کالی ہے
تم دل اپنا مجھے سونپ چکے، کیا سوچتے ہو
لو چرخ چوں رنڈ بڑھ بھی چلا، اب ابھی چکر
یہ وقت نہ یونہی بیت چکے، کیوں دیر کریں
اب آؤ یہاں سے دوڑ چلیں، کہیں دوڑ چلیں

(کنفیو شس)

۴

سرخ رنگ دھوؤ نہیں!

ٹھنڈے پانی کے جوہر میں
دھوبی کپڑے دھوئیں
چھو آچھو چلائیں
نزل پانی، اُجلا پانی کا پیسے اور حق رائے
کسی کے کورے کھائے
میں ڈھیلے بازو اٹکائے
کب تک کھڑا رہوں گا
نیلے جل کے پھولوں میں سے
کتنے توڑ سکوں گا

کوئل رنگ رنگیلے کپڑے
دھوپ میں اور برکھائیں دھول کر
پھیکے پڑتے جائیں
ان کے ساتھ بہاروں کے دن
اور غیشیوں کے سائے
ختم ہوئے مر جھائے
کیا اپنے سندرہ پسینے بھی
یو نہی دھو کا دیں گے؟
خالی خواب رہیں گے؟

پتھر و! دھوبی کی موگر یو!!
پت جھڑکا موسم آیا ہے
لکڑی کے بل پر لے گزرتے
پالے کی پتلی تہ میں سے
میرا سایہ کانپ رہا ہے

۵

برف کا کالا

برف کا میں اک کالا ہوتا
موج اڑانے والا ہوتا
ہر اک منزل، ہر اک رستا
میرا دیکھا جالا ہوتا

رپ رپ رپ رپ — خیر برادر
میں تو چلا نیچے دھرتی پر

اونچی رنگا رنگ فضا میں
آن بان سے گھوما کرتا
بجھنی کی بجبیاں جا کر
بجھنی کی رہ دیکھا کرتا

رپ رپ رپ رپ — اُس کے توہر سو
ناچ رہی ہے بھیننی خوشبو،

میں نہ کسی وادی میں جانا
اور نہ کسی ویراں گھاسی پر
میں نہ کہیں گلیوں میں جھکتا
آوارہ سا — ایدھر اُدھر

رپ رپ رپ رپ — دیکھ نہ بھائی
میری بھی اک منزل ٹھہری

تب میں یونہی اڑتا اڑتا
اُس کی چوٹی کو ہسلا تا
اُس کے سینے کی لہروں میں
اپنے من کا منشا پاتا
اُن کو لہروں میں آخِر
گھل جاتا — بس گھل ہی جاتا

تنقید شعر اور حالی

عبد القادر سروری

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کر سکتے کہ شعر کی ایک حد تک حالی کے تنقیدی کارنامے حد تک نعتیہ کہلا سکتے ہیں۔ حالی سے پہلے اردو تنقید زیادہ تر صوری اور اسلوبی تنقید تھی جس میں شعر کے صوری محاسن، زبان اور اسلوب کی نزاکتوں کے بارے میں اتنا سے مل جاتے ہیں اور بدیع معانی اور دمع و منہ پر کھل کر بحث کی جاتی ہے۔ نثر عام طور پر مجاہدے اہل نگاروں کی چھان بین سے بے نیاز رہی اور شعر کی اہمیت کے د نظر صاحبان ذوق کی ترجمہ زیادہ تر شاعری پر مرکوز رہی۔ جدید عہد سے پہلے اردو نثر کی اصناف بھی کئی تھیں اور اگر کبھی کسی نے نثر کے بارے میں اظہار خیال کرنا چاہا ہے تو جو صرف، زعفران، محاورہ اور صحت الفاظ ہی تک محدود رہی۔ بعض وقت شریک یا پور پر مستند ادیبوں نے نثر نگاروں کی اس طرح کی تحریروں کا اچھا خاصہ ذخیرہ اُمداد میں سمیٹا ہے۔ لیکن نثر نگاروں کی باتیں ہر وقت ہیں۔ نثر تنقید سے مستحق کچھ شاعر نے بعض تحریروں میں ایسے بھی کیے ہیں جن میں کوئی ادبی کا دھار کی زبان یا محاورہ پر قمر بیض کی گئی ہے۔ ایسی تحریروں میں ترجمہ ایک سرور کے جناح عجب، کاویا سحر کا مال ذکر ہے جس میں سرور نے میر اس کی "بارغ و بہار" کی زبان پر قمر بیض کی جگہ کر۔ "میرا منی صاحب سچو، درویش میں بکھیرا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن دھتے ہیں یہ زبان آئی ہے۔ دہانے دھتے ہیں محاورے کے ہاتھ نہ توڑے ہیں۔ پھر پڑی دی کی کچھ پہی خیالی انسان کا نام ہوتا ہے، مفت یم بنایا نام بد نام ہوتا ہے، بشر کو دعویٰ کب منور ہوا ہے۔ کالموں کو ہیرو وہ کوئی سے نکال کر بکا، نیک و نیک ہے۔" انیسٹ کہ خود جو کہ عطار کو بد۔ یہ وہی مثل سننے میں آتی رہا۔ کہ اپنے منہ سے دھانی

ایک سہریں بہت جمل ہیں اور اکثر دقات قمر بیض کی کبھی کبھی طنز و استعزاء کی صورت میں آ کر قریبی ہیں۔ ایسی تنقیدیں کم موزنی تنقید بھی نہیں کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اہل ذوق تنقید کی یہ شامیں بھر سکتی ہیں۔

عہد جدید سے پہلے ہمارے یہاں ذوقی تنقید کے کچھ اشارے بعض وقت ہمارے سنجیدہ نگار تذکرہ نگاروں اور قدیم دور کے چند شعرا کے کارنامے مل جاتے ہیں۔ لیکن یہ زیادہ تر نثر سے نقل رکھتے ہیں اور صوری تنقید کو شائیں لکھا جاسکتی ہیں اس نوع کی تنقید کی یہ بھی مثال کو لکھنے کے قدیم شعرا میں بھی مل سکتی ہے۔ "قطب" نے "میرا منی" اور "شرح شعر گو" کے عنوان سے اس نے جو پانچ حصے لکھے ہیں ان میں وہ بھی نے شعر کو جانچنے کے معیار پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب ہے۔

کتاب جو کہ تنقید پند کی ایک بابت، کو بہت مستعد و اس میں دھار و دھار نہایت

ان اشارے سے شعر کے جو معیار ملے آتے ہیں مدد ہیں کہ شعر میں ملاست اور صفائی نزاکت اور تازگی ضرور ہوتی ہے اور اثر شعر کا بنیادی وصف ہے۔

یہاں اردو کے شعرا میں جنسی (۱۸۵۵ء) نے اپنی مثنوی "قد ہے نفیر" کے آغاز میں سخن اور شعر کی تعریف میں کئی شعر لکھے ہیں۔
 قییم شعرا میں کلام اور شعر دونوں کے لیے استعمال کرتے تھے جنسی شعر کی روحانی قدروں کا زیادہ قابل نظر آتا ہے۔ کتاب ہے

سخن گنج ہے عالم الغیب کا سخن موج زن ملک لاریب کا
 آگے وہ شعر کی حلاوت اور اس کی جان بخش خصوصیت بارے میں لکھتا ہے

سخنی ات ٹھکانی میں مسلا اے سخن سفرۂ من و سلوا اے
 رکھن ہر سر ہنر دل کا حسن !! سخن بے سخن ہے سخن ہے سخن

وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ معنی اور کندہ ذہن عمدہ شعر سر انجام نہیں کر سکتا
 کہاں ہے کوئی نہ شعر سلیم کہے کاٹ کا آن درہ برگ نیم !

صنعتی، سخن سنجی پر بھی غمی کو فوجیت دیتا ہے۔
 زیادہ ہے نزدیک اہل قیاس سخن دانے لے سخن کا قیاس

شعر کے حسن و قبح کو جاننے کے یہ معیار قییم ہیں۔ مشرق میں بھی معیار پرانے زمانے سے قائم رہے ہیں۔ مغرب میں یونانیوں کے یہاں بھی کچھ اسی طرح کے معیار تھے۔ یونان پرانے کربزبان کے علاوہ اپنی معیاری اور سلاطین ادبی اصناف کی بنا پر ادبی اور تنقید شعری کے اصول مرتب کرتے رہے ہیں۔ عربوں میں ابن اریق اور دوسرے عربی نے تنقید شعری کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ زیادہ تر قصیدہ کو معیار مان کر لکھا۔ اصناف ادب کے ارتقاء میں قومی مزاج اور طبیعت کو بہت دخل ہوتا ہے۔ علمائے اکثر یہ کہتے ہیں کہ اپنی مانوس ادبی اصناف کی بنا پر جو تنقیدی اصول مرتب ہو سکتے تھے انہیں عربیت کی شکل دے دی۔ یونانی علمائے عمر تائیدی کیا ہے۔ مثلاً دو اعداد زبان مرتب کرتے ہوئے انہوں نے اپنی زبان کے جو قواعد برکتے تھے انہیں معیار مان کر دنیا کی دوسری ساری زبانوں پر انہیں کو منطبق کرنے کی کوشش کی۔ زبان کی طرح شعری تنقید میں بھی انہوں نے یہی کیا۔ اپنی ادبی اصناف کے مطابق سے جو اصول استخراج ہوئے تھے انہیں عربی شکل دے دی، یونانی شاعری میں رزمیہ، لبرک و غنائی اور ترکیبی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس اعتبار سے جو اصول تنقید شعری کے ان کے یہاں مرتب ہوئے ان کی بنیاد بھی اصناف تھیں اور اسی طرح انہوں نے زبان کے قاعدوں میں تعمیر کر کے انہیں ساری دنیا کی زبانوں پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح اپنے شعری تنقید کے اصول کی کوشش پر عام طور پر یونانیوں کی کوشش کی۔ زبان کے بہت سے علمائے ایسے تھے جو اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبان بھی جانتے تھے۔ زبان کی قییم ترین تحریری تنقید کے جو آثار ملتے ہیں ان سے تنقیدے بارے میں دو تصورات واضح ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ شعر میں اثر یا دلکشی ہونی چاہیے اور دوسرے یہ کہ شعر صداقت کا مظہر ہوتا ہے۔

جہاں تک شعر کے اثر اور دلکشی کے اصول کا تعلق ہے مغرب اور مشرق میں ہم آہنگی ہے صداقت شعری کے سلسلے میں تصورات بہت سے نشیب و نشا اڑ سے گزرے ہیں، شعری صداقت کا سائنٹیفک اور داخی تصور ابھرتے ابھرتے بہت بڑھ چکا گیا
 حالی سے پہلے شعر کے کلام کے علاوہ تنقید شعری کے کچھ اشارے ہم کو بعض تذکروں میں بھی مل جاتے ہیں۔ یہ اشارے

اصل کی ضرورت میں بہت کم ہیں مگر کچھ اصل عمل تنقید دل سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ اس تلاش اور تحقیق سے جو اصل تنقید شعور کے بارے میں دنیا پر ہوتی ہے وہ بہت تر محفل میں ملے گی دوسری بات یہ ہے کہ زیادہ تر عربی بعد از دسی شاعری میں مروج اور مقبول اصناف کی بنا پر مذہب اور مذہب کے متعلقہ خیالات سے کمال اصل کی ساری دنیا کی شاعری پر لاگو نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح کسی انداز کے مخصوص اصناف شعر کے اصل پر اردو شاعری کی تنقید نہیں کی جاسکتی۔

اصل بات یہ ہے کہ تنقید شعور کے مجرد اور مطلق اصولوں کو ترقی کرتے اور نشوونما پاتے پاتے کافی موصوفہ مل گیا۔ یہ اصل ذمہ دہ انداز میں نشوونما اور تحقیق آج بھی ان کے طریقوں کے ترقی پانے کے ساتھ ساتھ نشوونما پاتے ہیں۔ انسانی انداز تحقیق کے طریقوں سے شرق اور ہندوستان عام طور پر انیسویں صدی عیسوی سے پہلے، اوس نہیں تھے۔ انیسویں صدی کے وسط سے جب وہیں اور خاص طور پر انگریزی ادب ایک برتر اور ناقص کے اب کی حیثیت سے اردو کے علاوہ دوسرے ادب سے ہوا تو اس سے ہمارے علم کی اثر پذیری ایک فطری بات تھی۔ آزاد اور حال کو لا ہوں کچھ تو بعض انگریزوں کی ترغیب دلانے پر خاص طور پر حالی کو ترجمے کے حکمے میں کام کرنے ہوئے مغربی ادبی کارناموں اور ان کے دیباچوں اور مقدمات سے ان کی کوئی وجہ سے اپنے ادبی کارناموں کو بھی مغربی اصول تنقید پر جانچنے کی خواہش نظر آتا پیدا ہوئی۔ اس میں کچھ ضرورت کو دخل تھا اور کچھ اعتنائے خودت۔

حالی جب شعور و شاعری کا جائزہ لینے بیٹھے تو ان کے سامنے شعری تنقید کے کچھ عمومی اور مجرد اصول تھے، جن پر انہوں نے اپنے کارنامے "مقدمہ شعور و شاعری" کے ابتدائی حصے میں بحث کی ہے۔ اس کے آخری حصے میں، انی اصولوں پر اردو شاعری کی مختلف اصناف کو جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقدمہ شعور و شاعری ہندوستان کی جدید زبانوں میں شعری تنقید کے مغربی اصولوں پر لکھی ہوئی اولین کتاب ہے۔ اردو میں بلاشبہ یہ اولین متنقل کتاب ہے جس میں شعور کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے اور مردوجہ شعری اصناف اور اسالیب پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے اس سے پہلے شعر کو پرکھنے کے جو معیار ہمارے افکار پر دازوں کے سامنے تھے، وہ بہت کچھ مختلف تھے۔ عام طور پر منظم اور متعینی کلام کو شعر سمجھا جاتا تھا یہ صحیح ہے کہ شعر کا تصور اور اسلوب بھی پیش نظر رہتا تھا لیکن بر حیثیت مجموعی یہ کم دیکھا جاتا تھا کہ کیا کلام حارہ ہے۔ بلکہ تو یہ اس بات پر زیادہ توجہ تھی کہ کس طرح کلام حارہ ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اہمیت زیادہ تر اس بات کو دی جاتی تھی کہ کوئی شاعر مجرد اور تانیہ کی اصول کی کمال تک پابندی کرے گا ہے اور زبان روزمرہ اور محاورے کی صحت کا کس حد تک خیال رکھتا ہے۔

حال سے پہلے کی تنقید کے غرنے ہمارے شعر کے تذکرہ میں ملتے ہیں۔ تذکرہ دل کا آغاز کسی شاعر کے کلام کی پسند سے ہوتا تھا۔ اچھے شعر یا خاص میں زیادہ اشت کے لیے نگاہ لیتے جاتے تھے اور شاعر کے بارے میں بھی کچھ سمجھات تھیں کہ لہائی تھیں۔ رشتہ رشتہ تذکرہ نگاری کے کچھ اصول بھی نشوونما پائے اور یہ شاعری کی تاریخ کی شکل اختیار کرتے گئے لیکن شعرا کی یہ تاریخ دراصل مطالعے کے لیے خام مواد کا گھارا ہوا تھی کہ نہ شاعر کی زندگی اور حالات کے بارے میں بہت کم چھان بین کی جاتی تھی۔ شعری پسند یا پسند کی بنیادیں انفرادی ذوق ہوتا تھا۔ شعر کی تنقید جیسا کہ مختصر حالہ صاحبین نے لکھا ہے شعر کو عرض کی کسی نہ کی گئی۔ اس کے فطری اور ترکیبوں پر اساتذہ کی سند لانا اور تذکرہ و ثانیست کی بحثوں میں الجھنا سمجھا جاتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ حالی سے ہے اندسے انگریزیاں کچھ نئے شعاعوں کی طرح ڈالتے ہوئے تھیں۔ یہی تھی کہ ۱۸۷۷ء میں مباحثہ
 سرحدی تنقید کے لیے انشاد سے ملے ہیں۔ آزاد کو نے نظم اور کلام مرادوں کے بارے میں خیالات ظاہر کرتے ہوئے شریک حیرت انگیز
 تحریریں بہت زیادہ کیا تھا۔ اسکا سفر ایران کے کچھ خیالات کی روشنی میں لکھی گئی۔ آزاد کو فارسی شاعری سے جو گناہ تھا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا
 کہ انھوں نے ردی اور سہمی کی شاعری کو نہ بھلا کر اور نہ کلام مقصد پند فصاحت اور بے اسیرت کا ہر وہاں پر لکھا تھا۔ آزاد کا یہ نظریہ
 دراصل شریک اخلاقی قدروں اور اپنا نقطہء نظر، خاصہ شریک کے وجود و تعداد کے پس تمام کلکی قابل قبول نہیں۔ اخلاقی قد حقیقت میں حیاتی
 قدروں کا ہے صرف ایک مقصد ہے شریک تبدیل ہاس سے کہیں زیادہ دیکھیں۔ اسی تحریر میں اندسے نے اردو شاعری کے فرد و انداز پر
 بھی بحث کی ہے۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جہاں تک عبارت کا اردو، مضمون کا جوش و خروش اور لطافت و صافی کے سامان کا تسلی ہے
 وہاں سے ہر گز اس قدر دے گئے ہیں کہ اس معاملے میں ہماری زبان کی کمی کم نہیں۔ لیکن انہیں انہیں ہوتا ہے کہ ہمارے شاعر اسی قدر
 اور جوش کو بے اصل اور معدوم پا کر ان میں صاف کر رہے ہیں۔ وہ چند غیر ضروری اصطلاحوں میں گھر کر محسوس ہو گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی
 حسرت آتی ہے جب میں زبان انگریزی میں دیکھتا ہوں کہ ہر شے کے مطابق و مضامین نثر سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نظم کہتے ہیں اور
 حتیٰ کہ کلام میں جہاں والی دیتے ہیں۔ وہ جوش میں آکر اپنے اپنی وطن کو ابھارتے ہیں کہ۔

تمہاری شاعری جو چند محدود اصطلاحوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو نہیں
 تو تمہاری اولاد ایسا ہی ہے کہ وہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہو گئی۔

آزاد کی تقریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں کچھ تو غالباً بیوقوف یا کرکٹ حوالہ کے ایسا پر اور کچھ انگریزی شاعری کے نو فوں
 کو دیکھ کر اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اردو شاعری کچھ غیر ضروری حدود میں گھر گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کو کھٹکھٹا ہٹا کر اس سے باہر نکلنے کی کیا
 سبیل انہوں نے بتائی تھی؟ اور شاعروں کے لیے کیا مبینہ نظام تجویز کیا تھا؟ اس بارے میں آزاد کی تقریر اور پھر ت کوئی رہنمائی نہیں
 ہوتی۔ صرف تباہ اندازہ ہوتا ہے کہ منزل کی انہیں کچھ شعور تھا لیکن اہل منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی مبینہ راہ وہ نہ بتا سکے۔ اس کا سبب
 شاید یہ ہو کہ آزاد ایک انشاد پر از سنئے تجزیہ اور تخیل سے ان کی طبیعت کو نگاہ نہ تھا، وہ کچھ بھی بڑا، واقعہ ہے کہ آزاد میں اس کی شخصیت تو
 کہ سکے لیکن صلاح تجویز نہ کر سکے۔ اس لیے آزاد کی تقریر اور پھر شریک تنقید کا کوئی نظام مرتب نہیں کر سکا۔ ان سے محض شاعر کے معاملے میں
 نئے معیار کی تلاش کا پتہ چلتا ہے اور موجودہ شاعری کے بیچ سے انکسار کا اظہار ہوتا ہے۔ اس بات کو آزاد نے اندسے کی طرح ظاہر کر دیا ہے
 کہ جیسے شعر نے اپنی فضا کو غیر ضروری طور پر محدود کر لیا ہے حالانکہ وہ چاہتے تو فضا کی دستروں سے کام لے سکتے تھے۔

آزاد کے شاگرد غلام حیدر رنار کے ایک بیان سے جو نظم آزاد کے آخر میں چھاپا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کی تقریروں نے
 لابی لی بل پر پارک دی تھی اور آزاد کے انبرہ آغا محمد ہمدانی نے اس کے آزاد کے ”وہم راہ غلط“ کرتے ہی ہر طرف سے حاسمت کے
 زبرد سے ملے۔

اس میں منظر میں جب ہم ”مقدمہ شعر و شاعری“ پر نظر ڈالتے ہیں تو ان اور ان میں پہلی دفعہ ہم کو شعر اور مطالعہ شعر کے سادے
 پہلوؤں پر ایک نئے انداز سے روشنی پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ حالی کی بحث اور بحثیں کا انداز اور ان کے اکثر مباحثہ وہی ہیں جو
 جدید تنقید کے موضوع ہیں۔

حالی بشعر و شاعری پر قلم اٹھاتے ہوئے سب سے پہلے شعر کی ضرورت کا جواز دیا تھا، کہنا تھا، اس کی ضرورت اس وجہ سے بھی تھی کہ زبان کے لیے بڑے مفکر و افلاطون نے اپنے ہم عصر کے خیالی ڈھانچے سے شاعر کو سکے سے خارج کر دیا تھا۔ افلاطون کے ذہن سے صحیح یا غلط طریقہ سرچنے والے ادبی کئی علاقے پس سماجی نظام میں شاعر کی ضرورت تسلیم ہی نہیں بعض اہل رائے ایسے بھی ہیں جو شعر کو جاہلیت کی یادگار سمجھتے ہیں اس لیے آج کی تباہی دنیا میں انہیں شعر کا کوئی متبادل نظر نہیں آتا۔ حالی کے لیے اس نقطہ خیالی کو رد کرنا آسان کام نہیں تھا، لیکن انہوں نے فطرت و طبیعت اور فطرت کے دل سے سرچنے کی صلاحیت کی مدد سے اس نقطہ خیالی کی بڑی خوبی سے اصلاح کی ہے۔ حالی نے شعر کے جواز میں یہ استدلال پیش کیا ہے کہ حکیم علی الاطلاق سے اس دیرانہ آکامد یعنی کاروانہ دنیا کی بدلتی اور انتظام کے ایسے انسان کے منتفع گرد و حور میں مختلف صلاحیتیں پیدا کی ہیں، اگرچہ ان میں بعض جماعتوں کے کام ایسے بھی ہیں جو سراسمٹی کے حق میں جذبہ سود مند نہیں مہم جو رہتے مگر جو کچھ تمام انزل سے ان کی یہی حصہ پہنچا ہے اس لیے وہ اپنی قیمت پر قائل اور اپنی کرشماتوں میں سرگرم ہیں جو شخص اس عطیہ الہی کو مستغنائے فطرت کے موافق کام میں لائے گا ممکن نہیں کہ اس سے سراسمٹی کو کچھ نفع نہ پہنچے۔

حالی کا یہ استدلال اس انداز کا ہے کہ منکر بھی سوچنے پر اہل ہو جائے گا۔ حالی نے سماج میں شعر کی ضرورت کے مسئلے کو اور آگے بڑھانے کے لیے شعر کی تاثیر کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔ اندل لال کا یہ طریقہ جدید یعنی طبع لفظ ہے جو کسی مسئلے کو ثابت کرنے میں بہت دوزی رہتا ہے۔

حالی نے ان لوگوں کے خیالی کی بھی بڑے سلیقے سے اصلاح کی ہے جو شعر کو زمانہ جاہلیت کی یادگار سمجھتے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ شاعری شائستگی میں بھی قائم رہ سکتی ہے۔

شعر کی اخلاقی قدروں کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے، کچھ علما و شاعر کے ساتھ کسی انادری یا زریقی مقصد کے واسطے کئے جانے کے خیالی ہی سے جزبہ ہوتے ہیں یہ وہ ادھاری جو اس زبردستی ہیں کہ شعر کا مقصد محض شعر ہے، شعر سے دوسرا شعر کا کوئی مقصد قرار دینا ان کے خیالی میں بد ذہنی ہے، کچھ اور علما اس خیالی کو رد کرتے بغیر شعر کی اخلاقی قدروں کو سب سے اہم سمجھتے ہیں، آزاد کا خیالی اس بارے میں اور پر تیار ہوا چکا ہے، حال بھی اس مسلک کے حامی ہیں، چنانچہ "مقدور" میں یہ بحث انہوں نے بڑی خوبی سے کی ہے کہ شعر انسان کی روحانی خوشنودی کو اگاتا ہے، انسان کی روحانی خوشنودی کے ساتھ اخلاق کا تعلق یہی ہے پھر انہوں نے اس بحث کی وضاحت کی ہے کہ شعر، علم اخلاقی کی طرح براہ راست متبعین اور تربیت نہیں کرتا، لیکن از روئے الصفات اس کو عام اخلاق کا نائب مناب کہہ سکتے ہیں، اس کی تائید میں ان صدیوں کے مسلک کو پیش کیا ہے جو سماج کو قرب الہی اور مذکورہ نفس کا ذریعہ مانتے ہیں، حالی کہتے ہیں کہ سماج کا رکن شعر ہی ہے، شعر کی ضرورت اور اہمیت کے مسئلے کو زینہ بزیہ اٹھانے کے بعد حالی ذہن کو شعر کی خلعت کی طعن متقبل کرتے ہیں۔ شعر کی تاثیر کو مسلم اور ماس کی اخلاق قدر کر رہی مانتے کے بعد حالی اپنے پیش رو علما کی بقصدی پر قناعت نہیں کر لیتے، وہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ شاعری سب کچھ مرنے کا دوا و سرسماٹی کے تابع ہے اس مسئلے پر حالی تطویل اور مدلل بحث کی ہے۔ اور شعر کو عالم تخیل سے دینا تو اب دکل نہیں آتا دیا ہے، حالی کی بحث سے بظاہر یہ مستفاد ہوتا ہے کہ شاعری میں جب بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اس کی وجوہات کی تلاش ہم کو سماج میں کرنا چاہیے، لیکن اس اصول کو اپنی لینے کے بعد ہمیں پر د کا نہیں جاسکتا، استفادہ اکی مدد سے ہم بھی کچھ کہتے ہیں کہ شاعری کا مبداء بھی سماج ہے، شاعری سماج سے اٹھتی ہے سماج میں جیتی ہے، سماج حیات ملی ہے اور خیالی

میں محبت ہے جو شاعری سماج سے اپنے رشتے توڑ دیتی ہے۔ وہ حیات سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے اور اپنے مبداسے کٹ جاتی ہے۔ حالی نے شاعری کو سماج کے تابع بنا کر حقیقت میں اردو شاعری اور نقادوں کے ذہن کو نہایت ترقی پر دوں گھور سے روشناس کر دیا تھا۔

شعر کی ناہست اور شعر کے عناصر بالازم سے بھی حالی نے بحث کی ہے۔ بحث بھی چند حوا کا غاص سے خالی نہیں ہے۔ مثلاً قافیہ اور دلیل کی جھجکا اور ہمارے پر قدم اٹھانے والے شاعر دل سے حالی کا یہ گناہ کاغذ اور دلیل شعر کے لازم سے نہیں بلکہ نظم کے لوازمات سے ہیں۔ ان کی ماری ذہنی دنیاوں کو ڈھانے کے مترادف تھا۔

اپنے تجربہ پسندوں کی مدد سے حالی نے شعر اور نظم یعنی "پوسٹری" اور "پوس" کے درمیان پہلی دفعہ فرق کیا، شاعری کی شرطیں ہیں جس کے ہم شرط انہوں نے مطالعہ کائنات کی نظر کی ہے۔ یہی مد اہل وہ پہلے جہاں ہمارے پرانے شاعر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اپنے اندام کے لیے، جو عین فطرت کا مطالعہ کرنے کی بجائے، انہوں نے اساتذہ کے دیوان ٹرنے کو زیادہ پسند کیا۔ دوسروں کی زمین غزل پر صرف کرنا بڑے فکر کی بات بھی جاتی تھی، مضمون پر مضمون باندھنے کی عادت تھی، دراصل اسی کو تاری کا تجربہ ہے۔

حالی نے بھی تفصیل لکھی ہے کہ شعر میں کیا خوبیاں ہونی چاہیں۔ یہ وہی ادبی کو انگریزی کے شہور شاعر، لیکن سے حاصل ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں تاریخ تنقید میں، لیکن کے تنقیدی خیالات کی اہمیت اتنی زیادہ نہیں تھی کہ سب اہم کارنامہ یہ تھا کہ اس نے شعر میں قافیہ کے التزام کی مخالفت اور بے قافیہ نظم کی وکالت کی تھی۔ لیکن چونکہ وہ بڑا شاعر تھا، اور حالی کے زمانہ میں وہ مستقبل انگریزی شاعر تھا، اس لیے حالی نے اس کے بغیر اصل کی تعریف شعر کے بغیر ہی اصول سمجھ دیا اور اسی سے انہوں نے جہاں تک شعر کی معنوی تہیہ کا تعلق تھا، کام لیا۔ مادگی اصلیت اور جوش، جو لیکن کی نظر میں، شعر کے لازمی اجزاء ہیں، ان میں وہ اجزاء، یعنی مادگی اور اصلیت سے، حالی سے عین پسے کی شاعری، بیگانہ جو ہمیں بھی جوش، یا ایک اور نقاد کے الفاظ میں، جذبات کا از خود چھلکاؤ، یا تو سر سے پایا ہی نہیں جاتا تھا، اور شعر ذہنی کاوش کا نمونہ بن گیا تھا، یا جو بے موقع اور حد سے بڑھا ہوا تھا۔

حالی نے "مطلق حقیقت" سے، مادگی اور اصلیت کا حق احتیاج سے تجربہ کیا ہے، وہ آج بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ شاعری میں جوش کے عنصر کو سمجھتے ہوئے انہوں نے نہ صرف اردو شاعری پر بھی تبصرہ کیا ہے، اور اس میں دو سارے امور گناہے ہیں جن کی وجہ سے، ہماری شاعری، مادگی، اصلیت اور جوش، سب دور ہو رہی تھی۔ یہ تبصرہ حقیقت میں، حالی کے مطالعے کی وسعت اور نگاہ اتنی کا پوڑ ہے۔ انہوں نے لیکن کے اصول، انگریزی میں، اردو غزل اور قصیدہ کا بھی جائزہ دیا ہے۔ حالی کی صحت پسند طبیعت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ "خدا نے سخن" تیر کی شاعری میں ماری خوبیاں ہی خوبیاں دیکھے۔ چنانچہ مادگی بیان کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

اگرچہ ہمارے بعض شعرا ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے مادگی بیان کو سب چیزوں پر مقدم سمجھا ہے جیسے میر، درد، اثر اور مصطفیٰ وغیرہ لیکن چونکہ انہوں نے قدما کے خیالات، سنہ میں سے بہت کم تجربہ کیا ہے، اس لیے ان کے دیوال زیادہ تر بھرتی اور پر کن اشارت سے جس کے ہوئے ہیں۔

کسی یہ اور حالی کے زمانے میں ایک اصطلاح "نیچرل شاعری" کی پل پڑی تھی جسے ادبی حلقوں میں اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہ نیچرل شاعری کو وہ یہ مقدم مہانتے تھے کہ وہ شاعری ہے، جو غزلوں سے مزین ہے اور جس میں نیچرل خیالات اور تصورات پیش کئے جاتے ہیں۔ سرسید اور حالی "نیچرل" کہلاتے تھے، چنانچہ سرسید کی اصلاحی مراسع کے مخالفین اور ادیبوں کا وہ کردہ جو

حالی نے محض اصول اور ضابطے مدد لی کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان اصناف کو اپنے بیان کیلئے پرئے اصولوں کے مطابق بننا بھی۔ حالی کی عظمت کا حقیقت میں بہت بڑا سبب ہے۔ اصول سازی جویشہ آسان کام ہے، لیکن عملاً ان اصولوں کو اختیار کرنا، آسان نہیں۔

عملی شرعی تنقید کے کارناموں میں حالی کی تصانیف، حیاتِ سعادت اور "یادگار غالب" حالی کے مضبوط اور نئے ہیں حیاتِ سعادت میں، سعادت کے کلام اور تصانیف پر حالی کی تنقید کا ایک حصہ ان کی تصانیف کی بقولیت سے متعلق ہے جو حصہ کلام اور تصانیف کی براہ راست تنقید سے متعلق ہے، اس میں نکلا حصہ حالی نے "مقدمہ کے مینہ اصولوں کی سختی سے پابندی نہیں کی، بلکہ بعض جگہ تنقید کے ہدایتی انداز سے بھی کام لیا ہے۔ اس حصے میں وہ قطعی تنقید کے طریقے سے بھی کام لیتے ہیں اور اپنے ماضی انصاف کی وضاحت کرتے ہیں۔

اُدو شاعری کی عملی تنقید میں "یادگار غالب" وہ حصہ بہت لکھا ہے جس میں حالی نے مرزا کے کلام پر "ریور" کیا ہے۔ یہ حقیقت میں وہ مقام تھا، جمالِ حالی، اپنے مقدمہ اصولوں سے زیادہ سے زیادہ وابستہ رکھتے تھے۔ لیکن انھوں نے بعض اور عملاً کی طرح اپنے آپ کو اصولوں سے سختی کے ساتھ بندھا رہا رکھنے کی بجائے، کسی قدر آزاد روی سے بھی کام لیا ہے اور خیالات کے سجاد کے رُخ پر نکل گئے ہیں۔ اصل میں اچھی تنقید بھی ممکن ہوتی ہے اور نیکی کے تحت شعور میں اصول کا رد فرما کر کہتے ہیں، لیکن مصنف کا ان کے ساتھ ٹھک جانا، اکثر عمدہ تحقیق کا باعث نہیں بنتا۔ حالی کی تنقید کا اصل موضوع تو مرزا غالب کی غزل گئی ہے۔ لیکن ان کے قطعات اور رباعیوں کی جانب بھی عملِ انشائیہ سے ملے ہیں۔

مرزا کی غزل پر حالی کی تنقید کا اسلوب کچھ ہدایتی سا بن گیا ہے۔ وہ غزل گئی کو یہ حیثیت مجموعی حائرہ نہیں دے سکے ہیں بلکہ اپنے جائزہ کاروں نے خالوں میں بانٹ لیا ہے مختلف عزائمات تا تم کو کے ان کے ماتحت غالب کے اشعار پیش کرنے اور ان کی شرح کرنے کے طریقے کو حالی نے پسند کیا ہے۔ ایک بات ضرور قابلِ توجہ ہے کہ حالی نے تنقید خصوصاً اور اسلوب تنقید تک محدود نہیں رکھا۔ اس تنقید میں یہ بات واضح ہے کہ حالی کی معمولات کا دائرہ محدود تھا، اس لیے وہ مغرب کے غنائی شعرا سے غالب کی غزل کا قطعی مطالعہ نہیں کر سکے۔ انہوں نے عام طور پر فارسی کے غزل گو شعرا سے بھی غالب کا مقابلہ نہیں کیا اور یہ ضروری بھی نہیں تھا۔ بلکہ بعض وقت ایسا مقابلہ خطرناک بن جاتا ہے۔ جمالی تک غالب کے کلام کی شرح اور تفہیم کا تعلق ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حالی کی تشریحوں نے، اس کے محاسن اور معنویت کی جانب زکون کی توجہ منصف کرانے میں بنیادی خدمت انجام دی

"یادگار" میں حالی نے مرزا کی اُدو تشریح پر بھی نظر ڈالی ہے۔ لیکن حالی کی شرعی تنقید، اس انشائیہ کے موضوع سے خارج ہے۔

داراشکوہ کا دیوان

پروفیسر محمد علم الدین سالک

شہزادہ داراشکوہ، شاہ جہان کا بے بڑا بیٹا تھا۔ باپ وہاں سے بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عہدِ غل کی پہلی دوا دلا دیں روکیاں تھیں۔ شاہ جہان کو لڑ کر کراؤا بڑا بڑا تھی۔ اس غرض کے لیے اکثر خواجہ معین الدین حسینی (جو میری کے استاد) ہمارے پر حاضر ہوا کرتا تھا۔ آخر اس کی دعا قبول ہوئی اور داراشکوہ ۲۹ صفر ۱۰۲۷ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۶۱۸ء کو آگرہ کے مقام پر پیدا ہوا۔ دھڑلہ عزم سے کو مقامِ وطن کی کیا گیا۔ ایک شاعر نے اس واقعہ کی عجیب و غریب تاریخ لکھی ہے۔

عقل پائے ادب گرفت و گفت نقل داراشکوہ شد تاریخ

$$۲ + ۱۰۶۷ = ۱۰۶۹$$

داراشکوہ کی تعلیم و تربیت عام مثل شہزادوں کی طرح بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ اس زمانے کے مشہور اساتذہ اعلیٰ اس کی تعلیم و تربیت پر مقرر ہوئے۔ ان میں مولانا عبدالمطیف لطیف لکھنوی، علامہ میرزا ابوالفتح فیروزی کا ذکر داراشکوہ کے اساتذہ کی فہرست میں ملتا ہے۔ خطاطی اس زمانے میں ایک شاہانہ وصف سمجھا جاتا تھا۔ داراشکوہ نے تہذیب کا مشہور عالم استاد عبدالرشید دہلوی سے کمال حاصل کیا اور اس نے اس فن میں خوب مہارت حاصل کی۔ ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں داراشکوہ کی لکھی کتابیں اور تصانیف آج بھی ملتی ہیں جن سے اس کے کمالِ فن کا پتہ چلتا ہے۔

فنونِ سپہ گری کے بغیر شہزادوں کی تعلیم مکمل نہ بھی جاتی تھی۔ داراشکوہ نے اس میں بھی کمال حاصل کیا۔ سامانِ لڑائی کا معرکہ داراشکوہ کی سپاہیانہ مہارت کا آئینہ دار ہے۔

بہر حال داراشکوہ اپنے دادا شہنشاہ جہانگیر اور اپنے باپ شاہ جہان کی سرپرستی میں رہ کر گونا گوں کمالات حاصل کیے اور اسے "شاہِ بلند آقبال" کا خطاب ملا۔ طبیعت میں شہرت کا مذاق موجود تھا۔ اس پر کثرتِ حق کا جہنمِ داغ میں سا گیا۔ اس لیے اس کی تصانیف میں ایسی ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو اسلام کے نقطہ نظر سے قابلِ اعتراض ہیں۔ گویا بعض اربابِ تصوف نے انہیں مختلف پہلوؤں پر ہمارے عین اسلام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ داراشکوہ آزاد روی، تلاشِ حق کا سودا اور دنیا و عبادت سے گراؤ کوشی کی وجہ سے اس قسم کی باتوں کا پیدا ہو جانا لازمی تھا۔

داراشکوہ جو ان جہاتِ تصنیف کا قلم اس کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ ۱۰۴۹ھ میں جب وہ آگرہ کی پچیس بہار میں دیکھ چکا تھا۔ اس نے

یہ تصنیف دنیا کے سامنے پیش کی۔ یہ سفینۂ الاولیٰ تھی جس میں اس نے چار سرگیاں بزرگانِ دین کے حالات کھسے ہیں۔ اس کتاب میں اپنے آپ کو حنفی ائمہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۰۲۰ھ رمضان ۱۰۲۰ھ کو مکمل ہوئی جس کے مختصر اور عمدہ بعد وہ ملا شاہ بخارا کے مریدوں میں شامل ہوا۔ اس کے تین برس بعد ۱۰۲۵ھ میں اس نے اپنی دوسری کتاب سفینۂ الاولیاء لکھی جس میں دارائے نوے نوے مریدوں کے حروفِ حیات بیان کیے ہیں۔ وہ اکثر انہیں حضرت ہادی نعمانی کتاب ہے اور حسنات العارین میں اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے۔

”چل ایشاں و دروہ ہائے فریبے قصیدہ باری عزالت لڑی بودن من ایشاں و باری تقدی می گفتیم“
دارا کو صوفیائے والہانہ عقیدت تھی۔ وہ اکثر صوفیائے مجدد اور دستِ امداد کے مسانی پر خط و کتابت کیا کرتا تھا یہ خط و کتابت جے حد و چلچل ہے۔ اس سے دارا کی لوباز شان ظاہر ہوتی ہے۔ فنا کے سہے پر وہ سرمد کہتا ہے۔

”ہیرہ سرشد من ہر روز قصد ملازمت دارو، میسر نمی شود۔ اگر منہم ارادہ من معلل چرا؟ دارا منہم سے تقصیر مرا؛ قتل ام حیات
”چو شیت از دلست میں یزید و دیباں حیات؟ دارا غیر شیت است پس منہ“ یفعل اللہ ما یشاء، وہکلم ما یرید، حیات؟
”نبی عنانہ جنگ کناری رفت، شکست در اسلام می افتاد۔ علمائے خارجی گویہ تقصیر صبر است، منتہی را تعلیم چه درکار؟“
سردی نے اس کا جواب ایک نہایت فصیح شعر میں دیا۔

اسے عزیز ہے

نا آنچہ خواندہ ایم منب اوش کردہ ایم!
الاحیث دوست کو نکو آدمی گفتیم!

غرض دارا نے اپنے اشعار میں بھی اس کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ شاعر تھا، ذہنی تخلص کرتا تھا۔ ہر محل شہزادے کی طرح و شہزادگی کا دلدادہ اور شہزادہ قدر دان و مرقب تھا۔ اچھے شعر کی دلدل کھول کر مینا اور شاعر کو انوارِ مسم سے مالال کرتا تھا۔ رضی شہید نے ایک دفعہ ایک غزل کہی، اس میں یہ شعر دارا کو بہت پسند آیا ہے

”ہاک را سر سبز کن اسے ابر نیماں در بہار
قطرہ آسے تو اند شد حیرا گو ہر شود!

دارا نے اس پر اسے ایب لاکھ روپیہ انعام دیا اور خود اس شعر کے جواب میں یوں لکھا
”مسلطت سہل است خود را آشنائے فقر کی

قطرہ تا دریا تو اند شد، چرا گو ہر شود!

یہ مرقع نہیں کہ دارا کی تمام تصانیف پر فضل بحث کی جائے۔ سردست ہم اس کے دیوان کے ایک چھو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ دارا کا دیوان نہایت مختصر ہے اور بہت کیا ہے۔ اس وقت تک اس کے بہت کم نسخے دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو نسخے نامکمل اور دو نسخے جو بنگالہ ہر مکمل ہیں۔ ایک خود وہیں، ایک دفعہ نگار کے فاضل مدیر نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ دارا کا مکمل ان کے پاس موجود ہے اور وہ اسے شائع کرنا چاہتے ہیں اس پر تقریباً چوتھا صدی گزر چکا ہے مگر دیوان ابھی تک زیورِ مطبع سے آراستہ نہیں ہوا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دیوان دارا کا نہیں کسی اور کا ہے۔ اگر خوشی لاریت الشعرا میں اور طالعہ نصیر آبادی اپنے تذکرہ میں اس

کرد خواہش بیدار شمع خوش
 پس ز بوم عاشقی بیدار شد
 چون کہ بر حسن کج خلقی بود
 از ہی خواست جلد از وجود
 حسن خود بر سبیل نخل دید
 نام کی گل محرم فرمود
 از تمہ ہزار گل ہطفت
 یک در نام ائمہ و محمود
 گفت معشوق خوشی نہ ای نام
 شد کھید و حسرت از وجود
 بعد از این غیر ترش نہ ای خلعت
 شد اخلاص اور سہل گفت و شنود
 غمست قرآن خوشی را بہ ترو
 خاص بادوست حوفا گوید
 چون نظر کرد در صفات فریش
 شد جیم کایم در پ و دود
 آسماق و بیں بشد پیدا
 چوں حباب از میال و دیانہ
 گفت نہ آمد از خوشی آن و دیا
 از جہاں موج و عشق مدئے نمود
 گرمی و سرد شقی چوں آفتاد
 نام خود کہ و شاہد و شہود
 آنوز عشق جملہ پیدا شد
 ای کہ ہما نام عشق کشود
 نقدہ ہر چوں تمام بشد
 عجب در نام گشتہ شد محمود
 قادر کی جملہ از تو پیدا شد

آنچہ بود است و بہت و خلد بود

ملائی تنگ نظری سے غرق ہمیشہ نالاں رہی ہے۔ دارا کے مذہبی استقامت پر بھی اکثرے دے جوتی رہی ہے اور اس میں تاہمیشہ سبک آگے ہوتا تھا۔ دارا اس کا دھم خوردہ تھا۔ اس واسطے وہ ملا کے متعلق اپنے ولی جذبات کا اظہار یوں کرتا ہے۔

بہشت آنجا کہ ملائے نباشد
 جہاں خالی شود از شہر ملا
 ز لاکت و غوغائے نباشد
 در آنجا شہرے کہ ملا خانہ دارد
 ز فرتی باش پروائے نباشد
 در آنجا بیچ واناے نباشد

میں اسے قادر کی توردے ملا

مرد آنجا کہ شیدائے نباشد

میری میری اور بہت کے جو از عدم جواز پر ہمیشہ عجیب چلتی آہی میں۔ دارا نے اس کے جواب میں ایک غزل بھی ہے جس کے چند شعر

طعن کردی تو بر ارادت من
 من چگونہ مرید کس نشد من
 من ز طعن کر کے شود و تبیر
 از ارادت مراد شرت خمیر
 من مریدیم بحضرت میراں
 کہ ارادت کنی تو با میرے
 ہست و شام پیش من ہے پیر
 جلد از تو را چوں نفس شریر

یہ ہیں۔

مردم شہر ماچو بے پراند
قادری کی ماند فاش از تقدیر

ویران میں اس زمانے کے شہر روحانی بزرگوں کی مقبوت بھی پائی جاتی ہے۔ چونکہ دارالکامیہ طریقت کبھی لاہور دار کبھی کشمیر میں رہتا تھا اس لیے پنجاب، لاہور اور کشمیر اس کی اراوت کے خاص مرکز تھے۔ وہ پنجاب کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہوتا ہے۔

باز چوں جانی و دل ہے تاب بہت باز چوں شہان من ہے خواب بہت
عشق پنہاں نمودہ ہے سہرا زال کہ نقشب دومت در پنجاہ بہت
کعبہ من حضرت لاہور داں سجدہ من سوئے آل عراب بہت

قادری راکب دارالپور شد

کاذر ال لبیاء فتح الالب بہت

دارالپور لاہور کا ایک مشہور محلہ تھا۔ یہاں حضرت یارِ نیرِ قیام پذیر تھے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں آج کل آپ کا مزار اور آواز دہ ہالو سلیم کی قبر واقع ہے۔ دارا نے یہ محلہ اپنے دادا پر کے نام سے پراگیا تھا۔ ایک اور غزل میں وہ حضرت میاں پر کے مقبوت کرتا ہوا لکھتا ہے۔

دل شدہ غارخ از ہر تدبیر می شود آنچه بہت در تقدیر
شخصہ اندر دل نمی آید خطرہ لا دور کرد میاں میاں

داراشکوہ کی عقیدت کا دوسرا نمونہ علامہ شاہنشاہن ملاشاہ نجفی ہے، جیت تک حضرت میاں نیر بغیر حیات ہے۔ ملاشاہ گرمیاں کشمیر میں اور سردیاں لاہور میں لکھتا کرتے تھے۔ مگر جب حضرت یارِ نیر ۱۰۴۵ھ میں فوت ہو گئے تو انہوں نے مستقل طور پر لاہور میں رہنا شروع کر دیا۔ جہاں آواز سلیم نے ان کے لیے ایک نہایت خوبصورت خانقاہ سرنگرم میں تیار کرائی جہاں دارالکثران کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ یہ خانقاہ کہہ مارال کے واسطے میں واقع تھی۔ اب بھی اس کے کھنڈرات وہاں پائے جاتے ہیں۔ اسی من بہت سے دارا یہ شعر ان کی مقبوت میں اکثر پڑھا کرتا تھا۔

کہہ داراں بکرمل پندشال دارو این چنین بخت کجا تخت میاں دارو

ملاشاہ کی مقبوت میں بھی دارا کے ویران میں کئی غزلیں ملتی ہیں۔ ایک غزل ہے۔

مرا بخشید ملک ہدایت کہ اکل ملک مرز و نہایت
دل بر جہلے صدوقین دارم مرا چوں شاہ دارو در حمایت
تو کردی بخشش شاہ آئے شاہ تو کرد از ادبیا دیگر ذایت

تو کردی دست در می را خانہ آباد

سلامت بر سرش دارو عذایت

ایک اور غزل میں آپ کی مقبوت کرتے ہوئے دارا لکھتا ہے۔

ذات ادبست بیخ اہل اللہ اہل تعید را مال باشر
صورت جامع حقیقت مشرق شرح اور انگہاں باشد

ایک نہایت عمدہ غزل حضرت پیراں پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مدح میں بھی ہے جس کے لفظ لفظ سے عقیقت مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ بیان نہایت سادہ، انداز نہایت دلنشین ہے۔ ملاحظہ ہو۔

حضرت میراں خداوند جہاں	خوش بن ہنس و شاہ عارفان
محمدی دین شیخ عبدالقادر دست	آں کو اور اعراض باشد آستان
نہ سادات محسبہ اولیاء	نیردیں شہباز و چلا مکان
دہلے شاہراہ احمدی	دستگیر جملہ در ماندگان
ہر گویا بے ندادی بر زمین	خمر کرنے آسمان زمین بر گتان

خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی سلسلہ نقشبندیہ کے بانی ہیں۔ دارالکران سے بھی حدیث تھی۔ دیوان میں دو غزلیں ملن کی مدح میں بھی موجود ہیں۔ ایک کا مطلع ہے۔

نقشبند یقین بہاؤ الدین
شاہ جہانی دود کی ایک مشہور شخصیت حضرت ایتناں بھی تھی۔ ان کا نام محمد اور عرفت خواجہ خاوند محمود تھا۔ کشمیر میں سلسلہ نقشبندیہ کو انہیں کی وجہ سے فروغ ہوا، بعض سیاسی حالات کی بنا پر انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا مستقل قیام لاہور میں رکھیں۔ چنانچہ انہوں نے لاہور کے سب امیر اور دولت مند محلہ منسل پورہ میں اقامت اختیار کی اور یہیں اسی مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی، آپ اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث اور مفسر تھے۔ ۱۰۵۰ھ میں فوت ہو کر یہیں دفن ہوئے۔ دارا نے آپ کا سر شیشہ کھاجے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دارا کے تعلقات آپ سے نہایت مخلصانہ تھے۔ سریشے کے چند شعر یہ ہیں۔

چوں نباشد آسمان ہاشم تر	چوں مسافر فرمود شیخ مجرور
شیخ ہفت تعلیم طوائس خرام	پیشوائے اولیاء معتبر
آن محمد گزنی آمد بدون	اہل شرق و غرب را گردیدہ سر
روز شب می گرد و گرد و حرم	کال چنای گردش نیا کید از مشر
اولیاء امر، می باشد حرام	لایموزاہست چوں اندر خبر
دو ہزار و پنج دود چوں رفت آمد	روز شد شعبہ و پنج از صفر

قادر می گویاں مہمانہ از عجب آؤ
گرد از دارے ہمارے چوں سفر

دیوان سے دارا کے مذہبی معتقادات خاص کر توحید رسالت، ختم نبوت، حب اہل بیت اور خلفائے راشدین سے عقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ توحید کے بارے میں اس کا خیال ہے۔

تو کہ ز تار کردہ اس زان رو	تا وحدت نمود در ز تار
قادر می نیست بیچ جز قادر	وعدہ لا اللہ الا ہو !

خروج مشرق غیر خفا

دشمن بہت سب سے ہوا

دشمن کے بارے میں اس کے خیالات کا خط ہوں ۔

چند بازی تو بر شریعت خود

اتحاد کرل از غناست سرا

ختم نبوت کے متعلق کتاب ہے ۔

چوں خاتم النبیین باید عاقبت

آرہنیش میں شد دیگر جاد وائم

خلفائے راشدین کے بارے میں کتاب ہے ۔

نیست چیزے چہ چار یار دست

نیست بچارہ پہلج کار دست

بایہ چار استر اعداست

بہرہ بخت نمی ہیں باید

بہت ہے ۔

ذات اوست ہن اهل اللہ

اہل توحید را اماں باشد

دارا کو جس لاد پیار سے لاد ہوا پنے پالا، اجر طرح سے لکھا اور ہر بات میں اس کی نذر داری کی، اس سے لے کر دہم ہو گیا تھا کہ وہ اپنے تمام جہانوں سے ممتاز ہے، چنانچہ دیاں میں اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے جانتے ہیں۔ ان اشعار سے پورا پورا احتیاط اٹھانے کے لیے یہ لازم ہے کہ ہم بات ذہن نشین کر لیں کہ شاہ جہاں اپنی جگہ پر فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کا مائشین دارا ہو گا۔ اس نے اسے "شاہ بلند اقبال" کا خطاب بھی دیا تھا۔ اسے پیر شاہی اور دیگر اوقات شاہی استعمال کرنے کی عہدت بھی دیدی اس واسطے دارا اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتا تھا۔ وہ خود کہتا ہے ۔

قرن نام چو قہ در ی باید

قادر ی صاحب قرآن گشتہ

ہر چند کہ نیست سایہ از د آخذ

لیک نمود سایہ شہ غیر نما

دائم چوں گویند مر اسایہ حق

ترسم کہ از یں در ی آید حق را

بعض اشعار سے دارا کے اخلاق و عادات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ محب ذر کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس واسطے کہتا ہے ۔

دست زرد آرد بد بوی خسرو

جان زرد آرد ر احوال صیت

دارا کے خیال میں بنیادی سچائیاں ہر مذہب میں موجود ہیں۔ اس لیے وہ ہر مذہب کے لوگوں سے راہ و رسم رکھتا اور ان سے میل ملاپ بڑھاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ دنیا پر ظاہر کرتا تھا کہ اس کا مملکت صلح کل ہے اور اسے کسی مذہب اور کسی فرقے سے کھلوت نہیں۔ اس کی وجہ فلسفہ ہم دوست ہے چنانچہ وہ کہتا ہے ۔

قادر ی دید تا را در کل !

صلح کل کرد از عدا و گزشت

قادری زاد داری پر بہت زور دیتا ہے اور تعلق کرتا ہے کہ وہ علانی اور دواوی دنیا میں کامیابی کا راز ہی ہے کہ اپنے اسرار کو چھپاؤ اور
اگر کوئی راز دار بنانا چاہتے ہو تو اپنے دل کے سوا کسی کے راز دار نہ بنادو

راز خود را بغیر دل تو نگور راز داری بغیر دل نہ بود

بعض بعض اشعار شریعت کے نقطہ نظر سے لکھتے ہیں جن پر فقہا خوردہ گیری بھی کرتے رہے ہیں اور جو آخر میں اس کی تباہی کے باعث

بجھٹا

کفر و دین در ریش پریاں دمدہ لا شریک لا گریاں

قادری گشت تمار مطلق از پیئے ہر فنا کال بقات

قادری ز مدین قادری شد چوں مدد کرد تمار بغیر او

ہم محمد تو کی وہم اللہ ایں عنایت تراست

قادری راز قدرت کامل قادری ذوالجلال سا دے

یہ دارا کے دیوان کا ایک نہایت سرسری مطالعہ ہے۔ افسوس ہے کہ دیوان کا کوئی اچھا نسخہ مکتبہ خانہ کی وجہ سے بعض اشعار نہ
پڑ سکے۔ ہر حال ہر کچھ مل سکا اس سے دارا کی آفتاد طبیعت، اس کے ماحول اور اس کے اعتقادات کا کسی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے
اس سے دارا کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے اور وہ اسباب بھی سامنے آجاتے ہیں جن کی بنا پر اسے ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر دیوان
کے ساتھ ساتھ دارا کی دیگر تصانیف کو بھی سامنے رکھا جائے تو دارا اور اس کے دور کی بڑی دلچسپ تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ ایسی تاریخ جس
کے آئینے میں اس دور کے مسلمانوں کی خوبیاں اور کمزوریاں کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور ان عوامل کا سراغ بھی مل سکتا ہے جو مسلمانوں کی تعلیم اشان
سلطنت کے اٹھنا زوال کا باعث بنے۔

گل بکاؤلی

محمد عبداللہ قریشی

اردو کے غیر مشرقی فلسفوں اور نظم افسانوں میں تقدیر گل بکاؤلی بہت مشہور ہے جس میں تاج الملوک اور بکاؤلی کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ اصل کہانی کی نگار گل بکاؤلی کا علم تو خود تاریخ کو بھی نہیں۔ البتہ ہندوؤں کی بعض قدیم کہانیوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں جس سے قیاس ہوتا ہے کہ ابتدا میں اس کے خالق کوئی کتاب مسکرت وغیرہ میں بھی گئی ہوگی مگر اس کا کوئی ثبوت آج تک نہیں مل سکا۔

فارسی زبان میں یہ تقدیر پہلے اعلیٰ حضرت اللہ بنگالی نے ۱۶۲۲ء (۱۱۲۴ھ) میں اپنے ایک دوست محمد کی خواہش پر لکھا اور اس دوست کی وفات کے بعد اس کی یادگار کے طور پر اسے شائع کیا۔ اس تاریخی نقشے کی مصروفیت انیکہ کورٹ ویم کالج کے مشہور پرنسپل ڈاکٹر جان گلڈاسٹ نے لاڈل وینلی گورنر جنرل ہند کے عہد میں نہال چند لاسل نے اسے اردو میں ترجمہ کر لیا۔ اس ترجمہ کا نام ”مذہب عشق“ ہے۔ کتاب کے آخر میں ہجری اور عیسوی تاریخیں ملتی ہیں۔

خوفِ حق میں سے کیا ان کو شاد	ہماری بھی دے یا الہی مراد
یہ قصہ ہوا جب بخوبی تمام	تو پھر فکر تاریخِ حق صبح و شام
یہ ایک شے میں نے آوازِ غیب	کہ ہے ”مذہب عشق“ تو تاریخِ تمام

۱۲۱۶ھ

ہوئی پھر خواہش کو ملک و دہان	کریں عیسوی سال کو بھی حیاں
تو پھر آفتِ غیب نے دی ندا	کہ اس ”مذہب عشق“ میں کوئی آ
کرے ”مذہبِ جام“ اگر اختیار	تو رازِ نہاں اس پر ہر آشکار

۵۸۶

یعنی ”مذہب عشق“ کے ۱۲۱۶ھ میں ”مذہبِ جام“ کے ۵۸۶ھ مدد لانے سے ملتے حاصل ہو جائیں گے۔

لاہور میں چند کے آباؤ اجداد شاہ جہان آباد دہلی کے رہنے والے تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد نیک وطن کے لاہور آئے اور آگے چل کر لاہور ہی کہلائے۔ اس نقشے میں انہوں نے نہایت صحیح باحجام اور باقاعدہ زبان لکھی ہے۔ پہلی مرتبہ یہ قصہ ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا۔

دیارہ اشاعت کے وقت میرٹھ علی انوس نے نظر ڈالی کہ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف مطالع میں کئی ترتیب طبع ہوا اور ہمیشہ شرق سے
 بیجا جاتا رہا۔ مولانا سید کریم نے "نگار نگار" سے آٹا دیا "میں اس کے مختلف ایڈیشنوں کی خدمت دی ہے۔ جو زبان طویل ہے۔
 ٹاکر گیان چند جین ایم اے ڈی ٹی کل صد شہزادہ و عیدیکانج بھوپال نے اس قصبے کے مختلف نسخوں اور زبوں کی کیفیت یوں
 بتائی کہ ہے :

فارسی۔ محل بکاؤلی از عروت اللہ بنگالی ۱۷۲۲ء (۱۱۳۴ھ)

شمسوز از فرحت انھارویں صدی کے آخر میں۔

اردو۔ دکنی نسخہ ۱۳۵۵ھ بارود خانہ اودھ کے کتب خانے میں (اسپرگر)

شمسوزی قصہ مجلس سلاطین بقول دتاسی بہار کی نام ہے اور اس سے ۱۷۲۸ء (۱۱۵۱ھ) نکلا ہے۔ لیکن دراصل
 ۱۷۵۵ء نکلا ہے۔ رام بابو کسینہ تحفہ المجالس نام دیتے ہیں اور اس سے ۱۷۵۵ء برآمد کرتے ہیں۔

گلشن منظر یا خیابان ریحان از ریحان الدین ریحان لکھنوی ۱۲۱۲ھ (راجن ترقی اردو)

مذہب عشق از جمال حیدر ۱۲۱۶ھ عروت اللہ بنگالی کے فارسی قصہ کا ترجمہ۔

شمسوزی گلزار سیم از ریاضت کسیم ۱۲۳۵ھ (۱۲۵۴ھ)

محل بکاؤلی قلمی منظوم ۱۲۶۱ھ از محمد داؤد علی ۲۶ داستان اور پانچ لطیف مصنف حیدر آباد سے نکلتا گیا اور شہر سلطان کے خاندان
 کی سرپرستی میں رہا (کتب خانہ مسعود حسن ضوی)

ہندی۔ بکاؤمن از بیج سنگھ و مالک ۱۸۷۵ء لکھنؤ۔ مذہب عشق کا ترجمہ۔

فرانسیسی۔ از گارسان دتاسی ۱۸۳۵ء

انگریزی۔ از ڈی۔ پی۔ میڈل۔ مذہب عشق کا ترجمہ۔

از نقیثت آر۔ پی۔ ایڈرس ۱۸۵۵ء دلی۔

گروپ میں نے دتاسی اور میڈل سے لے کر ۱۸۸۹ء میں آئے گروپ ایڈیٹرن رومانس (A GROUP EASTERN ROMANCES) میں شامل کیا۔

از بادا جھو سنگھ ۱۹۰۳ء۔

مذہب عشق کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ پورب کے کسی بادشاہ زین الملوک کے چار بیٹے پہلے سے موجود ہیں، پانچواں بیٹا الملوک
 پیدا ہوتا ہے جو بادشاہ کو بہت محبوب ہوتا ہے مگر بخوبی اسے بادشاہ کے لئے خوبست آثار قرار دیتے ہیں بلکہ یہاں تک کہ وہ دیتے ہیں کہ اگر
 بادشاہ نے کہیں اسے دیکھ لیا تو اندھا ہو جائے گا۔ زین الملوک نے شیر خوار بچے کے لئے شہر سے باہر ایک مکان بنوایا مگر تقدیر کے
 سامنے کیا چارہ۔ ایک روز بادشاہ شکار سے واپس آکر دیکھا کہ نور چشم پر نظر جا پڑی۔ اسی وقت آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ علاج کے لئے

ہزاروں تہذیبیں گئیں مگر ایک زمینی۔ آخر ایک بزرگ نے کہا کہ شغافرت اس پھول سے ملے گی جو بکاولی پری کے چمن میں ہے۔ بادشاہ کے چاروں
بڑے بیٹے اس کی تلاش میں نکلے تھے اور سفر کرتے کرتے ایک شہر میں پہنچے ہیں جہاں ایک پیرا درباری رہتی ہے۔ وہ بانادی عورت
جو سر کھینچے ہیں اپنا جواب نہیں دیتی کہ وہ ایک نئی اور چوہے کی مدد سے ہمیشہ بازی جیت لیتی ہے۔ چاروں شہزادے اس کےاں جاتے ہیں
اور اپنی تمام دولت بلکہ آزادی تک مار کر اس کے غلام بن جاتے ہیں۔ وہ انہیں قید کر لیتی ہے۔ بالآخر چاروں شہزادے تاج الملوک اپنے بھائیوں
کی خوشی میں وہاں پہنچتا ہے اور اس حیانہ کے مکہ فریب کن ایک نیوے کی مدد سے اسے قید میں شگست دیتا، اسے اپنی لوثی بنا اور نانا
شہزادوں کو اس کی غلامی اور قید سے نجات دلاتا ہے۔ پھر یہی قسم کی مصیبتیں پھیل کر گئی بکاولی کی تلاش میں باغ ادم کی جانب روانہ ہوتا ہے۔ راہ میں
ایک ہیبت ناک دیا اسے ملتا ہے جسے دیکھتے ہی شہزادہ کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ وہ خوش ہوتا ہے کہ آج مدت کے بعد لذیذ شکار نصیب
ہوا ہے۔ اتنے میں دیکھو چنڈاؤنٹ آٹا روغن اور شکر وغیرہ سے لدرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ غراں ہوا جاتا ہے اور ان سب کو اٹھا لیتا
ہے۔ چونکہ بوجھ زیادہ ہوتا ہے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔ تاج الملوک موقع غیبت جان کر نہایت لذیذ طعہ تیار کرتا ہے جو دلوں کے پرش
میں آئے تک بالکل تیار ہوتا ہے۔ دیریشی کی کھا کر بہت خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے۔ اے آدمی زاد! مانگ کیا مانگتا ہے۔ شہزادہ گل بکاولی
کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ دیرہاں کے بہت سے خوشناک نظارے بیان کرنے کے بعد آخر اپنی بہن حمالہ دیہی کے نام ایک خط دیتا ہے کہ
اس آدمی نادے کی مدد کی جائے۔ حمالہ کے پاس ایک آدم زاد لڑکی محمودہ عہد سے متغیہ تھی جسے وہ جان و دل سے عزیز رکھتی تھی۔ اس نے
تاج الملوک اور محمودہ کے تعلقات میں ایسی مضبوطی ڈال دی جسے جیتنے کی کوئی نہ فوٹ سکے۔ محمودہ کی سفارش سے حمالہ نے بہت سے دیووں
کو جہ ہے بنا کر باغ بکاولی تک ایک ٹرنگ کھدوائی۔ تاج الملوک اس ٹرنگ کی راہ اس جوض تک پہنچا جس میں وہ پھول تھا۔ پھول اٹھا
لیا اور غلاب کا بکاولی میں جا کر اپنی انگشتری نشانی کے طور پر اس سے بدل لی۔ بکاولی نے جب آنکھ کھولی اور وہ پھول وہاں نہ پایا تو دنیا آنکھوں
میں اندھیر ہو گئی۔ بہت روئی، بہت مٹی، کسی پر خستے ہوئی کسی کو ڈرایا دھکا یا کسی پر جی کا انزام لگا یا۔ مگر جو اصل گلچیں تھا اس کا پتہ نہ چلا۔
تاج الملوک وہ پھول لے کر دربار پیرا کے ملک میں پہنچا۔ تمام قیدیوں اور اپنے بھائیوں کو غلامی لگا کر رہائی ملائی مگر راستے
میں چاروں بھائیوں نے وہ پھول اس سے چھین دیا اور باپ کے پاس لے گئے جس سے اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔

ادھر بکاولی گل کے خزان میں دیوای سی ہو گئی۔ اسے پھول چرانے والے سے عاشقانہ عشق ہو گیا۔ وہ اپنے پھول اور دل کے چور کی
تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ ماری ماری پھرتی رہی اور بیشمار تلخیصیں اٹھانے کے بعد جب وہ زین الملوک کے ملک میں پہنچی تو اس نے بادشاہ کے
اندھا ہونے اور اپنے پھول کی کماست سے دوبارہ بینائی حاصل کرنے کا چرچا سنا۔ وہ فوراً ایک خبردار آدمی کا روپ دھار کر بادشاہ کے دربار میں
پہنچی۔ بادشاہ اس کی باتوں سے اتنا خوش ہوا کہ اسے اپنا وزیر بنالیا۔

تاج الملوک نے اپنے پیچ کر حمالہ دیوئی کا ایک بال جو اس نے مشکل کے وقت کے لئے دیا تھا آگ پر رکھا۔ حمالہ فوراً حاضر
ہوئی۔ اس نے پوچھا محمودہ کہاں ہے؟ لہذا اس کے رہنے کے لئے مکان ہے نہ باغ نہ جوض، اس نے ان سب چیزوں کی ضرورت ہے
حمالہ نے دیووں کی مدد سے تاج الملوک اور محمودہ کی خاطر قلعہ بکاولی کے نزدیک پراک ایک عالی شان محل کشن نگار تعمیر کرایا جس کی دھرم بادشاہ زین الملوک
تک پہنچا۔ بادشاہ اس سے ملنے گئے آیا۔ دونوں کی عظمت ہوئی۔ بادشاہ کا وزیر فرخ دینی بکاولی بھی براہ تھا۔ تاج الملوک نے باتوں ہی باتوں
میں بادشاہ سے پوچھا۔ آپ کیسے صابر ہوا؟ بادشاہ نے چاروں بیٹوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ایک اور بھی تھا مگر اس کینست نے تلوٹھے

دھواکھہ یا۔ یہ چاروں شہزادے بکاؤلی کا بھلے بلاتے جس سے مجھے پھر جیانی نصیب ہوئی۔ تاج الملوک نے میرواہ کی ذبانی چاروں شہزادوں کی گرفت سے بادشاہ کو نکال دیا اور جان بوجھوں میں ڈال کر بکاؤلی کے بھول تک پہنچنے اور بکسنگ لگانے کا تمام ہجرانہ مٹایا باپ نے بیٹے کو گلے لگایا اور غوطہ محبت سے اس کی پیشانی پر جم لی۔

بکاؤلی نے حسب اپنے تاج جسے کی لکٹی تھو تیناب بر کر اپنے وطن گزرا اور ہم چلی گئی۔ وہاں سے تلج الملوک کو ایک خرافیہ حکا کھا اور وہاں پہلی کے مذہبیے اپنے گھریں کو اپنے پاس ہی بلایا۔ بکاؤلی کی ماں کو حسب جی کی نگاہ بازیوں اور نگاہوں کا حال معلوم ہوا تو اس نے تاج الملوک کو دریا سے طلسم میں ڈال کر میٹی کو قید کر دیا۔ تاج الملوک عجیب عجیب شکلیں اختیار کرتا رہا۔ اسوقت ایک عرصہ اور ٹوپی دستیاب ہوئی جس کی مدد سے وہ جہاں چاہتا پہنچ جاتا۔ اس طرح وہ ایک ایسے حق ووق صحرائیں پہنچا جہاں دیوؤں اور پریوں کی حکومت تھی۔ وہاں روح افزا نام ایک پری نے جو بکاؤلی کی چھاننا نہیں تھی تلج الملوک کو اپنا ڈکھڑاسنا یا کو کس طرح یہاں کے دیو نے اسے دھوکا دینے سے قید کر رکھا ہے۔ غرض لامٹی اور ٹوپی کی مدد سے دونوں یہاں سے اڑ کر روح افزا کے وطن میں جا پہنچے۔ روح افزا کے واسطے آجائے ہر گھر خوشنیاں ہونے لگیں۔ یہ خبر سن کر جمیل علی اپنی بیٹی بکاؤلی کے ہمراہ مبارک سلامت کے لئے آئی۔ یہاں تاج الملوک اور بکاؤلی کی ملاقات بھی ہو گئی۔ روح افزا نے حسن امداد اور خود روح افزا نے جمیل سے کہ سن کر بکاؤلی اور تاج الملوک کی شادی کرادی اور دونوں ہنسی خوشی باغ ارم میں رہنے لگے۔

شہزادہ کو حسب وطن کی یاد آئی تو بکاؤلی کو ہمراہ لے کر کشن نگاریں نہ آیا۔ بخوشی دونوں کے بعد بکاؤلی کو راجہ اندر نے یا ایک تاج الملوک بھی سایہ کی طرح تختہ درواں کے ساتھ تھا اور راجہ اندر کی محفل میں جہاں بکاؤلی لہجی گاتی تھی یہاں اس کے ساتھ رہتا تھا۔ بکاؤلی ٹوٹی لہجی کہہ رہا کہ خبر ہو گئی تو دونوں کو ہلاک کر دے گا مگر شہزادہ کی خدمت سے مجبور تھی۔ جب راجہ بکاؤلی کے گلے سے خوش ہوا تو اس نے کہا کہ آج مانگ جی مانگ ہے۔ میں تمہاری خواہش پوری کروں گا۔ بکاؤلی نے تاج الملوک کو دکھا کر اس کی فرمائش کی۔ راجہ اندر ایک آدم زاد کو اپنی محفل میں دیکھ کر غضب ناک ہو گیا۔ اس نے بکاؤلی کو بد عادی جس سے اس کا نصف بدن پتھر کا ہو گیا جو بارہ برس تک رہا۔ شہزادہ بھی دربد پتھر کا رہ گیا۔ سنگدلیپ میں آیا تو بکاؤلی کے نصف انسانی جسم سے دو فریق کی باتیں کہیں۔ اس اثنا میں راجہ چتر سین وائے سنگدلیپ کی لڑکی چتراوت شہزادے پر عاشق ہو گئی مگر وہ زمانہ۔ آخر جب اس کو چوری کے الزام میں بے گناہ قید کر دیا گیا تو اس نے شادی کا اقرار کر لیا۔ شادی ہو گئی اور ایک مہر تک باہم ملنے رہے۔

بارہ برس گزرنے کے بعد جب بکاؤلی نے ایک کسان کے گھر بنا جنم لیا تو تاج الملوک بھی اس رہنماں زادی کے محسن کا شہر و سن کر وہاں پہنچا۔ چونکہ دل پہلے ہی سے ملے ہوئے تھے بغیر کسی تکلیف و تردد کے شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد دونوں چتراوت کے محل میں آئے۔ اس کو ساتھ لے کر تاج الملوک اپنے وطن کشن نگاریں میں پہنچا جہاں دلیر اور محمود پہلے ہی سے بال بندگی موجود تھیں۔ تاج الملوک کا وزیر بہرام روح افزا پر عاشق ہو گیا اور آخر بکاؤلی کی سعی سے ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ غرض ہے۔

حاصل ہوئی ان گھون کو بے خوار
سیر شب زلف صبح رخسار

جس طرح انہیں بھم لایا
بچھڑے ہرے سب میں خدایا

اس قصے کے اجزائے ترکیبی کچھ ایسے ہیں کہ اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ تلج الملوک اور بکاؤلی کی شادی بہتم ہوتا ہے۔ ایک جینیت سے قصہ میں تم ہو گیا ہے۔ محل کی راہیں جبراً جتنیں نصیب وہ عبور کرنی پڑیں۔ تمام مشکلات اور مسئلے حل ہو جاتے

ہیں۔ ہمارے جزیرہ انتظام کو کسی بات کا انتظام نہیں رہتا۔ یہاں تک قصبہ پر ناسی رنگ ہے۔ اس کے بعد دوسرا جزو شروع ہوتا ہے۔ مصنف قصبہ کو طویل دیر سے کے لئے شائستہ نکالتا ہے۔ یہ قصبہ راجہ اندا اور امرنگر کے بیان سے شروع ہوتا ہے اور بکاؤلی کے دوسرے جز کے بعد طویل حالت میں آنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قصبہ خالص ہندوستانی ہے۔ اس کے بعد کہانی کو آگے بڑھانے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ میرا قصہ بہت مختصر ہے۔ اس میں ہیرو اور ہیروئن ہی بدل جاتے ہیں۔ یہاں تاج الملوک اور بکاؤلی کی بجائے بہرام وزیر زادہ اور روح افزا منظر پر آ جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے قصبہ کو دوسرے حصے کے بعد اور بڑھا چاہا مگر اس سے بآسانی ممکن نہ ہوا کہ بکاؤلی اور تاج الملوک کو کسے کبھی کچھ اختراع کر سکے۔ اس لئے بہرام اور روح افزا کو قصبہ کے درمیان لایا گیا۔ یہ قصبہ ایک نئی کہانی کی حیثیت رکھتا ہے اور اصل کتاب سے بالکل الگ ننگل معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کا خیال ہے کہ اس قصبہ کے بعض حصے قدیم داستانوں سے ملتے جلتے ہیں مثلاً دلبر مسیحا، شہزادے کو گل بکھولی کی جہم سے روکنے کے لئے جہنم اور شہر کی حکایت سنائی ہے۔ یہ پنج تتر کے دکنی نسخے میں موجود ہے۔ شمال ہند کے نسخوں میں کچھ اختلاف ہے۔ تاج الملوک اپنے بھائیوں کو زنداں سے رہا کرانا ہے لیکن وہ اس سے دفا کرتے ہیں یہی الف لیلہ میں شہزادہ خداداد کی کہانی میں ہے۔

پھیل یا کسی اور چیز کے انکسوں سے چھرانے سے بینائی کا حود کرنا بھی نیا خیال نہیں۔ اس کی ابتدائی مثال حضرت یعقوب علیہ السلام کا قصبہ ہے۔

دیوں کے ذریعے محل تیار کرنا اور دیں چراغ خوب ہی میں نہیں ہندوستانی کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔

گل بکاؤلی میں ایک شہر کی دیو سے جنس تبدیل کر کے مرد ہو جاتی ہے۔ یہ بہا بھارت کے ادھیگ پر دے لایا گیا ہے۔ ٹیکسڈی عورت تھی لیکن مرد کی طرح پہرہ پوش کی گئی۔ شادی کے موقع پر وہ جنگل میں گئی اور ایک کیش سے جنس بدل کر مرد ہو گئی۔ طلسمی جنگل کے ایک حوض میں غوطہ لگا کر تاج الملوک عورت ہو جاتا ہے۔ جنس بدلنے کی مثالیں ہنبال پیمپی کی چورھوں کہانی میں بھی ملتی ہیں۔ سند بکاؤلی کہانی میں جنس بدلنے کے کمزور کا ذکر ہے۔ الف لیلہ کی دوسری کہانیوں میں چتر پانی پینے سے یا چتر میں غوطہ لگانے سے جنس بدلنے کا ذکر پایا جاتا ہے۔

قصہ گل بکاؤلی میں جطسم ہے اس کی مثالیں داستان امیر حمزہ یا داستان خیال میں بھری پڑی ہیں۔

اندربھا کا ذکر سنسکرت ادب میں تفصیل سے ملتا ہے اور ہر شخص اس سے عداوت ہے۔

بہار دانش میں چھٹے ذہیر کی کہانی میں ایک شخص چھپ کر پری کے ساتھ پروں کے ملک میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں سے شادی کے لئے ورتا ہے۔ تاج الملوک کا اندربھا میں پہنچاؤ یا کوئی مشکل نہ تھا۔

قصبہ کے خاتمے میں بہرام کو نائنہ بنا دیا جاتا ہے۔ کامروپ میں اس کا رواج گل بکاؤلی سے پہلے بھی تھا۔

دائمی شہزادوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ قصہ گل بکاؤلی ہندوستان ہی میں لکھا گیا۔ پنج تتر کی کہانی ٹیکسڈی کا قصبہ اور اندربھا کا ذکر کافی ثبوت ہیں۔ دلبر مسیحا کو سرکھینا ہندوستانی بات ہے۔ بکاؤلی ایک مٹھ میں قید ہوتی ہے۔ مٹھ کے اہدام کے بعد وہاں سرمن آگتی ہے۔

اس کے تیل سے کسان کی بیماری کے عمل نظر آتا ہے اور بکاؤلی یا جہم لیتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف آواگون یعنی تنازع پر عقیدہ رکھتا ہے یہ فقہ کی ہندوستانی اصل کا قوی ثبوت ہے۔ فقہ کی عام فضا فارسی داستان کی سی ہے۔ تمام نام فارسی ہیں فقہ کا مرکزی نام بکاؤلی بھی ہندی یا سنسکرت کا نہیں۔ اس کے علاوہ مرغ اور حیداد کی حکایتیں حضرت سلیمان کے دربار میں انصاف کیا جاتا ہے۔ یہ کسی اسلامی روایت سے لیا گیا ہوگا۔

”فہرست عشق“ کے عجیب باب میں اور چونکہ ساری کتاب میں ایک ہی طویل فقرہ ہے اور ہر باب میں اس کا ایک حصہ یا داستان بیان ہوتا ہے اس لئے ہر باب کو داستان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اکثر داستانیں لکھتے ہیں اسے شروع ہوتی ہیں سادہ و سنجیدہ اصل کتاب کے بہت سے فارسی الفاظ باقی رکھے گئے ہیں اور زینت کلام کے لئے چونکہ رافضی ہوئی تھی اس کو بھی برقرار رکھا ہے۔ ترجمہ اصل سے کم ہونے پایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا طرز بیان قبیحٹ اردو کی کتابوں کی طرح زیادہ سادہ اور سلیس نہیں۔ بجا بجا شاندار الفاظ اور فارسی ترکیبوں کے ترجمے پاسے جاتے ہیں۔ ترجمہ میں آزادی کو مطلق کام میں نہیں لایا گیا۔ ساری کتاب پر فارسیت سوار ہے۔ بعض جگہ ہندی کے الفاظ بھی ہیں لیکن جن زمانے کی یہ کتاب ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے بہت ہی کم ہیں۔ ان کے معاصرین میراں، بشیر علی، افسوس اور نیر علی وغیرہ کی کتابوں میں ہندی الفاظ کا استعمال جس کثرت سے ہوا ہے اس کے مقابلے میں ان کی تحریر کو ہندی الفاظ سے بالکل خالی سمجھنا چاہیے۔ عجائبات کاغذ پر دیکھیے۔ جب بکاؤلی غیند سے جاگی اور اس نے گلاب کے درخت میں گل کو نہ دیکھا تو اس کے چور کی تلاش میں نکلی۔ دیکھیے کیا نقشہ کھینچا ہے :

”جب بکاؤلی نے جادو بھری، کچھ کھولی اور خواب راحت سے چونکی، پتھر ازاناز سے پہنی، لنگھی سے بالوں کو ہنوارا، دوپٹہ اوڑھا، آہستہ آہستہ چھڑی اٹھیلیوں سے حوض کی طرف چلی۔ ہر قدم پر وہ گل اندام اپنے نقش قدم سے زمین کو پاشیں باغ بناتی تھی اور گرد وادہ سے چشم بلب میں سرسبز لگاتی تھی۔ جب حوض کے کنارے پر پہنچی دست لگا رہیں سے گلاب اپنے رخسار پر ڈالنے لگی اور چہرے کا جوار کو تیرنے مانند تھا، حدود کو گلاب میں ملانے اور حوض کو چاندوں طرف چشم مست ناز سے دیکھنے بھانسنے لگی۔ ناگاہ گل بکاؤلی کی جگہ پر نظر جا پڑی۔ ہر چند بخور مثال نگاہ کی کچھ اس کا نشان نظر نہ آیا :

ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو :

”لکھتے ہیں کہ تاج الملوک قیروں کے بعض میں اپنے بھائیوں کے پیچھے چلا جا رہا تھا کہ ان کا ارادہ کہ حقہ دریافت کرے۔ انھیں وہ جہاں آتے ہوئے تھے وہ بھی آئی پہنچا اور ایک کونے میں بیٹھ کر ان کی سن ترائیاں اور جہانیاں جھوٹی جھوٹی سننے لگا۔ آخر وہ نہ سکا رہا کہ آکر وہ بندہ کہنے لگا : آپس میں یہ کیا بیوہ باتیں کر رہے ہو۔ اپنا منہ دیکھو گل بکاؤلی پرے پاس ہے، اور اسی وقت اس کو کرے کھول کر ان دعا بازوں کے سامنے، گدہ دیا، تھڑا دے

ختمے میں اگر بولے بھلا اس کو بان، اگر تیری بات بھی نہ ہو تو ہم جو سپاہیں تجھ کو سزا دیں
تاج الملک نے کہا ساجی کو کیا آجی۔ بہت بہتر اے۔

جب تاج الملک سے ان واقعت اللہ شیوں نے گل بگولی پھینک لی اور وہ بیچارہ دل
میں بچھڑتا ہوا رہ گیا۔ شل سے کہہ دو رویش بمان رویش۔ پھر کچھ نہیں کہنے چھپے چھپے
بعد چند روز کے اپنے باپ کی سرور میں آیا۔ ایک جنگل جو درختوں کا مسکن تھا اس میں جا پہنچا
اور حقیقت سے آگ بھڑک کر سالہ کے دستے ہوئے بال کو اس پر رکھ دیا۔ جو کھانی کھلی نہ بھلا
ہوگا کہہ اٹھا ہزار دیوؤں سمیت آ پہنچی اور تاج الملک کو فقیروں کے بھیس میں دیکھ کر
آگ ہو چڑھی کہ اسے شہزادے میری بیٹی کو کیا کیا اور تو نے اپنا حال کیا بنا یا؟ تاج الملک
بولہ کہ آپ کی زوجہ سے سب خیریت ہے لیکن ایک کام مجھے نہایت مضمونی ہے اور اس
کی تدبیر مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے کہ آپ کو نصیحت دی ہے۔ حمار نے کہا کہ اسے
غیر بائیں نہ بنا۔ وہ کون کام ہے جلدی کہہ۔ تاج الملک نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ
یہاں ایک محل اور باغ کہہ بہرہ بگاؤ کی کشتہ اور باغ سا ہو، بناؤں۔ تم جس طرح جانو صلہ
بنوادو۔ وہ بولی اسے بیٹا! کتنی بڑی بات ہے مگر میں نے اس باغ اور عمارت کو نہیں
دیکھا۔ بھلا بن دیکھے مکان کا نقشہ کس طرح بناؤں اور بنوادوں تاج الملک بولا جس طرح
میں کہوں اسی طرح بنوادو۔ حمار نے اسی وقت کئی سو دیو اصل بدخانی کے لئے اور سیکیوں
عقیق میانی کے لئے اعداد ہزاروں روپے اور جواہر پیش قیمت کے واسطے ہر چار طرف بھیجے۔
دیوؤں نے تین روز کے عرصہ میں جواہرات وغیرہ کے باجی توڑے لگا دیئے۔ پھر شہزادہ جس طرح
ہمانے لگا اسی طرح وہ بنانے لگے۔ پہلے خود وزیر سے ٹھیکہ کر لیا ایک دی اور وہاں زرخاں
بھڑیا اور اس قلعہ طوطی پر چڑاؤ عمارتوں کی بنا ڈالی۔ غرض تقریباً دس دنوں میں ویسا ہی قلعہ و اسطرح
کا باغ جواہر نگار چڑاؤ بہترین درختوں سمیت اور زبردست عمارتوں کے دو والان عالی شان آنے
ماتے پہنچے۔ ان کے ایک حوض ہر قسم اسی قلعہ کا گلاب سے معمور بنایا۔ پھر ایک مکان میں
فرش اسی رنگ کا بچھرایا۔ حاصل یہ کہ جتنا جواہر سونا پیر دیو لائے تھے اس میں سے آدھا
مکانات کے بنانے میں خرچ ہوا۔ جو کھانی کا خزانہ جات کی تیاری کو دے دیا اور باقی خزانے
میں داخل کیا۔

ان مثالوں سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ زبان عام طور پر ہموار نہیں۔ دو تین سطریں سادہ و صاف ہوتی ہیں پھر ناری تر کیسیر کی
شروع ہر جاتی ہیں جن سے دعائی بھر دیا ہوتی ہے اور قدم قدم پر ٹھکر گھٹنے کا احساس ہوتا ہے۔
اگرچہ اخلاقی حیثیت سے شرقی ادب میں اس قسم کے کوئی مدح نہیں۔ پھر بھی جسے کی خواہیاں جتنی تاج الملک کے بھائیوں کو شیل کی

غیر کوئی شہری یا محبت کے مصائب و تاج الملک اور بکاؤلی پر گزرتے۔ جاملاہ خدا اور نامناسب بے اعتبار کی کمی نہیں جو ہمارے ہیرو کے لفظ
راجہ اندر کے حکم سے بکاؤلی کو کھسی چڑیں پہلے اٹھیا ہی اور بعد کو محفوظ نہ رکھنے کا نتیجہ جس سے تاج الملک نے وہ بھول اپنے لٹنے سے خدا یا جس
کے لئے اپنی دو طرح کی استے لٹنے پاؤں مارے۔ اور اپنی تحقیقات جمیل تھیں۔ یہ سب اور ان کے علاوہ اور ایسی باتیں ہیں اس کتاب
میں موجود ہیں جن کی تفصیل انسانی زندگی میں نہایت سبق آموز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف تاریکی کو روشنی، عیب کو ہنر، زہر کے پالے
کو شہرت کا گلاس کہہ کر پیش کرنے کے آرٹ سے واقف ہے۔ وہ ہدی کے چہرے پر حسن و زینت کا نقاب ڈال کر اسے پیش نہیں کرتا۔
بلکہ ہدی کی جب معذوری کرنا ہے تو لٹک پٹک کر کہہ بھی دیتا ہے کہ یہ بدی ہے۔ اس کے قریب میں نہ آتا۔ دیکھیے جب بادشاہ کے چادوں
شہزادے ایک بازاری عورت کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں اور تاج الملک انہیں چھڑانا ہے تو مصنف کا قلم ان واقعات سے یہ نتائج
کھاتا ہے۔

”مے حیرت افزا نے معلوم کیا کہ میں نے کیا کیا؟ اس بات کا حاصل یہ ہے کہ دل میں شغل
تیز و جلدی بخش باوٹا ہی کا اور دیکھنے والا مادہ اور مجرما کا تھا جب اس کی آنکھ اس
خلیقت ناپاک پر پڑی۔ اس کی بصدارت کو رنگ لگا اور دیدہ روشن تاریک ہو گیا۔ اب
آنکھ اور سر نہ بینائی و شعور نہ معنی ملی مراد کی تلاش میں کوشش کر لیکن راہ میں دنیا سے قیاد
کی بازی میں کہ تختہ فریب کا دھرا ہوا ہے شغل نہ ہو جانا۔ سارا فاشہ کجہ کو پہلے فریفتہ کر کے
بتا دے اور بعد اس کے مکر کی جلی اور فریب کے چہرے کی مدد سے اچھا پانسہ اپنی
حسب مرضی پھینکے اور اچھا ناک تیرے قوٹل کا سراپا یہ آخر ہو جائے تب کجہ کو دائم الجس
کر رکھے۔ اگر تو صبر کے سیرے کی امانت سے اس مکارہ کی بازی طعم کو روک کر دے تو
وہ نا مشہور بادشاہوں اور گردن کشوں کی ہم نشین ہے تیری فرمانبرداری تو مٹی پر کہ چاہے کہ قہ
کو اپنے حسن و جمال پر فہمائے۔ پھر اگر تو اس کے منہ پر الفت سے نگاہ نہ کرے تو نہیں
سے کہ کئی مراد کے دامن پر تیرا دستہ پس ہو“

مولانا عبدالمجید دیابادی نے ایک مقالہ میں قصہ کلی بکاؤلی سے مناسبت تصوف و شعور نہ دھونڈ کر لکھے ہیں، مثلاً:
”تاج الملک سر مذکور نے کرتے سر عبد الملک بکاؤلی تک پہنچا لیکن وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ قلعہ بکاؤلی جہاں وہ گلی مراد پو شیدہ ہے
اٹھارہ ہزار دیوؤں کی حفاظت میں ہے اور سال سال بھر کی مسافت کے مقامات تک ان کی چوکیاں چلی ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ بیٹھار پر پاں ہوت
نگرائی کرتی رہتی ہیں کہ کوئی پرندہ ہوا کے راستے پہنچ نہ سکیں۔ نیز چوہوں کا بادشاہ بے حد حساب شکرتے زمین و آسمانوں کی پاسبانی کرتا رہتا
ہے۔ تاج الملک نے یہاں پہنچ کر ایک قوی سیگل دیکھ کر کسی طرح اپنے رافق بنایا اور اس کی بہن حاکم کو جو سب دیوؤں کی سردار تھی، ٹھایا یہاں تک

مولانا کا یہ مقالہ پہلے ہی رسالہ ”معارف“ انجم گم کو بابت جولائی ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اب یہی مضمون مجموعہ میں کچھ کے عنوان سے مضامین

عبدالمجید دیابادی میں صفحہ ۶۹ تا ۸۰ پر جمع ہوا ہے۔

اس نے اپنی پروردہ ایک حسین لڑکی محمد کو اس کے نکاح میں دے دیا۔ مصنف ان اسرار صوفی کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے :
 ۳۰۰ سوزنا روشنی چشم ظاہر میں کی سات پردوں میں ہے اور تجلی باری تعالیٰ کو نور دیدہ
 اولیا ہے ستر ہزار پردوں میں ہے۔ اگر یہ ارادہ ہے کہ وہ ہر دے درمیان سے اٹھیں تو
 پہلے اس بڑے گنبدان دیو نفس کا عجب کچ سے اٹھا کر اس کو بس میں کر کے وہ عین اپنی
 کبودی کو چھوڑ کر محمد کے مقام میں پہنچائے۔ لیکن یہ بات یاد رکھ کر کہ اگر یہ دے اٹھائے
 تو سید حاشیہ ہے ۔

تذکرہ نفس اور عرفان حق کی اس سے واضح تر تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے ؛ (معارف جولائی ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۸)
 تاج الملوک نصائب و آفات کا شمار بنتا ہے فلسفی ٹوٹی اور عصا الگ رکھ کر سرجاتا ہے۔ سر کرانے کے بعد ایک حوض میں
 نہاتا ہے تو مرد سے عورت بن جاتا ہے۔ طرح طرح کی مصیبتیں بھیلنے کے بعد ایک اور حوض میں غوطہ لگا کر پھر اپنی اصل حالت پر آتا ہے۔ یہ
 فلسفاتی کا رخانہ دوستان نویس کی بنیان سے ایک مجموعہ حقائق و معارف بن جاتا ہے۔ و تاج الملوک کی حکیم سے روٹی پر کرتا ہے :
 ”اے یاران دہرا حق تعالیٰ نے بنی آدم کے سر پر کراحت کی ٹوٹی پہنا کر اور عظمت کا عصا
 ہاتھ میں دے کر فلسفہ کو دنیا میں کر مرزہ آخرت ہے عاقبت کی تکمیل کے لئے بھیجا ہے
 پس انسان کو چاہئے کہ کل خود خاں اور آب و سراب خوب پہچانے۔ ہر ایک بانگ کے
 پھول گزرتے سمجھے۔ ہر ایک تر سے گھڑانہ بھرے کہ ہاں کاٹنے گل سے رنگین اکثر اور
 شرب بھر دو سنا آب اور دھڑھڑ ہے اسے حویزا اگر گورہ دنیا کے لئے عیشہ جہاں میں
 غوطہ مارے گا خود اس کا کلاہ اور عصا کھو دے گا۔ یہ حکم اس بات پر ہے کہ طالب
 دنیا پرست میں اور طالب سید و صاحب ہیں بتیرا پیکر معانی جو خدا مرد و کامل ہے ہر صفت زناں
 ناقص و معطل ہو جاتا ہے گا۔ پس اس وقت نیکو بانی کے سوا کچھ چارہ نہیں۔ چاہئے کہ
 دم بخود ہو کر گورہ دنیا سے نکلی اٹھیں اور غوطہ مارے۔ اس کے بعد جو سر و شعلے کا توہی
 عصا اور وہی ٹوٹی سر پر رکھے گا ۔“

”اس قسم کی فصاحت بہت پاکیزہ انداز کی تھی اور قصبے کو تشبیل کا رنگ عطا کرتی ہیں۔ فوقی فطرت کے بعد جب یہ بند آتے ہیں تو
 ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ ایک تشبیل ہے جس کی یہ تفسیر ہے۔ ان فصاحت سے قصبے کی فصاحت بلند ہو گئی ہے۔ قصبے میں انماک اور اتفراف کے
 بعد ہم اس طرح چونک پڑتے ہیں جس طرح کسی دنیا میں پھنسے ہوئے آدمی کو کیا کیا رحمت کا پیغام دیا جائے۔ اسے اس حالت سے
 خبردار کر کے صحیح راستہ بتایا جائے۔ ان میں وعدہ کی خشکی نہیں۔“ (اردو کی تخری و داستانیں ص ۱۷۷)

مشہور فرامیسی ناضل اور ادب اور ادب کے سرپرست و قدر شناس گارسیں ڈی ٹامی نے جو انگریزی عہداری کی ابتدا میں مشرق
 ہندوستان میں مقیم رہے اپنے بعض مچھروں پر مشتمل ایک کتاب لکھی تھی جس کے فرامیسی نام کا ترجمہ تاج الملوک و کجاولی کے افسانہ عشق کے
 فلسفیانہ و مذہبی نتائج و نکات ہے۔

ناگپور کا ایک متوسطہ کا علاقہ اور جزیب میں سوسیل کے فاصلے پر ضلع بلاس پور کا علاقہ ہے مغرب اور شمال میں ریاست دیوان کی حدیں ملتی ہیں یہاں موضع امرکنٹک میں جو خوبصورت تھمراہی ہے اس میں پانچ چورس پینٹس اور پکائی آباد ہیں۔ امرکنٹک دراصل ایک جنگل ہے جس کے کھنڈے یہ موضع مشہور ہے۔ اس موضع کے ایک گوشے میں ایک مندر راج کرن کے زمانہ کا اب تک موجود ہے جو سن ۱۵۲۵ء کو مٹی میں دیوان کا راج تھا۔ ایک راجہ مرہا راجہ جادو نے بنوائی ہے جو آج سے پچاس سال قبل راج پاٹ چھوڑ بیٹھے تھے۔ اس سے مسافر دیوان اور یاتریوں کو بہت آرام ملتا ہے۔

نربدا کے دو نہر ایک پختہ تالاب ہے جس کے ایک طرف ایک مندر بھی ہے۔ اس مندر کے نیچے ایک قدیمی پتھر جانی ہے جس سے تالاب ہر وقت بھرا رہتا ہے۔ تالاب کے مغرب کی طرف ایک اور موضع ہے جس میں پانی غلو قلو ہمکدا اٹھتا ہے۔ نہر کی دھار کے جو موضع سے قریب چالیس گز کے فاصلے پر گنتی ہے یہ گھاٹ قدیمی آبشار کا کام دیتی ہے اور نہایت جھریب گاں پیدا کرتی ہے۔ اس گھاٹ میں قریب دو میل پہاڑ کی بلندی سے پانی گرتا ہے۔ اس کو پل دھار کہتے ہیں۔ آبشار کو نہر کے دے پانی کی پانی اس کی دھار دینے سے پہلے ہی گر پڑے اور کوڑا آدمیوں کے لئے اس کی فائیت ہے۔ تالاب کے چاروں طرف ہیرا لگی اور پکائی میٹھے رہتے ہیں۔ یہاں کا ایک چیت اور بکھ کے مہینوں میں میل گتا ہے جو کئی مہینے رہتا ہے۔ اس میں خیلوں اور نمنا جوں کو کھانا بھی کھلایا جاتا ہے۔

سون ندی دیہاتے نہر کے دامن سے دو میل شرق کی جانب بھارت کے علاقے میں جا ملتی ہے۔ وہاں سے چو کاٹ کر ریاست دیوان میں داخل ہوتی اور پھر دیہاتے گنگا میں جا ملتی ہے۔ اسی سون وادی میں موٹا کے قریب ایک بہت بڑا سرسبز و شاداب اور مختلف قسم کے خوشبودار پھولوں سے آباد ایک جنگل ہے۔ اس جنگل کو بکاؤلی کا باغ کہتے ہیں۔ اسی جنگل میں ایک درخت ہے جس کے پھول ہڈی کے رنگ کے ہوتے ہیں۔ اسے بکاؤلی کا درخت کہتے ہیں۔ گل بکاؤلی نہر دیہاتے میں بطور چڑھاوا چڑھتا ہے۔ پنڈتوں کا کہنا ہے کہ گھوچر جے پنجابی میں گنگا نکالتے ہیں، اس کے ساتھ گل بکاؤلی میں کر آ کر آکھیں میں لگایا جائے تو آنکھوں کا جلا دور ہو جاتا ہے۔

کتاب تھمراہان بہار میں مصلیٰ اور منشی محمد الدین فتح مرحوم مدیر اخبار شمیری لاہور نے آج سے پچاس سال قبل اپنے سفر تکمیل میں لوگوں کی زبانی سنا تھا کہ مولوی سید بد علی تحصیلدار رام نگر علاقہ دیوان، جہاں ایک پنج کے انہوں نے اس مقام کی سیر و پیمائش کی مگر دلیل اور اخبار دار جہاڑیوں کی وجہ سے وہ جنگل میں دوڑ نک نہ جاسکے۔ اگرچہ امرکنٹک ان کی تحصیل میں تھا، ان کو آرام و آسائش، راہداری اور واقعیت کے تمام ذرائع حاصل تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ البتہ وہ پیرنٹ اور بکاؤلی کے کچھ پودے وہاں سے لے آئے جو انہوں نے لگائے گئے پیرنٹ کے درخت تو کچھ حصہ دیہاتے ہر گئے مگر بکاؤلی کے چند درخت ششہ تک رام نگر میں موجود تھے۔ شاید اب بھی یہاں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اصلی بکاؤلی کے درخت نہیں بلکہ وہ درخت ہیں جو چھللی منیش کے اثر میں اصلی درخت کی خوشبو سے ایسے ہو گئے ہیں۔ جیسے ہمارے پنجاب میں قصور کی مٹی بہت مشہور ہے جو اصل ذہبت کم اور صرف ایک آدھ کھیت ہی میں ہوتی ہے لیکن اس کی خوشبو سے دوسری قسم کی مٹی کے کھیت بھی اسی طرح خوشبودار ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ بکاؤلی کے یہ درخت بھی ایسے ہی ہیں۔

خان بہادر مولوی رحمان علی دیکل دیوار دیوان مقیم متانے منشی محمد الدین صاحب فوق کو بتایا تھا کہ سید بد علی تحصیلدار نے بکاؤلی کے کچھ پھولیں پھول بطور تھمراہی سے پاس بھی بھیجے تھے جن کو میں نے دوستوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ وہ پھول زردی مائل اور خوشبودار تھے۔ تھمراہی لگایا کہ جب کسی کی آنکھ مشوب کرتی تو اس پھول کا حق ڈالنے سے آرام ہو جاتا۔

گل بکاتلی کے حالات میں ایک کتاب تاریخ طبرستان لکھی تھی جس میں لکھا ہے کہ سرکنگ ایک جنگ کا نام ہے جو ایسا دینا
 پڑھا و بخت نامک اور اتنی دودھ ہے کہ کان کوئی جاننے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ امرکنگ ریڈاں سے باہر نکل جانے کا نام ہے۔ اس جنگ کی آج
 تک یہاں شش نہیں ہوئی۔ اس کی حدود اصطلاح بھول، بلاں پورا اور زندہ سے ملتی ہے یہاں اصطلاح جنگ سے باہر اور ترقی ہو جانے کے نام سے یہی
 اس جنگ میں بے شمار تھے اور نہ گزندے، شیر پیتے، ریکچہ بند اور دیگر اکیس ہیں۔ اس سے پہلے بکاتلی ایک نرنگ بدوقت پہنچے جاتے ہیں
 مگر قلعہ بکاتلی ایک کوئی نہیں جاسکتا اور یہ ایک مسلم مسلم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس قلعہ سے بدوقت و صول اٹھتا رہا ہے اور دن رات
 نسبت نامک آوازیں آتی ہیں۔

قلعہ بکاتلی کس نے بنایا ایک بنا، اس کے متعلق لکھا ہے کہ سن ۶۵۲ء میں سے پہلے دکن کے ایک سامنے اپنے بھرتے بیٹے
 بصیرت سے ناراض ہو کر اسے کوہستانی جنگ اور قریب ایک دے کر ایک کر یا جب راجہ کے گھوڑے بھرتے بیٹے کے ہمارے بدقت نامک
 اس کا تجربہ ہو گا کہ بڑے بیٹے شامز جنگ کا ملک ہرگز سرسبز نہ ہو گا اور بھرتے کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

غرض ملے بصیرت تن بہ تقدیر اپنے قلعہ ملک ہیں جو اس کی فوج کی تعداد کے لیے بھی کافی نہ تھا، آیا۔ جب اس جنگ میں پہنچا تو اسے دھننے
 کے لیے کوئی کونڈوں تمام نہ مل سکا۔ آخر ایک دین واپس ہوا اپنے ہوا ہیں کے ساتھ جن میں اکثر ریاضی دان اور نجومی تھے امرکنگ میں پہنچا۔ وہاں اسے ایک
 بہت بڑا تالاب نظر آیا جس کی وسعت اور گہرائی کوئی اتنا نہ تھی۔ بصیرت نے یہ تمام پسند کیا۔ اس کے مشیروں نے اپنے علم اور تدبیر کے ذریعے
 تالاب کے وسط میں ایک قلعہ بنوایا جس میں واقف کاروں کے سرا کوئی جائز نہ تھا۔ قلعہ کے علاوہ مکان اور قلعہ آئینہ زخات بھی تیار کر کے بظاہر
 انسانی طاقت سے ہیہ معلوم ہوتے تھے۔

بصیرت راج کے گھر اسی قلعہ میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جو بہت حسین خلقی اور جس کی جسم پتری بنا کر بزمیں نے اس کے نیک اختر ہونے
 کی بشارت دی تھی۔ اس لڑکی کے دو نام رکھے گئے۔ ایک شامیب یعنی پریش کی امانت اور دوسرا زبیرال جس کے نام پر بعد مشہور ہے۔ مگر یہ
 دونوں نام زیادہ مشہور نہ ہوئے۔ ایک ہیرا گئی نے اس لڑکی کا حسن و جمال دیکھ کر اس کا نام بکاتلی رکھا جو آج تک مشہور ہے۔

معلوم نہیں تاج الملوک اور بکاتلی کے عشق و محبت کی داستان فرضی ہے یا اس میں کچھ اصلیت بھی ہے۔ بہر حال بکاتلی میں
 کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔

حضرت سید احمد بریلوی کی داستان جہاد

ڈاکٹر غلام جیلانی بریق

سید احمد بریلی کے رہنے والے تھے۔ ۲۹ فروری ۱۸۸۱ء کو ولادت ہوئی۔ والد کا نام گرامی سید محمد عرفان تھا۔ سلسلہ نسب مجتبیٰ علیہ
پشت حضرت علیؑ سے جاتا ہے۔ سید عرفان بھٹو میں ملازم تھے۔ شیشہ میں بھار چڑھتے اور بیماری ہی کی حالت میں وطن کو چلے گئے لیکن
وہیں انتقال ہو گیا۔ اس وقت سید احمد کے عمر چھ برس تھی۔ بریلی کے مکہ تب میں نازیروہی کی کتابیں چڑھتے اور ساتھ ساتھ ابتدائی اسلامی مشق
بھی کیا کرتے تھے۔

اسی اثنا میں وہلی کے شاہ ولی اقصی خاندان کا شہوش تو بغرض انتفاہ بریلی سے پیدل چلے گئے۔ چودہ دن کا سفر تھا اور آپس کی صحبت
میں صرف تین پیسے تھے۔ آپ ہر چوتھی منزل (چوتھے روز) پر ایک پیسے کے سوا اور ذرا سا کھانکھا کر گزارا کرتے اور پھر مین دن صبح کے ہوتے۔
چھ دن کے بعد شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ نے سید احمد کو اکبر آبادی مسجد میں شاہ عبدالقادر (فران) کا مشہور رزمبرائی کا سہرا لٹا
بیٹھا دیا۔ وہاں کوئی چند گناہیں پر مہربان تھیں۔ اس قدر مشاہدے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ شیشہ میں شاہ عبدالعزیزؒ کے ہاتھ
پر بیعت کر لی۔ کچھ مدت بعد وطن چھٹے آئے۔ شیشہ میں ضعیف آبادی کا ایک سید زادی زہود سے شادی کر لی۔

وہ زمانہ مغلوں کے غلامانہ تھا۔ کئی صوبے ہو کر سے کٹ چکے تھے۔ مرہٹوں کی طاقت بڑھ رہی تھی۔ پنجاب پر بھگت سنگھ
کا قبضہ تھا اور جنوب و مشرق سے انگریزی تسلط کی آمد سی بڑھ رہی تھی۔ سید احمد ایک شمس دل و دماغ رکھتے تھے۔ آپ نے مستقبل کے پہلو
سے اسلامی زوال و انحطاط کا منظر دیکھا تو تاریخ کے دھارے کو روک دینے کے واسطے سوچنے لگے۔

اس نائنے میں سید احمد نے چھ گناہیں ایرخان انگلیجی کی محنت و محنت تھا۔ اس کے پاس چھ مہینے ہزار جانا بڑوں پر مشتمل ایک شاخ
لنگر بھی تھا۔ سید احمد اس قومیت کے دل چاہے گئے۔ ۱۸۸۱ء سے ۱۸۸۲ء تک اس کے دل سے یہ سوچا تو ان کی حیانت و خبیثت کے منہ پر ہر
رہے تھے کہ نواب ایرخان انگلیزوں سے مل گیا اور سید صاحب مجبوراً دل نہ گئے۔

دہلی میں ہزار مسلمانوں نے شاہ اسماعیل میت آپ کی میت کی۔ پھر دیات و قصبات کا وعدہ کیا۔ ۱۸۸۱ء میں بریلی کی طرف چل
وئے۔ راہ میں ہزار مسلمانوں نے بیعت کی۔ دو برس اور دو ماہ بریلی میں قیام کیا۔ پھر مارا کس اور کان پور سے ہوتے ہوئے کلکتہ میں پہنچا اور وہاں
سات مہینے قیام کیا۔

جب آپ نے دیکھا کہ لوگوں میں جہاد کی ٹھپ پائی جاتی ہے تو آپ نے اس عظیم کام کو شروع کرنے سے پہلے عزم کی زیادت کا

فیصل آباد۔ چنانچہ ۳۰ دسمبر ۱۸۵۲ء کو چار سو عقیقت منوں کے بھروسہ دلائے ہوئے۔ بنارس کے کشمیریوں کے فدیہ لکھتے ہوئے۔ گھر سے خالی ہاتھ نکلے تھے لیکن راہ میں قدر دانوں نے اس قدر داند سے پیش کیے کہ لکھنؤ میں دس ہزار روپے لکھ کر دیا جو وہ بندہ دے بنا تھا اپنی جیب سے لاکھ لاکھ ہزار روپے دے اور پورے دس ماہ کے بعد اہر سنی ۱۸۵۳ء کو یہ فائدہ لکھ کر واپس داخل ہوا۔ عجیب کی فریاد صد تک بیت اللہ میں رہے بعد پھر مدینہ طیبہ میں پہنچے۔ ایک ماہ وہاں رہے۔ دو عبادت گاہ کو آئے اور مین میں کل چھ ماہ تک قیام کرنے کے بعد واپس چلے گئے اور وہاں ہر ایک کو بل کر بلایا۔ حج میں سامنے فاضلہ کا بیٹا اتنی ہزار روپے سے نڈھ ہوا تھا جو کہنے سے اپنی جیب سے ادا فرمایا اور اس کے بعد بھی آپ کے بیت المال میں دس ہزار روپے بڑھ گئے۔

وطن پہنچنے ہی آپ جہاد کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ بائیس ماہ تک تبلیغ و ترغیب نیز حج و عمرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد آپ جنوری ۱۸۵۶ء میں سات سو جہان بازوں کے ساتھ گھر سے نکل پڑے۔ راہ چلتے آئے سندھ اور کوئٹہ سے ہوتے ہوئے پہلے قندھار پہنچے۔ اور وہاں سے ۲ اکتوبر ۱۸۵۶ء کو کابل میں داخل ہوئے۔ ڈیڑھ ماہ کابل میں رہے۔ غالباً سید صاحب امیر کابل اور اس کی رعایا سے مدد مانگتا تھا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی اور ۱۹ دسمبر ۱۸۵۶ء کو وہاں سے چل دئے۔ صرف پانچ روز کے سفر کے بعد پشاور آ گئے۔ تین روز کے بعد چار سہ چلے گئے اور گرد و نواح میں جہاد کی تبلیغ شروع کر دی۔ آپ نے اس علاقے کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ صوبہ سرحد کے لوگ سکھوں کے ظلم سے تنگ تھے۔ نیز یہ لوگ بہادر اور فنی کارزار سے آگاہ تھے اور پھر اس علاقے میں قدرتی طور پر چھ جلی بہت زیادہ تھے۔

جیسے سکھوں کو آپ کی سرگرمیوں کا علم ہوا تو دس ہزار سکھوں کی ایک فوج سردار بدو سنگھ کی کمان میں روانہ ہوئی اور ان کا ٹھکانہ جنگ میں پہنچ کر جنگ کی تیاریاں کرنے لگی۔ سید صاحب پندرہ سو جہادوں کے ہر اوچا رسد سے نکل کر نوشہہ میں آ گئے۔ ۱۹ دسمبر ۱۸۵۶ء کی شام کو زور چاڑھوں کا ایک دستہ روانہ ہوا اور آدھی رات کو سکھوں پر چاچا نک چڑھا۔ سکھوں میں گھبراہٹ اور ابتری پھیل گئی۔ اس جھڑپ میں چالیس خانی اور ایک ہزار سکھ ہلاک ہوئے اور کچھ تین میل سپاہ ہو کر شیعہ میں آ گئے۔ چند روز بعد سید صاحب نے صفوہ پر ایسا ہی ایک چھاپہ مارا۔ وہاں بھی سکھوں کا کافی نقصان ہوا۔ چار سو کے قریب ہلاک ہو گئے۔ لیکن اس مرتبہ سکھ سپاہ نہ ہوئے بلکہ تعاقب کیا اور فغانوں کو بھاری نقصان پہنچایا۔ صفوہ کی جھڑپ کے بعد سارے علاقہ کے علماء و خواہین نے سید صاحب کو اپنا امام بنالیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ بہت سے دعوہ بعد سید صاحب کے لشکر میں اتنی ہزار جہان باز شامل ہو گئے اور پشاور کے سردار یار محمد خان کے بیس ہزار جوان ان کے علاوہ تھے۔

کافی تیاریوں کے بعد سید صاحب کی فوج شیعہ کی طرف جہاں بدو سنگھ کی فوج (دعا آؤ ۳۵ ہزار) خیر آباد تھی، برسی پیش قدمی یار محمد خان کی اپنے لشکر کے ہر اوچا شامل ہوا۔ صبح کا ناشتا کھاتے ہی سید صاحب اسماعیل دتے میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن اس بہر میدان جنگ میں موجود ہے۔ لڑائی شروع ہوئی، گھسان کاڑھ پڑا۔ سکھوں کو زبردست شکست ہوئی۔ میدان جنگ سکھ متھتوں سے پرٹ گیا اور باقی ماندہ بھاگ نکلے۔ مین اس موقع پر پہلے سے طے شدہ حکم کے تحت یار محمد خان کے آدمی سرپٹ میدان سے بھاگ نکلے اور شہر چھاپا بھاگ نکلے۔ شکست شکست۔ گھبراہٹ میں چند دیگر مسلمان بھی دوڑ پڑے جس سے باقی ماندہ سکھوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ پٹ کر وہ علاقہ کیا کہ مکمل فتح کو ایک خوفناک شکست میں بدل کر رکھ دیا۔ چھ ہزار فغانی ہلاک ہو گئے اور باقی بھاگ گئے۔ یہ شکست تھی جس پر سکھوں نے ساری سلطنت میں چر خاں کیا تھا۔

کہتے ہیں کہ اس روز یار محمد خان ہی کے کسی آدمی نے سید صاحب کے ناشتے میں زہر ملا دیا تھا۔ گو سید صاحب بچ گئے لیکن بھنگ

نہا کا اندر۔ غازیوں کی جمیعت منتشر ہونے کے بعد آپ کئی ہفتے تک بیماری کی حالت میں تریہ بہ تریہ گھومتے رہے اور پھر سوات کی طرف نکل گئے۔ وہاں چند ایک قبائل کو جادہ کے لئے بے تاب پایا۔ چنانچہ انہیں جمع کیا اور ایک مختصر سا لشکر شاہ اسماعیل کی کمان میں ہزارہ کی طرف بھیجا۔ سکھوں سے ایک دو غیر فیصلہ کن سی جھڑپیں ہوئیں۔

سوات سے لوٹ کر سید صاحب ایک مقام بھٹار میں آگئے جہاں دو ہزار غلام نے آپ کو امیر شریعت مقرب کر کے آپ کے ہمیت کر لی۔ لیکن ہندو کے رئیس غادے خاں نے ہمیت کے باوجود علم بغاوت بلند کر دیا۔ چند ماہ پہلے یعنی مئی ۱۸۶۸ء میں مدانی سردار نے ایک لشکر سید صاحب کے خلاف بھیجا تھا۔ اٹلان ڈی میں تصادم ہوا۔ پہلے سید صاحب کو کامیابی ہوئی۔ لیکن آپ کے چند بھائی سردار دھوکہ دے کر ورتانیوں سے جا ملے اور یہ فوج شکست میں بدل گئی۔ انہی دنوں سید صاحب نے ایک فوج سکھوں پر حملہ کرنے کے لئے قلعہ ٹانگ کی طرف روانہ کی اور تمام مصلحت کو حیرت سوز میں رکھا گیا۔ یہ فوج نہایت ہوشیار دی سے چپکے چپکے جا رہی تھی کہ غادے خاں نے سکھوں کو اطلاع دے دی اور غازیوں کو کامیابی کا سہ دیکھنا پڑا۔

اس کے بعد سکھوں نے سید صاحب کے بڑے گوارڈ پر بھارتیوں پر حملہ کیا لیکن مسلمانوں کے دفاعی انتظامات اس قدر مضبوط تھے کہ سکھوں کا کام لوٹ گئے۔ اس فوج میں ٹنگی ایک اہم مقام تھا جس پر ورتانیوں کا قبضہ تھا۔ سید صاحب نے اسے آزاد کرنے کے لئے فوج بھیجی جس کا ایک حصہ غازیوں کو چھوڑ کر ورتانیوں سے جا ملا اور غازیوں کو بھرپور شکست ہوئی۔

چونکہ غادے خاں مسلسل بریٹانی کا باعث بنا ہوا تھا اس لئے سید صاحب نے پانچ سو سواروں کا دستہ شاہ اسماعیل کی کمان میں غادے خاں سے پٹنہ کے لئے روانہ کیا۔ مولوی سی جھڑپ کے بعد مہم تریہ قبضہ ہو گیا اور غادے خاں میدان جنگ میں مارا گیا۔ یہ قسمیہ ختم ہی ہوا تھا کہ پشاور کے ورتانی سردار یار محمد خان نے غازیوں کے خلاف حملوں کا ایک نانا بنا دیا۔ آخر ۲۹ ستمبر ۱۸۶۹ء کو سید صاحب نے ایک مختصر فوج یار محمد کے خلاف بھیجی۔ نتیجہ کے مقام پر لڑائی ہوئی۔ یار محمد مارا گیا اور اس کی فوج بھاگ نکلی۔ اس معرکہ میں صرف دو غازی شہید ہوئے تھے۔

یار محمد کے بعد اسب کے امیر بابینہ خان نے شہریت شروع کر دی۔ مجبوراً اس سے علی علی پڑا۔ اس وقت ہو گیا اور پانچواں نے اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد پشاور کے امیرستان محمد خان نے یار محمد کا انتقام لینے کے لئے بارہ ہزار کی ایک فوج روانہ کی۔ سید صاحب نے صرف رات سے تین ہزار سپاہی بھیجے۔ مردان کے قریب کھسار کا دن پڑا۔ سلطان محمد بھاگ نکلا اور پشاور میں جا دم لیا۔ سید صاحب نے اسے پشاور میں آگیا اور اس نے اطاعت قبول کر لی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ تمام علاقہ دشمنوں سے صاف ہو چکا تھا۔ اسب سے لے کر خیبر تک غازیوں کا حکم آزادانہ لہرا رہا تھا اور وقت آگیا تھا کہ تمام نزاعات سکھوں کے خلاف صرف کی جائے۔

اس سلسلے میں انتظامات ہو رہے تھے کہ سرحد کے تمام علاقہ نے سید صاحب کے خلاف ایک مہم شروع کر دی۔ ان پر مختلف قسم کے فتوے لکائے۔ پشاور کے گورنر نے اس مہم میں خاصہ حصہ لیا اور جب لوگوں کو نتیجہ متزلزل ہونے لگی تو مسلمان محمد پشاور کے قاضی بروہی نے غلطی کر کے سید صاحب نے غلط کیا تھا، قتل کر ڈالا اور ساتھ ہی چند غازیوں کو بھی مرگ کی گھاٹ اتار دیا۔ پشاور صرف پشاور ہی میں نہیں ہوا تھا بلکہ سلطان محمد کی دوت اور علاقہ کے فتووں نے سارے علاقے میں آگ لگا رکھی تھی۔ چنانچہ مقامی ملکوں نے

بسیوں عظامتہر سید صاحب کے انتظامی افسروں اور سپاہیوں کو ایک روز منہ اندھیرے مار ڈالا اور اس طرح وہ قہر و حرام سے زمین پر آ کر ہی جس کی بنیاد سید صاحب نے ہزار ہا جان باندوں کے سروں سے ڈالی تھی۔

امرا و علما کی اس خدائی سے سید صاحب کو انتہائی دکھ ہوا۔ آپ کے تمام دلوں پر اس پرگنی اور جب آپ نے دیکھا کہ خود مسلمان ہی اسلام کا سرگرد و غدر کے پتھر سے پھل رہے ہیں تو آپ نے پختہ سے بھرت کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ رخت و سحر باندہ حاکم اور چند عقیدت مندوں کو ہمدرد لے کر ۳۰ دسمبر ۱۸۳۱ء کو شمالی پہاڑوں کا رخ کر دیا۔ پہلے راج دواری میں قیام کیا۔ یہ جگہ وادی کا فان کے نقطہ آغاز کے قریب ہے۔ تین ماہ بعد اپریل ۱۸۳۱ء میں بالا کوٹ جا پہنچے۔ یہاں سید صاحب کے گرد پھر کچھ پروانے جمع ہو گئے آپ نے ان سے کام لیا اور ان کے فوج کو منظر آباد و آجکل آزاد کشمیر کا دار الحکومت پر قبضہ کر لیا۔ نغہ آباد کا ایک بڑی اثر میں زبردست خان پہلے سید صاحب کے ساتھ تھا۔ لیکن حملہ کے دن کھجور کے ساتھ مل گیا۔ باقی ہمہ کھجور کو شکست ہوئی۔ اس شکست کا انتقام لینے کے لئے بڑی تعداد میں کھجوریں جمع ہوئیں اور بالا کوٹ پر حملہ کر دیا۔ اس وقت سید صاحب ایک مسجد میں تھے براہِ رنجی جگہ واقع تھی۔ کھجوریں اسے مغربی پہاڑوں سے آ کر بالا کوٹ کی طرف بڑھ رہی تھیں اور مسلمان انہیں روکنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ نیچے میدان میں اور سامنے پہاڑ کے دامن میں ہر طرف تلواریں چل رہی تھیں۔ گیارہ بجے کے قریب خود سید صاحب غازیوں کے ایک دستے کے ساتھ میدان میں آئے۔ ان کے دسکے کھجور کو کھٹے تھے۔ سامنے پہاڑ کے دامن تک نکل گئے۔ وہاں کھجوریں کافی تعداد میں تھیں۔ مسلسل گولی چلاتے رہے۔ آخر ایک گولی آپ کی ران میں لگی لیکن آپ آگ برداشتے ہی رہے۔ پھر ایک وزنی بل آپ کے سر پر پڑی۔ آپ گر گئے اور اس طرح ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو دن کے بارہ بجے یسوع و جالہ ہمیشہ کے لئے چھو گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ کو وہیں ایک جگہ دفن کر دیا گیا۔ لیکن کھجور نے دو دن بعد قبر کھود کر آپ کی نعش دریا میں بہا دی اور اس وقت بالا کوٹ میں جو قہر سید صاحب سے منسوب ہے وہ مورخ کے نزدیک محض ایک نشان ہے جس میں کچھ بھی دفن نہیں اور اگر ہے تو وہ سید صاحب کی نعش بقیدِ نابیہ۔

اسی روز میدانی جنگ کے شمالی نقطوں میں حضرت شاہ اسماعیل بھی لڑتے لڑتے شہید ہو گئے تھے۔ ان کی قبر مقام شہادت کے قریب ہی واقع ہے۔

- ۱۔ سید صاحب کی تاریخ ولادت
 - ۲۔ دہلی میں شاہ ولی اللہ خان سے تعلیم
 - ۳۔ شادی
 - ۴۔ اودے پور کے نواب امیر خان کے پاس
 - ۵۔ سفر فرج
 - ۶۔ حج سے واپسی
- ۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء
۱۸۰۲ء تا ۱۸۰۶ء
۱۸۰۹ء
۱۸۱۰ء تا ۱۸۱۸ء
۳۰ جولائی ۱۸۲۱ء
۲۹ اپریل ۱۸۲۳ء

- ۶۔ امدادہ ہمارے آغاز سفر
۸۔ کابل پہنچے
۹۔ کابل سے کوچ
۱۰۔ پشاور میں پہنچے
۱۱۔ نوشہرہ میں ورود
۱۲۔ سکھوں سے پہلی جھڑپ اکوڑہ میں
۱۳۔ شیدو، احصو اور ٹنڈ کی جنگیں
۱۴۔ اٹمان زئی میں ڈرائیبل اور غازیوں کی جنگ
۱۵۔ دو ہزار عہدہ داروں کو امیر شریعت بنایا
۱۶۔ غازیوں کا ناکام حملہ ایک پر اور سکھوں کا پنجاب پر غازیوں کا حملہ ٹنڈی پر
۱۷۔ زبدہ کے مقام پر یار محمد خان سے جنگ
۱۸۔ اس کے سردار پانینہ خاں سے جنگ۔ مردان کے قریب سلطان محمد خاں سے تصادم { نامعلوم
پشاور فتح۔ عام بغاوت
۱۹۔ پنجتار سے ہجرت
۲۰۔ بالاکوٹ میں ورود
۲۱۔ شہادت
- ۶ جنوری ۱۸۲۶ء
۲ اکتوبر ۱۸۲۶ء
۶ نومبر ۱۸۲۶ء
۲۱ نومبر ۱۸۲۶ء
۱۹ دسمبر ۱۸۲۶ء
۱۹ دسمبر ۱۸۲۶ء کی رات
تاریخ نامعلوم
مئی ۱۸۲۸ء
فروری ۱۸۲۹ء
تاریخ نامعلوم
۵ ستمبر ۱۸۲۹ء
۳۰ دسمبر ۱۸۳۰ء
اپریل ۱۸۳۱ء
۶ مئی ۱۸۳۱ء

عر : ۴۴ سال ۵ ماہ ۷ یوم
مرتبہ جہاد : ۱۹ دسمبر ۱۸۲۶ء سے ۶ مئی ۱۸۳۱ء تک یعنی چار سال چار ماہ ستون یوم

آگرہ کی ادبی شخصیتیں

میکش اکبر آبادی

آگرہ کے پہلے ہنزہی مضمون سے زیادہ اپنے حال میں مست رہے۔ شاہجہان کے آگرہ سے جلنے کے بعد آگرہ ایک گوشہ ہو کر رہ گیا۔ آگرہ کے واسطے گوشہ گیر مہیاں نظیر کسی رئیس نے ماہر سے بلایا تو انہوں نے کہیا کہ میں تو وہاں ایک جانا ہوں جاں تک ساج محل کے بیچ سے نظر آتے ہیں۔ ماری عکس کے پڑھا کر گزردی مگر آگرہ نہ بچھوڑا۔ میرزا غالب آگرہ پر نہ جاتے تو شاید یہ مقام چل نہ کر سکتے۔ یہاں نظیر کے صاحبزادے یہاں تھے۔ اعلیٰ امیر کی دو دواؤں اور دکنی بول کے صفت تھے گراج خود آگرہ سے والوں کو بھی ان کا کوئی شعر یاد نہیں۔ کاشخدا کے واسطے راجہ بڑا ہن گئے۔ راجہ کا خدا صلا کرے کہ وہ ساتھ رو پر ہمارا انہیں راجات دیتے رہے۔ ایک طرحی مشاعرے ہیں تھوڑا بہت دوسرے شعر انگریز تھے۔ امیر کی غزل سب اچھی رہی۔ امیر جب غزل پڑھ چکے تو ایک رئیس نے ہر محل مثیل پر ایک اشرفی دکھا کر پیش کی۔ امیر نے کہا ایک شعر بانی رہ گیا تھا۔ پتے وہ اہل علم و فضل رہے۔

سختی نے نہ رہی بلکہ روپا تو کب
پلکتا ہے مٹی اہل کرم کی بندھی ہوئی
میں نے انی اساتذہ کے دیکھنے والوں کو بھی اچھی طرح دیکھا لیکن یہ سنایا کہ اب اسیر مہر شاہ وغیرہ کے بعد آگرہ میں شاعری کے چار منزلیں بچے جاتے تھے۔ رئیس، واصف، شاعر اور عال۔ اب ہمارے ہاتھ میں نہ ان حضرات کا کلام ہے نہ سرائح حیات۔ اجماعاً صدیقی نے رسالہ شاعر کا اور رضاد صبا اکبر آبادی نے "مشورہ" کا آگرہ نمبر شائع کر کے یہ احسان کیا کہ آگرہ کے اہل قلم کے مختصر حالات یک جا کر دیئے۔

آگرہ کے ادبی شخصیتوں پر اگر کچھ لکھنا چاہیے تھا تو فشی خادم علی خاں صاحب اختر کو کہیں کہ وہ عمر میں یہاں کے سب ادیبوں اور شاعروں سے بڑے ہیں۔ انہوں نے رئیس، واصف وغیرہ کو نہ صرف دیکھا بلکہ ان کے سامنے شاعر بھی پڑھے ہیں اور ان کی بہتوں میں بیٹھے ہیں مگر مختصر حسب محلی پاکستان کو یہاں سے جوئے اور نہ بھی جرتے تو اب ان کا وہ دل دماغ کہاں۔ دل تو شاید اب بھی وہی ہو کہیر نکاب بھی جب کوئی قبول صحت انسان ان کے سامنے آجاتا تو ان پر ایک انصافی کیفیت طاری ہو جاتی تھی خواہ وہ کسی عمر اور کسی طبقے کا ہو۔ مگر وہ دماغ تو اب یقیناً نہیں رہا جب وہ شاعری بھی کرتے تھے۔ تجارت بھی نہ لیدٹی بھی۔ ایکشن بھی رٹتے تھے اور شاعر بھی۔ خود تو وہ میرزا علی گہری سے آئے نہ بڑے، مگر کونسل اور اسمبلی کے ایکشن انہوں نے خوب لڑا۔ ہر طبقے اور ہر طرح کے لوگ ان سے مشورہ لیا ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی بکلی سوجھ بوجھ کا نام آگرہ کے شعرا کیٹ کی تعمیر اور اس کی انجمن کی تنظیم ہے جسے آگرہ کے واسطے کبھی فراہم نہیں کر سکتے۔ ان کا ادبی کارنامہ

حال میں ان کا کچھ کلام دستیاب ہو رہا ہے لیکن شاید اسے کاغذ پر آج اور دوسری کتابیں اب بھی ملے۔ اس شاعر کے کچھ مٹی پڑیا ہمارے ساتھ ہے ہم کی بندھی ہوئی۔

یہ نہ صرف چند نصیحتوں تک محدود ہے بلکہ ان کے کام کے مقابلے میں بھی نہیں ہیں وہ ایک ایک نشست میں سینکڑوں شعر کہ ڈالتے۔ آپ جب ان کے حکاکن پر جائیں گے انہیں شعر لکھا ہوا پائیں گے کہ خط و کتابت کو خود بھی مشکل سے پڑھتے تھے۔ ہمیشہ ایک ایسے کاتب کی تلاش میں رہے جو ان کے سامنے بیٹھ کر ان کی غزلیں صاف کر دے۔ دوسروں کو بنانے اور سچ اڑانے میں محال صاحب کا جواب ہی نہیں تھا اس کے لیے دانت اور منہ کی قید تھی اور نہ صلات و جلوس کی۔ وہ مرعوب ہوا مانتے تھے نہ کسی کو بخشا۔ جتنا ہنسنا ان کا محبوب شہنشاہ تھا۔ ایک مرتبہ مرزا اس کی لگاؤ لکھنوی ہو گئے اُسے اور منو انجم آغا۔ اُس کے مہمان ہوئے۔ نجم صاحب نے ان کے اسرار میں ایک مختصر صحبت منتقد کی فانی، اخضر، دلگیر مانی، محمود صاحبان سب ہی جمع تھے۔ باتیں برہنہ تھیں بلکہ صاحب لکھنوی کے شعر کا ذکر خیر فرما رہے تھے فرمانے لگے کہ ایک شاعر سے میں عزیز لکھنوی نے شعر پڑھا۔

دل سمجھا تھا کہ غزلت میں وہ تنہا ہوں گے

میں نے پورے کربو اٹا تو قیامت دکھی !

میں نے اس طرح داد دی کہ عزیز کہنے لگے آپ نے میرا شعر منانے کو دیا۔ یہی ختم ہو میں اور غزل خوانی موقوف ہوئی بلکہ صاحب کی

بارہی آئی اُنہوں نے مطلع پڑھا۔

پیامِ ذیل اب ایسا کچھ سُناؤ گیا

اشارہ پاتے ہی اُٹھ لائی لی رہا نہ گیا

دلگیر شاعر نے ایک جھٹے ہوئے فقرے سے استقبال کیا ان سے بلکہ صاحب سے پہلے سے تعارف بھی تھا ادب کے متعلق بھی ہم لوگ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ اخضر صاحب کہنے لگے وہ مرزا صاحب سبحان اللہ پر راکرک شاعر ایک شعر میں جمع کر دیا ہے۔ خدا کی شان اب وہی خاں صاحب ویسے ہو گئے تھے کہ ان کے ناخلف شاگرد داخل ہیں ان پر فقرے کہتے تھے۔ ان کے دفتر نے گھر سے کی شکل اختیار کر لی تھی جھاڑو کے نام سے بیچ تک ماکر بھی کوئی چھٹات نہ کی جاتی میز سے زیادہ کرسیوں پر ضروری اور غیر ضروری کا خندول اور کڑے کے ڈھیر تھے ان کے کوٹ اور شیروانی سال بھر لٹے رہتے تھے ان میں کڑاں جاے تن لیتیں اور چھپکیاں انڈے دیتی رہتیں اور جب ضرورت ہوتی وہ بڑی اناکار کر زیب تن فرمایتے۔ محمود صاحب فرمایا کرتے ہیں کہ اخضر آگرے کے مرزا اسودا ہیں۔ ذرا کسی سے ناخوش ہوتے اور ایک نظم سے اس کی تراضی کر دی۔ اور وہ منظم ایسی ہوتی کہ گھٹنوں میں زبان دو عام ہو جاتی ایک سے ایک اس کی نفیوں، ناگیا پھرتا اور لوگ انہیں نہانی یاد کر لیتے۔ سنا ہے اب حیدر آباد منو میں الکی سازو سامان کے ساتھ تشریف رکھتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ موزوں شخصیت جو لکھنے اور لکھے جانے کے لائق ہے دل احمد صاحب اکبر آبادی ہیں وہ ہمارے آگرے کے سب سے بڑے اور اہم نثر نگار ہیں۔ میں وہ دہندہ دتانی اور اکبر آبادی اور قریشی برادری کے ایک فرد گو مرزا ج، دماغ اور اپنی دوسری خصوصیات کے اعتبار سے ان آئینوں سے بہت بلند و درز ہیں جسم کے اعتبار سے مختصر گو دل اور دماغ کے اعتبار سے بہت بڑے ہیں انہیں شدید سے شدید پریشانیوں میں آنا مستقل اور متحمل پایا ہے کہ اس کا تصور کرنا مشکل ہے ان کے چہرے سے ان کی کھرائی اور ان کے جذبات کا اندازہ مشکل ہے۔ دل احمد صاحب نے انسانے لکھے ہیں تجارت کی ہے۔ وہ مقرر کی تراضی ہے، اور بیات ملک میں خند یا ہے۔ ان نے میں ان کی شخصیت ملک میں اور تراضی میں دونوں میں یک ہے۔ تجارت میں وہ کبھی کامیاب ہے یہ انہیں کبھی ناکام یا بیکار یا بیات میں وہ ہمیشہ ناکام یا ب رہے۔ بیات سے میرا مطلب مرزا ایکشن بازی سے ہے اور یہی ان کے اچھے ہونے کی دلیل ہے۔

کیونکہ وہ سب کو اچھا سمجھتے اور سب پر عہدہ رکھتے ہیں مگر جو شخصیتوں پر ہمیشہ نادر کے گالوں میں ان کی شخصیت بہت نمایاں رہے گی۔ بقول حضرت سیاح الکر آبادی

مازنی ہے ارض تاق کو ذات لطیف پر

ان کی تصنیف دتر جے بہت ہیں اور ان کے دیکھے بغیر ان کی قابلیت اور شخصیت کا اندازہ نہیں کر سکتا ملک انہیں صفت اول کے اعزاز اور حقیقت سے جانتا ہے۔ ل احمد صاحب کے نادر کے ساتھ ہی شاہ و گلبرگ کا اندازہ ہو جاتی ہے کیونکہ ل احمد، حمزہ، و گلبرگ اور امام الکر آبادی ہم نوا ہیں اور ہم ذاق اصحاب ہیں تھے۔

شاہ و گلبرگ نے ترقی یافتہ دور میں میر سے بہت قریب کے عزیز بھی تھے اور اسی کی گھر میں مجھے بہت بڑے تھے اس لیے مجھے ان کی زندگی کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا وہ اتنے بے تکلف اور خوش باش تھے کہ ان کا دل کی طرف آج بھی دکھتے۔ حذرت کی طرح غفلت میں بھی بے تکلف غور سے کہتے اور قہقہے لگاتے ان کے پاس بیٹھ کر دت بڑا اچھا لگتا تھا وہ خوش ہونا اور خوش کرنا نہانتے تھے، شعر اتنا اچھا سمجھتے تھے کہ کوئی کم کچھ کا اچھے شعر انہیں بہت یاد آتھا وہ کسی سے خوش ہوں یا ناخوش کر اس کے اچھے شعر کی داد بڑی فرائز ولی سے دیتے وہ خفا بھی جلدی ہو جاتے تھے اور معذرت بھی جلدی قبول کر لیتے البتہ اس کے لیے کبھی کبھی معذرت خواہ کر ان کی ادان کے اصحاب کی دعوت بھی کرنا پڑتی تھی پھر ان کا دل ہوتا تھا۔ ہر دنگ مقرا سے ایک شامی میں شریک ہو کر وہ ایسے تھے شہر کے ایک اور بزرگ بھی ساتھ تھے انہوں نے مقرا کے مشور پر میر سے خود سے تھے شاہ و گلبرگ سے کہنے لگے ان کے پیڑے کھانے چاہیں تم ناگوام سے انکار کر دیں گے میر سے یہی جرأت لیکن قہی خود ہی انہوں نے تمہید اٹھائی تھرا کے پیڑوں کی خصوصیات کا ذکر پھر اپنی نادانیت ظاہر کی اور آخر ایک پیرا کھینچنے کو مانگا پھر دوسرا اور پھر تیسرا اور اس طرح کہتے، ہی پیڑے کھائے اس میں انہوں نے خوشاد بھی کی اور چونکہ وہ صاحب صوفی تھے آدمی تھے خدا رسول کا واسطہ بھی دہا اور غوث پاک کا بھی ساتھ تھا وہ دامن چھپا کر کھڑے بھی ہوئے اور زبردستی بھی کی اور اس طرح ایک دوسرے سے چینی کھاتے گئے اور قہقہے لگاتے گئے۔ ان کے واقعات اور لطیفے بہت ہیں جو ان کے مخصوص اصحاب نیاز و محظوری ل احمد حمزہ مانی وغیرہ حضرات لہا وہ ہیں اور ان کے بیان کا حق بھی انہی حضرات کو پہنچتا ہے۔ اور وہ کہا کرتے تھے شاعر حرف حق دیکھتا ہے۔ وہ اپنے معصروں کی طرح شاعرانہ قواعد و ضوابط کے سختی سے پابند تھے ایک دفعہ میں انہیں اپنی غزل سنا رہا تھا جب یہ شعر پڑھا۔

میر سے روئے پر روئے وہ بھی بدگانی نکل گئی دل کی !

تو انہوں نے مجھے ٹوکا فرماتے گئے معشوق کا ردنا مسلمات شاعری کے خلاف ہے ایسا جتنا نہیں ہے میں نے کہا میرے ساتھ ایسا ہر اس لیے مجھے لکھنے کا حق ہے جس نے گئے کر لیس نہیں کیا تاریخ اور دین نقاد کے نام کے ساتھ ان کا نام بھی زندہ رہے گا۔ مولانا سیاح الکر آبادی ہمارے دور کے وہ تنہا الکر آبادی شاعر تھے جن کو اگر سے سے ہا سب سے زیادہ لوگ بحیثیت شاعر جانتے ہیں ان کے ہم وطن اور ہم عصر شعرا نے ان کی نذر نہ کی گرائی تھی ان کے کا نام زندہ بھی کیا اور روشن بھی۔ مولانا خواہ مخواہ کسی سے نہ لکھتے تھے وہ بہت معذب اور رک رکھاؤ کے آدمی تھے کہ جو ان سے اچھے لکھنے والے ان کے احوال کے کمال کو پہنچنے کے لیے اس وقت وہ مصافحہ کرتے تھے۔ وہ سب سے صلہ ایک مرکز بنائے ہوئے ادب کی خدمت میں اس طرح مصروف رہتے جس طرح کوئی عبادت کرتا ہے مشاعروں میں شرکت فرماتے اور ہمیشہ طرح پھول کہتے وہ فرماتے تھے میں کسی ایسے طرحی شاعر سے میں شریک نہیں ہر اجمال میں نہ طرح میں غزل پڑھی ہو۔ اس بارے میں وہ مجھ سے شکایت فرمایا کرتے تھے کیونکہ میں ہمیشہ سے مشاعروں میں مجبوری ہی شریک ہوتا ہوں۔

مولانا کے ہنسنے ہنسنے اور مزاح میں سب میں ایک آواز اور رکھ رکھاؤ تھا جو چھوٹوں سے شفقت سے بڑوں اور بزرگوں سے تہذیب و ادب سے پیش آتے انہوں نے کبھی اپنے چھوٹوں کو آگے نہ جانے اور ان کی کارگزاری کے اعتراض میں نکل سے کام نہیں لیا بعد ہم چھوٹوں کے ساتھ ایسا کیا۔ مولانا جو سے عمر میں بہت متفاوت تھے مگر انہوں نے کبھی اپنی بڑائی کو عذر نہ فرمایا، ایک روز جب سے فرما گئے، آپ اپنا کام رسائی کر لیں نہیں دیتے کیا یہ کام حاجت میں کچھ کام، بیٹا کئی دنہ نے یہی اگر سے میں عید ڈر کے نام سے عید کی شام کو ایک اجتماع ہوا تھا جس میں کئی کئی کے ہندو مسلم شرفاء کو ایک جگہ جمع ہونے کا مشق مل جاتا تھا اور مسلمان بھی آپس میں عید مل لیتے تھے، ایک بار میں کچھ دیر سے پہرہ بپا ہوا تھا حاضرین سے جھڑپا ہوا تھا اور یہ ناگھن تھا کہ سب حضرات سے مل کر اس لیے گرد پیش کے دس میں احباب سے مل کر ایک طرف بیٹھ گیا مولانا سیما بھائی سے ہر حق میں دہان تک نہ پہنچا نہ سکا جب میں بیٹھ گیا تو خود آگے لہرے شر پڑھتے ہوئے مجھے معاف کیا۔

دو دن آگے تو آئی جی ملے دلہا اس میں کیا تیری شان جاتی ہے

مولانا اس حیثیت سے بھی خوش قسمت تھے کہ انہوں نے ستر سے زیادہ تصانیف اور مطبوعہ اور غیر مطبوعہ لاکھوں اشعار اور اس کے علاوہ اعلیٰ تصانیف (دیر شاہ بیٹی) منظر صدیقی، ریر چم کرچی، جیسے لائق فانی فرزند اپنے صحیح جانشین چھوڑے فانی صاحب کی اگر تشریف آوری میرے لیے بہت بابرکت ثابت ہوئی۔ وہ میرے پاس اکثر تشریف لاتے تھے اور کبھی کبھی میں بھی ان کے یہاں حاضر ہوا تھا اور ان کی مخصوص اور مجسموں میں شریک ہوا تھا فانی صاحب کے صاحب کا حلقہ بہت مخصوص اور محدود تھا اس کے معزز و فخر و محرم صاحب اکبر آبادی بھی تھے وہ شاعر بھی ہیں ادیب بھی ناقد بھی اور افسانہ نگار بھی اور ان سب کے ساتھ فانی صاحب کے ہم پیشہ یعنی وکیل بھی، چنانچہ ان مجسموں میں شریک ہونے سے مجھے غرور صاحب ل احمد صاحب خان صاحب کی مجالت بھی میسر آگئی یا مذہبی تو پہلے سے بھی حاصل تھی۔ غرور صاحب بڑے ذہین اور ذی علم انسان ہیں ان کی بے شکلی میں بھی اکثر غرضات فانی صاحب کے ساتھ ہیں، ایک روز جو شمس آبادی اور غرور صاحب میرے یہاں بیٹھے تھے صحبت پر لطف بھی تھی اور بے تکلف بھی، غرور صاحب نے جوش صاحب سے کہا آج آپ اپنے دوستوں بد بصرہ کیجئے میں نے کہا کیا تبصرہ کریں گے یہ آگے کے ایک شاعر سے تھا ہو گئے اور نظم کھ ڈالی سب آگے والوں پر (اے رفیقان اکبر آبادی... دل و دماغ سے تم سے فریادی، غرور صاحب نے چرامر اور کیا اور جوش صاحب بل بزرگ داستان کی طرح چمک لٹھے سب سے پہلے فانی مرحوم کی شامت آئی چرامانی صاحب اور دوسرے احباب کو ایصالِ ثواب کیا اور پھر میں ل احمد صاحب پرانا لڑی، غرور صاحب کہنے لگے مجھے ادب پیش صاحب کر لیں چھوٹا یا آخر ہم دونوں پر بھی تبصرہ شروع ہو گیا مگر بہت دم اور بے لطف ایسے لطیفے غرور صاحب اکثر برپا رکھتے تھے میں نے ایک مرتبہ ایک چھوٹی الماری ان کی تصانیف سے بھری ہوئی دیکھی تھی روحِ نقیر ان کا ایک غیر فانی کا نام ہے وہ خود پر آگے ہیں آگے کی کسی وجہ سے ذی علم اور خدائی شخصیت کو دیکھنا ہو تو غرور صاحب کو دیکھ لیجئے۔ آگے والے ان کی دوسرے بھی غرور ہو گئے۔ سب سے آج کل کراچی میں جھڑپائی کے فرائض انجام دے رہے ہیں وہ ان کے یہ قد شناسی بھی کیا کم ہے جب ان کے عالی شان مکان کی طرف گزرتا ہے تو دل پر ایک کھڑا سا لگتا ہے۔

ان حضرات نے دور سے پہلے بزرگوں کے میں نے مذکور ہی سنے ہیں اور ان میں سے چند کو دیکھا بھی تو ہمیں ہی میں دیکھا ہے۔ مرزا یونس یہاں کی بڑی اہم شخصیت تھے ان کا صرف جاننا ہی دیکھا میں بہت کم عمر تھا کہ خاندانی تعلقات کی وجہ سے اور اس لیے کہ میرے خاندان میں کوئی اور بزرگ زندہ نہ تھا مجھے ان کے جنازے میں تھوڑی دیر شرکت کرنا پڑی تھی جنازے پر شامیاد تانا ہوا تھا اور شمس اعلیٰ ہوئے تھے۔ یہ طریقہ پرانے شیعہ شرفاء و رؤسا کے یہاں رائج تھا۔ خوش وضع رنگین طبع اور نازک مزاج تھے۔ مرزا صاحب میں جذبہ

اعتراف کم تھا دوسرے شاعر کا شاعریت کم مانتے تھے چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

اغلا میں کہیں کہیں اغلاق لے بیٹیں
دیکھے کلام داغ و آہر و جلال کے

جب شاہ عری میں پڑا پڑا دکھ کر ادنیٰ کر بیٹھا جاتے تھے تو کسی کو کہہ ملانے کی جرأت نہ مانتی تھی اپنا حقہ کسی کو نہ پلاتے تھے، شاہ عری میں بھی لاکھ پیتے تھے۔ دراز قد سید رنگ ڈاڑھی صاحب بخیمیں بڑی بڑی انگرکھا اور دو پٹری ٹوپی پہنتے لاشوق تھا با جامہ اکثر بڑے پائون لاپنتے تھے۔ غرافت مزاج میں حد سے زیادہ محلی بات بات پر منہ سے کالی گل جاتی تھی مگر بغیر دل شکنی بے حد حسد اور ذہول اور ایک طبیعت انسان تھے عمر چھ شعر کہے اور پھر اپنے کے لیے جب کسی نے کہا تو صاف انکار کر دیا ۲۵ جنوری ۱۹۱۲ء بعد از منہ بدل انتقال کیا۔

(اقتباس از شاعرانگہ نیر جون سنہ)

سانہے آگے میں کسی دہانے میں ایک شاعرے میں مرزا داغ و بوی کا تشریف لائے تھے داغ و بوی صاحب شعر پڑھا۔

بڑا مزاج ہو جو عشر میں میں کوئی شکوہ

وہ ہنستوں سے کہیں چپ رہو نہ ٹکے

مرزا دیتیں نے کہا حضرت عشر میں شکوے ٹکائیوں کا کیا موقع ہو گا یوں ہوتا تو سب تھا۔

بڑا مزاج ہو جو عشر میں میں کوئی فریاد

کچھ روز اس سلسلے میں بحث و مباحثہ ہوتا رہا آخر مرزا داغ نے رئیس صاحب کو کچھ چپ دہو خدا کے لیے " اور یہ مھر کہ ختم ہوا۔

اسی طرح کہتے ہیں کہ ایک شاعرے میں طرح برتی

چھر لیسے ہیں آئینہ میں سانپ ہراتے بھینے

دہلی سے آغا تشریف لائے تھے انہوں نے ایک شعر پڑھا جس کا مصرع شافی تھا

کاسہ دفعہ دیکھئے ٹھوکر کی کھاتے ہوئے

مرزا دیتیں نے کس پر شاعرہ ٹوکا کاسہ دفعہ رکھا

کاسہ سران کے دیکھے ٹھوکر کی کھاتے ہوئے

یہ جیتے میں نہ پرانے لوگوں سے سنے یہ ایک واقعہ خود اپنا بالو بھو دیال صاحب شام اکبر آبادی سناتے تھے کہ ایک شاعرے میں

میں نے یہ شعر پڑھا۔

ہر بن مرثکرا کرنے کو سب گریا زبان

تیر کی نعمت کا ادا چھر بھی نہ شکرانہ ہوا

مرزا صاحب نے فرمایا کہ گولانا (نثار) کو غول نہیں دکھائی تھی۔ مولانا نثار بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا مجھ سے فرد گداشت ہو گئی ہوگی

آپ دوست فرمایاں رئیس صاحب نے کہا اس طرح کہو۔

ہر بن مرثکرا کرنے کو بنا گو یا زبان

مدارگ زبان ہی کنا چہستے ہر تو پھر لیں کہو

بر سر مرثیہ شکر کرنے کو بنا گویا دیں

اس دور کی ایک اور اہم شخصیت ماسٹر سید نعون حسین صاحب واقعہ کی تھی۔ بات مشہور ہے کہ وہ اگر سے کے سب سے زیادہ نادرک خیال شاعر تھے اور وہ خود بھی بہت ہی نادرک اندام تھے۔ مہلے پتلے کشیدہ قامت اور عی غلی کی گول ٹوپی خوشنوی ڈاڑھی سر پہ شہرے کا سہارے دھام کے سدا مر لیغ۔ باتیں بھی جلدی جلدی کرتے اور ناز بھی جلدی جلدی پڑھتے تھے بڑے سب سے بچائے آداب یاد کا کے بند کی کہتے وہ مجھے اس لیے یاد ہیں کہ ہمارے یہاں روزانہ شام کو آتے تھے اور مغرب کی ناز پڑھ کر چلے جاتے تھے حضرت، والد ماجد کے حضور میں احباب میں تھے اور وضع کے ایسے پابند تھے کہ ان کے مصالح کے بعد بھی روزانہ مقررہ وقت پر شریف لاتے تھے کوئی اور مزید ہر جمہور نہ جانتے تھے اگر کوئی ان سے بات کرنے والا بھی نہ ہوتا مگر انہیں اپنا معمول پر کرنا تھا انکے بیٹھنے کی ایک جگہ مقرر تھی وہاں غلطی سے اگر کوئی اور بیٹھا ہوتا تو آپس میں ہر جانتے ایک پاں سے زیادہ اس نشست میں نہ کھاتے۔ ان کی وضع واری کے سلسلے میں ان کے احباب سے ایک واقعہ منسلک ہے کہ کسی روز ان کے کچھ آزاد و غلش احباب صبح سے ایک طوائف کے مکان پر سے گئے ماسٹر صاحب کو علم نہ تھا کہ یہ مکان کس کا ہے اس زمانے کی دیرہ دلدل طوائفیں شرف الی طبع اندر زمان خانوں میں رہتی تھیں، ماسٹر صاحب اس وقت قیام قریبی رہے اور پاؤں کی خالی میں ایک روپیہ والی آئے۔ اس واقع کے بعد سے ماسٹر صاحب سال میں ایک بار اس طوائف کے یہاں جاتے اور اسی طرح ایک روپیہ دے کر چلے آتے۔ ان کا کام بھی اگر سے کے اور شعر کے کام کی طرح صاف ہو گیا۔ ان کی ایک نظم "لعل راج" اور ایک "تفہیم" تربت شہید ناز کے نام سے کسی نے چھپوائی تھی میرے بچپن میں تفہیم بہت مشہور تھی اور بہت لوگ اس پر مدح دیتے تھے ایک ابتدائی ہند مجھے اب بھی یاد ہے

اک دن جو سوئے گرد زرباں ہر اکر
بکھ ڈھیر ٹوٹی قبروں کے آئے مجھے نظر
چادر چڑھائی اشکوں کی میں نے چہرہ تر
آئی نہ اکسی کی کوئی سے میرے فوسر گر
آجستہ ایک نکل برفشال بر مزار ما

بس نادرک است شہید اول در کنار ما

مولانا شاہ علی بابک صاحب تبارک رب نے بھی طرح دیکھا ہے چو گوشتہ کو بھی ہوئی گول ٹوپی چہرہ گلاسے ہوئے نیچا کنا اور اس پر صدی محمدی رنگ شرعی ڈاڑھی اور کھڑی میں آشوب کی قسم کا کوئی مرض۔ یہ ان کی وضع قطع تھی۔ میرے چھوٹی زاد بچوں نے ایک آئین بنائی تھی جس میں ماما زاد شاعر ہوتا تھا ماسٹر کی تھا چار پانچ مچھ جاز اور چھ بھی زاد بچائی اور چار پانچ ہمارے گلاس فلو پیٹھ جاتے اور ماسٹر سید بھی غزلیں پڑھتے اور خوش ہر ایسے ہم میں سے ایک لڑکا مادی شاعر علی صاحب کاشا گرو ہر گیارہ کبھی کبھی مولانا کو ان صحبتوں میں سے آتا مولانا نہایت شائستگی سے شریک کرتے اچھے شعروں کی داد دیتے اور آخر میں اپنی غزلیں سناتے۔ کبھی کسی کے شعر پر اعتراض نہ کرتے نہ اصلاح دیتے نہ شاگرد بنانے کی کوشش کرتے بڑے درویش صفت انسان تھے۔ چلے مرزا ساقی علی بابک چکر گزراں دیکھا۔ تب تھے اس کے بعد جب شاہ محمد اکبر صاحب اکبر دانا پور سے بیعت ہو گئے تو غزل بھی شاہ صاحب کی کو دیکھنا شروع کر دی حالانکہ بعض اہل نظر کی رائے ہے کہ شاہ کا مرتبہ شاعری میں شاہ اکبر سے بلند ہے اگر سے اور اگر سے ہر مولانا کے شاگرد بہت تھے جن میں سے سیدم شاہ دار ثی، منہر اکبر آبادی اور بالبر بھوبھو بال شام اکبر آبادی نے مولانا کا نام خوب روشن کیا ان میں شام صاحب محمد اللہ بقید حیات ہیں اور ان کے دم سے مولانا کے نام کے ساتھ اگلی شرافت اور علم علی بھی

لڑے جیسے شہریت خوب کہتے ہیں اور تحت المظاہر نے میں آکر سے ہیں اپنا جواب نہیں رکھتے ان کے والد شہر شکر دیال صاحب اگر سے کے
 بڑے نامی وکیل تھے اور سزا غالب کے شاگرد تھے میرے بچپن میں شاعر سے لڑا تھا صاحب کی سرپرستی میں ہوا کرتے تھے مولانا سیاب
 شاہ دیگر دور شام، منظر فلک سبحان کا طرہی دلاتا تھا، دیگر شاہ کے سران سب شاعروں کے شاگردوں کے جھنڈ کے جھنڈ تھے جو شاعروں کو
 سر پر اٹھا لیتے تھے حضور صاحب کا مہرجم کے شاگرد بہت زیادہ تھے وہ خود ان کی تعداد ستر سے اوپر بتا کرتے تھے شاعروں میں جلتے تو
 وہ طہ نے ہونے شاگردوں کی فوج ساتھ لیے جاتے ان کی زبان سے مصرع غلام حبیبیہ کرام کی گئی فلک صاحب کا گشت روزانہ شام کو سیر
 کتوی بازار سے مال کے بازار تک لگتا تھا وہ کو تو اپنے معمولی لباس میں ہوتے لیکن شام کو ہاتھ کی پٹاری لکڑی کے سوا سا مال باندھ لیا جاتا، گلابی
 دورہ، پٹلی، ریشم کی شیروانی کا تہر کی دیریں گولی ٹوپی، گلے میں ہار منہ میں پالان، پاؤں میں ولی کا لکڑی سلیم شاہی ایک ہاتھ میں پٹاری مٹا
 تھوڑا دوسرے ہاتھ کو رومن خان کی طرح جنبش دیتے ہوئے نکلتے ہوئے بازار کے اس سرے سے اس سرے تک بل گیا کہتے تھے
 چمے چار پھر میں شاگرد حلیہ میں صاحب شہاب حلیہ ہال کش صاحب بارغ شمس اور کا شرف صاحب وغیرہ مودب چلتے اور اپنی اپنی
 غزروں پر اصلاح کرتے جاتے سال کی بھینسی سے تعلق رکھتا تھا فلک صاحب مرزا میں کے شاگرد اور دیار گار تھے اب ان کی یاد گار صرف
 سلیم صاحب بارغ باقی ہیں اور اگر سے کی قدیم روایات شعر و سخن کا خوبی کو بڑی خوبی سے سمجھتے ہوئے ہیں۔ نثار اور داصف کے
 مدد کے شعر میں سب سے زیادہ عمر مرزا عاشق حسین صاحب بزم اکبر آبادی نے پائی ان کا انتقال ابھی چند سال ہوئے سید بابا میں ہوا ہے
 اعلیٰ تعلق بہادر دام پور سے تھا اس لیے اب اپنے آخر زمانے میں اگر سے آئے اور چند سال وہ کھر باہر تشریف لے گئے مرزا صاحب کو
 میرٹھ آبادی سے لگتا تھا ان کی شخصیت بڑی دل آویز تھی، چارچ غلم کی جوبلی کے سلسلے میں دیاست دیا میں بڑا اہتمام کیا گیا تھا اگر سے
 سب بزم صاحب ہمارے میر کا دل تھے۔ شام صاحب اور میں بزم صاحب کے ساتھ دیتا میں تین چار روز دریاں تمام ہی کتھری دلچسپی
 موجود تھیں اگر ہمارے لیے سب سے زیادہ دلچسپ مشاعرہ بزم صاحب کی باتیں تھیں وہ بچوں میں بچہ جواڑوں میں جوان تھے لیکن بڑا حوصلہ
 میں بھی بڑھے نہ تھے۔ ۱۹۳۲ء میں جے پور میں ایک بہت بڑا امٹنہ ہوا تھا اگر سے سے سیاب اور بزم صاحبان تشریف لے جا رہے
 تھے اتفاق سے جوش ملیح آبادی بھی اگر سے ہی سے جے پور کے لیے ریل میں سوار ہوئے بزرگوں کے لیے میں نے الگ انتظام کر دیا تھا جوش
 صاحب اور میں علیحدہ بیٹھے، گیارہ بارہ بجے رات کو جوش صاحب ایک اسٹیشن پر اترنے لگے میں نے پوچھا میریت تو ہے اس وقت کہاں؟
 تھے گئے ذرا بزم صاحب ایک مخصوص قسم کے شعر سننے جا رہا ہوں غیہ نہیں آ رہی ہے اس موضوع پر ہندوستان میں اس وقت ان کا جواڑ
 نہیں ہے۔ بزم صاحب کے صاحبزادے مرزا غلام آفسر ایان کے صحیح جانئیں اور چچی یادگار ہیں شعر و ادب میں بھی اپنے والد
 بزرگوار کی طرح ان کا مقام بہت بلند ہے۔

اگر سے کے ادیبوں شاعروں اور مصنفوں کا جب بھی کوئی تذکرہ لکھا جائے تو اس میں حافظ امام الدین اکبر آبادی غنی کا نام
 اللہ تعالیٰ ان اکبر آبادی صاحب اکبر آبادی کا ذکر ضرور کرے جو گوارا ان حضرات کے علاوہ مرزا غلام چشتی مرحوم کی ذات ایسی نہیں ہے جس کا ذکر کیا جائے
 مرزا چشتی کی تحریریں تھیں سنگت اور زندہ دل کا صوم ہوتے ہیں بظاہر ایسے نہ تھے وہ کچھ خاموش اور جلد سے ہوتے رہتے تھے ایک بات یہ بھی ہے
 کہ ان کے کیا مرزا اکبر ایمان، صاحب چشتی کی تحریریں تھیں ان تھے کہ جب بھی ان لوگوں سے ملنے جلتا اپنے سر اس سے ہاتھ ہی نہ دیتے ان کی
 باتیں غمزدہ جمیں تھیں مرزا اکبر ایمان ملک صاحب شاعر بھی تھے اور مختلف قسم کی لکچر کے مصنف بھی ان کی جوانی کی خبر نہیں ہے کہ ان کا ساتھ کسی

نہ چاہا کہ دیکھا بارہ گھنٹے کی نادیں اور بارہ بیسٹ کے روزے رکھتے انیس کروڑ کیا ان کے واقعت طیفوں سے کم نہیں کر سکتے براحتہ طیفہ الہ کے غلبہ
 لکیر نو انیم یک چنائی تھے وہ اکثر بارہ ہوتے تھے دو چار دس پندرہ دس کے لیے آگے آجاتے تھے جتنی دیر بیٹھے بیٹھے سانسے بہتے اور غصہ
 نہ بیٹھے یہ حضرات آگے کے تھے کہ بعض حضرات یہاں ایسے بھی تھے جو تھے آباہر کے گراما دی عمر ان کی آگے سے ہیں گری اور آگے سے ملاؤں کو انہوں
 نے بہت کچھ کیا منہ حق محمد صلی اللہ علیہ وسلم صاحب امر کی نادیں مکرورہ عالمیہ آگرہ میں مدرسہ اہل ہے عربی ادب اور حدیث میں ان کا جواب بن شکل
 ہے غلام سی و دو میں سعدی غلبہ فرماتے تھے اور ہم مخصوص طالب علموں کے سوا کسی کو شعر و سناتے و اشعار نقل کرتے دیتے ہیں نہ جو کچھ دینیات اور مقبول
 پڑھا اس کا بیشتر حصہ منہ حق صاحب سے ہی پڑھا لیکن صاحب لکیر آبادی کو اب فیاض خاں صاحب امام لکیر آباد کی پندرت و اچانق صاحب کسزور
 اور ان جیسے بہت سے اصحاب منہ حق صاحب کے شاگرد ہیں میں منہ حق صاحب کی خصوصیات لکھنے کے لیے ایک مستقل تصنیف کا ضرورت ہے اسی طرح
 مولانا حامد بن صاحب قادری الدہریہ فیہ طایر غلام علی صاحب کے دم سے آگے کی علمی ادبی تحفیں روش تھیں یہ دونوں حضرات بھی پاکستانی ہو گئے اور اب
 بھی آگرہ تہ سے مکرورہ آگرہ معلوم نہیں تھا، مگر مکان بدل گئے زمین و آسمان بدل گئے تہذیب و اخلاق بدل گئے اور اب آذربان بھی بدلتی معلوم ہو
 رہا ہے۔ ان چیزوں کا نام کو نرا لے بھی کچھ مدد میں نہ ہوں گے اور دایع خزان محبت شب کی جلی ہوئی شمع غار میں کا بھی ذکر ہی رہ جائے گا۔

غالب کی شاعری

عطا محمد شعلہ

غالب کے متعلق ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ ان کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ اردو کے پہلے فلسفی شاعر تھے۔ حالانکہ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں اور اس دعویٰ کا کھوکھلا پن جتنا بھی غور کیا جاتا ہے اتنا ہی ظاہر ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان کے ایسے اشعار سب سے کچھ لوگوں نے ایک غلط نتیجہ مرتب کر لیا اور پھر وہ سارے رواں کی طرح چل نکلا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا پھر نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈر لیا مجھ کو ہونے نے نہ ہونے میں تو کیا ہوتا

قطرے ہیں دھندلے کھائی شے اور جڑوں کی
کھیل لڑکوں کا ہوا وید و مہیشا نہ ہوا

اے کون دیکھو مکھن کہ بگاڑتے ہیں وہ بگاڑ
جڑوئی کی جو بھٹی ہوئی تو کہیں وہ چار ہوتا

ہاں کھا بہت قریب بہت سی
ہر چیز کہیں کہ ہے نہیں ہے

موم نہیں ہے قومی فدا کے راز کا
یاں وہ نہ جو حجاب ہے پردہ ہے باز کا

نفس فریادی ہے کس کی شوقی تحریر کا
کاغذی ہے پیر کا ہر بیکار تصویر کا

اصل مشہور و شہور و شاہد ایک ہے
حیران ہوں پھر شاہد ہے کس حساب میں

ان اشعار میں ایک فلسفیانہ طبیعت کا سراغ ضرور ملتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ غالب ان اشعار کی وجہ سے ایک فلسفی شاعر بنے جاتے ہیں نہایت ہی گمراہ کن طرز استدلال ہے۔ غالب اس لئے زندہ نہیں ہیں کہ وہ ان یا ان جیسے دیگر اشعار کے خالق ہیں بلکہ یہ اشعار اس زندہ ہیں کہ غالب کے چند کمزور جذباتی لحاظ ہیں یہ ان کے دماغ میں شوبے اور بے اختیار الفاظ کی صورت میں مضبوط تحریر میں آ گئے۔ غالب چونکہ ایک عظیم اور عاقلانہ فکرات تھا۔ اس کی نسبت سے ان اشعار کی تقدیر میں بھی زندگی نگاہ کی گئی یہ ہمارے ناقدین اور شاعریں غالب کی کم عقلی اور بے بصیرتی ہے کہ وہ ان اشعار پر صغفے کے صغفے سیاہ کرتے ہیں اور ان کی طرح طرح کی ترجمانی کر کے ایک خیالی محفل سجاتے رہے ہیں اور اس طرح ہمارے ادبی مزاج کی صحیح پہنائی سے قاصر رہے ہیں۔

ان یا ان جیسے اشعار میں غالب نے کوئی عظیم فلسفہ پیش نہیں کیا۔ ان میں وہی چاہو افسوس ہے جو اس زمانے کے نثر نویس کی غفلتوں میں عام موضوعات ٹھنڈے رہتا تھا اور اس طرح وہ لکھنؤ کی دیر کے لئے ان لکھنؤی جلیقوں میں پھنس کر زندگی اور حقائق کی تجویز سے منہ چھپانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ جمادات، ہر ذات، خدا کا وجود اور اس کی رستی کے مسئلے میں استدلال اور اس مسئلے میں

طبیعیات و موجدان، جبر و اختیار کا فلسفہ اور جبر و کمال کا تعلق اور اس کے خلاف و موافق دلائل و ہجائیں۔ یہ سب صورتیں اسی وقت وجود میں آتی ہیں جب انسان عقل سے گہرا کہ خیالات اور محنت کی ماریکیوں میں پناہ ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اس لئے کسان مسائل کے طے ہونے یا الجھے رہنے سے زندگی کی مہمیت اور مداحی حقائق کی سنگلاخی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انسان تخلیقات کے اس غفل میں ایسے ہرگز زندگی سے زیادہ دور اور عقل کے لحاظ سے زیادہ ناگاہ رہتا جانا ہے اور اس میں شک نہیں کہ غالب کا جہاں ایسے گہلا کے ایک عظیم اجتماع کا دور تھا جس میں مادہ خام کی بنیاد پر نہ صرف عقل کی رہنمائی باقی نہ چھوٹی تھی اور چونکہ اپنے حمد کی چھاپ اور اس کے اشعار سے انسان کا نگاہ جہاں مشکل ہے غالب کے یہاں کہیں کہیں ایسے اشعار کی موجودگی ہماری سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ پھر بھی غالب کے موجودہ دور میں ایسے اشعار جن میں محض ذہنی تلا بازیوں اور شعبہ بازیوں کا انداز ہو کہ ہم اور گنتی کے ایک روحانی صدی اشعار کی بنیاد پر کوئی ایسا نتیجہ نکال لیں کہ جس کی بنیاد پر شاعر کے کل ذہنی سرمایہ کو غلط پس منظر میں پیش کیا جاسکے، میرے نزدیک کوئی مستحسن کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس سے ایک ادبی بے راہ روی کی بنیاد پڑتی ہے اور ذوق ادب کی صحیح نشوونما نہیں رہ پاتی۔

غالب شاعری میں روایت پرستی کے پہلے اور سب سے بڑے حامی ہیں۔ وہ پہلے بت شکن ہیں جن سے ادب کی تاریخ میں ہمارا واسطہ پڑتا ہے اور یہی ان کی عظمت کا سنگ بنیاد ہے۔ پیر اور غالب کے درمیان شاعرانہ کا ایک عظیم فلسفہ ہے جس کے یہاں وصل و فراق کی ایک ہی نئے مٹی کی تھی اور عشق و عشق کا ایک ہی انداز، بلکہ زیادہ صحیح طور پر یوں کہنا چاہئے کہ فارسی شاعری اور اس کے اثر سے اردو شاعری از اول تا آخر غمزدہ عشق کی ایک ہی دھن سنائی دکھائی دیتی ہے۔ ماں آواز کے زیر و بم سے مختلف مڑھیا کئے گئے ہیں۔ مثلاً تیر کے یہاں سوز اور مردوگی ہے نور و در کے یہاں گداز اور سپردگی۔ انش کے یہاں گرمی اور نفرت ملتی ہے تو مصطفیٰ کے یہاں دھجباہن۔ طغر کے یہاں وہی آواز زیادہ مایوس کن اور دردناک ہوتی نظر آتی ہے تو ذوق کے یہاں اس میں ایک ٹھہراؤ ہے اور وہ اپنے زوال آگاہی کے نئے ایک اخلاقی اساس کا بہانہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن غالب ان سب سے الگ ہیں۔ غالب کے یہاں اردو غزل کی دھن بدلتی صاف سنائی دیتی ہے اور اسی لئے وہ اردو کے شعری ادب کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عشق جو اب تک سراپا جذبات و دیرانگی تھا پہلی مرتبہ عقل انسانی سے معروف اور پیش نظر آتا ہے اور اس آویزش کے نتیجے میں عقل و عشق دونوں ہی کچھ اس طور پر سمجھوتہ کرتے نظر آتے ہیں کہ یہ بات اب تک دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عشق کے متعلق فرسودہ روایتی خیالات غالب کے یہاں بالکل نئے انداز میں ایسے بدلے ہیں کہ وہ ایک نئے تو چونکا دیتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نئی ہی بات پیش کی گئی ہے جس کی طرف عام انسانی ذہن جا ہی نہیں سکتا۔ یقین نہ آئے تو یوں سنئے۔

گر شہ نہ بخار رسوم و قیود تھا	تیشے بغیر نہ سکا کہ کن است
کہتے ہیں جس کو عشق نخل ہے باغ کا	بل کے کار و بار پہ ہے خندہ ٹٹل
اک گونہ بے خودی محمدی رات پہاڑے	سے سے غرض نشاط ہے کس رویا کو
روانی و روش و مستی وادار کشتے	نہیں نگار کو الفت نہ ہر نگار تو ہے

ان اشعار میں ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے کوئی الحار نہیں کر سکتا۔ مگر پھر بھی حقیقت کے اس پہلو پر غالب کے پہلے

کسی تک نہیں جی ملتی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی مسلمات کے بعد سے ہی حقیقت نہ دینے مستور ملتی ہیں کو غالب نے فیض کو پیش کیا ہے کہ نگار حقیقت اپنے اصل روپ میں سامنے آگئی ہے لیکن چونکہ اس طرح دیکھنے کا طعن انتقادی طور پر لکھیں انتقاد نہ کہ کئی ایسا حادثہ ہے کہ غالب کے ساتھ چاکر شیش آگیا ہو۔ جب تک حقیقت کے متعلق اس طرح خیال کو اپنے ذہن میں رکھا جائے کہ جہنم بنایا جائے راج اہوت خیالات اور ان کی فرسودہ شکل سے دامن بچا کہ جہان نامکمل اگر نہ بھی ہو تو وہ درجہ شکل ضرور ہے۔

عشق کو دماغ کا خلل کہ دینا شخص قافیہ کی مجبوری نہیں ہے۔ میر بھی بہت بڑے قریب تک پہنچ کر ٹک گئے۔
نحت کا دماغ جس نے پیچیر مذہب عشق اختیار کیا

میر سے غالب تک عشق کا شاعری تصور اتنا غیر متنا سب حدود میں پھیل چکا تھا کہ کوئی ارضی چیز رہی نہ جی ملتی اور زندگی جس کا ایک خانہ عشق ہے برتا سر عشق بن کر رہ جاتی تھی۔ گویا ایک طرح عشق زندگی عشق بن چکی تھی۔ غالب نے عشق کو زندگی کا ایک جز بنا کر جذبہ عشق کی نو آہ و گاری کی اور اس طرح عشق کو معنائی زندگی میں قابل قبول بنایا۔ انہوں نے غم جانا اور غم دھڑکا میں ایک ایسا حلول و اتزان پیدا کیا کہ دونوں میں ایک تمام سب اور ایک محسن آگیا اور اس طرح فرسودہ خیالات کو نئے کر کے عشق اور شاعری دونوں کے لئے حسین تر، قدیم اور سازگار ماحول پیدا کیا اور ایک نئی سعادت کی بنیاد ڈالی جو آج تک ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔ غالب اگر نہ ہوتے ہوتے توحید غزل آج جس رنگ میں پیش نظر ہے نہ ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ غزل میں اس ایک کا وجود ہی نہ ہوتا جس نے غزل کو آج بھی ہماری سب سے زیادہ مقبول صنف سخن بنا رکھا ہے اور ہم غزل کا مریض ادب سے بہت پہلے طرح چکے ہوتے آجیے اس دماغ کو ان کی شاعری کی روشنی میں پرکھیں۔

دل میں زوق وصل و یار ایک ناک نامی نہیں	اگل اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
دہر میں نقش و نوا و جبرست نہ ہوا	ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا
کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب	دیکھا تو کم ہوئے چہ غم روزگار تھا
غم اگر جہاں گل ہے پر کہاں پھر گل ہے	غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
بلبل کے کا دھار پہ ہے غم ہائے گل	کہتے ہیں جس کو عشق غم ہے دماغ کا
زندگی یوں بھی گذری جاتی	کیوں ترا راہ گزریا دیا
آئینہ دیکھو اپنا سامنے کے رہ گئے	صاحب کو دل نہ مینے پر کتنا غور تھا
گو میں رہا رہیں تم ہائے روزگار	لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
لطافت بے کفایت جلوہ پیدائیں مکتی	چمن رنگار ہے آئینہ باد بہاری کا
نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ	اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد	آپ کی صورت تو دیکھا چاہتے
تاب لاتے ہی بسنے کی غالب	واقعہ نحت ہے اور جان عزیز

فرصت کو دوبارہ شوق کے
 ذوقِ نطفہ نے جمال کہاں
 روہی بھی کہتے ہیں کہ یہ بے رنگ نام ہے
 یہ جانا اگر توئی تا نہ گھر کو میں
 وفا سے دلبر ال ہے اتفاقِ ہر زمانے سے ہم
 اثرِ فدا دل دلائے حریف کس نے دیکھا ہے
 آد کا کس نے اثر دیکھا ہے
 ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھنے میں
 ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھنے میں
 رخِ طاقت سے ہوا ہوتا بشر کو
 دہن میں غریبِ تسلیم و بندہ تو سہی
 گھر میں تھا کیا کہ تراخ سے غارت کیا
 وہ جزو کھینچتے تھے ہر اک حسرتِ تعمیر سے
 ہم بھی نہ میں زبان رکھتے ہیں
 کاش پوچھو کہ معاکا ہے

ان اشعار میں نہ تیر کا صمد ہے نہ در کی سپردگی، نہ غم کی برائی و مایوسی نہ تو میں کی شوخی و مینہ تر سے بازی۔ نہ ذوق کی وہابی
 جنہیں فراقِ رومانی و پنجابی بانوں کا نام دیتے ہیں۔ دلکش کی گرمی و تندیب نفس ان میں ہے نہ تھکنی کا لدا ز اور ملاطبت۔ لیکن پھر بھی ہم
 اشعار میں جن سے اردو ادب کی آبرو ہے، جن کی وجہ سے غالب اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ان کا نام خوب سے دیا جاتا
 رہے گا۔ ظاہر ہے کہ غالب سے پہلے شاعری ادب کے جتنا سبب اور سناچے تھے ان سے یہ آواز اور یہ طرزِ اظہار اپنی ایک علیحدہ
 نوعیت رکھتا ہے۔ زندگی ایک نئی نوعیت سے یہاں نظر آتی ہے اور اس کے مطالعہ کا ایک ایسا زاویہ عطا ہے جو سراسر مادی ہے جس
 میں زندگی اتنی عزیز ہے کہ واقعہ گفتاری سخت ہوتا ہے لائے بغیر کوئی صورتِ نظر نہیں آتی۔ جس میں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ حقائق
 بے کثافت نہ تھے، مگر جلوہ سے محروم رہتی ہے۔ جس میں ایک بدستے ہوئے معاشری نظام کی اخلاقی قدور پہلی دفعہ نظر آتی ہے۔ جاگیر داری
 ادب پر سرِ تاج داری کے ہمہ کی چھاپ گئی دکھائی دیتی ہے اور اس حقیقت کا اعلان ہے کہ بے رنگ و نام عاشق کی معشوق کی نگاہوں
 میں کوئی وقعت نہیں رہتی نہ تو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے رنگ و نام ہے، حالانکہ غالب سے پہلے عشق و عاشقی کا نظریہ اس کے عکس
 تھا۔ وہاں بے رنگ و نام ہونا ہی عشق میں پختہ کاری کا ثبوت تھا۔ فارسی شاعری عشق کے اسی پہلو پر زور دیتی تھی۔ پرے پہلی دفعہ
 کوشش کی تو صرف اتنا کہا کہ "اس عاشقی میں عجب سادتاں بھی گئی"۔ گویا حسب و نسب کی برتری کا احساس انہیں کچھ ہولہ اگر چہ چاہی
 کہتا ہے۔ "پندہ عشقِ نریدی نرکِ نسب کین جاتی"۔

جاگیر داری نظام میں رہنا کو فرصتِ عشق تھی۔ لیکن غالب کے زمانہ میں فرصت کو دوبارہ شوق، محال ہو چکی تھی۔ گویا یہاں
 نظام نے معاشرے میں جو تبدیلی پیدا کی تھی اس کا اثر ہمیں دفعہ غالب کے دین نے محسوس کیا اور پہلی دفعہ حقیقت پسندانہ نظر سے
 عشق و عاشقی کی قدروں کو نئے ماحول میں انہی نے پرکھا۔ اسی سے ان کے یہاں ہم کو یہ وجہِ جذباتی اور رومانی شاعری سے ایک
 ایسا انحراف ملتا ہے جس میں عقل پرستی اپنی پوری قوتوں کے ساتھ ہنگامہ آرا ہے اور اسی عقل پرستی کی دین ہے کہ غالب کو ہم اردو
 کے شاعری ادب کی تاریخ میں پہلا بہت لیکن راستے ہیں۔ غالب نے حقیقت کا تجزیہ اس قدر بے رحمانہ انداز سے کیا ہے کہ یہ بہت
 ہوتی ہے۔ لیکن اس کا اظہار اس قدر فن کا رمانہ پہلو سے کیا ہے کہ ان کے اشعار گفتگو میں بے تکلف استعمال کرنے کے لئے ہر حال میں
 نظر آتے ہیں اور اس مقصد کے لئے ان سے پہلے یا بعد کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس کے اکثر اشعار گفتگو میں اس طرح استعمال کئے
 جاسکیں۔ غالب کے علاوہ کس کو ہمت ہو سکتی تھی کہ کہے "میں نے دیکھ اپنا سامنے لے کے رہ گئے"۔ یہ بے تکلفی کا دوبارہ شوق میں جو بہ

کے ساتھ سلا سپردگی ہونے کے ساتھ ساتھ کبھی بھی اس کو حقیقت کا آئینہ دکھا کر یہ احساس دلانا کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے اور یہ کہ اس کا تعلق دنیا ہی تک ہے کہ جب تک فائنل اسے ایک خاص زاویہ سے دیکھ رہا ہے اور اگر وہ زاویہ بھی غلط ہو جائے تو یہ پتہ چلے گا کہ یہ سب باتیں اردو میں ہی چلی چکی ہیں اور ان کی جگہ پر بھی جگہ ہوتے ہوئے اصل میں کچھ حقیقت کا صحیح روپ بھی ہی تھا۔

لوگوں نے کہا ہے کہ غالب اپنے زمانے سے قبل پیدا ہو گئے تھے میں اس کو نہیں مانتا۔ ایسا کہنا تاریخی حقیقت سے بے روزگاری کا ہے۔ غالب ٹھیک اپنے زمانے میں پیدا ہوئے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تاریخی عمل بعض اوقات اس طرح نمودار ہوتا ہے کہ شروع میں اس کی رفتار نہایت سست دکھائی دیتی ہے اور ایک نظام سے دوسرے نظام کی تبدیلی بہت آہستہ آہستہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے چند فیصد لوگ ہی اس کا احساس کر پاتے ہیں اور باقی لوگ جو اپنے نظام کی روایت میں پکے پکے ہوئے ہوتے ہیں اگر اس نئے نظام کو آنا ہوا محسوس بھی کرتے ہیں تو اپنی روایتی عینک کی وجہ سے انہیں اس نئے نظام میں ساتھ نظام کی خوبیوں کے خلاف ایک ایسا بڑا وقت نظر آتی ہے اور نئے نظام کو وہ مراد جیسید ہی سمجھتے ہیں اور اس طرح نئے اور پچھلے کے آؤ پرش جنم لیتی ہے۔ کچھ وقت تک ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدیم تہذیب کے علمبردار جیت رہے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ نیا نظام جو ایک تاریخی ضرورت ہوتا ہے، سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور اس کو تسلیم کرنا بھی زندگی کے لئے ضروری ہی ہو جاتا ہے اور وہی چند لوگ جو شروع میں نئے نظام کو خوش آمدید کہنے کی وجہ سے سر پھر کے اور پاگل قرار دے جاتے تھے، نئے ماحول میں پیامبر جدید کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے سے قبل پیدا ہو گئے تھے۔ حالانکہ یہ بات غلط ہوتی ہے۔ وہ ٹھیک اپنے زمانے میں تاریخی عمل کی پیداوار ہوتے ہیں اور اگر وہ پیدا نہ ہوتے تو تاریخی عمل میں وہ تنظیم اور تیزی نہ آتی جس کی وجہ سے آج وہ پیامبر جدید کہے جا رہے ہیں۔ غالب بھی بالکل اسی طرح اردو کے شعری باب میں پیامبر و درجید تھے۔ غالب نہ ہوتے تو چمکتے اقبال، فانی، حریت، حسرت، اصغر علی نہ ہوتے۔ غالب نے جن اطراف میں اپنی ذہانت اور طبع رسائی روشنی چمکائی ہے ان سب نے ان میں سے ایک ایک میدان کو اپنے لئے منتخب کیا اور اس میں ریسرچ کا کام کر کے ان گوشوں کو اور زیادہ اجاگر کیا۔ لیکن یہ غالب ہی تھے جنہوں نے اردو غزل کے امکانات کی طرف پہلے اشارے کئے اور جدید غزل کے تصور کو اجاگر اور بجا طور پر یہ کہہ کر دیا کہ

باقی یاد دہان اسکے پد و فرزند آذر را نگ

ہر کس کہ شد صاحب نظریں بزرگش خوش نگر

غالب کا مطالعہ کرتے وقت جو بات میں نمایاں دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ پہلی بار انہوں نے غم عشق پر غم و دگر کو فضیلت دی ہے اور غم عشق کو غم و دگر کے بدلنے کے لئے ایک وسیلہ مانا ہے غم عشق بذات خود راتنا اہم نہیں ہے

”غم عشق مگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا“

اس کے ساتھ ساتھ ایک حسرت تعمیر بھی ملتی ہے۔

گھر میں تھا کیا جو ترا غم سے فارت کرتا وہ ہر کہتے تھے ہم کی حسرت تعمیر ہو ہے

اس حسرت تو کو کرم محبوب بھی نہ ملا۔ یہی حسرت تو میر ہے جو ان کی ہری شاہی پر چھائی ہوئی ہے اور اسی حسرت تو میر سے وہ خضر ہوا
ہوئی ہے جس میں سے قوت و جذبہ کے سوتے پورے ہیں اور جس نے جدید غزل کی بنیاد ڈالی ہے۔ ان سے پہلے یہ حسرت تو میر
کہیں نظر نہیں آتی۔

یہی نہیں بلکہ جدید دور کے علوم جدیدہ سے جو مسائل پیدا ہوئے ان پر غالب نے کافی غور و غوض کیا ہے اور یہ بالکل منطقی
وہ بھی بات تھی۔ اس لئے کہ حسبِ عشق کو اس کے اصل ارضی و سماوی پس منظر میں دیکھا جائے گا اور اس پر اب تک روحانیت و
مثالیات کی جو ایک دیر تیز ترقی و ہمارا یونین کی جائے گی تو ظاہر ہے کہ عشق کی نفسیات بھی معرض بحث میں کئے گئے گی۔ اسی لئے غالب
کے یہاں قدم قدم پر نفسیات انسانی و نفسیاتِ محبت کے بنیادی نکات ملتے ہیں جن پر ان سے پہلے کے شعرا نے کوئی توجہ نہ دی تھی۔
اور اگر کسی کے یہاں اس طرف اشارہ کہیں ملتا بھی ہے تو اس لئے کہ شاعر خود کسی قدر مرنار و عانی لبان چڑھائے ہوئے ہر گز
وہ پھر بھی انسان تھا اور کسی نہ کسی چہرہ و راز سے بنیادی انسانی جذبات و نفسیات کے گھس گھس کا خطہ لاحق ہو ہی سکتا تھا،
یہی وہ نکتہ ہے کہ جس کی وجہ سے غالب کی مقبولیت کی باڑہ رکے سے نہڑک سکی۔ اس لئے کہ شاعر کے مخاطب بہر حال انسان
ہیں اور ان کی طبیعت کا تقاضہ ہے کہ وہ اپنی دلچسپی کی بات کا مطالعہ کریں۔ یہاں غالب ہی کے یہاں ملتی ہے۔ انہوں نے غزل میں
پہلی بار ایسا دھنسا کر داخل کیا جس میں انسان کی بنیادی نفسیات و جذبات کا مطالعہ ممکن ہو سکا اور اسی نے انہیں وہ مقبولیت حاصل
ہوئی کہ شہرت و دام کا تاج ان کے سر پر رکھا گیا۔ آئیے اس بات کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں۔

بے نیازی حد سے گزرنی بندہ پر و کب تک _____ ہم کہیں گے حالی دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟

یہ کہاں کی مدتی ہے کہ سنہیں روست نامع _____ کوئی چارہ ساز ہنسا کوئی غم گسار ہوتا

تجاہلِ پیشگی سے دعا کیا _____ کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

مجھ تک کب ان کی بزم میں آنا تھا و بیام _____ ساتی نے کچھ طائرے یا پھر شراب میں

لوہ لہی کتنے ہیں کیرے بننے نام ہے _____ یہ جانا اگر تو ٹٹا نہ گھر کو میں

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کہیں کرو غالب _____ یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

دل ہی تو ہے نہ رنگ و بوست دوسے خبر نہ کہیں _____ روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں سنائے کیوں

غائبِ مستند کے بغیر کون سے کام بند ہیں _____ روئیںے زار و کار کیا کیجئے ہائے کیوں

ہے جھک جھک سے تذکرہ بغیر کا گلہ _____ ہر چند بسبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجلتے خود اک عشرِ خیال _____ ہم اکھن کجئے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

جب بیکرہ چٹا تو پھر لب لباب کی آہ _____ مسجد ہر حد سے کوئی خانقاہ ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا غصوں سے تو غالب _____ تھے بے ہر کھنے سے وہ تھہرے ہر ماں کیوں ہو

کچھ ہی روزوں کے لئے ہم معترفی _____ قریب کچھ تو بر طانات چاہئے

کھڑا کسی پر کیوں ہوئے دل کا کھار _____ شہوں کے اتفاق سے ہو گیا ہے

چھتر خواں سے چنی خشا تہد گر نہیں وصل خوت سے نہ کی
 میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب سخت اٹھائے غمراہ ایک
 سبے طلب ہیں تو مر اس میں سوا ملتا ہے وہ گدرا جس کو تو تو خوشے سوال اچھا ہے
 ان کے دیکھتے جو آفاق سے نہ ہر وقت وہ بھگت میں گریہ سارہ حال اچھا ہے
 قہر ہوا بلا ہو، جو کچھ ہو کاش کہ قدم سے لئے تھے
 دوستی کا پردہ ہے بیگانگی مرنے چھپانا ہو سے چھپنا بیانیہ

گرمی میں کلام میں انہیں نہ اس قدر کی جس سے بات اس نے نکالت ضرور کی
 اب تک کی شاعری میں نادر خوبی کو نہ کوئی جاگہ حاصل ملتی۔ نندرجہ بالا اشعار بتا رہے ہیں کہ ان کی عشق و غلاب سے ناز محبوب کے
 مخالف لاکھڑا کیا ہے اور اس طرح عشق کے سراپا میں عاشق کی اہمیت کو باقاعدہ طور پر اس نے سمجھا جو کہ پیش کیا۔ یہاں تک کہ بے صبر ہو کہ
 کہ اپنے ”کونان“ اسے سراپا ناز کیا گیا، عشق کو سراپا پر دی کی حد سے نکال کر اس میں باقاعدہ خالصت کا عنصر لائے اور عاشق و معشوق
 کو اہمیت کی ایک ہی سطح پر لا کھڑا کرنے کے لئے غالب نے پہلی بار باقاعدہ کوشش کی۔ اس سے نمائندہ ہوتا ہے کہ وہ مایوسی اور جھوٹ
 جو غدر کے اثرات سے اور زیادہ تیز ہو گئی تھی، غالب کے مزاج کو زیر کر کے میں کا سیب نہ ہو گیا اور انہوں نے بدلے ہوئے نظام میں
 انسانی طافت کی افضلیت کو ایک نئے طریقے سے پیش کیا جس سے آنے والی زندگی کے انکوائز، روشن ہونے اور ایک طرح کا احسا
 خموری اور اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا جس کے بغیر انسان میں خالصت پیدا نہیں ہو پاتی اور ظاہر ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو ہندوستان کی سماجی معاشی
 غلامی کبھی دور نہ ہو پاتی۔ اس رنگ کا کھلا نشان غالب ہے جس نے تناور درخت ہو کر برطانوی سامراج کی خس و خاشاک کو اس طرح
 سناپ میں لیا کہ وہ نہ سناپ ہی نہ سکاراں کہیں کہیں ہمارے ایک، و اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان پر اہمیت
 کی ہی بنانا ضروری تھی اور نہ انسانی ہیں ایک عشر خیال کا تجزیہ نہیں انہیں کا لطف دے جاتا تھا۔ لیکن ایسے اشعار کم ہیں اور ان کا ہونا اس لئے
 افسوسناک ہے کہ غالب تاریخ کے جس دور میں پیدا ہوئے وہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک ترین دور تھا۔ اس میں اس رنگ
 اور اندازہ صحت کا احساس ہی پایا جانا بھی جو غالب کی شاعری میں ملتا ہے ایک عجیب و غریب معجزہ ہے اور بتاتا ہے کہ غالب کے
 اعصاب کتنے قوی تھے جو باوجود وجہ رشدد اور مصائب کے پہاڑوں کے سامنے ہستے ہوئے زندگی کی آبر بکریں اور صبح کا ابراس
 کر سکتے تھے۔ اس احساس ہی سے ان کی زبان سچے اور خضر انداز میں وہ طرح کی پیدا کی کہ آج ہم غالب کی عظمت کا احساس کرنے پر
 مجبور ہیں۔ انہی نے سوشلٹی میں باقاعدہ طور پر آنے والے نظام کو خوش آمدید کہنے اور سمجھنا کا جذبہ پیدا کیا اور اس بات کا احساس دلایا کہ
 اب زندگی کی نئی تبدیلی رہی ہے۔ انہوں نے زندگی کی روانی کو احساس اور اس میں سماجی عنصر کے در آنے کا اندازہ کیا۔ فزکی اہمیت
 رائج ہو رہی تھی، سماجی بکھری بڑھ رہی تھی، مادی طبقہ وارانہ تقسیم ہونے کا پہلی تھی کہ غالب آئے اور انہوں نے اعلان کیا: ”غالب خستہ
 کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟“ یہ اس بات کا اعتراف تھا کہ انفرادی شکستوں کے ماتم کا نانا نہ گذر چکا۔ اب انسان کو ان
 اندرونی غموں کے چلنے سے باہر آکر ایک نئے زاویہ نظر سے سوجھتا ہے اور اسے والی تہذیب کے لئے تیار ہونا ہے۔ غالب سے پہلے
 منزلی میں کسے دئے ”شہ طاول قدم آفتست کہ مجنوں باشی“ کا رواج عام تھا۔ غالب کی نظروں نے پہچانا کہ وہ زمانہ ہوا ہر چکا۔ آج کی لیبی

کے نئے بے تنگ و نام پر نامی سب سے بڑا عیب ہے۔ آج عاشق کے لئے سماج میں باحیثیت بننا شرط اول قرار پا گیا ہے اور اسی نے اپنے بے تنگ و نام پر نامی ہونے پر انہوں نے یوں اظہارِ ناصفت کیا :

”یہ جانست اگر تو لانا نہ گھر کو میں“

اسی کے ساتھ انہوں نے عین کو بھی تنبیہ کیا کہ :

”گھر میں بھی کلام میں لیکن نہ اس قدر“

موسیقی کا معیار ہواں رہا تھا۔ عین کے لئے عین بعض کے علاوہ کچھ عشرہ واد اور بھی ضروری بن گئے تھے۔ غالب کی بڑی اسی میں ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کے پہلے نقیب تھے اور سماج میں آنے والی تبدیلیوں کو ان کی دور میں نگاہوں نے صوب سے پہلے پڑھا اور سمجھا اور ان کی توقعوں اور ان تبدیلیوں کو ایک تاریخی حقیقت مان کر سب سے پہلے خوش آمد کہا۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب کی شاعری آنے والے نئے ذہن کی طرف وقت کا پہلا اشارہ تھی جس نے باضابطہ طور پر زندگی کے عمل میں آنے والی تبدیلیوں کا احساس دلایا۔ ہمارے اندازِ فکر میں ایک انقلاب پیدا کیا اور تاریخ کے مادی نقطہ کو باضابطہ طور پر قبول کرنے اور کرانے کی ہم کو تیز کر دیا۔ اگر ہم غالب کا مطالعہ غور سے کریں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے ادراک حقیقت میں محسوسات اور حواسِ خمسہ کو بنیادی مرتبہ دیا ہے اور ہر ایسی چیز کو رد کرنے کی کوشش کی ہے جس کا ادراک حواسِ خمسہ کی مدد سے نہ کیا جاسکے۔ اس لحاظ سے غالب کی شاعری ہمارے اندازِ فکر میں ایک انقلابی موڑ کا پلان نشان بن جاتی ہے۔ اس دور کے کو ان کی شاعری کی روشنی میں پرکھیں تو شاید یہ بات اور زیادہ واضح ہو سکے۔

یہ نئے سننے اور لطف لیجئے ۔

واحد نہ تم ہیوں نہ کسی کو چا سکوں کیا بات ہے تمہاری شرابِ بلور کی

اود بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا جامِ جم سے تو مرا جامِ مریخ اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے حبت کی حقیقت لیکن دل کے ہلکانے کو غالب نے خیال اچھا ہے

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب اس کھ کھل گئی تو زبانی تھا نہ سُرِ تھا

نقی وہ اک شخص کے تصور سے اب وہ عرفانی خیال کہاں

ننگ ننگ کے ہر مقام پر دو چارہ محض تیرا پتہ نہ پاؤں تو ناپا کر کیا کریں

وہ چیز جس کے لئے ہر عینِ بہشتِ حوزہ سوائے بادِ گلِ فام و مشکبویک ہے

اس نزاکت کا بڑا ہودہ بجلے میں تو کیا ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

ابنِ مریم ہر اک سے کوئی میرے دکھ کی دعا کے کوئی

نہ صرف زندگی کی اخلاقی سطح بدل رہی ہے بلکہ ان اشعار میں معتقدات بے ہوشے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ آنے والے انسان کا مادی نقطہ نظر ان اشعار پر سایہ لگن ہے۔ اب صرف وہی معتقدات باقی رہ سکتے ہیں جن کی وجہ سے تمہارا دنیاوی عیسائی تجربہ رات براہِ راست ہو سیکے۔ محض خوش فہمی عقلی بصیرت کے سامنے یہ اندازِ ہوتی ہوئی یہاں صاف دکھائی دیتی ہے۔ یہی نقطہ نظر آگے چل کر پورے نظام کو اپنی رفعت میں لانے والا تھا۔ عرفانی خیال کسی شخصِ حسین کے تصور ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے اور وہ شخص حسین چلے ہے ابنِ مریم کی

ہیں نہ ہو اگر اپنے کار کا نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اگر اپنے دھم دھوکے دوا اس کے پاس نہیں تو گواہ کسی کام کا نہیں۔ سر باہر دارانہ نظام میں
 منطق بھی تلافی بنیادوں پر استوار ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے اور اب چیزوں کے حسن سے بچ کر ان کی افادیت پر نگاہ جاتی ہے اسی نئے
 جام جم سے جام سفال کہیں بہتر نظر آ رہا ہے۔ عقیدہ جنت کا یہ بے رختانہ تجزیہ کہ
 وہ چیز جس کے لئے ہمیں جنت ہے
 سولے باؤ کا کام ہندو کی ہے
 اسی نقطہ نظر کے مطلق ہے اور اگر یہ چیز شعر سے نکل کر کہیں نثر میں ادا ہوئی ہوتی تو شاید غالب شہادت سے بکزار ہو چکے ہوتے۔

غالب کے معتقدین اور سوانح نگاروں نے غالب کے ساتھ ایک ظلم یہ کیا ہے کہ انہیں ایک چڑھا ثابت کیا ہے
 اور یہ بتایا ہے کہ وہ عوام سے غریب تر ہو رہے اور محض خواص کے ساتھ رابطہ مضبوط کے قائل رہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس
 تخلص میں اس بناء پر چھوڑ دیا کہ یہی تخلص کسی سستے کا بھی تھا، اور غالب تخلص تخلص اختیار کیا۔ میں یہ ماننا ہوں کہ وہ عوام سے زیادہ رابطہ
 کے قائل نہ تھے اور ان کا سماجی مرتبہ اور شان و شوکت اور دکھ اور دونوں ہی اس بات کے متقاضی تھے کہ وہ خواص سے صحبت رکھیں لیکن
 پھر بھی اس کا یہ مطلب نکالنا کہ وہ عوامی جذبات سے بے نیاز رہے بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ غالب اس حقیقت کو سمجھ گئے تھے
 کہ عوام سے رابطہ تو کرنا شروع ہی زندہ رہے گا نہ شاعری ہی۔ یہی وجہ ہے کہ طرز تنبیہ کی چیتاں کوئی چھوڑ کر انہوں نے ایک دم
 سادہ نگاری کو اپنایا۔ عوام کی زبان کو مجرب سمجھا اور اس کے تکلفی سے اس کا استعمال کیا کہ نثر و نظم دونوں میں اسلوب کی وہ سدا بہار
 یادگار چھوڑی کہ پھر کسی کو یہ بات نصیب نہ ہوئی۔ جس طرح ان کے خط و خطا میں اردو نثر اپنے امکانات کی جھلک دکھائی ہے اور پہلی
 بار ایک ژورنائی کیفیت و اثر سے روشناس ہو کر نکالے کا لطف دیتی ہے اسی طرح ان کی شاعری میں بھی زبان اپنی سادگی کے
 باوجود ایک آن مان اور توانائی کا احساس لئے نظر آتی ہے اور ایک ایسی قوت اور اسلوب سے روشناس ہوتی ہے جس نے
 غزل کو ایک نئی زبان اور نیا لہجہ عطا کیا ہے اور اس میں جذبہ عظمت کا ایک ایسا امتزاج ملتا ہے جو اس سے پہلے کیاب ہی نہیں
 پایا تھا۔ یہ بات اسی لئے اس کی کہ غالب کا تعلق زندگی سے کبھی نہ چھوڑا۔ وہ ذوق اور محنت کی طرح اپنی ذات اور معتقدات
 کے حول میں محدود ہو کر نہیں رہ گئے۔ مومن نے محض جذبات کے ساتھ عقد پڑھا لیا تھا اور ذوق نے جالی ہوئی جاگیر وارانہ قدر کا
 اور فرسودہ ماحول کے ساتھ یہی وجہ ہے کہ ذوق اکثر اخلاقی مسلمات کے تنگ نظر آتے ہیں تو مومن محض جذبات کے مرید۔ مومن
 کے عشق میں اس سے ایک بانناں بن جاتا ہے اور ذوق کی شاعری میں اخلاقیات کی خشک اور تنہا ترگر، ان۔ غالب ان سے
 علیحدہ ایک جہاد وجدان کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں جن کی چھاپ اردو ادب و شاعری پر کچھ اس ادا سے لگی
 ہے کہ مٹانے نہ مٹ سکے گی اور اس طرح ایک ہی زلزلے میں غالب، مومن اور ذوق طبقاتی شعور کی تین مختلف منازل کے
 تین مختلف منظر ہیں۔ مومن میں اگرچہ شگفتگی ہے مگر وہ جذبات کے نئے نئے نام کے منظر ہیں اور اس طرح فردی ذہنیت کے لئے
 ایک آڑ کا کام دیتے ہیں۔ ذوق ایک ٹورن کی طرح مٹتے ہوئے نظام کے اخلاق کے آخری تقیب ہیں اور غالب آئندہ طلوع
 ہونے والے نظام کے تقیبِ آدل۔

اسی کے ساتھ ساتھ جب ہر تہذیب شعور کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ غالب باوجود اپنی

آئندہ روی و تغذی اور مستی کے اجتماعی اخلاق کی گرفت سے آزاد نہیں رہے اور باوجود اپنی مستی کے انہوں نے اپنی بری باتوں کو گھڑا ہی سمجھا اور کبھی بے جا فخر و مبالغہات کا اظہار نہیں کیا۔ ریاض، بنجام، جوش اور بھگت کی طرح باہر سے شعرا کی طرح انہوں نے بے لوثی کو نبی بھی اپنے لئے باعث فخر نہیں گنا اور بے کی لذت لینے کے باوجود اس کے غیر اخلاقی اور غیر انسانی عنصر سے وہ بھی غافل نہیں رہے ورنہ وہ نہ کہتے ۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسباہ کو

ایک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

رُوسباہ کا لفظ ان کے اس احساس کا پوری طرح عکاس ہے کہ وہ شراب نوشی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ یوں شراب سے متعلق ان کے دیوان میں کافی اشعار ہیں اور عرصہ میں متناہی ہے کہ وہ شراب کے والد و شیدا ہیں۔ لیکن ان میں وہ لذت پرستی نہیں ہے جو جوش یا بھگت کے یہاں ملتی ہے بلکہ ان کی شراب نوشی میں ایک سبھرت ہے اور وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ شراب نوشی حسن نہیں عیب ہے اور پھر نفس اس لئے سہ ہے کہ اس سے غرض نشاد نہیں بلکہ خودی کی جستجو ہے تاکہ انسان اپنے رنج و غم کو پیالہ مے میں غرق کر دے اور انہیں یہ بھی احساس ہے کہ اس کے نشے میں بہت سے وہ کام بھی ہو سکتے ہیں جو سوسائٹی میں بہتات عقل و ہوش باہر نہیں ہیں۔

سنئے فرماتے ہیں ۔

ہم سے کھل جاؤ لذت سے پرستی ایک دن

ورنہ ہم چھڑیں گے رکھ کر غدا پرستی ایک دن

ان میں اجتماعی اور معاشرتی اخلاق کا ایک ایسا تصور پایا جاتا ہے کہ وہ ان کے احساس کو ہمیشہ راورامت پر رکھنا ہے اور وہ ہمک نہیں پاتے۔ یہاں تک کہ جس غم کو بھلانے کے لئے وہ اس کا استعمال کرتے تھے وہ غم بھی ان کے سامنے برابر رہتا تھا اور وہ اس کے انباتی پہلو سے غافل نہیں ہو پاتے تھے۔

قرض کی چیتے تھے لیکن سمجھتے تھے کہ ناں

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

یہی وہ پہلو تھا جس نے غالب کو زندگی کے تعمیری اور اثباتی پہلوؤں سے شناسا رکھا اور وہ کسی حال میں بھی عروس زندگی کے رخ سے غافل نہیں ہوئے اور ان کی مے نوشی سرستی کی جگہ بصیرت سے بھگتا رہی۔ برخلاف اس کے مومن کے یہاں زندگی الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی ملتی ہے۔ وہ عیاشی کے وقت مکمل عیاش ہیں اور ضرورت کے وقت سرزدش مجاہد۔ جب عیاشی کا وقت آتا ہے تو وہ اسلامی تعلیم کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے تو وہ اسلام کے مجاہد بن جاتے ہیں۔ غالب کے یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ نہ ان کے یہاں کوئی مذہبی تصور ملتا ہے اور نہ روحانی جیسا کہ ذوق کے یہاں ملتا ہے۔

نہ مارا آپ کو جو خاک ہوا کسیر بن جاتا

اگر پارے کو اسے کسیر گر مارا تو کیا مارا

بلکہ غالب کے یہاں خالص انسانی تصور ملتا ہے۔ ان کے نزدیک کسی قسم کا مذہبی غول بیکار تھا۔ وہ محض انسانی لحاظ ہی کو انسان

کے لئے ضروری سمجھتے تھے اور اس حیثیت سے ان کے یہ اشعار بھی جو انہیں اخلاقی نقطہ نظر کے حامل ہیں محض زندگی کے انسانی
ذات سے متعلق ہیں ان کو برا نہیں سمجھتا۔ یہ اور جو ہر انسانی سوسائٹی کے لئے قابل عمل ہر مسئلہ سے

زندہ کر کے کوئی نہ کر کے کوئی
روک کر غلط چلے کوئی بخش کر غلط کرے کوئی

جب تو یہ ہی اچھی غائب
کیا کسی سے کرا کر کوئی

ہم پیشہ و ہم شرب و ہم راز ہے میرا غائب کوئی است کر اچھا ہے آگے

غائب ہونا مان جو رو غلط کر کے ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

ان اشعار میں وہ اخلاقی نکات اور زندگی سے سمجھنے کرنے کا وہ جذبہ ملتا ہے کہ جو ہر کلاں اور ہر انسانی طبقہ کے لئے باعث
برکت ہے۔ اس پر کوئی مذہبی یا فرقہ دارانہ پابندی عائد نہیں ہو سکتی۔

غائب کا زمانہ ہندوستانی تاریخ کا ایک بہت ہی پُر آشوب زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں دو مختلف نظاموں کی جنگ ہوئی
تھی۔ بالآخر جاگیر دارانہ نظام نے ہتھیار ڈال دیے اور سرمایہ دارانہ نظام کی فتح ہوئی۔ اس جہانی فتح کے بعد ایک اور جنگ لڑی گئی جس
میں جاگیر دارانہ سماج اور اخلاق نے سرمایہ دارانہ نظام و اخلاق سے بالکادہ جنگ کی اور اہستہ آہستہ سوسائٹی کے اخلاق و آداب
بالآخر سرمایہ دارانہ اور تجارتی رنگ میں رنگتے چلے گئے۔ یہ جنگ ہر محاذ پر لڑی گئی۔ یہاں تک مذاہب کی بھی نئی توجہ دینے و تشریح کرنے میں
آئی ورنہ ان کے بھی مٹ جانے کا خطرہ لاحق تھا۔ سوسائٹی میں نئے مصلح و روادار پیدا ہوئے۔ راجہ رام موہن رائے، گاندھی جی، نرہرے جی
اور دیگر چھوٹے بڑے مصلح سب اسی دور کی ضرورتوں سے متاثر تھے اور ان لوگوں نے اپنے اپنے دائرے میں مذاہب کی نئی تشریح و تفسیر
کرنے کے وقت سے مصالحت کرنے کا ایک نیا انداز نظر پیش کیا۔ یہ جنگ اتنی شدید تھی کہ اس کے نتائج دور رس ہوئے اور غیر دشر
کے نقصانات میں بھی ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ غائب کا دماغ ایک زندہ دماغ تھا۔ انہوں نے اس لڑائی کو محسوس کیا اور اس ذہنی
کشمکش کی طرف جہاں کی آنکھوں کے سامنے تھی انہوں نے واضح اشارے بھی کئے تھے۔

ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کھیسارے آگے

یہ لڑائی کلیسا کے پیروؤں کی ہی بدولت معرضِ ظہور میں آئی تھی۔ وہی ایک ایسا نیا نظام حیات ہے کہ ہندوستان پر تسلط ہو
کہ جس نے کعبہ کو پیچھے اور کلیسا کو آگے لاکھڑا کیا تھا اور جس کے نتیجے میں بالآخر کعبہ کے ماننے والوں کو زندگی سے سمجھوتہ کرنے کے لئے
اور نقد پس کعبہ کو بچانے کے لئے کلیسائی اصولوں پر اسلام کی نئی توجہ دینے و تشریح کرنے پڑی۔ محض غزنی کفر سے اس لڑائی میں اس نظام حیات
کا بچنا مشکل تھا جواب تک سوسائٹی پر حاوی تھا۔ علوم جدیدہ کے بغیر اب اس نظام کو محض الٹی نظام مان کر تسلیم کرنے والے بھی اپنے
ایمان میں شکات پڑتے ہوئے محسوس کر رہے تھے۔ غائب نے اس کشمکش کا بغیر جانبدارانہ مطالعہ کیا اور اس کا صحیح نقشہ پیش کیا اور اس

کی روشنی میں عقل انسانی کی برتری کا فہم کیا۔

اک کھیل ہے اور نگہ بیلان مرنے نزدیک
اک بات ہے اجمار سیاح مرنے آگے

اسی کے ساتھ ساتھ انسانی انگ اور امیدیں ایک جاوہرانی یقین کا معترف ہم غالب ہی کو کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ
گو گاہے میں جنبش نہیں آگھولیں تو دم
رہنے دو ابھی سا غم وینا مرنے آگے

یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں مقدمہ پر نیک و بد کی آویزش ملتی ہے۔ لیکن وہ انسانی عزم و عمل میں ایک اصطلاح بن کر رہتے تھے اور اسی لئے ان کے یہاں ریاوی کی لئے بہت کمزور اور کمزور کہیں ملتی ہے۔ شروع سے آخر تک غالب کے یہاں ایک تعمیری احساس کا سراغ ملتا ہے اور ناقابل شکست عزم و جوش سے برشناوری نظر آتی ہے جس کی وجہ یہ بھی ہے کہ غالب میں ایک خود تنقیدی طبیعت ہے اور اسی بناء پر آج ان کا دیوان مختصر ترین دیوان ہے ورنہ میر تقی میر کے دیوان کی طرح رطب و یابس کا ایک انبار ہوتا۔ یہی خود تنقیدی شعور آج غالب کی عظمت کا ضامن ہے۔ یہ خود تنقیدی شعور کس قدر شکل اور نایاب چیز ہے اس کا اندازہ صاحب تصنیف حضرات ہی لگا سکتے ہیں۔ اس لئے کہ جب انتخاب کرنے کا وقت آتا ہے تو اپنا کمزور سے کمزور شریا گھٹیا سے گھٹیا نثر کی ایک لائن بھی کاٹتے ہوئے دل دکھنا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ پتھر ٹسے سے بڑے مصنف کی بہترین سے بہترین تحریر سے بھی افضل ہے۔ لیکن غالب نے جو انتخاب اپنے کلام کا پیش کیا ہے وہ صحیح منوں میں ان کی زندگی کا چھوڑ ہے۔ اس میں سے چند اشعار کو بھی نکال بھیجنا کسی بھی شخص کے لئے ناممکن ہے۔ برخلاف اس کے بڑے سے بڑے شاعر کا کلام فی زمانہ رطب و یابس سے پاک نہیں ہے۔ سوائے غالب کے ہر شاعر مصنف کا انتخاب پیش کیا جا سکتا ہے۔ غالب کی ایک یہی خصوصیت ان کے ذہن رسا کے کمال کا اعتراف کرانے کے لئے کافی ہے۔

اس تمام بحث سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی حیثیت غزل کے لئے ایک مجتہد کی سی تھی۔ انہوں نے غزل میں نئی وسعتیں پیدا کیں اور غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم روزگار کو باقاعدہ طور پر غزل میں لانے والے وہی تھے اور اس طرح وہ اپنے غزل گوین میں معروضی حقیقت کے پلٹے بار کہے ہیں۔ اس لئے کہ شعری طور پر غزل کو زندگی کی شش جہتی کا آئینہ انہی نے بنایا اور پھر اس بات کا اعلان بھی کیا۔

ہر چند ہر مشاہدہ سخن کی گفتگو
بنتی نہیں ہے باد و ساغر کے بغیر
مقصود ہے ناز غم و غم لئے نکل گیا
چندا نہیں ہے شہرہ و خبر کے بغیر

یہ اس بات کی توثیق تھی کہ ان کی غزل غم جاناں کے علاوہ بھی کسی اور چیز کی آئینہ دار ہے اور یہ کہ غزل سے کچھ اور بھی کام لے جا سکتے ہیں۔ غالب کا یہ اشارہ مستقبل کے شاعروں کے لئے قطب نما بن گیا اور غزل کے لئے حیات جاوید کا پیام، آقبال، حسرت، فانی، مصفا اور جدید نسل کے لوگ جن میں اختر انصاری، اختر شیرانی، فراق اور پھر ان سے بعد یہ ترجمان میں عدم، فیض، جذبی اور مجاہد وغیرہ آئے ہیں۔ ان سب نے اس اشارہ کو ایک حقیقت بنادیا اور ایک ایسے زمانے میں جب زبان پر تعزیریں تھیں۔ غزل کی اہلیں

سیاسی و سماجی زندگی کا ہر رخ صحت کر آگیا۔ اس لئے کہ یہاں بادِ ساعز اور دشنہ و نجر کے پیرایے میں ہر مضمون ادا ہو سکتا تھا۔ اگرچہ غالب ہی نے یہ بھی کہا کہ —

بقدرِ شوق نہیں غرتِ بگنا سے غزل کچھ اور چاہئے وسعت کے یہاں کے لئے

اور بیان کی اس وسعت کے لئے قدرت نے ان کے شاگردِ حالی اور حالی کے ہم عصر آزاد کا انتخاب کیا نہیں بلکہ غزل کو بقدرِ شوق وسیع نہ پانے کا احساس شاید پہلے پہل غالب ہی نے کیا۔ یہ احساس ان کے دماغ کے زندہ ہونے کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ اس زمانے کے بڑے سے بڑے صاحبِ نظر کی نگاہ غزل کے احاطہ میں مصور ہو کر رہ جاتی تھی۔

غزل کے دامن کی اس تنگی کے احساس کے باوجود قافیہ و ردیف کی پابندی نے زبان کو نکھارنے اور الفاظ میں معانی کی پوست پیدا کرنے اور لہجہ و لچک بخشنے کا غیر معمولی کام انجام دیا ہے۔ اس کے اس دماغ کو اجاگر کرنے اور زبان کے مجمعِ لطف اور چٹخارہ کو سامنے لانے میں بعد میں واضح نے ایک گنا اقدار کا نامہ انجام دیا۔ لیکن غالب کے یہاں بھی قصیدوں میں زبان کا یہ حسن اپنے پورے شباب پر ہے۔ ان کے قصائد میں زیادہ تر صرف قوافی ہیں اور ردیف نادر ہے۔ ان کے ایسے ہی قصیدوں میں قوافی کے برمحل استعمال ان کے قوافی کو بہشت پہلو معانی سے آشنا کرتا ہر اوصاف نظر آتا ہے اور زبان کا لطف دیتا ہے۔ اس سلسلے میں بھٹو ان کا قصیدہ ”صمیم دروازہ خاور کھلا“ ان کی ذہانت کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے اور میر سے اس دعویٰ کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔ مثالیں دے کر میں اس مضمون کو بجا طول نہیں دینا چاہتا۔

غالب کے ایسے اشعار سے جن میں انہوں نے جنت یا شرابِ طور کا مذاق اٹایا ہے اور دوسرے اشعار سے کچھ لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان کا مذہب تشکیک تھا۔ یہ ان کے ساتھ کھلی نا انصافی ہے۔ غالب عقل پرستی کے پہلے پیامد شاعر ہیں اور اس لحاظ سے ان کو تشکیک کا پیرو بنانا ان کے ساتھ سب سے بڑا ظلم ہے اور ناتذکیم عقل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ دراصل ہر بڑے شاعر اودادِ بیک کی طرح غالب میں بھی ایک احساسِ خیر تھا (SENSE OF WANDER) احساسِ خیر احساسِ تشکیک سے بالکل الگ ایک چیز ہے۔ اگر غالب تشکیک پسند ہوتے تو وہ اتنے بڑے انسانِ لطیف نہ ہوتے۔ ان کی ظرافت پر صدمہ دماغی اور تصنیفیں ملتی ہیں اور ان کے خطوط ظرافت نگاری کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے وہ لطیفے جو نقل کئے جاتے ہیں اور ان سے منسوب ہیں ان کی اعلیٰ ترین ظرافت کے آئینہ دار ہیں اور ان کی تازگی سردا بہار ہے۔ یہ ظرافت تشکیک سے نہیں یقین سے پیدا ہوتی ہے۔ ناقدین ایک ہی سانس میں انہیں غالیف بھی کہتے ہیں اور ان کی عقل پرستی کے بھی قائل ہیں اور پھر اسی سانس میں ان کو تشکیک پسند بھی بتاتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نقد نگار زیادہ تر نقل کرتے ہیں اور ان میں کوئی ایسی قوتِ اختراع یا تنقیدی ذہانت نہیں ہے جس سے وہ کسی ادیب یا شاعر پر ایک صحیح رائے پیش کر سکیں۔ تشکیک پسندی سے بڑا ہتھکنڈا غالب پر کوئی نہیں لگا جا سکتا۔ اس کے برخلاف وہ مذہبِ تشکیک کے پہلے باغی ہیں جنہوں نے عزمِ یقین کے ساتھ نئے راستوں کی طرف کاروانِ شاعری کی رہنمائی کی ہے۔

ان کے احساسِ خیر کو احساسِ تشکیک ماننے کی وجہ یہ ہوتی کہ غالب روایتی اخلاق و مسلمات کے باغی ہیں اور کونزنگی اور نئے نظامِ اخلاق کو خوش آہدیت کہتے ہیں۔ وہ ایسے عقاید کا جن کی توجیہ و حواسِ خمسہ کی زد سے نہ ہر کے مذاق اڑاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ جب وہ عظیم فن کارانہ اس خیر کو مظاہرہ کرتے ہیں اور روایتی انداز میں سوال کرتے ہیں کہ — ”پھر یہ ہنگامہ

اسے نکالنا ہے۔ تو لوگ انہیں فعلی سے تشکیک پسند سمجھ جیتے ہیں اور اس طرح ناقدین کو ایک بہت بڑا دھوکہ ہوتا ہے۔ یہ احساسِ تکیہِ عظیم فنِ کاوی کا لازمہ ہے۔ غالب ایک عظیم فن کار ہو کر اس احساسِ تکیہ سے نا آشنا کیسے رہ سکتے تھے۔ یہ احساسِ تکیہ نہ ہوتا تو غالب کی کامیابیوں میں گامزن نہ ہو سکتے اور نہ ان کی وہ اہمیت ہی ہوتی جو آج انہیں حاصل ہے۔

اس کے علاوہ غالب کی ایک اہمیت اور بھی ہے اور وہ یہ کہ غالب نے غزل کو ایک نیا Diction دیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح فی زمانہ فیض نے غزل کو ایک نیا Diction دیا ہے۔ لیکن فیض کے Diction میں غزابت ہے۔ غالب کے Diction میں غزابت محسوس نہیں ہوتی۔ فیض کا Diction بے انتہار وادانیت لئے ہوش ہے اور غالب کا Diction زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ فیض نے فکر کو دانستہ غزل میں داخل کیا ہے اور اس لئے اس میں سیاسی رنگ محسوس ہوتا ہے۔ غالب نے رنگ کے تجربوں کو کچھ اس طرح بچایا ہے کہ غزل کا فکری عنصر غزل کے مزاج سے یوں ہم آہنگ ہو گیا ہے کہ اس میں کوئی عجب یا اسپناپ پن محسوس نہیں ہوتا۔ ان کے مشہور شعر

دارِ فراغِ محبتِ شب کی جہلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی نموش ہے

کے متعلق ایک زمانے میں یہ بحث شروع ہو گئی تھی کہ یہ شعر بہادر شاہ کے لئے کہا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کو اس سے اختلاف تھا اور انہوں نے تاریخ و مین کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ یہ بہادر شاہِ فقیر سے تخت چھن جانے یا ان کے مرجانے کے بعد کا شعر نہیں بلکہ یہ اس سے پہلے کا شعر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ یہ کس زمانے میں کہا گیا ہے، بلکہ یہ ضروری ہے کہ یہ کن حالات میں کہا گیا۔ بہادر شاہِ فقیر کی تخت نشینی بھی فی الاصل کوئی بادشاہت کا درجہ نہیں رکھتی تھی۔ ان کی بادشاہت کا نمائندہ بھی گویا نعل زمانے کا ایک تمغہ سمجھے بلکہ وہ بادشاہت نہ تھی، بادشاہت کا ایک مذاق تھا۔ سیاسی حیثیت سے وہ انگریزوں کے رحم و کرم پر تھے اور بادشاہت کے جملہ اختیارات سے محروم تھے۔ ان حالات میں یہ شعر کہا گیا ہے اور یقیناً یہ سیاست و وقت کا مظہر ہے۔ لیکن غزل کے مزاج سے اتنا ہم آہنگ ہے کہ بادیِ نظر میں یہ سیاسی شعر نہیں کہا جاسکتا۔ یہی غالب کا کمال ہے۔ غزل نے شاعروں نے یہ کمال اس سے پہلے بھی ظاہر کیا ہے مثلاً آتش کا مشہور شعر

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو غزلِ حرفِ اغائبانہ کیا

تاریخ پر ایک چوٹ ہے۔ غزل کی یہی خصوصیت کہ وہ مخصوص تجربات اور جذبات کو اس رنگ میں رنگ دیتی ہے کہ یہ عمومی جذبات اور عمومی تجربات پر عادی ہو کر وقت کی تبدیلی سے آزاد ہو جاتے ہیں، اس کو زندہ رکھنے کی ضمانت ہے۔ اس قیاس سے غالب کے Diction پر عمل رہا ہے۔ لیکن ان کے کچھ اشعار سننے جن میں انہوں نے غزل کی مروجہ زبان سے ہٹ کر اشعار کہے ہیں اور اس طرح غزل میں زبان کے نئے تجربے کئے ہیں جن سے ان تجربوں کی بنیاد پڑی جن پر آج کے استادانِ زماں ہیں۔

پانی سے رنگ گزیدہ ڈرے جس طرح آئندہ
قدما ہوں آئینہ سے کہ مروجہ گزیدہ ہوں

نہ تھا دن کو نو گھنٹہ رات کو یوں پہنچتا
روکھ ٹکٹہ چوری کا دو عادی تیار ہیں رہزن کو

سچ طاقت سے سما ہوا نہیںوں کی پٹری
زمین میں غریبی تسلیم و رضا ہے تو سہی

پیسس میں گزرتے ہیں جو کو چہ سے وہ میرے
کندہ جالعی کماروں کو بد گئے نہیں دیتے

وفا سے دلبرائ ہے اتھافی ورنہ اسے ہدم
اثر فریاد دل ہاتے جزیں کا کس نے دیکھا ہے

پڑھیں یوں درد سے جوں راگے کوئی باجر
اک ذرا چھڑی پھر دیکھتے کیا ہوتا ہے

غزل کی ہندسی مکی زبان اور عمارہ کی اٹل پیر سے باہر آنے میں غالب نے نمایاں کام کیا اور اس غزل کی فصاحت و فصیحی
نمایا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ احساس دلا کر کہ غزل کو دشمن و خائن کے بغیر اور مشادہ جہ کو یاد و دماغ کی تعلیمات میں اسیر کئے بغیر اس
دنیا میں کام نہیں چلتا۔ انہوں نے غزل کی تعلیمات و تشبیہات کو ایک نئی وسعت دی۔ شمع و پروانہ، گل و بلبل، غمزہ و دادا، وصل و فراق،
جنون و غمزدہ، ان ساری تعلیمات کو ایک نئے معنی پہنائے اور اس طرح زبان کے خزانے میں الفاظ کا اضافہ کئے۔ یہ معانی کے دریا
بہاؤ تھے۔ اس کا انہیں خود بھی احساس تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں :-

تجفیفہ معنی کا تسلیم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

اور اس طرح انہوں نے غزل کی زبان کو سٹیک (STATIC) سے حرکی (DYNAMIC) بنا دیا۔ یہی وہ بات ہے جسے میں Diction کا
نیامین کہتا ہوں۔ وہ الفاظ کے ایک بے بدل صانع تھے اور انہوں نے زبان کو اس کمال اور مہارت سے استعمال کیا ہے کہ اس
کی مدد سے مثال ڈھنڈھے سے نہیں ملتی۔ الفاظ و معانی پر ایسی قدرت ہوتی ہے کہ ان کی متعدد تشبیہیں ملتی ہیں اور ہر تشبیہ نگار
ان کے اشعار سے علیحدہ نئی اور معانی کا استنباط کرتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نگار خانے میں ہمیشہ اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ مختصر مضمون
اس طوالت کا حامل نہیں ہو سکتا کہ ان کی قدرت زبان پر مکمل روشنی ڈال سکے۔

غالب پر ایک اعتراض اور بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ اتنے خوددار اور بڑے انسان نہیں تھے جس قدر ان کا بتایا گیا ہے۔
بلکہ وہ طبیعت کی جھبک مانگنے لگتے تک پہنچنے اور ان کے دلوان میں لمبی کچھ ایسے شعر ملتے ہیں جن سے ان کی خودداری کی نفی ہوتی ہے
مثلاً "یاد تھیں حقہ بی دعا میں حرف درباں پر گئیں" وغیرہ وغیرہ۔ تو اس کے متعلق میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایسے لوگوں نے غالب
کو سمجھا ہی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں تیر کی کمی خود پسندی اور بے لچک خودداری نہیں تھی لیکن یہ کہنا کہ وہ خودداری کے جوہر سے محروم تھے
ناقدین کی ناگہمی پر دلالت کرتا ہے۔ غالب کے حالات و واقعات اور شریعت مزاج سے جن کو طبیعتی ہے اور جنہوں نے ان کی زندگی
کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ باوجود دی خواہش اور ضرورت کے وہی کلمہ کے دروازے سے ایک مغربی نوکری کو محض اس لئے
ٹھکرا کر چلے آئے والے کہ ان کے استقبال کو کلمہ کا سبب بڑا احمد و داریں نہیں آیا، غالب ہی پر کہتے تھے "ہا یہ کہ پیش کے لئے
انہوں نے کیا کیا حق کے لئے تضاد کھسے، محض ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالنا انصافی ہے۔ اس غالب زندگی سے سمجھتے تھے کہ تعامل
تھے۔ وہ بہادر شاہ کے خلیفہ خوار تھے اس لئے تضاد کہتے تھے۔ لیکن اس سے آگے وہ اپنے رہنے کے خلاف کوئی بات بہادر شاہ
سے لمبی معنی کے لئے تیار نہ تھے۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ یہی زندگی سے سمجھنا ہے۔ یہی صورت ان کی
انگریزوں کے ساتھ رہی اور یہی بات دیگر امرا و عمائد کے ساتھ تھی۔ اسی لئے انہوں نے کہا ہے :-

بندگی میں بھی وہ آزاد و خود ہیں ہم ————— اُسے پھر آنے دو کہہ اگر وہ نہ ہوا
 ہم کھیلوں اور کھیلوں کوں ہلے ————— غلہ کا دروازہ پائیں خر کھلا

بندگی کو تسلیم کرتے ہوئے یہ خود بھی کہہ کر کہہ اگر وہ نہ ہلے تو اُسے پھر آئیں اور اس دنیا میں کا شمار نہ ہو کہ اسے داکر نے کے لئے
 روز خواست کرنا چاہئے یہی غالب کے مزاج کی کلید ہے اور یہ پھر ایک مرتبہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ غالب نے اس کے
 مزاج میں تھے غمان کا مزاج جاگیر و ادا نہ تھا اور عقل سراپا وہی کی غمناکی میں یقین رکھتی تھی اور ایک سراپا دارانہ حمد کی آمد کا انتقال
 کے لئے گویا رشتہ — اسی لئے عقل میں پھر بھی اور مزاج میں انسانیت تھی۔ اسی باعث ایک طرف وہ بے انتہا رکھ رکھاؤ اور جاگیر دارانہ
 غرق مراتب پر دے تھے تھے تو دوسری طرف علم و پیش کی جستجو اور وظائف کے خواستگار تھے۔ گویا زندگی کو تباہی کے لئے جس مادی
 نقطہ نظر اور حقیقت پسندانہ آگہی کی ضرورت تھی غالب کے عمل اور اشعار میں اس کے پہلے نشانات ملتے ہیں اور انہیں اس بات
 کا احساس تھا کہ خود اسی و خود بینی کا یہ عمل کسی نہ کسی دن تار پھینکا ہی پڑے گا۔

ہیں آج کہیں بویل کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں!

اسی سے میں کہتا ہوں کہ ہمارے شری ورثہ میں غالب معروضی حقیقت کے پہلے بار کہ ہیں۔ غالب کی انہیں مادی
 حقائق کے لئے چمک ہے۔ تیر کے یہاں یہ بات نہیں ہے۔ ان کی انسانیت کھڑی تھی جو ٹوٹ سکتی تھی مڑ نہیں سکتی تھی۔ غالب کی
 انا ایک زندہ شاعر ہے جو بقدر ضرورت ایک بھی سکتی ہے اور مڑی بھی جاسکتی ہے۔ لیکن انشا کی بے حد تیزی سے غالب کے عقائد ایک
 بالکل الگ چیز ہیں اور وہ اس لئے کہ انشا اپنا توازن کھو چکے تھے۔ غالب ایک لمحہ کے لئے اپنا توازن نہیں کھوئے اور اسی لئے
 وہ زندگی میں صرف اسی قدر سمجھتے تھے کہ قائل میں جس میں انسان اپنی ذات کا توازن قائم رکھے اور عین زیست میں اضافہ کرے
 یا بہ الفاظ دیگر جتنا سمجھتا انسانیت کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے اس سے آگے جانا شکست کھاتا ہے۔ غالب اس شکست کی ریت
 کو بھٹکنے کے لئے کبھی تیار نہ تھے۔

واجد علی شاہ اور اُن کی سبکیا کے خطوط

تمکین کاظمی

واجد علی شاہ ان بڑھاپوں میں سے تھے جو صاحبِ ذوق و وجدان اور صاحبِ جدت و طرز ہونے کے باوجود گوشہ نشینی میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان پر الزام یہ لگاتے جاتے ہیں کہ وہ اپنی سلطنتِ سنبھال نہ لے سکے اور انہوں نے خاموشی کے ساتھ سلطنت اور حکومت کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ عشرت پسند ہمیش کو ش اور راگ و رنگ کے رسیا تھے، اور عجب میں زندگی گزار دی، انگریزوں سے مقابلہ نہ کر سکے۔ انگریزی قیدی بنے ہوئے رہے۔

نظاہر الزام بہت سنگین ہیں مگر غور کیجئے تو نہایت طفلانہ اور حد درجہ مضحکہ خیز، کیونکہ سلطنتِ حق ہی کو کسی جس کو نہ سنبھال نہ سکے اور سلطنتِ دہلی کا حال یہ تھا کہ

سلطنتِ شاہِ عالم از مہلی تا پالم

کہاوت مشہور تھی۔ جب سلطنتِ دہلی کا یہ حال ہو تو غور کیجئے کھنڈ کا کیا حال ہوگا۔ بیچارہ شاہ شطرنج تھا کہ کیا سکتا تھا، اپنی چار دیواری میں انہوں نے جو کچھ کیا وہ اتنا ہے کہ دوسرے لوگ کسی پشت میں بھی نہ کر سکے تھے، نہ صرف کھنڈ میں بلکہ کلکتہ کی نظربندی میں بھی بڑی بڑی جدتیں واجد علی شاہ نے کیں اور فوجی طبعیت کی خدمت آخر تک کرتے رہے، کھنڈ تو خیر کلکتہ کو بھی انہوں نے رشک کھنڈ بنا دیا اور شطرنج میں اُنہوں کی مہکسال بنا کر پانگوڑہ دیکھ جلدی کر دیا جو آج تک چلا ہے۔

جیسا کہ عام طور پر شاہانِ مشرق کا طریقہ رہا ہے واجد علی شاہ نے بھی سینکڑوں خواہشیں اور محل سکے تھے جن کی تعلیم و تربیت باقاعدہ اور باضابطہ ہوتی تھی اپنی آپ بیتی ”پہلی خانہ“ میں (جس کا اردو ترجمہ مرزا خداحملی خجستہ نے محلِ خانہ شاہی کے نام سے شائع کیا ہے، واجد علی شاہ لکھتے ہیں:

”اسی زمانہ میں مرزا حسن نامی مولوی کو جو غلامِ رضا خاں کی معرفت ملازم ہوا تھا، بیگمیں اور بیویوں کے سبق دینے کے واسطے مقرر فرمایا اور ایک قطعہ مکان علیحدہ مکتب خانہ کے واسطے جو نیز فرمایا، پہنچا ہر ایک نے اپنی ریاست کے موافق علومِ شرعیہ کی تحصیل کی اور میرے تختِ آہانی پر جوس فرمائے تاکہ یہی سلسلہ جاری رہا۔“ (صفحہ ۱۸)

واجد علی شاہ نے اپنی خواہشوں، بیگمیں اور مولویوں کو نہ صرف موسیقی و رقص میں ملانے کر دیا تھا بلکہ وہ ادب و شعور میں بھی شہرہ آفاق شخصیت تھے۔ تقریباً

درد و رنج و گمات بہترین شکر کشتی نصیب جن میں سے کئی ایک کے دیوان، غزلیاں اور مجموعے چھپ چکے ہیں اور تیس چالیس بیگمات نہایت ہی اچھی شکر کشتیں جن کے رقصات بڑی خصوصیت رکھتے ہیں، ان رقصات کی تعریف عبدالمعین شرت نے مثنوی ”غزلیہ اختر“ کے مقدمہ میں یوں کی ہے :

”وہ اجد علی شاہ کے کورٹ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ بادشاہ اور ان کے حوالت کے درمیان میں جو خط و کتابت ہوتی وہ ”تودنا“ نامہ کے لفظ سے یاد کئے جاتے اور رنگین و پرافشاں کاغذ پر ہوا کرتے، معاملات کی طرف سے جتنے تودنا مے جاتے کاغذ کی طرح نہایت ہی رنگین اور متغی عبارت میں ہوتے اور ان میں زبان کی پاکیزگی کے ساتھ نہایت ہی شستہ و رفتہ با محاورہ زبان کا محاورہ رکھا جاتا اور عاشقانہ رنگین بیانی ہوتی۔ اس سے وہ تجربہ فدا ہو گیا اور نہ میرے خیال میں اس سے اچھا ادبی ذخیرہ اردو زبان کو پھر نصیب نہ ہو سکے گا۔ اتفاق سے ایسے تودنا محبت کثرت سے میری نظر سے گذرے ہیں اور میں انہیں نہایت ہی شوق سے پڑھتا رہا ہوں اور اصل حقیقت یہ ہے کہ مجھ میں جو کچھ ادبی ذوق پیدا ہوا یہ انہی تودنا موں کے پڑھنے کی برکت ہے۔“ (۱۹۶۵ء)

دس سال پہلے مجھے ایک محققہ سار سارا ملالہ صاحبہ نے ادبی دینا لاہور، بابت جنوری ۱۹۶۳ء میں چھپوایا تھا مگر اب تراب علی خاں صاحب بارڈر نے اپنے نایاب ذخیرے میں سے دو بڑے اہم مجموعے مجھے دے دیے ہیں ایک کتاب ہے ”مخزن اسرار سلطانی“ رقصات بیگمات جو رائل سائز کے ایک سو بیس صفحات کی ہے جس کا نام تاریخی ہے یعنی تاریخ ترتیب ۱۳۱۹ھ تک ہے جس کے مرتب انبیا ز علی خاں نجیب ساکن فرخ آباد نے ۱۹۰۲ء کو چھپوایا ہے اس میں واجد علی شاہ کی تیرہ بیگمات کے بہتر رقصات ہیں اور چند رقصات واجد علی شاہ کے انہی بیگمات کے نام ہیں۔

یہ رقصے ۱۲۶۳ھ سے ۱۲۷۴ھ تک کے ہیں اور زیادہ تر ۱۲۶۳ھ ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بالکل حوالتی زبان ہے، روزمرہ نہایت فصیح، محاورے ٹھیک ٹھیک سالی اور اسلوب و بیان حد درجہ سادہ اور دلچسپ ہے جو لکھنؤ نوافذ بیگمات کے لکھے ہوئے رقصے ہیں اس لئے نہایت درد انگیز ہیں۔ بیشتر بیگمات نے منظوم رقصے بھی لکھے ہیں یا جابجا اپنے شعر نقل کئے ہیں۔

دوسرا مجموعہ واجد علی شاہ کے رقصات کا ہے جو ”خطوط انہی شاہ واددہ“ کے نام سے مطبع نوکشتہ لکھنؤ میں چھپا ہے۔ واجد علی شاہ کے منظوم بیس مکتوبات کا مجموعہ ہے جو رائل سائز کے پینتیس صفحات پر محیط ”لسان العصر“ کے ضمیمہ کے طور پر شائع ہوا ہے جسے خواجہ عبدالرؤف عشرت نے ۱۹۱۰ء میں مرتب کیا ہے۔ یہ واجد علی شاہ کے کلکتہ سے لکھے ہوئے رقصات بھی اتفاق سے تیرہ بیگمات کے نام ہیں۔ اس طرح ہمارے سامنے تیرہ خطوط مختلف بیگمات کے واجد علی شاہ کے نام اور تیرہ ہی خطوط واجد علی شاہ کے مختلف بیگمات کے نام ہیں۔ ان دونوں مجموعوں سے واجد علی شاہ کی چھبیس بیگمات کے نام معلوم ہوتے ہیں۔

مجھے اب بیگمات واددہ کے خطوط پڑھے۔ ۲۶ جمادی الآخر ۱۳۷۴ھ کو شیدا بیگم نے واجد علی شاہ کو لکھا ہے :

”دعائی رعایا، ناصر برایا، نرم رخہ اکاسایا !

اشتیاق نامہ ہمارا ستر عویں کا لکھا ہوا عین انتظار میں آیا، ہم نے دیکھتے ہی آنکھوں سے لگایا، حسیہ کو پڑھ کر مٹایا

ہر فقرہ دشمن لہجہ، غمچیز طبیعت کو دکھایا، تمہاری جوانی نے وہ صدمہ دکھایا کہ منہ کو کھیر آیا۔ ہم کو گم نے ایسا دکھایا کہ
خون آنکھوں سے برسیا۔ پیر فلک نے عجب زینگ دکھایا، تم کو ہم سے مین جوانی میں چھڑایا۔

ترے دام کال میں مل ہے اسیر
کسی وقت آرام آتا نہیں
مراحل یہ ہے بقول قصیر
تصور ترا دل سے جلتا نہیں

”اب جلد خدا یہ امید برائے تمہاری صورت رشک و رشید دکھائے، یعنی تم کو ہم سے ملائے، سب تردد
جائے، دل کو تسکین آئے اور اس زمانہ ناکام میں کم آرام ہے، سبب اختلاف آب و ہوا پر خور و زاریاں ہو گئیں
کو زکام ہے۔“

خدا تم کو صحت سے رکھے خدا
کرے ملک جلدی تمہارا عطا

یہ شیدا بیگم و اجد علی شاہ کی بڑی چیتی عمل تھیں۔ و اجد علی شاہ نے اپنی شہزادی حزن اختر میں شیدا بیگم اور ان کی بیٹی گلہ آسمروٹ بہ قیاد بیگم
کا ذکر یوں کیا ہے :

تنگیں آرا چو تھی جو شہزادی تھی
رقیہ ملائیں جو بانو سے ہم
حقیقت میں گھر بھر کی آبادی تھی
لکھیں نام اس مر کا لے دی کریم
جو خواب پہلے تو بیگم ہے بعد
یہ شیدا کی خالق نے لداو کی
خدا نے یہ کی شیدا بیگم پر ہر
برس تین کی پہلجی تھی نیک ذات
سنایہ عدم کو گئی رشک ماہ
خبر یہ مل ہے مجھے آوا آوا

۱۲۴۳ھ کے رقعہ میں شیدا بیگم نے تنگیں آرا کی علالت کو رکھیر شانی کی رسم کا ذکر کیا ہے۔
۱۲۴۳ھ کے رقعہ میں شیدا بیگم نے بڑے مرے مرے کی باتیں لکھی ہیں، آپ بھی لطف اٹھائیے :

”اختر آسمان دلربائی کو ہر دریا شے کشائی ابلبل شاخسار بچتی، خسرو، شیریں گفتگو، سلیمان چشم
بفتیس شہیرا یوسف جمال، زلیخا خصال، ماہ صورت، چکوہ سیرت، ایل کی سچ، معجزوں کی دھج، ادم کے دل
کا گھاؤ، نعل کی صورت کا بناؤ، اندرا کا ناز و امن کا انداز، شاہ کی راحت، عروزی کی عزت، شیخ کا رنگ، پروانہ
کا ٹھنک، آشہر کی آرائش، پہلو کی زینائش، بند کھولنے والے، لپٹ کے سونے والے، ازخیم فراق کے مرہم،
مرزا جان عالم، بلکہ جان جہاں سے بہتر سلطان عالم اختر!..... الخ“

۱۲۴۳ھ کے رقعہ میں شیدا بیگم نے جلیے پھوٹے پھوٹے ہیں کسی نے ان پر تہمت اٹھائی تھی جس کے جواب میں خوب خوب
صلواتیں سنائی ہیں، رقعہ لباس ہے مگر ہے مزیدار، آپ بھی سنئے :

”تم نے جو دشمن کے کہنے پر تحریر کیا تھا کہ ”۳۳ شہزاد کو شہزادی سنیہا لاتی پر چڑھ کے چینی بازار میں تمہارے

عمل کے کوٹے کے سامنے چار گھڑی تک کھڑا رہا اور تھارے یہاں کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور عورتیں بیٹھیں تھیں۔ نہ تو کھڑکیاں بند ہوئیں نہ عورتیں کھڑکیاں کے پاس آئیں۔ اس کے کیا معنی؟ — جانی! اس کے ہیں دو معنی ایک تو لغوی دوسرے اصطلاحی، پہلے تو لغوی سے ہر گاہ کہ اصطلاحی سمجھنا خاطر خواہ۔ لغوی تو یہ ہے کہ اس میں کچھ منسوب ہے اور نہ خلوت، ہر جہاں اس حال صدق مال کا حوت بحوت ہے صاف صاف کہ تین کھڑکیاں دھڑاڑا ہمارے عمل کے کوٹے پر جانب چینی بازار کوٹے پر چلی ہوئی آدمی آدمی چنی ہوئی ابتدا سے ہیں، فی الحقیقت بعد فیروز پورہ کے اسی کے کھٹنے کی کوئی صدمت؟ جس طرح چاہر اس کی پہنچاؤ سنہ کو قول حاسدوں کا ہر جہاں زور لغوی تو ہو چکے ہر قوم اب اصطلاحی کہ معلوم کہ جب سے تم آدمی حصار سے ہو رہے چینی بازار کی طرف اپنے کوٹے پر دو کرے بنائے ہیں اور جہاں شیشی آلات سے سجائے ہیں، پر دے کمانی کے بند حوائے ہیں، چاندی سونے کے پلنگ بچھوائے ہیں اور عورتوں کا کیا ذکر ہے خود ہمارا یہ حال ہے کہ ہم کو ایک تہہ بھی نہیں ہمارا خیال ہے۔ جب دو تین گھڑی دن رہتا ہے تو ہم ہر روز ونداں بیٹھنے کو جاتے ہیں، دیدہ و دانستہ ہر روم سے آنکھیں لڑاتے ہیں اور وقت شب جس کو چاہتے ہیں اس کو بلاتے ہیں، تمام بات خوب مزے اٹھاتے ہیں۔ ہمارا کام بیٹھنا سر راہ ہے یہاں سے کلکتہ تک ہر شخص اس پر گواہ ہے جو روز ونداں ہمارا ہے تم پر بھی سب ہشکارا ہے۔ ہم کو ہرگز کچھ نہیں ہے باک، جموٹوں حاسدوں کے منہ میں بے خفاکی اور دل اس وقت کچھ خوب یاد آیا، ایک یا مضمون دہن میں سما یا۔ میں تم سے پوچھتی ہوں خلاصہ اس کا بتانا، جلد تر کہہ کر بھجوانا۔ تم نے جو کچھ تھا اس دنیا تمہارے عمل کے سامنے کھڑا تھا، اس بات کو تصور کرو اور غور و فکر کرو کہ سن پانچ کا یہاں کیا کام ہے؟ اس کا تو بار چرخ خانہ مقام ہے۔ اگر کوئی باورچی ہوگا جہاں سالار علی ہر ایک ہر گاہ و دن ہوگا۔ یہاں حال و تم کو بخوبی معلوم ہے اور ظاہر و باطن سب معلوم ہے کہ باورچی ہے نہ روزنی نہ حجام ہے، ان میں سے ایک کا بھی یہاں نہیں کام ہے، ہم فقط آپ ہیں یا آپ ہی کے کارکن ہمارے باپ ہیں اور عورتیں بھی ہمارے یہاں رہتی ہیں ان میں سب ضعیف اور ادھیڑ ہیں کوئی جوان نہیں۔ ان پر فعلی بد کا کسی کو گمان نہیں۔ ہاں مگر ایک منظر ہے سورہہ ملی مستانی نہیں دیوانی ہے۔ کوئی ملک حرام حیا رہنے اڑھائی چاول پکایا کرے ہزار لیکن یہاں وال گھنے کی نہیں زمیندار، بلکہ بعض پختہ کاروں نے ابتدا میں کچھ کچھ ہم کو اکثر دم دیا، خدا شاد ہے ہم نے بجز تمہارے کسی کو قبول نہ کیا۔ فقط!

ایک خط میں شیدائیکم نے فخر کی پریشانیان ملی تفصیل سے لکھی ہیں مگر اس پر تاریخ اور سنہ نہیں ہے۔ یہ خط شیدائیکم کے ۱۲۳۵ھ کے خطوط کے بعد ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خط محرم یا صفر ۱۲۳۵ھ کا لکھا ہوا ہے، یہ بیگناہ اور وہ کی شرکاء عمل نور ہے۔ اس کی قیمت ادھڑہ جاتی ہے جب آپ ۱۲۳۵ھ (۱۹۵۴ء) میں انہیں پڑھتے ہیں۔ پورے ایک سو سال پیشتر کی نشر کا مقابلہ آج کل کی نشر سے کرتے ہیں:

”انیس و ہدم، جان عالم! بعد کم اللہ تعالیٰ! بعد اشتیاق وصال فواب شیدائیکم کا ظاہر جو تم پر حال، مدت

جاک ہے ایسے جینے پر خاک ہے۔ اب طاقت بارہائی اٹھانے کی نہیں رہی ہے، اٹھوں پودا بھی ہے کہ خدا جلہ نہ کہ یہاں لائے، چاندی شکل ہم کو دکھائے۔

پھر وہ چرچے ہیں پھر وہی باتیں دن ہوں عشرت کے پیش کی باتیں

(۲۲ رجب ۱۲۷۳ھ)

دیہیہ نگیم نامی کوئی مستورہ دیندہ پتی جس کا کوئی سال نہیں نہ مل سکا گو ایک رقم ملا ہے اسے لمبی دیکھ لیجئے:

”نہیں ہم بوس محرم حضرت جان عالم زید اللہ عشقہ محبت نامہ موت غنا مد قہار سے نے ۲۱ ماہ رجب کو شل لکھیں
دلی انگلیں نہ لیا کیا اور صورتہ روح مجسم ہے جان میں حلول کیا۔ ہماری طبیعت شاد ہوئی، قیدیہ غم سے آزاد ہوئی۔ قزاق
دور ہوا دلی سرور ہوا۔ مگر صدمہ و فراق ہے اس قدر زلہ رات تصور ہے آٹھ پہر کبھی تمہارے ویر و دغاں کے تصور
میں شگ بہائی ہیں اور کبھی لب بافت کون کے وحیاء میں دیدہ نول بار سے سخت مجبور مثل عقیقہ احمد چاق ہوں
کبھی تمہارے ہر رنگ زہر دانی کے خیال میں دست و حشمت غیرت مرغان سے اپنے ماضی کا گدھ کو مارے ٹانگوں کے
لال کشی ہوں اور کبھی شیش خیال وصل کی نئی واسطے دفع فغان کے سینہ پر دھرتی ہوں۔ کئی کالک مشائش کی یاد میں
نیلیم کی طرت آنکھوں میں، سی تیگر کی چھائی ہے کہ ہر ایک آنکھ پتھر کے نگینہ سیلابی بن جاتی ہے غرض ایسا
رنگ بھائی ہے کہ جان لبوں پر آئی ہے۔ اب نہ اکامیاب، جلد تم کو لائے اور عیش و عشرت کا دن نکھائے۔ فقط
”بست و دوم شہر رجب محبوبہ سلطان عالم دیندہ نگیم“

ہندی نگیم لمبی اخترا بیکی ایک جیتی پتی اس کا بھی ایک رقم پورہ چسپ ہے مطالعہ کیجئے:

”دھرتی سرورستان محبت لکھنوی شکرستان موت، آفتاب آسمان کرم حضرت جان عالم زید اللہ حسن امانت
آنکھیں رو تے رو تے تصنیف ہو پیش تمہارے فراق میں رخسارے کھل گئے۔ انگہاری کے فراق سے میں جہن
کسی وقت پاتی نہیں، سبے فزادی دم بھر جاتی نہیں۔ سامنا ہے مصیبت کا ہر گھڑی اجل سر پر رہتی ہے کسٹری۔
تمہاری فرقت میں بیا رہوں زندگی سے بیزار ہوں۔ کچھ بس نہیں تقدیر کے ناچار ہوں تدبیر سے سیدہ غم سے
پارہ ہے ہر لمحہ دھیان تمہارا ہے۔“

کیا کون کچھ کاب نہیں جاتا لائے چپ لمبی را نہیں جاتا

محب طرح کا انقلاب آیا کہ مرغ دل کو رخ غم پر کباب پایا۔ ہمارے طرہ ہوش کو تمہارے صیاد محبت نے قید
کیا اور شہاب عشق نے کج تر ہوش کو صید کیا۔ ساجی زبان اب شہم دہن میں بیتاب ہے، گوہر عیش و عشرت نایاب
سے۔ زون جگر ہر دم جیتی ہوں، فقط تمہارے شربت وصل کی پیاسی ہوں۔ اب جلد باہر آؤ نہیں یہاں لائے
اور صبح دم ہر سے ملائے۔ فقط! ”بست و مخمر رجب ۱۲۷۳ھ دہ لائے جان عالم زید اللہ نگیم“

دیہیہ نگیم نامی کوئی مستورہ پتی جس کے کئی اتنے اخترا بیکی لکھے ہیں آپ بھی پڑھ لیجئے:

”سچا غ و دو مان خیر وسعادت شمع شبستان محبت و صداقت، آفتاب آسمان کرم جان عالم زید اللہ جمالہ محبت نامہ

نہ شمار مرقوم ہوا۔ جب کا معرفت منشی صفدر جلد گریہ روشن مارا گھر ہوا۔ خوشیہ مضمون نے گردوں صفوں کیوں سے ملنے کی، دورہ نم دیدہ منور ہونے لگا جب دیکھنا شروع کیا، کیا عبارت تھی، اشارہ اللہ کی فصاحت تھی۔ ہر فقرہ گوہر شمار ہوا، انھیں سنیں، کس دلی سے قرار تھا۔ تمہاری تحریر کیا خوب ہے، تقریر تمہاری دل کو مرغوب ہے، جذباتی ہے، حال بہت غیر ہے، ناچار در پیش ملک عدم کی سیر ہے۔ جب خط تمہارا آتا ہے، دل تھوڑی دیر آرام پاتا ہے۔ پھر بستور ہوتی ہے، بے قراری، چستہ چستم رہتا ہے، باری۔ اب جامع المتعرقین وہ دن لاسے کہ تم کو ہم سے جلد ملا۔ مئے فقط!

بست و ششم شہر رجب ۱۲۶۳ھ ملازمہ جان عالم نورنگیم

فرخندہ محل بھی اختراعی کی ایک محل تھی مگر یہ ادوروں سے زری ہوشیار تھی۔ چار پانچ رتے اس کے لمبی ہیں جن میں سے ایک رفعتیں غدا تفصیل ہے۔ یہ پہلی خاتون ہے جس نے کام کی بات جان عالم کو بھی ہے ورنہ سب محلات غافل کرتی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

..... اٹھویں کو اس مینے کی روزنیک شہید و دوسرے فوج انگریزی تقسیم کرکا توڑوں کی بگڑ گئی جنگ و جدل کی نظر گئی۔ سب فوج کوئی باغ میں عیسا شیوں کے قتل کو ایک جا ہوتی، اول سمیٹوں پر ہیبت غائب ہوتی، بگڑا ہوا فوج کو سمجھا یا، ان لوگوں کے خیال میں نہ آیا۔ آخر ان گدھوں نے کئی سو گورے نکالے اور قریب شام اس مست کو روانہ کیا، لیکن کسی نے صلح کو روا نہ کیا۔ وقت تخریز تک وہی جمع کثیر ہے، دیکھئے کیا ہوتی اس کی اخیر ہے۔ بے ڈھب ہوا یہ بگاڑ ہے، اب تو عیسا شیوں کو کوئی باغ جانا پڑا ہے۔ اطلاعاً کھا ہے آگاہ تم کو کیا ہے، اور اسے جان عالم معلوم نہیں یہاں کے اخبار ہر روز تم کو گزارتے ہیں یا اہلکار پوشیدہ کرتے ہیں، عیسا پر ابور کھو کر ہم یہاں سے تحریر کیا کریں اخبار اور حال مفصل کیا کریں انہار فقط!

شہر سوم ۱۲۶۳ھ

کنیزہ غلامہ بھی جان عالم کی ایک محل تھی اس کا بھی ایک نرے دار رفعت نظر آتا ہے :

دناؤ کی بخش گھمائے محبت، رونق افزائے بوستانِ مودت۔ دافع درد و الم حضرت جان عالم زید اللہ شہقا محبت نامہ تمہارا دلوں سے پیارا مانہ فصل بہار کے آیا، خاندن ویران ہمارا رنگ گلزار فرخار بنایا، دور سالانہ مہل کیا، ہم کو اس نے نہال کیا۔ باعث آرام دل، آشفته ہوا، خنجر طبیعت، تنگفتہ ہوا، سمان اللہ کی خوب مضامین، گھٹے گھمائے مضامین کی خوشبو سے معطر دماغ ہوا، میدان خوشی سے باغ باغ ہوا۔ گھڑی دو گھڑی توبے کی دور ہوتی، پھر وہی حالت بستور ہوتی۔ حال ہمارا یہ ہے کہ تمہارے غم سے دل مضطرب ہے، جان آتی لب پر ہے۔ رنگیں چشم حیراں سے منبل زلف پریشان ہے۔ رنگ و محن میں چین چین ہوں، صورت بل نعوزن بھل۔ ہرچند قعتہ ہجر طوفانی ہے، لیکن مختصر یہ کہانی ہے۔ اے یوسف دوران! زینما واد تمہارے بیابان محبت میں ہیں، گردن

سہر نہ نہیں اس میں کچھ فرق ہے

مرا دل تری چپا میں غون ہے

اب بحر ہے افسوس کا رواں، روانہ ہوا صبر کا رواں۔ تمہاری فرقت میں یہ عالم ہے، دل مضطرب ہے، زخم ہے
 گرچہ من بجلی اسامہ ملی چوں مجوں در برات
 سر بھرا می زلم لیکن حیا زنجیر یاست
 واقعہ مطلوبہ جانِ عالم کنیز فاطمہ بیگم

وزیر بیگم بھی جانِ عالم کی ایک محلِ مقلی۔ اس کی نظم و نثر بھی ایک دفعہ میں مقلی ہے، خوب لکھتی مقلی ملاحظہ فرمائیے،
 "سرورِ خوبانِ جہاں، داوڑِ محبوبانِ دوراں! اخترِ آسمانِ کرم حضرتِ جانِ عالم زید اللہ نورِ حسنہ!
 بیابا کہ ترا تنگ، و کست و کشم
 رنگِ آمد و دم چند انشراحِ کشم
 داستانِ تمہارے فراق کی طو لانی ہے، دریا سے اشک کی بار بار طے پانی ہے، محبوبِ طرح کی پریشانی ہے۔ چھٹا
 کھانا پینا ہے غم کی ایسی المی گھٹا کہ زور بدن کا سب گھٹا۔ زمانے کی کسی تباہی کی کہ آفت کی چھائی بدنی، سر پر
 تیغِ اہل دم بد چھائی ہے، بجلی ہلا کی خزنِ ہستی پر دکھتی ہے۔ آتشِ شوقِ دل میں بھڑکتی ہے، جانِ تن میں بھڑکتی ہے۔
 بغیر تمہارے نہیں گل، اشتیاق میں لکھتی ہوں یہ غزل سے

مرے گل پر بہن سلطانِ عالم
 مرے غمخیز بہن سلطانِ عالم
 ۱۸ ارباب وزیر بیگم

اس غزل کے ۹ شعر ہیں جو مطلع ہی کے سے ہیں۔

امراء، بیگم حضرت سلطانِ مقلی جانِ عالم کی ایک متنوع مقلی جو اپنے دفعہ میں نظم و نثر دونوں سے کام لیتی مقلی۔ چھٹے،
 "مطلوعِ نگین بیانِ بلبلِ ہزار داستان، امرنہم زخمِ دردِ عالمِ جانِ عالم! ہمیشہ سے محبت تمہاری، مدتِ مدید اور
 حوصلہ بعید ہوا کہ تحریر تمہاری جنیں آئی غمخیزِ حیرت کی نہیں پائی۔ ہم نے کئی خط نام کو بھجوائے جواب ایک کا بھی نہ ملا
 غمخیزِ دل نسیمِ حشرت سے نہ کھلا۔ میں روزِ گندے کہ ایک خطِ عشقِ سرور کے زریعہ ہم نے بھجوا یا اس کا بھی جواب
 اب تک نہیں آیا۔

معلوم نہیں یہ کیا سبب ہے
 تشریش زیادہ مجھ کو اب ہے

منا جان بھی جانِ عالم کی ایک ہمیت مقلی اس کے دورِ قے بھی مقلی تھے ہیں۔ وہی قاعلی ہے اور کچھ نہیں، کچھ حقہ ملاحظہ فرمائیے،
 "مہرِ سپردِ لہری، غیرتِ ماہِ مشتری، سرورِ دہما تے، پر غم سلطانِ عالم بلکہ جانِ عالم دہام اللہ بقاء کم انیتہ، انیتہ حیدرِ نیر
 مرقوم بہت و ششم ماہِ رمضان بھیجا ہوا تمہارا ہمارے دل و جان سے زیادہ پیارا، اہل شہر حال یعنی ماہِ شوال کو آیا اور
 آتشِ عشق کو بھڑکایا، حال تمہاری صحت کا سن کے ہمارے دل نے بڑا عطا اٹھایا۔ سیدِ خوشی سے رنگِ گلشن ہوا
 گھر سارا روشن ہوا۔ یہ حال سن کے گھڑی دو گھڑی تو خوشی کی رہی صورت، پھر زیادہ ہونے لگا غمِ فرقت۔ اب
 خیر غمِ دل پر چلتا ہے، جان جاتی ہے دم کٹتا ہے اور خدا سے ہر وقت یہ دعا ہے کہ اصدوسی مالی تم کو صحت

رکھے کیونکہ تہذیبی و تمدنی ہمارے ہمارے صحت ہے جس طرح حکیم مطلق نے عارضہ تپ تھم سے کیا دودھ ہمارا دل ہوا
مسرور اب جامع المتعقبات بحجاب ہمارے ہمارے درمیان سے اٹھائے اور ہم کو تم سے ملائے کہ دفع ہو
یہ سفاک الم پھر تم ہم کو باہم - فقط!

مرقومہ یادزدہم سوال ۱۲۴۳

امراؤ میں ایک بگم امراؤ بگم کے سوا ملتی جو جان عالم کی جیتی ملتی اس کا ایک دفتر بھی ملاحظہ کیجئے۔
”جان جان سلیمان نان سلطان انسان، عینی امراض الم جان عالم ہمیشہ رکھے اشد کمال تمہارا انگلستان عشق
کا بھول راہنہ دل دے طول اختر نشہ جرج محبت گوہر نابندہ درج مروت ہم کو لاکھ جان سے خوب
یعنی تمہارا کتب الفت اسلوب بستم شہبان کا گھسا ہوا یوسف علی خاں ہمارا کی معرفت ہمارے خاندانہ کیاد کا روشن
کرنے والا ہوا تمام گھر میں اچھا ہوا۔ احوال شوقیہ ظاہر ہوا، دل ہمارا اس کے مضامین رنگیں سے ماہر ہوا.....“
نوروزی بگم بھی جان عالم کی ایک محل ملتی اور بڑی ہی دیدہ دلبری تھی۔ ایک دفتر کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے کتنی بے تحاشہ مبارکات ہے:
”..... مصر ہوا کہ درج و نا کا گوہر اور درج و نا کا اختر باغ محبت کا شجر نخل مروت کا ثمر یعنی نامزدانی الفت نامہ
گراہی تمہارا، شوق وصال سے ملبہ مارا راحت روح ہمارا محبت کا کنا اشارہ نہ کیا ہمارے خاندانہ دل کو کبلا احوال
بنایا۔۔۔ اور بھی کسی سے خیر تہذیبی خیریت کی نہیں پائی، طبیعت نہایت ہی گھبرائی بدل غم کی ہے دل پر چھائی،
جان لب پر آئی۔“

دل بہت تیرا ہے صاب رات دن انتظار ہے صاب

یہ نمونے تھے جان عالم کی محلات کی تشریفی کے جان عالم کی سر محلات تھیں جن میں سے چند ان کے ساتھ کلکتہ گئیں بقیہ کلکتہ ہی
میں رہیں۔ ان سے جان عالم مسلسل مراسلت کرتے رہے۔ ایک خصوصیت ان محلات کی یہ تھی کہ ان میں سے بیشتر کھسی چھی موسیقی میں فانی تھے
میں شہرہ آفاق ہونے کے علاوہ شعور شعاری کا مذاق بھی رکھتی تھیں۔ چنانچہ مجھے ان میں سے بیشتر محلات کے رقعات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے
اور دو ایک امر بھی میں نے لکھے ہیں۔

جہاں تاب میرا خیال ہے واجد علی شاہ ایک ہی بادشاہ اگر انہیں بادشاہ کہا جاسکتا ہے تو ایسے گزرے ہیں جن کے محلات
میں وقت و واحد میں تین درجن سے زیادہ کھسی چھی شاعر و عود تھے رہی ہوں۔ یوں مصلحت بہت سے بادشاہوں نے بھر لئے تھے مگر ان میں کوئی
خاص بات نہ تھی۔

اس مضمون میں اب تک ہم نے تیرہ محلات کے رقعات کا اقتباس دیا ہے۔ مخزن امرا و سلطان یعنی رقعات و گیمات اودھ کے ساتھ
واحد علی شاہ کے ہیں۔ رقعات مختلف گیمات کے نام ہیں جو زیادہ تر شہر میں ان میں سے چند کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔
شیدا بگم کو گھسا ہے:

سب جان عالم ناب شیدا بگم صاحبہ نا و حسنہ و جلالہ اند تھی نامے تمہارے ایک سب ہونوں ایک شہر میں ہوں

گو ناگوں آئے، انجم اللہ دل بہادری سے فوجی وجہ کو لا کر دکھائے۔ دل شاد ہوا طبیعت میں قوت جان ناز و تنہا جان
میں آئی۔ سراپا خوب تھا، دل کو ہمارے نہایت مرغوب تھا۔۔۔۔۔ مرقوم دہم رجب ۱۲۴۲ھ
فرخندہ محل کو لکھتے ہیں:

”مزیب بخش چار بائش محبت روفی افزائے بساط امانت ثواب فرخندہ محل صاحبہ جمال باکمال ہمیشہ روز افزوں ہے
محبت نامہ تمہارا بیچ تاریخ ۲۳ رجب کے معرفت منشی صفدر آباد کاشف حالات مندرجہ ہوا، خبر محبت اشرافہ دلاور
مضطر ہوئی۔ اس نامے سے جو محبت کی کئی انگلیں خاطر پریشان نے پائی.....“

مرقوم بست و پنجم رجب ۱۲۴۳ھ

فاطمہ بیگم کو تحریر کیا ہے:

”دشک بدر شتری قدر زہرہ جمال ہر شمال، سوز نثار دہری نہاد، گل روغن بو انیس و ہدم خوبی و محترم ثواب فاطمہ بیگم صاحبہ
امم ہستی رہو، مکتوب محبت، محبوب غرہ شہبان کو منشی صفدر کی معرفت نشاۃ بخش غرہ شوال ہوا، دلی غرہ دوست
خوشی سے مالامال ہوا، شوق وصال و وجد ہوا، ذوق و کس و کنار ہائے دل در زند ہوا.....“

۲۰ رجب چارم شہر شہبان ۱۲۴۳ھ

امداد محل کو رقم طراز ہیں:

”سہان جان عالم بانی جو دستم گل رغانی عالم کے کعبہ اعلیٰ ثواب امرا و محل صاحبہ باوہ محسن لازمہ سے سرشار
اور غریب گیر نے مشکلیں تمہارا غیرت و جبین و تازہ ہے، کاشتہ تن سے غیرت طلال جہل، صدر و مفاہرت سے غریب
بدر و کمال ہوں۔ فضل بہار نے نیانگ و اللہ دکھایا ہے۔ باوہ مر مراد انگلیں سے غم و شست کھلایا ہے۔ تمہارا بے
گل رخسار یعنی اختر جگر افکار ہوش و حواس سب بھولا ہے.....“

۲۰ شہبان ۱۲۴۳ھ

مناجیان کو مخاطب کرتے ہیں:

”جان جن راحہ مستوحان و دل مند دل در مضمحل باعث آبادی شہر عاشقان بہار ریاض و چمنستان ساجان تفریح بخش
غریب خاطر اختر مضطر ہو۔ خطہ تارا دل سے عزیز جان سے پیارا بست و یکم شہر حال معرفت کنز اللہ و دل بہادر کے کلید
تقل مسرت ہوا، منظومات مندرجہ بالا سے دریافت ہر ایک حال ہوا.....“

مرقوم ۲۳ رجب ۱۲۴۳ھ

یہ تھا جان عالم کے نثر کے رفعت کا نمونہ، اب ذرا ان کے منظوم رفعت کے چند نمونے بھی دیکھ لیجئے۔

ملکہ بیستین کے نام چار رتے ہیں جن میں سے تین فتویٰ کے طور پر لکھے گئے ہیں، ایک فقہ البتہ نقیہ تالیف ہے ملاحظہ کیجئے:

محب حسن و جوانی لطف دل راز و انیس اسفندہ محبان
طالب جام وصال بادشاہ سیم تن ملکہ تیس جو میری محبان

ناثر نامی جو پہنچ آپ کا کیا اٹھایا قلب نے لطف بیاں
 اسے مری بلقیس تاج تخت ہند تیرا مقتول ہے سلیمان جہاں
 جان دول تو ہے کبھی سے کلام ہے باغباں میں اور تو ہے گلستاں
 فرق فرق محسن تو میں پاسے عشق تو ہے معشوق اور میں عاشق بجاں
 غیرت زہر ہے تو ناہید رسال نام میرا اختر ہند وستاں
 ماشا اللہ تم پر تو نا نہیں پیر میں ہوں اور جہاں میں تم جواں
 سہاگن بیگم کے نام بھی تین رستے ہیں جن میں سے یہ ایک بڑا لطیف ہے ۔

شب ہر وہ صبا مخزن زرا برکرم مہدی جانی مری ہمد و مری بیاری ہمد
 یوں جواب اس کا ظلم سے لکھے جان عالم گوش دل سے سنو ذرا بہاگن بیگم
 ناثر نامی مجھے پہنچ اس لئے ہو جہیں ہوا مضمون نہاں سارا حیاں خوش کامیں
 ملقت اب ہوسے حال پر تم دل سے میں بیاں کہتا ہوں تم گوش ای حریصے سنو
 سادہ اقرار سند کب ہلاکے ہو و گواہ نہ کوئی اس میں قسم اور نہ حلف خدا شدہ
 فل ضمانت ہو تم ہارہ اما میں کی اگر وہ لکھا کجے گا کج جان جہاں یہ اختر
 بے قسم ہوسے جوا قرارہ اقرار نہاں جو لگاوٹ سے بری ہو و طرحدار نہاں
 ترکو منظور اگر وصلت اختر ہوگی تو گواہی بھی یہ قسم ناسر کے اوپر ہوگی
 چو چکا سن تیرا آپ کا ماشا اللہ قول حافظہ کس جاپے حاضر ہوں گواہ
 بعد اس قول کے البتہ محبت ہوگی اتنی ہو وے گی خوشی جتنی اطاعت ہوگی
 گیا حویں کو نہیں اس چاند کی بلالوں گا میر رخ سے زرخور شید کو شرمائل گا

کیسہ محسن پر از سیم محبت بادا

بہم اللہ زینین تو سیکے شہزادہ

مصورہ بیگم اختر بیاری کو بڑا مبارقہ لکھا ہے جس کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں ۔

میر مصر خوش رُو عزیز جہاں چراغ چمن بلبل بوستاں
 بہار گلستان شہوہ گری حبیبہ جلیبہ حسینہ پری
 تو مجبور بہ سلطان کی ہے اسے پری ملی بھر کو تجھ سے اک برتری
 وہ نواب اختر بیاری ہے تو یہ ثابت ہوا بس ہماری ہے تو
 جو مصورہ بیگم ہوا نام نیک نظر آیا سو نامداروں میں ایک

ارے ارے پری زاد بہر سدا
بھلا نہ دل سے مجھے تو ذرا
یہ کلکتہ ہے بے دناؤں کی کان
کہا مان شکوہ ترک بری جان
میں تجھ سے الفت ہے اے ماہ خو
کہیں گے اگر ہوں گے ہم رہو بد

سہر زلف مار سیہ تاب بار

دل دشمنان در نظر آب بار

اکلیل محل کے نام بھی دور قفسے ہیں، ایک تو طولانی اور لایینی ہے مگر دوسرا غنیمت ہے جس کے چند شعر نقل میں ہے

پری رو نیک طہیت مرغا خوش مرزجان
جو فنا ز جہاں اکیل فرق جان عالم ہے
سے وہ تاقامت یا لعلی باغ دنیا میں
گل خوبی ہے سرور اسے نظر مہم ہے
سلج نیک جو دی لعلی محبت نہ کی گئے
وہ بھول ہے لب کو ہوائے کچھ نہیں تم
جواب اسکا جس دن ہو بھول گا وہ تم کو
اپنی قفسے دل شاد میرا شادو تم ہے

شباب محل کے نام پانچ شعر کا منظوم رقعہ بڑا مزے دار ہے۔

آج میں نے یہ سنا مجھ کو بھلائی ہو تم
نہیں معلوم کہ کیرن عشق جاتی ہو تم
میں ہی ہوں کدہری توں گفت گئی نہیں
صاف ظہر ہے جواب جھٹی مجھ سے نہیں
ورنہ فاش غفلت کو نہ یوں ٹانٹیں تم
اپنے عاشق کی محبت کو نہ یوں ٹانٹیں تم
کیا کہیں کسی ہے شرمندگی تجھ سے ہم کو
سہر پھرا زہ چڑھا بھول گئے سب ہم کو
اٹھیں اب چارائیں توں سے سر کی قسم
تیسے ساتوں کی دہلی کی سے گھر بھری قسم

کھڑک کے نام کے قفسے میں چند شعر بڑے مزے کے لکھے ہیں۔

جوانی کی باتیں ہیں یاد ہیں
ہیں صید ہیں آپ صیاد ہیں
مقر اپنے مزے سے ہوئی تھیں جو تم
قسم کھائی تھی جب سے ہیں ہوش گم
نہیں کچھ بھی اپنے کئے کا علاج
زمانہ ہوا طول بدلا مزاج
مداوائے درد جگر اب کہاں
وہ اگلا سا نفع و ضرر اب کہاں
جو سودائے الفت ہے اب خام ہے
ترا پختہ کاری میں بھی نام ہے

دل آباد بیگم کو ایک دفعہ میں اپنی دوا سیر کی تکلیف بڑی تفصیل سے لکھی ہے۔

جو استاد ہوں تو نہیں ہے قرار
جو بیٹوں تو بے چین اس سے سوا
جو خاموش ہوں تو اچھتا ہے جی
جو چٹاؤں الفاظ ہوں مہمالت
جو بیٹھا تو دل کو تڑپ لے نگار
جو ٹپوں تو طاقت نہیں ہے ذرا
جو سیدنا چلا بہروی میں کمی
جو چپ ہوں تو کتا ہوں کر کوئی بات

ہے بے شائبہ ترضی کی قسم
جو ہوا مجھ میں بر نہ آئے مراد

نہیں اچھا بہت ہمارا مزاج
ہے تھیں سے مجھ کو مصیبت بہت
بھٹتا ہوں جگل گلستان کو
نہیں کرتا دود و دوس میں کلام
زبان دوا سے سنا الامان
ایک کام کرتی ہے شمشیر کا

اے رونق باغ خوش کلامی
اے کوس پائے زہد دم
دل سے بھی ہے بڑھ کے تو گرامی
بر سے ہر روز آب رحمت
خوش ہو گئی پڑھ کے جان انگلیں
معموم ہوئی وہ ہم کو صورت
بر آئی ہماری سب نعمت
ہر داغ جگ تھا میرا آلا

انشاء اللہ اے سمن بر

ہوتا ہے جلد تم کو بہت

دل آباد سیگم حسد کی قسم
جو دیر دے میں جاؤں ہم آئے ہاؤ

بہا نگیز نگیم کو بھی بوا سیری کا دکھڑا سنا ہے

بہا نگیز سیگم سر سخت و تاج
بوا سیر نے کی ہے شدت بہت
کسی وقت راحت نہیں جان کو
دوا و دعا رات دن صبح شام

دوسے اشتداد میں میری جہاں
جلتا ہے شعلہ بوا سیر کا

خافان محل کے نام بھی ایک رقعہ بڑا لچپ ہے

اے سرور ریاض نیک نامی

اے گلشن فوہسار عالم

خافان محل سے نام نامی

اللہ تجھے رکھے سلامت

پہنچا جو فیقہ خوش آئیں

منظور ہوئی تھیں جو قربت

اے جان ہاں برت اعلا

دوری نے تری تھا مار ڈالا

شہزادہ نگیم کو بھی بڑا لطیف رقعہ لکھا ہے

اے جان جہان و جان سلطان

تہمت ہے مجھ پر بھوٹ پیاسے

ہاں شکوہ عشق میں کروں گا

جب آنا ہوں تو نہیں ہوا

آنکھوں میں جب لکھ آئیے گا

تحقیق کرو بلا کے جہاں فی

اے ہرقت و نگار جہان

بے جا ہیں تمہارے وہم سارے

الزام تمہارے سر دھوؤں گا

اور دور سے باتیں ہو بہت

کب تھوہ عشق لایے گا

کس نے تمہاری قدر جانی

لگاؤ نہ ہوئے جس سے انہی تھکت نہ رکھو تم اس پر ہر آن
اب ختم ہے اے نگار نامہ ہر شعر ہے ایک کار نامہ
تم راضی ہو جب تو ہم بھی ہوں شاد
اللہ ہمیشہ رکھے آباد

تصویر محل کے نام ایک طویل رقعہ لکھا ہے جس سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :-
یہ سب اہل کلکتہ دیوانے ہیں تو ہے شمع سب کچھ پروانے ہیں
تراول دکھایا ہے کس ماہ نے زرخ داغ پایا ہے کس ماہ نے
کہا میں نے تصویر ہے اس کا نام کہ پر یوں کی افسوس ہے وہ مرہم نام
اے اس قدیم سے نفرت ہے یار ہٹاتی ہے سنت میں جو کرتا ہوں یار
جو ہزارہ لیٹوں تو کرتی ہے پشت جو میں نرم ہوتا ہوں وہ ہے پشت
مرا دل ہے تنگ سے بھی فزوں جو گھٹوں تو ہوتا ہے اس کو جوں

جو روئی تو ہنستی ہے ہر بات پر

وہیں طعن کرتی ہے ہر بات پر

کیا کہ جس بیگم کو حسینی خانم نے محل دے کر رافضیہ کو دیا تھا اس کی معافی میں ایک رقعہ لکھا ہے :-
بہاؤتین کو کاؤس بیگم حسین دغوش قدوم راز و ہمد
پس از بس دکان عشق بازی جہاں جو تم پر ساری جھلازی
کیا آنے کو تم کو منع کس دن نکلیں گھر میں تمہارے غم میں گل گن

عجب ہے لعل ترانے پر پی نادر

زودست جھلازاں بہت فریاد

منصور محل کو بھی بڑا اچھا رقعہ لکھا ہے :-

منصور محل ہماری پریا اللہ رکھے تہا را جہلا
من بعد مذاقی ہسکداری گوش دل سے سنو ہماری
تخریق ہماری اے گل تر پہنچی ہے حضور شاہ اختر
احوال جو تھا کھلا وہ ہم پر چوروں کا یہ غنجد تھا کیر
تم نہ جو بہشت نہ اے پری زاد وہ چوہ ہیں تم ہو رشک شاد
ہوگا وہ ہسان بھر میں رسوا دیوے کا خدا تمہیں بھرات
انشاء اللہ بعد چہ سلم چوروں کے طبعی ہوش ہو نہیں گئے کم

اے نامزد شوق آؤ کے جہاں
جلدی سے جواب نامہ لانا
اے بندہ عشق چیل ہوا ہو
اے خاک تلاش سیخ پا ہو
چل چل ہوس تلاش افتر
پہنچا دے یہ نامہ یار کے گھر

یہ تھے واجد علی شاہ کے رقصاتِ محبت کے نام ایک رقعہ حکیم شفا المالدولہ کے نام بھی اتفاق سے مل گیا ہے جس کا پتہ
سے نقل کر کے سید محمد فاروق شاہ پوری نے "زمانہ" بابت ماہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۰۸ء میں چھپوایا تھا۔ یہ رقعہ اکتیس شعر کا ہے اس میں سے
چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

بخت کے قابل نہیں میرا رمان
درد زنداں سے نہیں حاصلِ فراغ
ہر اک شوجھی ہے موقع پر مجھے
بیل غم نے دے دی ہیں پر مجھے
گوشتِ دل سے میں اسے توڑنے لے گیا
پھر کھنا شاہ کو اپن حبیب
بخت نصیب کے فزین تھا رانیال
کافر و مرتد وہ تھا یہ خوش نصیب
تا بہرگ اس نے بنا اس کا ساتھ
مذہبِ اثن عشر کے شاہ کو
کب غلاموں سے لکھ نہ چھٹ گیا
کون سے مالک کا بھگا ہے غلام
حق کے ہمراہ بہت گویا تھا
دنِ مصیبت کے اثر پر پڑے
یہ نورِ زنداں تھا فقط لے مہر ماں
بلکہ حق یہ ہے کہ حق کی بات نفی
جاں سے پیارا جان کرے قدر ماں
ہم کو چھوڑا قید خانے کے لئے
گر بھی طرزِ رفاقت ہے تو دوا
جو ہو مملوک اس کو پیاری جان ہو
رکے پھر دلا دے ہر اسے عجب جواب
اور جو یہ کی ہو غرض بجز تیرے نہ ہو
بوزنِ تیرا سب خدا فرمائے گا

درد زنداں سے نہیں حاصلِ فراغ
بیل غم نے دے دی ہیں پر مجھے
پھر کھنا شاہ کو اپن حبیب
کافر و مرتد وہ تھا یہ خوش نصیب
دستِ صادق سے چھوڑا اس کا ساتھ
تو نے چھوڑا قید میں اس کو
کون ہی سیلی سے مجز چھٹ گیا
بھاگ کر پایا ہے کس نے نیک نام
بھرنا چاہی سے بیڑا پار تھا
کس طرح اصحاب ہیں دل سے ٹھے
اس میں تو ہرگز نہ تھا جاں بازیان
جو نفی حق کی نفی سب اثبات نفی
لکھتو تم ہو گئے دم میں رواں
آپ جہا پہنچے زمانے کے لئے
آپ کا مالک نہیں ہے بادشاہ
دعویٰ مسلکی پھر ہر اک ہو
کب بھنا نہیں گئے اس کو شیخ و شاہ
میں نے تو کھنا لکھنا سب سنو
ماں کے دونوں کو جب ہوائے گا

اس سے بہتر ہے زیارت کیجئے وعدہ مشہور سے محبت کیجئے

یہ طیارہ اسی قسم کے لاطینی اشعار سے بھرا ہوا ہے جس سے اختراپا کی موزونی طبیعت کا پتہ تو پلٹنا ہے مگر لطافت و فنِ رانی کی قلعی بھی کھل ساتی ہے۔

واجد علی شاہ اگرچہ برائے نام شاہِ اودھ رہے اور کچھ ساری عمر قیدِ رنگ میں گذاری مگر کشمیر اور دہلی میں اپنا گز و سکہ جاری کروایا۔
 بنگال، رنگون، بمبئی آج جتنے اردو پوسٹے والے ہیں وہ اسی عابد علی شاہ کی رعایا ہیں اور جو فروغ ان مقامات پر اردو کو ہوا اسی قیدی بادشاہ کی دھڑ سے ہوا۔ علامہ علی حیدر نظم طباطبائی، مولانا عبدالمجید شمس، عابد مرزا، عظیم ریختی گودا جلد علی شاہ ہی کے تربیت کردہ اور طبیبانِ برج کے کھانہ پروردہ تھے جنہوں نے ساری عمر اردو کی خدمت میں گذاری۔

قطب شاہی دور میں اردو ادب کی رفتار

نصیر الدین شاہی

✓ اندھرا پرورش میں قطب شاہی بادشاہ ۹۲۴ھ (۱۵۱۸ء) سے ۹۸۶ھ (۱۶۸۰ء) تک شان و شوکت، کمزور، عدل و انصاف اور رواداری کے ساتھ حکومت کرتے رہے۔ ان کے زمانہ کی مختلف ترقیوں کا تذکرہ اس موقع پر ہوتا ہے۔ دوسری ترقیوں کے قطع نظر علم و ادب کو بھی ترقی ہوئی۔ جو کہ یہ معلوم ہے کہ قطب شاہی کی عام زبان تنگی اور اردو یعنی عربی تہا سی میں بھی اصحاب علم و فن کی جولانیاں ہوتی تھیں۔ اگر قطب شاہی دور تنگی زبان کا سنہرا دور کہا جائے تو غلط نہیں ہو سکتا۔ اس طرح عربی و فارسی ادب کی بھی ترقی ہوئی۔ میں مختصر طور پر اردو کی ترقی کا حال گوش گزار کرتا ہوں۔ اگرچہ وہ کن میں اردو کا آغاز قطب شاہی دور سے پہلے ہو چکا تھا مگر ابلی حیثیت سے قطب شاہی دور میں جو ترقی ہوئی وہ بڑی تابناک اور روشن ہے۔ قطب شاہی بادشاہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کے باعث اردو نظم و نثر کے شاہکار مرتب ہوئے جو آج تک باقی ہیں اور ان سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔

قطب شاہی بادشاہوں میں سے آخری چار بادشاہ یعنی سلطان محمد غلی قطب شاہ، سلطان محمد عبداللہ اور تانا شاہ ذکر کرتے ہیں اور ادب کے سرپرست تھے بلکہ خود بھی صاحب کمال شاعر تھے۔ خصوصاً سلطان محمد غلی قادر الکلام شاعر تھا۔ اس کی شاعری کا حال آپ اس جلسہ میں سماعت فرمائیں گے۔

✓ قطب شاہی دور کے جن شعراء اور نثر نگاروں کا اب تک پتہ چلا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

شمار	نام	تصانیف	سنہ تصنیف
۱	غلام خیالی		
۲	فیروز	غزلی تصنیف نامہ	قبل ۱۰۰۰ھ
۳	محمود		
۴	وجہی	غزلی قطب نشری	۱۰۱۸ھ
		سب رس	۱۰۴۵ھ
		تماج الحقائق	
۵	محمد غلی قطب شاہ	کلیات	۱۰۲۵ھ

شمار	نام	تصانیف	سنة تصنیف
۱	احمد	لیلی الخجولی	قبل ۱۰۰۰ هـ
۲	محمد قطب شاه	فخری مصیبت اهل بیت	بعد ۱۰۲۵ هـ
۳	غواصی	کلیات	۱۰۳۵ هـ
		سبب الملوك و بدیع الجمال	۱۰۴۹ هـ
		طوطی نامه	
		چند او دورک	
		کلیات	۱۰۵۰ هـ
۹	حسن شوقی	قصائد و غزل	بعد ۱۰۳۵ هـ
۱۰	عبد الله قطب شاه	کلیات	۱۰۶۵ هـ
۱۱	قطبی رازی	نظمه النصارح	۱۰۴۴ هـ
۱۲	عاجز	لیلی الخجولی	۱۰۴۰ هـ
۱۳	سلطان	کلیات	۱۰۵۰ هـ
۱۴	بناتی	نور نامه، معراج نامه	۱۰۶۵ هـ
۱۵	جنتیدی	نزهت سیکر	۱۰۶۴ هـ
۱۶	ابن شطی	پیر بن	۱۰۶۶ هـ
۱۷	طبعی	قصه بهرام و گل اندام	۱۰۸۱ هـ
۱۸	اولیا	قصه ابو شح	۱۰۹۰ هـ
۱۹	یادگار علی	گلشن سوزا	۱۰۸۰ هـ
۲۰	ابو الحسن تاناشاه	دیوان	
۲۱	محب	مجموعه غامط	
۲۲	نواص	قصه حسینی	۱۰۹۰ هـ
۲۳	غلام علی	پداوت	۱۰۹۱ هـ
۲۴	سیدیک	جنگ نامه	۱۰۹۲ هـ
۲۵	فائز	قصه رضوان شاه	۱۰۹۴ هـ
۲۶	لطیف	نظر نامه	۱۰۹۵ هـ
۲۷	افضل	محمی الدین نامه	

شمار	نام	تصانیف	مرہ تصنیف
۲۸	شاد راجہ	سہاگن نامہ وغیرہ	؟
۲۹	حبیب	مجموعہ مرثی	؟
۳۰	کاظم	مرثیہ	؟
۳۱	شاہی	مرثیہ	؟
۳۲	مرزا	مرثیہ	؟
۳۳	نوری	مرثیہ	؟
۳۴	مولانا عبد اللہ	احکام سلاط	۱۰۳۲ھ
۳۵	میراں جی خاٹا	شرح شرح تہذیب	۱۰۷۰ھ
۳۶	میراں یعقوب	شامل التبی	۱۰۷۸ھ
۳۷	عابدستہ	فخر السالکین مرآۃ السالکین	
۳۸	فتاحی	- مفید الباقین	

تقریباً چالیس شعرا اور شکرگزاروں نے مختلف موضوعات پر اپنی تصانیف چھوڑی ہیں۔

قطب شاہی شعراء نے مختلف اعداد و شمار میں طبع آزمائی ہے۔ مثنوی، قصیدہ، غزل اور رباعی وغیرہ کے میدان کو انہوں نے اپنی خیالی آرائی کی جہلاں گاہ بنایا ہے اور چغتائی شعراء کو اپنے سدا بہا پیوں سے آراستہ کیا جس کی ہمک آج تک اردو شاعری کی فضا کو مسطر کئے ہوئے ہے۔ قطب شاہی دور کی مثنویوں کو اردو ادب میں اقسام پر منقسم کر سکتے ہیں یعنی فارسی سے ترجمہ کی ہوئی مثنویاں اور دوسری اپجی مثنویاں۔ اول الذکر کا زیادہ ذخیرہ ہے۔ فیروز کا توصیف نامہ احمد کی ملی جملوں، خواجہ کی سیف الملوک بدیع الجمال، طوطی نامہ، جند اور لک، ابرفت علی کی پھول بن، ہمیں کی ہیر، گل نغم، جنید کی ماہ بیکر، عاجز کی میلا جملوں، سیوک کا جنگ نامہ، لطیف کا غفر نامہ، بلائی کا معراج نامہ، افضل کا محی الدین نامہ، غلام علی کی پداوت، افشار کی قصیدہ شاہ، رازی کی تحفۃ النصارح وغیرہ سب کی سب فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ مگر ان شعراء نے لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ کی پیشی کر کے اپنایا ہے۔ ان کا ترجمہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ ذاتی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

دوسری اپجی مثنویاں ان میں وجہی کی قطب مثنوی خصوصیت سے قابل تذکرہ ہے۔ وجہی نے اپنے زمانے کے ولی عہد یعنی ہونہ شاہ بادشاہ سلطان محمد قلی کو ہیر وکی حیثیت سے پیش کیا ہے اور قطب مثنوی کی مستحید داستان لکھی ہے۔ شاہ راجہ کی سہاگن نامہ اور دوسری تصانیف کی مثنویاں بھی اپجی مثنویاں ہیں۔

قطب شاہی مثنویوں کو مضامین کے لحاظ سے تاریخ و سوانح، مذہب، عشق و محبت، تصوف، پند و نصائح اور اخلاق پر منقسم کر سکتے ہیں۔ تاریخی یا سوانحی مثنویوں میں فیروز کی مثنوی توصیف نامہ افضل کی مثنوی محی الدین نامہ قابل تذکرہ ہیں۔ ان دونوں میں قادر یہ خاندان کے پچھرت حضرت سید عبدالقادر جیلانی کے حالات و مناقب اور کرامات وغیرہ نظم کئے گئے ہیں۔ شمال ہند میں جس طرح خواجہ معین الدین اجمیری کے مثنویوں کی تعداد

یاد دہتی ہے اسی طرح مگر میں حضرت جیلانی کے معتقدین زیادہ ہیں۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آغاز اردو ادب ہی سے حضرت جیلانی کے حالات مناقب کی بات کیجئے گا رجحان پایا جاتا ہے۔ اگرچہ توصیف نامہ اور مروجی اندر میں نامرسل سوانح خیراں نہیں ہیں مگر پھر علی ان کو کسی موضوع کے تحت پیش کرنا ضروری ہے۔ نصرت پند و نصائح فقہ اور عہدہ اور اخلاقی شہریوں مختصر انصاف، مہارنگ نامہ، معجزہ غافلہ نامہ، مہر بیع نامہ وغیرہ قابل تذکرہ ہیں۔ ان شہریوں میں مذہبی پرہیز میں حسن اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اور اچھے کھے کو دار اختیار کرنے کا سبق دیا گیا ہے۔

جنگ نامہ، نظر نامہ، روزِ شہنشاہی ہیں۔ ان میں محمد بن حنیفہ کو بہر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان شہریوں کے علاوہ جو شہریاں عشق و محبت کی داستانوں پر مشتمل ہیں ان میں جنگ کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ واقعات فرضی ہیں مگر جنگ و جدل اور معرکہ کی خوب چھٹ بڑی پاک، مستی سے نظم کی گئی ہے۔ ان شہریوں میں واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ مقابلہ کی روش اور معرکہ کا طریقہ روحانی کا نقشہ فقہ پر دھاوا، شہنشاہ محمد کی کیفیت، بری جنگ کے ساتھ بھری جنگ وغیرہ کا حال سلیقہ سے لکھا گیا ہے۔

عشق و محبت کی جہنمیاں ہیں ان میں قطبہ شہری بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس میں قطب شاہ اور شہری کا افسانہ نظر آتا ہے۔ یہی نے اپنے تخیل کی پرواز بڑے اچھے انداز میں ظاہر کی ہے، شاعر کے کمال فن کا اعتراف کرنا لازمی ہے۔ دوسری شہریوں میں بزم کی نظمیں عمل آرائی، عیش و طرب کی چرچ، داستان، شاہد و سانی کی لکھی، جہر و فراق کی المناک، وصال کی دلچسپ روایت سانسے آتی ہے۔ ان شہریوں میں ماضی قدرت کا نقشہ بھی لکھنا گیا ہے۔ صبح و شام، طالع و غروب، جنگ و بیابان گل و گلزار، بہار و خزاں، سمندر اور ریگستان کی عکاسی بڑے اچھے طریقے سے کی ہے۔ گویا اسلئے منفرد فوٹو لکھوں کے سانسے آجاتا ہے۔

ان کی شہریوں میں سلسل بیان کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ مربوط ہیں۔ ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ ملتا رہا ہے۔ کیونکہ اور اتحاد و تکرار کے لحاظ سے ان کو کامیاب کہا جاسکتا ہے۔

عشقیہ شہریوں کے قصے اکثر ایسے ہیں کہ عاشق معشوق سے کہیں خواب میں یا تصویر یا کسی نقشہ میں دوچار ہوتا ہے اور پھر اس کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ مصیبتوں کو جھیلنا، پریشانیں ہٹانا، دشت و بیابان کی خاک پر پائی کرنا، ملکوں ملکوں کی سیر و سیاحت کرنا، سحر و جادو میں پھنسا رہوں اور پریوں سے معرکہ کرنا، طلسم کشائی کرنا ہوا منزل مقصود پر پہنچ کر کامیاب ہونا اور اپنے دیس کو واپس واپس دیتا ہے۔

ان عشقیہ شہریوں میں جہاں جنگ و جدل کی روایت ہے وہاں روزمرہ معاشرت کا حال بھی درج ہے۔ ان سے اس زمانے کے رسم و رواج اور لوگوں کا ہنسی چلنا ہے۔ اس وقت کی تہذیب، شائستگی اور معاشرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

شہریوں کے دوسرے لازم کے لحاظ سے ان کو جانچا جاتے تو واضح ہوتا ہے کہ ان کے یہاں نقص بہت کم ہے۔ انہوں نے کسی جو کوہم نہیں چھوڑا۔ جو بیانات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ حسن و زینب کے عیار سے رکھا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے سالار کو مددگی سے زینب دیا ہے اور تاملیت کے ساتھ واقعات کو مربوط کیا ہے۔ ان سے ان کی نکتہ سنجی کا ثبوت ملتا ہے۔

بہر حال دو قطب شاہ، یہ شہریوں کو بڑی زلفی برہی اور آج تک ان شہریوں کو اردو کے ذخیرہ میں بلند مرتبہ دیا جاتا ہے۔

نادرخوں سے: اس امر کا بخوبی ثبوت ملتا ہے کہ وہ دکنی شہزاد نے قصیدوں کا بڑا ذخیرہ مرتب کیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ کی دست برد سے قصیدوں کا بڑا حصہ ناپ ہو گیا ہے۔ ہم کو صرف سلطان محمد علی قطب شاہ اور غرضی کے قصیدے ہی ملتے ہیں۔ ان میں قصیدہ دلی کے دو سے لاکھ ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے قصیدوں میں نعت، مناقب، مدح حضرت علی، ماتم حضرت امام حسین علیہ السلام اور بادشاہ کی مدح میں

بروز قبل دکھائی ہے۔ قصیدہ مدح میں قیید کی خوبی، گریہ کا شوق، مدح اور ستائش میں خیالات کی بلندی قابلِ داد ہے، دعا پر یہ ختم ہوتے ہیں قصیدہ میں تشبیہوں کی خدمت، امتقاروں کی صفت، خیالات کی بلندی، مضامین کا طموح، الفاظ کی شان و شوکت موجود ہے۔

جس زمانہ میں دکنی شعراء نے غزل گوئی کا آغاز کیا تھا اس وقت فارسی شعرا کے تین طبقے گزرجے تھے۔ ردی، اسدوسی، فردوسی، خاقانی، الوردی، نظامی، سعدی اور حافظ کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ان کی غزلیں ایران سے نکل کر ہندوستان اور دکن تک پہنچ گئی تھیں اور خود ہندوستان میں خسرو، حسن، ظہوری اور کلیم کی زمرہ خروانی نقاشیں گونج رہی تھیں۔ ان لوگوں کے کلام نے جو حسن و عشق کی رونمائی سے لبریز اور محبت و الفت کی داستان سے معمور تھے دکن کے غزل گو شعراء کے لئے نمونہ کا کام دیا۔

غلب شاہی دور کے جن شعراء کی غزلیں اب تک ہدست ہوتی ہیں ان میں سلطان محمد قلی، سلطان عبداللہ، غلامی اور شاہ سلطان کی غزلیات شامل ہیں۔

غزل اپنی ساخت کے لحاظ سے بہت سارے موضوعات پر لکھنے کی اجازت دیتی رہی ہے۔ مذہب، اخلاق، سیاست، شاعری سب کچھ غزل کے موضوع ہوتے ہیں مگر اس کا غالب رجحان عشق و محبت ہے، اس لئے غزل کو تنزل کا دوسرا نام بھی دیا جاتا ہے۔ دکن کے ابتدائی ہندو غزل گو غزل گوئی جتنی وہ اصیبت سے دور ہوئی تھی۔ ان کا مشق اکثر و بیشتر فرضی ہوتا تھا یا پھر بازاری، لیکن دکنی شعراء نے جو غزل سراہی کی ہے اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ انہیں نے اصیبت کو نافذ سے جانے نہیں دیا، خصوصاً سلطان محمد قلی اور سلطان عبداللہ نے جو رنگین مزاج اور عاشقانہ طبیعت کے مالک تھے۔ چونکہ شاہی قصروں اور اہل ان بلکہ خود گوگنڈہ اور شہر حیدر آباد و حسن اور رعنائی کے مرکز تھے اس لئے فرضی مشق کی ضرورت نہیں تھی۔

سلطان محمد قلی اپنے بچپن سے ایک عاشق مزاج اور ہندو مشرب شاعر تھا جس کی ابتدائی زندگی سے لے کر مرنے تک مشقوں میں بسر ہوتی۔ سلطان محمد قلی ہر ایک ملک اور ہر مذہب کی عورتیں جمع تھیں، اگر ان میں دکن اور گجرات کی نازک بدن اور گل انعام پانپل کی فراوانی تھی تو وہیں ایران اور ہندوستان کی گل رعنا اور گل رخ سروں کا بھی بگھٹ تھا۔ ہر وقت عیش و نشاط کی فصل گرم رہا کرتی، گوشِ شہر فزائی، مرغ کو مسرور کرتی، قطب کو مسرور پہنچاتی، مے تاب کے دورہ ہوش کرتے تھے۔ بقول ڈاکٹر زوراس کے رفیع الشان عمل نہ تھے بلکہ اصل میں نوبی حسن و فہم کی وسیع اور آراستہ دھیرا ستہ نمائش کا ہیں تھیں۔ ان میں کئی ملکوں اور کئی مذہبوں اور ہر وضع و قطع کی نازنین آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنے حسن و جمال کی آرائش اور زیبائش میں مصروف و منہمک اور عشق و مستی کی عجیب و غریب کیفیتیں اور جوانی و رعنائی کے بے پناہ جہش کا مظاہر کرتی رہتی تھیں۔ سلطان محمد قلی کی غزلوں میں نہ صرف عشق و محبت کی رونمائی مشق کے سراپا یعنی حسن و عشق کی شیریں اور پُرکھٹ تھیں، دانگلے کاغذ اس نے وصال کے پُر کیف و سرور مرقع ایسے جویاں الفاظ میں پیش کئے ہیں کہ کسی معرور کو کبھی ایسی عریاں فوٹو پیش کرنے کی قدرت حاصل نہیں ہو سکتی۔

راز و نیاز کا کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جو سلطان محمد قلی کی جولانی قلم سے چھوٹ گیا ہو۔ اسی طرح اس کے ذرا سے سلطان عبداللہ کا دور حکومت بھی اس کے نام کی یاد تازہ کرتا تھا جب بادشاہ اس قسم کے ہمدانی پسند ہوں کو ظاہر ہے کہ اہل ملک بھی حسن و عشق کے میدان میں جولانیاں پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تاریکوں سے پتہ چلتا ہے کہ چالیس ہزار شعراء اور ماہر موسیقی اس زمانہ میں حیدر آباد و گوگنڈہ میں موجود تھے۔ ہر حال غزل گو شعراء کے لئے خیالی اور فرضی مشق کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ وہ

حقیقت لگائی کرتے ہیں۔

غزل کی شہنشاہ اور ارتقا اور مقبولیت کا ناقض نہ جاننا چاہئے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ غزل اس وقت مقبول عام ہوئی اور پسند کی جاتی ہے جبکہ وہ عاشقانہ جذبات کی ترجمانی کرتی ہو۔ جن اشعار میں محبت کا عنصر غالب ہوتا ہے وہ بہت پسند کئے جاتے ہیں۔
 قطب شاہی غزلوں میں یہی پہلو نمایاں رہا ہے کہ اس حمد کی غزلیں غم جاناں کی تفسیر کرتی ہیں۔ غم بعد ازاں غم ان کی غزلوں میں نہیں ملتا۔
 جیسا کہ مذکورہ کیا گیا ہے غزل کا جو ذخیرہ ہمدست ہوا ہے وہ سلطان محمد قلی، خواجہ سلطان عبداللہ اور حضرت شاہ سلطان کا ہے۔ ان میں ایک عرف عشق مجازی کی داستان سنائی گئی ہے تو دامن عشق کا بھی رجحان ملتا ہے۔ خود سلطان محمد قلی کا بیان ٹاکٹر زور کے اضافہ میں سننے کے قابل ہے،

”میرے عشق مجازی کو دیکھ کر نقاش ازل نے مجھ پر رحم کیا۔ مجھے استاد نے ایک اور ہی تعلیم دی اور میں نے کچھ دیکھ کر ہی زنا را باندھا ہے۔ میرے دل میں جو درد ہے اس کو اغیار نہیں سمجھ سکتے۔ میں اپنے عشق کو کب تک چھپاؤں جب کہ منصور کا عاشق بھی اس کو چھپانہ لگا“

خواجه حافظانہ مرغیام کو بعض اصحاب نے غزلیات بقدر کثرت میں اور بعض سونی صافی تسلیم کرتے ہیں اسی طرح سلطان محمد قلی کو بھی وہی درجہ اور مرتبہ دیا جاسکتا ہے جو حافظ یا مرغیام کو دیا جاسکتا ہے۔
 عبداللہ قطب شاہ نے بھی خواجہ حافظ کی غزلوں کا ترجمہ کیا ہے اور اپنے نام کے نقش قدم کی پیروی کی ہے۔ شاہ سلطان ایک صوفی بزرگ تھے۔ ان کا دیوان تصوف سے ملبوس ہے۔ خواجہ نے بھی اپنے حمد کی پیروی کی ہے۔
 قطب شاہی حمد کے شعراء نے اصنافِ شاعری کی دوسری شاخوں یعنی رباعیات، مخمس، شمس وغیرہ اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مگر ان کی صراحت یہاں متروک کی جاتی ہے۔

قطب شاہی دور میں مرثیہ کو بھی ترقی ہوئی ہے۔ چونکہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کو اہل بیت رسالت سے بڑی محبت تھی اور وہ دل و جان سے ان پر فدا تھا نہ صرف اس کے پای تخت حیدر آباد، ملکہ اضلاع اور دیہات میں عاشور خانے بندھے گئے تھے جہاں ماہِ محرم میں مجالس عزائے ہوتی تھیں۔ مرثیے پڑھے جاتے اور واقعات شہادت سنائے جاتے۔ اس زمانہ کے اکثر شعراء نے مرثیے لکھے ہیں۔ ان کے علاوہ خاص مرثیہ گوئیوں کی ایک جماعت تھی جو صرف مرثیے لکھا کرتی اور سناتی تھی۔

سلطان محمد قلی، سلطان عبداللہ، خواجہ کاظم مرزا وغیرہ کے مرثیے ہمدست ہو چکے تھے۔ اب فواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ سے عبدالعزیز طویل کے مرثیوں کا ایک مجموعہ ہمدست ہوا ہے جو ۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مرثیے، سلام، قصے وغیرہ مدح ہیں۔
 بیجا پور کے مرثیہ گو شعراء نے غزلیات کے تحت مرثیے لکھتے تھے مگر گوگلڈ کے شعراء نے اس کی پیروی نہیں کی ہے۔ ان کے مرثیے اکثر بلا عنوان ہیں۔ لیکن ان میں اصغر کا نام، قاسم کی شادی، شہر بان کا نام، بے کس و بے بس، زینب، ظلم، دشت کو بلا کے مضامین ملتے ہیں جو اپنے سوز و گداز، سفاک عالم کے لحاظ سے اگر وہ مرثیوں میں خصوصیت رکھتے ہیں ان کے مرثیوں میں صفائی کے ساتھ نظم اور نظم اور نظم بھی موجود ہے اسلوبِ بیان کی تشنگی کے ساتھ ان میں نہ صرف مرثیہ پر ملے گا بلکہ ادبیت بھی موجود ہے۔ بعض میں سکالہ کی شان بھی پائی جاتی ہے۔ اگر غزلانہ

میں گھٹو میں شریں کو جو ترقی ہوئی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مگر کھٹی شعور نے اپنے مرثیوں میں مرثیہ پن کی جو بات رکھی ہے وہ نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ مرثیوں کی تاریخ میں ان کو طبعاً مقام دیا جانا چاہئے۔

شاعری کے بعد جب ہم شہزادگی کی طرف توجہ ہوتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ اس قطب شاہی دور میں نہ صرف قصوف، مثنوی اور غزلیہ کے مسائل اردو شاعری میں کھجے گئے بلکہ طویل افسانہ بھی ترمیم کھا گیا۔ وہی وہ خوش نصیب اور خوش قسمت شخص ہے، جہاں اس کی نظم قطب شہزادگی دونوں رسم الخط میں ملتی ہوئی ہے وہاں اس کی شہزادگی داستان سب سے بڑی شائع ہو کر ہر دو ان اردو سے خواجہ تحسین حاصل کر چکی ہے۔

قطب شاہی دور کو اردو کی تاریخ میں اس سے زیادہ اہمیت دی جانی چاہئے کہ نہ صرف شاعری کے میدان میں ترقی اور صحت ہوئی بلکہ شہزادگی میں بھی ترقی ہوئی اور پہلی شہزادگی داستان اسی دور میں لکھی گئی۔

قطب شاہی دور کا اردو ادب اپنی گونا گوں ترقیوں کے لحاظ سے تاریخ اردو میں اب ذرا سے لکھا جائے گا جس کو زمانہ شہزادگی نہیں سکتا۔ نہ صرف آخوند مرادیش میں بلکہ جہاں جہاں اردو مروج ہے قطب شاہیوں کی اردو نوازی و خوش رہی ہے گی۔

شیوہ جو امر دمی کا آغاز و اقصا

سید علی عباس خیل پوری

تیسری صدی بعد از مسیح میں یورپ کے جتنی قبائل کی بے پناہ تاخت و تاراج نے روم، الکبریٰ کی وسطِ عظمت اُٹل کر رکھی۔
تسخیرِ روم کے بعد اطالیہ کے علاوہ ہسپانیہ - گال - المانیہ - برطانیہ وغیرہ کئے۔ یوں میں بھی ونڈ ڈل - فرنگک - کانھ کلٹ - اور
برٹنی کے املا قبیلوں نے اپنی اپنی راجدھانیاں قائم کر لیں۔ مروجہ زمانہ کے ساتھ ان قبائل نے مذہب عیسوی قبول کر لیا لیکن اس
کے باوجود صدیوں تک وہ ہندوب و قدن کی برکتوں سے نا آشنا رہے یہی وجہ ہے کہ مورخین نے تاویجِ یورپ کے اس دور
کو ازمنہ تاریک کا نام دیا ہے۔ یہ گر یا یورپ کا زمانہ سجاہیت ہے۔ گیا چوتھی صدی میں یورپ کے ان اکھر قبائل میں ایک
غریب اشاعت پذیر ہوئی جس نے اُن غیب نشا نشتگی کے اصول و آداب سے روشناس کرایا۔ یہ chivalry یا
chivalry and اس کے آغاز و ارتقاء پر بحث کرتے ہوئے اسیویں صدی کے مغربی مؤرخین نے یہ
نظریہ پیش کیا تھا کہ شیرو جو انروی کی تاسیس و تشکیل ابتداً المانوی قبائل میں چھٹی قحی - عیسویں صدی کے مشرقی حقیقتیں نے اس نظریہ
کی زوید کی ہے۔ اور متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ جو انروی کی روایت کا سلسلہ ذہبی صدیاں اسلام کے جو افرادوں اور ماقبل اسلام
کے عرب شمسواروں پہنچی ہو رہا ہے۔ محمد اسلام میں اس نے قرب و ودون ہو کر باقاعدہ ایک ادارہ کی صورت اختیار کی اور مسلمانان
شام و ہسپانیہ کی وساطت سے مغربی ممالک میں اس کا شیروچ ہوا۔

پروفیسر نکلسن لکھتے ہیں :-

۱۔ عربی میں اس کا نام فروشیئت اور نقوش ہے اور انگریزی میں chivalry جواز و کرم عربی میں فنق الفارسی یا اخی کہتے

Literary History of the Arabs ۵۲ Knight میں اور انگریزی میں

” ازمۂ وسطیٰ کی chivalry کی بنیاد غالباً قبل اسلام کے عربوں نے رکھی تھی۔ جو افراد کا خطرناک ہمتا پروردانہ ہونا شہسواروں اور کیتھولک تازی قیدی جیناؤں کی مدد کرنا اور انہیں مصائب سے نجات دلانا۔ یہ تمام خیالات عربی معاشرہ کے اجزائیں اور chivalry کے نام کی طرح جس کے معنی میں شہسواروں شریفانہ نفس عالی بنی اس سے اخذ ہیں۔“

جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے لفظ chivalry عربی اصل ہے۔ عربی میں شاول تشاؤل کے معنی معنی ہیں نیزہ سے حملہ کرنا۔ رجل شہول مرد متورمہ اور نیزہ باز کہتے ہیں۔ بعد میں نیزہ بازی شہیدہ جو انفرادی کالزمرہ کی تھی۔ انگریزی کے لفظ chivalrous کا معنی ”شہسوار“ ہے۔ زمانہ قبل اسلام کے شہسوارانہ عرب نے جو انفرادی کے تین لوازم قرار دیئے تھے۔ ۱۔ ہمتاوت (ہمیت کے وقت ثابت قدم رہنا)۔ ۲۔ مروت (شجاعت اور مردانگی)۔ ۳۔ ضیافت (مہمان نوازی)۔ جو شخص ان اوصاف میں کسی ایک سے بھی عاری ہوتا تھا اس کو جو انفرادی تسلیم کرنے میں تامل کیا جاتا تھا۔ عورتوں کی حفاظت میں جان اٹا دینا لازماً مروت سمجھا جاتا تھا۔ مختصر بن شدہ کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دن وہ اپنے قبیلے کی چند عورتوں کے ساتھ کہیں سفر پر جا رہا تھا کہ ایک دشمن قبیلے کے چند سواروں نے ان پر حملہ کر دیا مختصر نے عورتوں کو ایک گھاٹی میں چھپا دیا اور پلٹ کر مہافت پر کمر بستہ ہو گیا، وہ دیر تک تنہا رستہ جنگ کرتا رہا حتیٰ کہ چند ایک کو اس نے مار گرایا باقی حملہ آور خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلے۔ اس لڑائی میں مختصر کہ کاری زخم لگے تھے لیکن وہ نیزے کی ٹپک لگائے اپنے گھوڑے پر بیٹھا رہا تاکہ دشمن پر اس کی زہر والی کاراؤں آشکار نہ ہو پائے۔ غمزدگی دیر کے بعد اس کے قبیلے کی ایک عورت قرب آئی اور اسے مخاطب کیا لیکن مختصر اپنے گھوڑے پر بٹ بنا بیٹھا تھا۔ عورت نے اس کے نیزے کی ڈانڈ ہلا کر اسے متوجہ کرنا چاہا لیکن وہ دھڑم سے زمین پر آ رہا۔ اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔

اسی بنا پر Oclaner نے مختصر کو تحریک جو انفرادی کا بانی کہا ہے۔
اس جہاں کے نامور شہسوار بلند پایہ شاعر بھی تھے مثلاً مکمل تغلی (عربی نصیبہ کا بانی) مختصر بن شدہ اور عمرو بن معدی کرب (جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے)
انہوں نے کثرت کے بعد جب جاہلی شہسوار شہسوار بہ اسلام ہو گئے تو ان کے شہیدہ مردانگی کو مزید تقویت پہنچی۔ خان کرامر نے حماسہ کے باب الہجاء میں عبد الرحمن بن اہلم کہتا ہے۔

فشاؤل بقیس فی الطعان ولا تعن۔ آخاھا اذا ما المشیقۃ سلکت

۱۔ ان میں برید بن مکتوم۔ حنیفہ بن عاتق۔ عامر بن مالک۔ بسطام بن قیس۔ عامر بن طفیل اور عمرو بن عبدود ورجو جناب علی کے ہاتھ سے مارا گیا تھا) خاص طور پر مشہور ہیں۔

۲۔ جنگ فزنا میں جس میں عربوں نے ایران کو شکست فاش دی عربوں کا فرہ جنگ یہ تھا۔ ہر شخص اپنی بیوی کی خفانت کرنے کے لئے لڑے۔ (عقد الفری)

۳۔ ترجمہ خدا بخش۔ عربک سولڈیش۔

لکھتے ہیں :-

”اسلام نے عربوں کی زندگی کو پاکیزگی بخشی۔ انھیں راست باز اور وسیع الشرب بنایا۔ ان کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا کیا اور انھیں ہمہ گیر وقت سے روشناس کرایا۔ ان میں نیکی اور شجاعت کی وہ روح بھونکی جس کے حبیل وہ فارغ عالم کہلاتے اور **knighthood** (جو انگریزی کے مثالی فونے بن گئے)“

صدر اسلام میں جناب علی مرتضیٰ اشیوہ مردانگی کے مثالی پکارتے تھے۔ قلبِ صحتی لکھتے ہیں :-

”مشورہ کے وقت صائب الرائے۔ فیصیح و بلیغ۔ دوستوں کے وفادار۔ دشمنوں سے درگزر کرنے والے علی اسلامی شرافت اور **chivalry** کا مثالی فونہ تھے بعد میں جب تحریکِ فقیان نے مختلف رسوم و نشانات اختیار کئے جو ازمنہ تاریخ کی تحریکِ جو انگریزی اور جدید سکاؤٹ تحریک سے ملتے جلتے تھے تو علی کو اس تحریک نے اپنا پہلا فنی اور جوامرہ ی کا مثالی فونہ تسلیم کیا“

جناب علی مرتضیٰ نے عرب بھر کبھی کسی زخمی یا کمزور پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ وہ بڑے بڑے نامی شجاعانِ عرب سے نبرد آزما ہوئے لیکن پہلے اور کا اختیار ہمیشہ حریف کو دیا۔ دشمن کی عورتوں بچوں اور قیدیوں سے نہایت رفق و دلاہمت سے پیش آتے تھے۔ آپ کو گناہِ محرم پر سوار ہو کر میدانِ جنگ میں نکلتے تھے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو ارشاد فرمایا اس کی دو وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ مجھے جنگ سے بھاگ نکلنے کا کبھی خیال نہیں آیا کہ تیز رفتار گھوڑا رکھوں اور دوسری یہ کہ میں بھاگتے ہوئے دشمن کا قاتل نہیں کرنا چاہتا۔

آپ عورتوں پر ہاتھ اٹھانے یا انھیں تلخ و ترش لہجہ میں مخاطب کرنے کو نہایت میسر نہ جانتے تھے۔ شامی فوج کے ایک سردار سفیان بن عوف نے عراق کے دیہات پر چھاپے مارنا شروع کر دیئے۔ ہمتے مردوں کو تہ تیغ کیا اور عورتوں کی بے عزتی کی۔ آپ نے یہ سنا تو بہت افسوس میں کیا اور فرمایا ”مجھے تو یہاں تک خبر ملی ہے کہ اس لشکر کا ایک آدمی مسلمان عورت کے گھر میں اور دوسرا ذمی عورت کے یہاں گھس جاتا تھا اور اس کے خیال۔ دست بند۔ بند بند۔ بندے گوشوارے چھین لیتا تھا۔ یہ واقعہ لشکر اگر کوئی مرد مسلمان اس غم سے ہلاک ہو جاتے تو اس پر تعجب نہیں کیا جاسکتا“

آپ کی عالی حوصلگی اور شہامت کی یہ کیفیت تھی کہ جانی دشمنوں پر تان لو پا کر انھیں معاف کر دیتے تھے۔ جنگِ جمل کے موقع پر مردان بن الحکم اور جنابِ صفین میں عمر دین العاص کو شکست دے کر ان کی جان بخشی کر دی۔ ان کے قتل سے وہ پوری تاریخ اسلام کے دُعا کو کوڑھکتے تھے لیکن آپ نے کبھی سیاسی مصالح پر شجاعانہ حوصلہ مندی اور وسعتِ قلب کو قربان نہیں کیا۔ انہی وجوہ کی بنا پر **Oshorne** نے آپ کو اسلام کا **Bayard** قرار دیا ہے اور ملازمین میں آپ کا شجاعانہ کردار ضرب المثل بن چکا ہے **لا فحق الا علی لا سیف الا ذوال الفخار**

ایران دروہم کی فتوحات کے بعد اگرچہ مسلمان سلاطین عیش کو شہ کی طرف مائل ہو گئے تھے لیکن انھوں نے شیوہ جوامرہ ی کے آداب و شعائر کو فراموش نہیں کیا۔ منصور اور مروان الرشید کے وقتوں میں عورت کا مرتبہ اس قدر بلند تھا کہ عہدِ خلافت کی شہزادیاں سر سے پاؤں تک غرقِ آہن ہو کر جہاد میں حصہ لیا کرتی تھیں۔ عباسی خلفائیں معتصم کی مثال نامزدہ حیثیت کی مالک ہے۔

سہ مشہوری اردی عربس۔ سہ خیمہ البلاء۔ سہ لہدپ کی شجاعانہ روحانی داستانوں کا ایک نمبر و۔

ایک دن سرور پاکسی نے ذکر کیا کہ جب رومی سہا ہی ایک سرحدی قصبہ پر حملہ آور ہوئے اور تاخت و تاراج شروع کی تو ایک مسلمان
دو تیزہ کو زمین پر پھینچے ہوئے دیکھے۔ اس مظلوم نے باؤڑ بلند کیا کہ کہہ دو! مصلحتاً۔ یہ سن کر مقتوم کا چہرہ جو شہر غضب سے تھا
اٹھا اور وہ فی الفور لگوڑے پر سوار ہو کر اسے سرسپٹ دوڑاتا ہوا رومی سرحد کی طرف روانہ ہو گیا۔ تاریخ کے اور افسانہ شاہد ہیں کہ
اس نے اس مدد شہزاد کی بے رحمی کا کس قدر خوفناک انتقام لیا۔

اتحاد جمہوری نے سرے سے تحریک جو انفرادی کی تدوین کی۔ غلطی جتنی، غرضی اور ابن الاثیر کے حوالے سے لکھے ہیں۔
”اتحاد نے آخری اضطرابی کوشش کی کہ خلافت کی عظمت و فتنہ کو بحال کیا جائے۔ وہ تحریک فقیان
کامیاب پرست و مہم تھی۔ **chivalry** کی قسم کی تحریک تھی۔ اس نے اسے از سر نو منظم کیا۔ اس جماعت
کے ارکان ملی تھے کہ اس تحریک کا سرسبب سمجھے تھے۔ اس میں بڑے بڑے موزین نمایاں تھے اور ان میں آل علی
کی اکثریت تھی۔ اس کے ارکان کو شہریت کے وقت ایک خاص رسم ادا کرنا پڑتی تھی اور مخصوص قسم کا لباس
زیب تن کرنا پڑتا تھا۔“

یورپ کے نیم وحشی قبائل صلیبی جنگوں میں سلطان فقیان اور جو انفرادی کے اخلاق حسنہ سے دو شاہس ہوئے تھے۔ بول ڈیورٹ
نے ایک آفریقہ میں ادنیٰ بان نے قدح عرب میں بڑی فراخ دلی سے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ تحریک جو انفرادی عرب صلیبی
کے دوران میں ہی یورپ میں پھیلی تھی۔ تی بان لکھتے ہیں۔

”مسلمانوں ہی سے ملنے جلنے کی بدولت یورپ کے عیسائیوں نے اپنی وحشیانہ معاشرت چھوڑی اور پورے
اخلاق اور اس کے کل فرائض یعنی عورتوں، بڑھوں، بچوں کا پاس قسم کی پابندی وغیرہ کو انہی سے اخذ کیا۔
ایک بہت بڑے مذہبی مصنف بار تھے، ایسی سینٹ پلر اپنی کتاب مطلقہ قرآن میں لکھتے ہیں، عربوں کی معاشرت
اور ان کی تعلیم نے ہمارے زمانہ متوسط کے اُمرا کی زبوں عادتوں کو درست کیا اور یہ سرور اور بلا اس کے کہ
ان کی بہادری میں کچھ فرق آتا ایسے اخلاق یکساں تھے جو انسان میں اعلیٰ درجہ کی وقعت اور قدر رکھتے ہیں۔
یہ امر نہایت مشکوک ہے کہ صرف عیسوی مذہب کو کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو ان میں ایسے اخلاق کیسے پیدا
کر سکتا تھا۔“

ان افسانہ آفر جنگوں میں دنیا کے اسلام نے فتوت اور جو انفرادی کے دو نہایت اعلیٰ اور ارفع نمونے پیش کئے سلطان
صلاح الدین ایوبی اور حاکم سلطان بیبرس۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کا کردار نہ صرف تاریخ اسلام میں بلکہ تاریخ عالم میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں میں
سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ مغربی اہل قلم نے اسے خراج تحسین و عقیدت پیش کیا ہے حتیٰ کہ دانستے نے بھی جو مذہبی مصلحت
میں سخت تنصیب تھا اپنی مشہور نظم نغمہ خداوندی میں صلاح الدین کو جنت میں جگہ دی ہے۔

۱۔ مشہور آدوی سرس۔ ۲۔ لکھ تہدی عرب ترجمہ سید علی بک لکھی۔

۳۔ یاد ہے کہ دانستے نے جناب رسالت مآب کو **Inferns** میں جگہ دی ہے۔

بیت المقدس کی فتح کا واقعہ اُس زمانے کے مغربی اور مشرقی آئین جو فردی کا تقابلی موازنہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ جب عیسائی افواج نے بیت المقدس فتح کیا تو مسلمان جنگجوؤں کے ساتھ اُن کے بچوں - عورتوں اور بوڑھوں کو بھی انتہائی مشکل سے طوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ بقول ول ڈیورنٹؒ ساٹھ ہزار سے زیادہ مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ مریم مقدہ کے نام لبرادوں نے ہزاروں مسلمان خواتین کی بے حرمتی کے لئے انہیں قتل کر دیا۔ ہزاروں بچوں کو بازاروں کی دیواروں کے ساتھ کیلوں سے ٹھیک کر دکھایا۔ خود ہیج مورخ تسلیم کرتے ہیں کہ اس قدر خون بہایا گیا کہ بازاروں سے گزرتے وقت گھوڑوں کے سُم خون میں ڈوب ڈوب جاتے تھے۔ اس کے برعکس جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس فتح کیا تو کئی دن فوج کو شہر میں داخل نہیں ہونے دیا شہر کے اندر ہزاروں عیسائی اہل سیف تھے۔ انہیں امان دی گئی اور اجازت بخشی گئی کہ اپنی عورتوں، بچوں اور ساز و سامان کے ساتھ جہاں چاہیں جاسکتے ہیں۔ چنانچہ وہ کئی روز تک قطار اندر قطار اپنا قیمتی مال و متاع لے کر رخصت ہوتے رہے اور سلطان کے کسی سپاہی نے اُنکھ اٹھا کر اُن کی طرف نہ دیکھا۔ آخر میں جب ملکہ سبیلہؒ اپنی خواہموں کے ساتھ باہر نکلے تو سلطان نے نصیری انیس اگے بڑھ کر اس کی مزاج پرسی کی اور افسوس کا اظہار کیا کہ ملکہ کو بڑی زحمت اُٹھانا پڑی۔ مورخین کا خیال ہے کہ سلطان نے ہزاروں جنگجو عیسائیوں کو آزاد چھوڑ کر فاش حاکم کی غلطی کی تھی مگر یاد رہے کہ مسلمان شہابیوں نے بھی دنیوی مصلحتوں کو اپنی فطری عالی ظرفی اور شہامت پر غالب نہیں آنے دیا۔ جب سلطان نے تائبریا کا قلعہ فتح کیا تو ریمینڈ طرابلسی جیسے خطرناک اور عالم دشمن کی بیوی کو نہایت عزت و توقیر کے ساتھ خاندان کے پاس بھیج دیا۔ یہ ریمینڈ وہی شخص ہے جس کے ہاتھ بے شمار مسلمان مردوں اور عورتوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔

صلیبی جنگجوؤں کا بازی اور معاہدہ کی خلاف ورزی کو آداب جنگ میں شمار کرتے تھے اور مسلمانوں کے قول و قرار کی پاسداری کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر مشہور انگریز بادشاہ ریچرڈ شیردل نے امان دینے کے بعد ہزاروں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا تھا۔

سلطان صلاح الدین کی فتوحات کو ملک انطاہر بیرس نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ بیرس اپنی شجاعت و لباس کیلئے شہرہ آفاق تھا۔ اس نے عین جاوت کی خونریز جنگ میں تائبریاؤں کو شکست فاش دی تھی۔ بیرس نے ساحل شام کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کے جتنے قلعے تھے سب یکے بعد دیگرے تہ تیغ کر دیئے۔ اُس کے متعلق مورخین لکھتے ہیں کہ وہ میدان جنگ میں شیربیر کی طرح خوفناک اور عقاب زریں کی طرح بیاک تھا لیکن لڑائی کے بعد دشمن کے زخمی سپاہیوں اور قیدیوں کے ساتھ نہایت رحم و کرم کا سلوک رکھتا تھا۔ عورتوں کو وہ بالخصوص بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اُسے عربی ممالک کا کنگ آرتھر سمجھا جاتے۔ آج بھی مصر و شام کے قصبات میں داستان گرواں کے کارنامے گا گا کر سناتے ہیں۔ اور جھوم جھوم جاتے ہیں۔ پہلے مصر کے ممالک نے ہی اپنی ڈھالوں اور دردیوں پر وہ نشانات نقش کئے تھے جو یورپ میں جا کر علامات حقانہ و ادنیٰ (Heraldic signs) کے نام سے مشہور ہوئے۔ غلبہ حتیٰ لکھتے ہیں :-

”در حقیقت ادارہ جو فردی (chivalry) کا ارتقا شام کے میدانوں میں عمل میں آیا۔ ہتھیاروں پر

لے ایک آر فیٹھ - ۲۔ بیرس ترک میں شیر کو کھتے ہیں - ۳۔ بیرس کے زمانہ کو حیرت انطاہر لکھتے ہیں -

مسلمانوں نے علامات خاندادی گنہ گرائے جو ان سے میل جول کے باعث مقبول ہوئے۔ دو سرورں والا عقاب fleur-des-bis (گل زنبق) اور دو چابیوں کا نشان اس زمانے کے مسلمان جنگجوؤں کے تمبیاروں کے نشانات تھے۔ ملوک سلاطین کی فوجوں میں مختلف دستے ہوتے تھے جن میں اقبیاء کرنے کے لئے ڈھالوں جھنڈوں اور زرد بکتروں پر مخصوص نشانات نقش کئے جاتے تھے سلطان پیرس کا ذاتی نشان ابن طولون کی طرح شیر ہر تھا۔

لی بان قدی عرب میں تھتے ہیں۔
 ”مما ایک کے لباس نہایت پر تکلف تھے اور ان کے تمبیار بہت چمکیے تھے اور ان پر وہ نشانات کھدے ہوئے تھے جن کی تقلید جنگ صلیب کے عیسائیوں نے اپنے تمبیاروں پر کی تھی۔“
 ارنسٹ باورکھٹنے ہیں۔

”جنگ صلیب کے طفیل علامات خاندادی کے اصول تمام مغربی ممالک میں ایک جیسے رواج پذیر ہوئے۔“
 مما ایک مصر کے علاوہ دوسرے ترکی قبائل میں مشرف بہ اسلام ہو کر عربوں کی تحریک فتنہ سے بہت متاثر ہوئے۔ ترکان غز کے دو قبائل بہت مشہور ہیں جو قی اور عثمانی۔ ابتدا میں یہ قبائل نہایت خوشنود اور وحشی تھے لیکن قبول اسلام کے بعد ان کی قلب ماہیت ہو گئی۔ ترکوں میں فقیان کو اخوان کہتے تھے۔ اخوان نے ملک بھر میں جا بجا اقامت گا دیں تعمیر کر رکھی تھیں جو مسافروں کے لئے ہر وقت کھلی رہتی تھیں۔ ابن بطوطہ نے دوران سفر میں بار بار ان اقامت گاہوں میں شب بانی کی تھی۔ وہ اپنے مشہور سفر نامے عجائب الاسفار میں لکھتا ہے۔

”اخوان تمام بلاد ترکمانیہ اور رومیہ کے ہیں۔ ہر بلد۔ شہر اور موضع میں ان کی اقامت گاہیں ہیں۔ تمام دنیا میں ان جیسا کوئی بھی اس قدر مسافروں کی خاطر مدارات کرنے والا نہیں پایا جاتا۔ یہ لوگ مہمان نوازی۔ حاجات پورا کرنے۔ ظالموں سے بدلہ لینے۔ ایذا رساؤں اور شریروں کو قتل کرنے میں نہایت عملت کرنے والے اور تیز دست ہیں۔ اخی ان کی اصطلاح میں وہ شخص ہے جو اپنے ہم پیشہ کو جواڑوں اور حجرہ دوگون کو جمع کر کے ایک جتھا قائم کرتا ہے اور خود ان کا پیشوا بن جاتا ہے۔ اس دستور کو فتنہ بھی کہتے ہیں۔ اخی خانقاہ بنا کر اس میں فرش کرتا ہے۔ چراغ جلاتا ہے اور تمام مایحتاج فراہم کرتا ہے۔ دن میں اپنے ساتھیوں سے معیشت میں مدد لیتا ہے۔ عصر کے وقت یہ لوگ جو کچھ کسی کے پاس جمع ہو جائے ساتھ لے آتے ہیں۔ اس سے چل اور کھانا خریدتے ہیں جس کا زاد خانقاہ میں صرف ہوتا ہے۔ اگر اس دن کوئی مسافر نہ آتا ہو زودہ سب اپنا کھانا جمع کر کے کھاتے ہیں پھر رقص و سرود سے تفریح کرتے ہیں اور دوسرے دن پھر کام پر چلے جاتے ہیں۔“

دور غزویم کے اواخر اور بعد سلطنت کے اوائل میں یہ عزیز یک تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل چکی تھی۔ آداب جو انفرادی کے زیرِ عنوان اس عہد کا مشہور اہلِ قلم شہزادہ لیکاؤس بن اسکندر اپنی کتاب قابوس نامہ میں لکھتا ہے :-
 یہ اصل جو انفرادی سند چیزِ است۔ اولیٰ آنکہ ہر چہ بگولی گئی۔ دوم آنکہ راستی خلاف نہ گئی۔ سیدہا کہ
 شکیب را کار بندگی... جو انفرادی بود کہ اور از چند گونہ ہنر بود یکی آنکہ دلیر و مردانہ بود و
 شکیبیا ہر کاری و صادق الرعدہ و پاک عودت و پاک دل و بکن نہ یاب نکند و زبان خویش از ہر
 شود و درستان خویش روا دارد و از اسیران دست بکشد و بر بے چاؤگی بہ بخشاید و بدان از
 بد کہ دن با نہ دارد و راست گوید و راست شنود و داد از تن خود بدد۔ و بر آن سفرہ کہ نان
 خوردہ باشد بد نکند و بچی را بدی مکنات نکند و زبان نیک دارد و بلا را راحت بیند ۱۱

ترکوں میں بالعموم اور ہمالیہ مصر میں بالخصوص ایک سپاہیانہ کھیل دورانِ مروج تھا جو ترکیک جو انفرادی کے شعائر میں بنیادی قیمت رکھتا تھا۔ اہلِ عرب میں یہ کھیل Tourney یا Tournament کے نام سے رائج ہوا۔ یہ الفاظ لغوی لی بآق لفظ دورانِ مئی ہی بدلی ہوئی بنو دوس ہیں۔ اس کھیل میں دو شہسوار مقابلے پر نکلتے تھے اور میدان کا چکر (دوران) کاٹتے تھے جسے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے اور جریہ پھینکتے۔ ہمالیہ مصر کے عہد میں دو گروہ ایک دوسرے کے مقابلے ہوتے تھے۔ دوران یا جریہ کا کھیل انیسویں صدی کے اواخر تک مصر میں بہت مقبول رہا۔ اسی - ڈبلیو لین برل لکھتے ہیں -

جریہ کا کھیل ترک اور مملوک جنگجو کھیلتے تھے۔ مصر صعبید میں یکسی معزز شخص کی شادی کے موقع پر کھیلا جاتا ہے۔ کھلاڑی دو جہازوں پر تپل ہوتے ہیں جو مختلف دیہات یا قبیلوں سے انتخاب کئے جاتے ہیں فریقین کی تعداد بارہ - بیس یا زیادہ بھی ہوتی ہے۔ سب کھلاڑی گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں۔ فریقین ایک دوسرے سے ہٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ درمیان میں کم و بیش پانچ سو فٹ کا فاصلہ ہوتا ہے۔ ایک فریق کا کوئی سوار سر پٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا دوسرے فریق کے پاس جاتا ہے اور مبارز طلبی کرتا ہے۔ دوسرے فریق کا ایک سوار اپنے ہاتھ میں چار - پانچ یا چھ جریہ لے کر (کھجوروں کی ٹہنیوں سے بنی ہوئی چھڑیاں جن کے سرے گندہرتے ہیں اور ایک طویل قامت کے آدمی جتنی لمبی ہوتی ہیں) مبارزت کی دعوت دینے والے کے تعاقب میں گھوڑا ڈال دیتا ہے۔ اور اس سے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اکثر وہ اس سے باز و بھر کے فاصلے تک قریب ہو جاتا ہے اور یکے بعد دیگرے اس پر جریہ پھینکتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ختم ہو جاتی ہیں۔ جریہ دونوں طرف سے گندہرتی ہیں اور ہاتھ اٹھا کر باریک جستے کی طرف سے پھینکی جاتی ہیں۔ ان سے اکثر گھوڑے ہلکے ہلکے زخم بھی لگ جاتے ہیں۔ جس شخص پر جریہ پھینکی جاتی ہے وہ اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے یا نیام میں بند تلواریں سے وار بچاتا ہے یا اس کے گھوڑے کی عبارت فاری اسے بچائے جاتی ہے۔ جب وہ اپنے ہمراہیوں کے پاس پہنچتا ہے تو جریہ لے کر اپنا تعاقب کرنے والے کے درپے

ہوتا ہے۔ یہ کھیل جو گذشتہ زمانے کے Tournament کی یاد دلاتا ہے اور جو قدیم ہندو
کا کھیل تھا افسوس نہ کہ ماری رہا ہے۔

ان اعتبارات سے یہ ثابت کہ نام مقصود تھا کہ تحریک جو افروزی مغرب میں رواج پانے سے پہلے ہر طرح اور ہر سلسلے سے دنیا کے
سلام میں یکن و مرتب ہو چکی تھی۔ اور اس کی شرائط و لوازم۔ رسوم و شعائر۔ مخصوص طہوسات۔ ذاتی نشانات۔ سپاہیانہ کھیل وغیرہ
مضبوط صورت اختیار کر چکے تھے۔ اس ادارہ کو مغربی ممالک نے شام۔ سپین۔ افریقہ سے مستعار لیا اور گیارھویں اور بارہویں
صدیوں میں اس کی اشاعت تمام یورپ میں ہو گئی۔ تاہم یہ قدیم کا یہ باب بڑا دلکش ہے کہ کس طرح شہرہ جو افروزی نے یورپ
کے اکثر حصوں کو تہذیب و دانش کی لطافتوں سے روشناس کرایا ایسے وحشی جنہیں تہذیب بنانے میں کھدسانے و دم کی
ایک ہزار سالہ پستی میں ناکام رہی تھیں جیگرؤں نے شام اور فلسطین کے میدانوں سے اس تحریک کے خد و خال کو
مستعار لیا تھا۔ ہسپانوی عربوں کے میل جول نے انہیں اس کی برکتوں سے استفادہ کرنے کے پیش از پیش مواقع ہم پہنچائے۔
ہسپانیہ کی اسلامی تہذیب اگرچہ بنیادی طور پر مشرقی تہذیب کی ہی ایک شاخ تھی لیکن بعض معاملات میں اس میں
چند ممتاز خصوصیات پیدا ہو گئی تھیں جن میں ایک یہ تھی کہ تحریک جو افروزی نے ایک ملک گیر قومی ادارے کی صورت اختیار
کر لی تھی۔ قرطبہ۔ اسبیلیہ اور غرناطہ علم و عرفان۔ فلسفہ اور فنون لطیفہ کے علاوہ شہرہ جو افروزی کے بھی شہرہ رکھتے جہاں
بقول ول دیورٹ شمال کی عیسائی مملکتوں کے رہنما اپنے بچوں کو آئینہ جو افروزی کی تحصیل کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ مورخ
Viardot لکھتا ہے "chivalry کا ادارہ اپنی تمام شرائط اور خصوصیات کے ساتھ حکم اور تصور واجب کے
عہد میں ترقی پذیر ہوا۔ بعد میں عیسائی ممالک نے اسے اپنا لیا۔"

ابن افرطیب نے بالتفصیل لکھا ہے کہ اس زمانے کی ادبی مجالس اور عسکری کھیلوں میں مسلمان خواتین نمایاں حصہ لیتی
تھیں۔ عرب شہسوار اپنے بازوؤں اور ڈھالوں پر اپنے مخصوص نشانات لگا کر اور اپنی محبوبہ کو یا ہر آدمی خود سے لہر اکیرہ بازی
کے مقابلوں میں شریک ہوتے تھے۔ فرسٹن اپنی محبوب خواتین کے حسن و جمال اور اپنے واردات عشق و شفیقتی پر رُپہ جوش فطریں کھتے تھے
جن کا جواب خواتین شعر و شہادتیں تھیں۔ اسی عہد کی شاعر خواتین اور ادب نواز درباروں کے تذکرے تاریخ کی کتب میں تفصیل سے
ملنے ہیں۔ ولادہ قرطبہ کی شہزادی اور مخنی اس کی سہیلی شہزادیاں شاعر تھیں۔ ان کی مجالس میں اس عہد کے مشاہیر شعر ادا کرتے
تھے۔ ان کے اشعار میں ایسے پر سوز جذبات اور دلہانہ دل پرستی کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ پیغوں کے لئے بھی باعث رشک
ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ زہرا بنت ابوبکر غسانی۔ حسانہ التیمیہ بنت البرہسین۔ ام العلاء شریفہ۔ عاتکہ والکلبیہ۔ الخواتین

کے Manner and Customs of Modern Egyptians جلد کے بجائے بعض اوقات بغیر کھیل کی
برچھی کی ڈانڈ بھی استعمال کرتے ہیں۔

۳۔ ہسپانوی عرب شہسوار اور جو افرو knight کو الفارس کہتے تھے۔ یہی نام شطرنج کے اس نمبر کے کا تھا جسے فارسی
میں اسپ کہتے ہیں شطرنج کے اس نمبر کے انگریزی نام knight ہے جو صحیحاً الفارس کا فعلی ترجمہ ہے۔ دوسرے نمبروں
کے ترجمے غلط ہیں جیسے فیل کا بڑبڑ اور رخ کا کاسل وغیرہ۔

ام الملتا۔ بہرہ نبت الملتی اپنے زمانے کی نغمہ گو شاعر تھیں۔ وہ شہر و شاعری کی مجلس میں بے نقاب شرکت کرتی تھیں اور شہر سنا کر مقررین سے داد دیا کرتی تھیں۔ ان کے کلام کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عشق بے حاصل کی گمناگ اور حسرت کا کبھی کیفیات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

دالستان گز قریطہ اور غزناطہ کے کوچہ و بازار میں بہادروں کے قہقہے اور ان کے مہلکتے رباب کے ساتھ گاکر سناسطے تھے۔ حمد و سلی کے مغربی Troubar Troubadour اور Trobar انہی قصاص کے مقلد تھے۔

فلپ حتی کہتے ہیں "Troubadour کا لفظ عربی لفظ طرب سے بنا ہے جس کے معنی ہیں گانا بجانا۔ ول ڈیورنٹ لکھتے ہیں "Troubadours کی موسیقی اور شاعری سلم ہسپانیہ سے پروانس میں اور سلم صقلیہ سے اطلالیہ میں آئی تھی۔"

یورپ اور امریکہ میں ایچ۔ جی۔ فارمر کو عربی موسیقی کے موضوع پر سند کا درجہ حاصل ہے۔ ان کے خیال میں بھی Troubadour کے لفظ کا اشتقاق عربی کے لفظ طرب سے ہوا ہے۔ اسی خیال کا اظہار ہے۔ بی۔ ڈنڈ نے کیا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ کے ازمنہ وسطی کی رومانی ادبی تحریک کا منبع و مبداء ہسپانیہ کی عربی شاعری ہے مغربی شاعری میں rhythm کا عنصر نرسخ اور زبل کی تقلید میں داخل ہوا تھا جو عربی شاعری کی شہرہ آفاق صفات تھیں۔ فلپ حتی نے صاف الفاظ میں تسلیم کیا ہے کہ تسلیم علیہ اور جنرل فرانس کے گز قریطہ وسطیوں اور شاعروں نے پہلے پہل ہسپانوی عربوں کے زبل کی تقلید و نقالی میں رومانی نظمیں لکھنا شروع کی تھیں۔ چنانچہ ادبیات یورپ کی حمد آفریں رومانی نظم Chauson de Rolaud موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے زبل کی ہی صدا سے باز گشت ہے۔ رومانی شاعری کا مرکز و محور شہرہ آفاق رومانیوں میں ایسے جلیل القدر فرسان (knights) کے کارنامے پیش کئے جلتے تھے جو شجاعت، خیال منی، مالی حوصلگی اور شہنشاہی سے حاصل یا افلاطون کی محبت کے مثالی پیکر جوتے تھے۔ اخلاطونی محبت کا تصور بھی ہسپانیہ کی عربی شاعری سے ماخوذ ہے جنرل فرانس کے گویے ان رومانی نظموں کو دوسا کی مفلوں میں گاکر سناتے تھے۔

ارنسٹ باہر لکھتے ہیں "نغمہ بدلاں اس شاعرانہ تخیل کی تخلیق ہے جس کی تحریک ان لڑائیوں سے ہوئی جو ہسپانیہ کے شمال میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان لڑی گئیں۔"

ول ڈیورنٹ ایچ او فیٹھ میں لکھتے ہیں۔

"الفاسفہ و ہم سلیبی کے مسودات میں کی تصاویر ہیں جن میں گویے عربی لباس پہن کر عربی ساز بجا رہے ہیں۔ ان گیتوں میں سے اکثر کی ہیئت عربی ہے۔ ممکن ہے کہ Troubadours کی موسیقی و شاعری کے ابتدائی موضوعات اور اسالیب کے ماخذ موزوں کے وہ گیت ہوں جو عیسائی زمین کے راستے جنرل فرانس میں داخل ہوئے تھے۔"

تسلیبیہ کا قومی و زمریہ نظم سید ہے۔ سید کا لفظ وہی ہے جو عربی میں سیدہ بمعنی سرور ہے۔ سید ایک عیسائی جنگجو اور زہد آزاد تھا جو اپنے جتنے کے ساتھ کبھی عیسائی اور کبھی مسلمان حکومتوں کے ساتھ بے پروا رہتا تھا۔ اس کے سپاہی اسے کہہ کر پکارتے تھے جو اصل میں 'یا سیدی' ہے۔ اس نظم میں عربی اصنافِ شعر کے اسانیب نمایاں طور پر موجود ہیں۔

ہسپانوی زبان کی سب سے پہلی کتاب جو آئینِ جرنالی پر مبنی تھی **Historia del Cavellero Cifar** ہے جو ۱۶۱۹ء اور ۱۶۲۵ء کے درمیان لکھی گئی تھی۔ **Cifar** در اصل عربی لفظ سفر ہے۔ اور **Cavellerio Cifar** کا ترجمہ انگریزی میں **Knight Errant** سے کیا گیا ہے۔ اس کی جبری کا نام **Garema** ہے جو صریحا کریم ہے۔

ایک نئے آر۔ جگ کے خیال میں فرانس کے جنوبی صوبوں میں گیارہویں صدی کے اواخر میں شاعری کی ایک نئی صنف کا ظہور ہوا تھا۔ اسلوب اور موضوع کے لحاظ سے اس عہد کی لکھی شاعری یا قدیم یونان و روم کی شاعری میں اس قسم کی روایت اپنید ہے۔ اور یہ صریحا ہسپانیہ کے عربی زحل سے متاثر ہوئی ہے۔ اس میں ایک قسم کے مسلکِ نسائیت (cult of the dame) کے آثار ملتے ہیں جن میں عورت کو نہایت ارفع اور رفیع مقام دیا گیا ہے۔ اس صنف میں عشقِ ناکام کے جذبات نہایت اچھوتے اور شگفتہ اسلوب میں پیش کئے گئے ہیں اور محبوبہ سے ایسی جنون آمیز شیفٹل کا اظہار کیا گیا ہے کہ مجازی محبت میں عارفانہ اور متصفانہ واقفگی کی کیفیات رچ بس گئی ہیں۔ غماز ہے کہ اس زمانے کے نیم وحشی اور اجدادِ مغرب عورت کو محض کنیز سمجھتے تھے۔ مذہب متقدمانہ مذہبِ عیسوی کے نزدیک وہ مصیبت و اہلیت کا پیکر محترم تھی۔ ان حقائق کے پیش نظر اس عہد کی مغربی رومانی شاعری میں مسلکِ نسائیت بغیر کسی بیرونی تحریک کے باور نہیں پاسکتا تھا۔ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ابنِ قرمان کے زحل نے ہی پروونس کے عیسائی گویوں اور شعر آکو اس نئی صنف پر طبع آزمائی کرنے کی دعوت دی تھی۔ پروفیسر میکین نے صاف لکھا ہے "جس طرح یورپ نے مذہبِ صیہون سے لیا تھا اسی طرح رومان عربوں سے مستعار لیا۔"

دانتے کی شہرہ آفاق نظم ڈیوانِ کامیڈی کے عربی آئندہ مشہور ہسپانوی مصنف ٹوکیل آسین نے محققانہ بحث کی اور ثوابد قاطع سے ثابت کیا ہے کہ اس کے جہت و جہتم کے اسفار و مناظر عربی کتب سے مستعار لئے گئے ہیں۔ اس کے خیال میں دانٹے شیخ اکبر علی الدین ابن عربی کی تصنیفات اور معلومات سے خاص طور پر متاثر ہوا ہے۔ نفیر غریب سے دیکھا جائے تو ڈیوانِ کامیڈی کا مرکز و محور بھی مسلکِ نسائیت (cult of the dame) ہے جس نے ازمنہ و سہلی کے اکھڑ عیسائیوں کو عورت کا احترام کرنے کے آداب سکھائے تھے۔ اس نظم میں دانٹے کا عشقِ جسمانی تقاضوں سے بزدل ہو کر منترہ شکل و صورت اختیار کر رہا ہے۔ اور اس کی محبوبہ بطریقے ایک پیکر نورانی بلکہ ایک متصفانہ غضب العین بن جاتی ہے۔ یاد رہے کہ

شیخ اکبر رحمی الدین ابن عربی نے بھی عالم شباب میں سکیں اعدین کی خبین و جبین بیٹی نظام سے عشق ناکام کیا تھا۔ یاس و حرمان کی حالت میں انھوں نے نظام کے فراق میں پڑسوز نظمیں لکھیں جو آج بھی قاری پر دافغی کی کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔ دوسری خصوصیات کے تدارک کے پیش نظر یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا اطاری حسینہ عربی مظلومہ کا بھی نقش ثانی بنتی ؟ ہسپانیہ سے مسلمانوں کا اخراج تاریخ عالم کا ایک المناک باب ہے۔ اس اخراج سے سپین اور جزیری فرانس کا معاشرہ اس لطافت اور شائستگی سے یکسر محروم ہو گیا جس کی ان آوارگان دشت غربت نے صدیوں تک پاسانی کی تھی۔ چنانچہ اسی زمانے سے ادارہ ہوائردی بھی رو بہ تنزل ہو گیا۔ اور بالآخر ختم ہو گیا لیکن مغربی ممالک میں آج بھی احترام نسوان کی صورت میں اس کے لطیف اثرات باقی ہیں۔ رہا اسلامی ممالک کا حال تو یہاں مسلمان عورت کی موجودہ زبوں حالی کو دیکھ کر ڈبلیو۔ سی۔ سمیٹھ سے کہنا ہو کہ کمنا پڑتا ہے

” وہ chivalry جو عربوں نے یورپ کو دی اور جسے خود فراموش کر دیا “

قرۃ العین طاہرہ

منظور الہی

زمانہ و مکان کی قید سے آزاد ہو کر میں نے کئی بار محبت کی اب وہ چھپنے کی محبت ہو، منظور ان شباب کی، شمالی برما کے ولا دینہ مرغواؤں کی پراسرار لٹکانیاں ہسپانوی سرحد کی پراسحبت کاسایہ پڑا تھا، وہ والہانہ شیفنگ کبھی کلام انبال کے ساتھ ہوئی تڑ بھی حقیقت و عصمت کی دیوی سینا کے ساتھ، میں نے کئی بار سوجا وہ آتش نوا جسے زمانہ قرۃ العین کے نام سے جانتا ہے جہاں بیوی میں کسی ہوگی، وہ مقہور و معترب رائدہ درگاہ جو قزاقوں اور چوروں کی طرح بھاگ بھاگی پھرتی تھی جس کے پیچے کوئی کچھ عافیت نہ تھا اسدہ یار میں صادق ابولا کیسے تھے جنہوں نے اسے پناہ دی یہ تڑپ رہی کہ عالم دنیا ہی میں اس روج جلیلہ کا دیدار کسوں جو جسدِ خاکی میں سیلاب لگی اور لعل در آتش تھی، اگر انسان کبھی ماضی کی طرف وٹ سکا اور سرد و زفر کے ساتھ ان نظاروں کو بھی آواز دے سکا جو اب تاریخ کے سینے میں آسودہ ہیں اور جن کی حقیقت اساطیر کی ہے تو میں وہ جانسوز نظارہ دیکھنے کی تمنا کروں گا جب طاہرہ کو پابجوالا سلطان وقت کے سامنے لایا گیا اس حال میں کہ تو اختیار مسلک کے وفد عشق میں وہ آپ سے باہر تھی، فرط غضب کے اس پر جنوں کی کیفیت طاری تھی زلفیں پریشان ہو کے اڑ رہی تھیں آنکھیں شعلہ باز تھیں اور منہ سے کف جاری تھا، ناصر الدین شاہ قاجار ہزار سنگدل سہی لیکن

تعارف : منظور الہی صاحبِ نثر ایم اے ہیں، ایک ایم اے فارسی میں کیا، دوسرا تاریخ میں اور میرا خاق و شرافت میں سی۔ ایس۔ پی ہیں، مگر ایسے افسر نہیں جنہیں ملنے سے پہلے اپنا آدھ پاؤ خون خشک کرنا پڑے، بلکہ ایسے جیسے اپنے کسی بھروسہ اور دیرینہ دوست سے ملے ہوں۔ انہیں اپنا کم قوم کا زیادہ غم رہتا ہے۔ اسی شوق میں اپنے بہنوئوں و امیروں اور فیروں سے ناخوش ہوتے ہیں اور ان پر ظلم کر مٹا دینا اور تنقید کرتے رہتے ہیں اور اتنے دود کے ساتھ باتیں کرتے ہیں جیسے ان کی مرضی کے مطابق سب کچھ ٹھیک نہ ہو گیا تو ابھانے ہو گا۔ اچھل نہ اید منسٹر ٹریڈ ایڈ ہیں یہ منصب ان کی مرضی کے عین مطابق ہے اس منصب میں افسرانہ طاقت تو کچھ نہیں ہیں مگر اس میں وہ کچھ نہ کچھ تعمیری کام نہ کر سکتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ سرے میں ہیں اور شمال دیا کرتے ہیں کہ پیسے ہندوستان میں اس بھروسہ پر ایس کے ٹے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے لیے اتنا کام کیا کہ آج وہاں کے دیباہ دیباہ نہیں رہے بلکہ ان میں زندگی کی تمام مستحکم اور شادمانیاں جاگ اٹھی ہیں۔ یہ طاؤں کے بنائے ہوئے اسلام کے دشمن، نادسی لوگ و لداہ، انبال کے حافظ، اور ادب کے طالب علم ہیں !

منظر کی کتاب دلا سکا اور کہنا تھا

مگر ابد کہ صورت زیبا وارو

کہاں کا فرماں موت اور کہاں کا فتویٰ، علم ہزار کیوں کر کشمکش و گردن زدنی ہے ناصر الدین پہ اس ساحرہ کا جامہ چل چکا تھا، جب اسی کو زندہ جلایا جا رہا تھا تو شے لک زبان سے اس کی زبانوں پہ چپے رہے اور ہاتھی ذب تفتنی باہی ذب تفتنی کی صدا بلند ہوتی رہی۔ کبھی دات کی گھری خاموشی میں ذہن کے گوشے گوشے میں یہ آتشیں لہجہ گونج اٹھتا ہے۔

گر تیرا فتنہم نظر چہرہ پچہرہ دوبرو

شباب نے اس کو فوٹو کے ایک فارغ التحصیل عرب کا قصہ سنایا تھا جن کا برسوں سے دین میں قیام تھا، ایک عام مزدور کی طرح مشقت کرتے اور مشقِ مصطفیٰ میں غرق رہتے ان سے جب کسی نے کہا کہ گندہ خضریٰ کا رنگ روغنِ دھم پر کیا ہے تو انہوں نے کہا اچھا دھم پر کیا ہے؟ نیچے تھے کنگھارے میں اتنے عورتے کہ چھت پر نظر ڈالنے کی نہ فرصت ملی وجہات کر لکھے۔ میںیں وصال میں مجھے حوصلہ نظر نہ تھا۔ گرجیہاں جو رہی میری نگاہ ہے ادب ادبیاں یہ خود اعتمادی۔

گر تیرا فتنہم نظر چہرہ پچہرہ دوبرو

حضرت رسی اُسی چوہے پر آفتابین ہوئے تھے جو اپنے محبوب کی زلفوں میں شاد کرنے اور جوتے سینے کی تنا کرنا تھا اور کہنا تھا اے خدا تو کہیں ملی جائے تو خود لاکے تجھے منہ سے منہ کے کھانے کھلاؤں اور سامنے بیٹھے دیکھا کروں۔

اے خدا بے من نہایت جان من	جملہ فرزند الٰہ و خان و مان من
تو کجا می تا سرت شان کسم	چارقت را و وزم و بجیر زغم
سازم و آرام پریشیت صبح و شام	از من آدرون ز تو خوردن طعام
اے خدا تے تو چہرہ بر ما تے من	اے بیادیت ہی ہی دیہا تے من

چوہا ہے کے بلا واسطہ مخاطب میں ایک دہقان کی ساوگی ہے۔ ادب ہزاروں تنائیں اور تشنہ آندوئیں اس شعر میں دست و

گربان ہیں

گر تیرا فتنہم نظر چہرہ پچہرہ دوبرو

ایکے باوجود خطاب میں بے حوصلی اور بے اکی ہے، زہے قسمت اگر کبھی دوبرو کا جامہ دے۔

گر شبے دست وحد وصل ترا از غایت شوق

گھر آویں تے مارے دکھ وصال

کہاں میں وصال میں تشنگی آرزو اور حسرت قرب

چہ قی متی کرنی دسی دکنا رہا بکنا رہا

اور کہاں شرحِ جسم غم ترا نکمہ، نکمہ موبو

محبت کی اس برہم گیری کا سامنے وہ عاجز تھی، محبت اُس کی رگ رگ نرس میں ہر اسیت لکھی تھی۔ اُس نے پر ڈال دیا تھی اور شوق
سہرڈی میں اقرار کر لیا تھا۔

مہر تر اول حوس، یہ فتنہ ہوا قاش حساب ؟
رشتہ بہ رشتہ نچ پر نچ تار بتا رہا ہے !
لکھنی ہندی در لکھنی محبت تھی اُس کے عشق میں، یہ نظم آج بھی مدد مندوں کے لیے تازیانہ ہے، لکھنے، بکھرنے، وہ لوگ جنہوں نے اُسے
زندہ چلا دیا، وہ جو خود اپنی آگ میں شہداء روز سستی تھی اس کے لیے چتا تیار کرنے کی کیا ضرورت تھی اُسے تو حجابوں کے مٹانے سے دخی کر دینا
تھا جہاں بہت آہستہ آہستہ گرتی ہے، جہاں گہرے نیلے آکاش پر پودہ ناشی کا پانہ، پان کا لاج سائے منور کر ٹھنڈک بٹاتا ہے جہاں طافرتی قوت
کا گندہ ریش پر ساری مٹراس کی جان کے روپے ہیں۔

آج بھی طافرتی روح جیتا باز منڈلاتی ہوئی، اُس شے کی کاش میں جو اُسے اُس دنیا میں نہ مل سکی۔
بیکھیر کبیرہ تاثیر محبت ز سدا !
گھر آو دم و دشت تو ایساں کر دم
وہ ایک عظیم شاعر، ہی نہیں تھی ایک عظیم انسان بھی تھی۔

(۲)

تم میری روح کے دیدار سے کیا لوگے میری یاد مختلف آلائشوں سے توٹ ہے، دنیا کوئی کمزوری صاف نہیں کیا کرتی لاکھ ٹیلیوں کو
قبلا کر ایک عیب کو کہتی ہے۔

میں نے ناز و نعم کے گوارے میں آنکھ کھولی، قدرت کا کوئی انعام ایسا نہ تھا جو مجھے دولت نہ ہوا ہو، جہاد و ششم عیالات، دینی و
دنیوی علوم میں خدا داد، ذانت و خطانت، شعر کہنے کے لیے مرزوں طبیعت، والد نے مجھے اتم سلی پکارا، میرے استاد کاظم رشتی نے قرۃ العین
کا نام دیا اور ہما اللہ نے طاہرہ کے لقب سے نوازا، میرا والد جو صبر و قنوت کا مجتہد اعظم تھا بڑا علم دوست انسان تھا، اُس نے مجھے علوم متداولہ
سے روشناس کرانے میں کوئی گسر نہ اٹھا رکھی، قزوین سے کچھ دور ایک گاؤں اُس نے مجھے بطور تحفہ دیا تھا جس کا نام میں نے محبت آباد رکھا، جب
شہری بھیجیوں سے طبیعت گہرائی میں اُس گوشہ عافیت میں پناہ و حُرمت کی اور مطالعہ میں غم ہر جاتی۔

مید کاظم رشتی ایک عظیم عالم تھے ایک مدت میری ان سے خداداد کتاب رہی، اُن کی بدولت بہت سے مسائل روشن ہوئے لیکن
کراہا کہ اُن کے درس میں شامل ہونے کی حسرت پوری نہ ہوئی، میرے دماغ پچھنے سے دس روز قبل اُن کا انتقال ہو چکا تھا کہ بلا میں اُن کے جانشین
کی حیثیت سے میں نے پس کتاب دوس دیا، جب میں نے سہلہ میری بہن مرضیہ کا خاندان ایک طویل سفر پر جا رہا ہے تو میں نے اُسے ایک
منظر کشی کا دنیا کو اُس موجودہ بستی کو پہنچا دے جس کی جگہ رت ہے جسے تو کھتی، مجھے یقین تھا کہ مرزا محمد علی اُس مرد کامل کو ضرور ملے گا۔ جب
باب کو میرا خط ملا تو اُس نے مجھے اٹھارہ مریدان خاص کے حلقہ میں داخل کر لیا، باب ہمیں "حروفات حقی" کتا تھا اور اپنی آپ کو نقطہ
گو عالم رویا میں متعدد بار دیدار دوست سے شاد کام ہوئی اور میری چشم بصیرت نے سب سے پہلے اُسے پہچان لیا لیکن خود ہی متبت دیکھنے،
"حروف حقی" میں سے ایک میں ہی تھی جو عالم آپ دیکھ میں اُس کے دیدار سے محروم رہی، باب کے شراق میں میں نے متعدد نقلیں لکھیں، میرے
شوق کا اندازہ اس شعر سے کر۔

لغات و جہاں اثر رفت و شعاع طلعتک غفلت

ز چہ رو انشت و بکلم نرانی برن کہانی ملی ۔

جب باب نے ایک نئے مسلک کی داغ بیل ڈالی تو اسی زمانے میں مذہبی ریاست تھی، دراصل حکومت کی اساس ظلم تشدد اور جبار حاکمیت پر تھی جس سے مذہب کو وہ کام اور مسند قضاوتانی کا وہ دورہ تھا، شاہ ایک عظیم انسان مگر ان تھا، وزیر اور صوبائی گورنر ایک طرف خزانہ کے نمبردار تک میں شاہانہ آمریت کی جھلک دکھائی دیتی تھی کہ وہی عدالت ایسی نہ تھی جو شاہ کے حکام میں مداخلت کر سکے، مزارے موت کے لیے نہ تھے نہ طریقے ایجاد کر سکے تھے، حبیب پر ٹکا دینا تو سب کے ہاتھ سے ہندو دینا، دندہ درگور کر دینا، انسانی جسم کی تشل بنانا، تیل میں تکی دینا، دودھ خورس کے سرے جھکا کر انسان کو جکڑ دینا پھر گرفت و حیل کر دینا، ان کو بے ناک حالات میں جب تدریں مٹ رہی تھیں اور انسانیت دم توڑ رہی تھی، باب نے مسیح کو مٹا دیا جو لوگ دعویٰ کیا وہ دعویٰ جس کے لیے ہفت اسلامیہ مدت سے گوش برآواز تھی، اُس نے کہا کہ وہ ایک 'باب' تھا اور ایک منظر پر توڑ کر اُس باب نہیں ہے گور کا عالم ایسا دین ظاہر ہونا تھا، جن پر خورس، کاباب نے اعلان کیا کہ ان کا تعلق صرف مذہب سے تھا لیکن ان کے نتائج پر سیر افتادہ طبقہ کے لیے وہ درس بلکہ ہر ناک ہو سکتے تھے، یہ کہہ دینا کہ شرعی قانون میں رد بدل کیا جا سکتا ہے، خود شریعت پر ایک ضرب کاری تھی، باب کی شاید یہ غفلت لازمی تھی خصوصاً اُس طبقہ کی طرف سے جو اس نرہ حکومت سے فیض یاب تھا، باہیرون کاشیرازہ منظر شر کر دیا گیا، باب کو مزارے موت ہوئی، اُس کے ساتھی چُن چُن کر قتل کر دیے گئے، ماسوا بہا اللہ کہ جسے جلاوطن کر کے ایک دوسرے ملک میں محسوس کر لیا گیا۔

جب میں نے تبلیغ شروع کی ایران خود دین و مِلّاتوں سے بھرا ہوا تھا جہاں مطلق برتے ہوئے اسلئے زمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، دندہ کی ایک خاص ڈگر پر چل رہی تھی، لوگ انسان کو انسانیت کی کسوٹی پر پکڑنا چاہتے تھے، تمہارے زمانے کی کج نظاہر کی ادائی کو کمال امر و کج کیا گیا تھا، خبر سے کچھ بچاؤ چھڑا کر اخوت کی تعلیم دینے والے مسجد سے باہر سہادت کی تعلیم کیسے سمات کر دیتے، جب اہل مذکر اپنی ناجائز، اہلک اور فاساد و لغزشوں کی فکر چھڑائے تو وہ مذہب کی آڑ سے ڈھال ہی نہیں بنتے بلکہ اُسے چھلکا کر چھیاں اور بنائیں بھی تیار کر دیتے ہیں، سیری تقریروں کی عدائی سنگدلوں کو رام کرتی رہی، مگر فریب کی، اجنبی و بھیر کی کھینچتی رہیں، اہل سیال سے ایک آئی تیار ہوتی رہی جسے بالآخر میرے سینے میں پیوست فرماتا تھا۔ جب میں ہمیں لیبی کی مجلسی راتوں کا نظارہ کرتی، بول تو حیران ہوتی، بول کر نہ کہنے نہ بیٹے میری نفس میں چنگاریاں بھردی تھیں میں نے سوچا تھا کہ تنہا کو کی چہرہ و ستیل کا، کم ظرف و الوس ملاؤں کا، پسے ہوئے عوام کی کھینچوں کا یہ مشرب واحد علاج ہے۔ شاید ہر وہ شخص جسے اپنے مذہب سے اک گز عقیدت، بریوں کی سرچشما، مسیح کو توڑ اور محمدی آخر الزمان آتے رہے، چند لوگ انہیں ملنے اور بیشتر جھگڑاتے رہے، عقاید کی چٹا جلتی رہی انسان کی راکھ سے نئے نئے وعادی اٹھتے رہے پھر تمہاری دنیا میں "ازم" کا دوشتر دینا ہو چلا رہا ہے۔ ایک "ازم" دوسری "ازم"، کو مات دیتی رہی اور وہاں شریعت اس میں غل میں پھنس چکی ہے، اشد کے منظر پر جان بے رُوح

جب کہ اس میں ٹکرا رہی تھی برقی ہوئی مقبولیت برداشت نہ کر سکے تو وہ پے آندہ ہوئے، میں نے بغداد کی زلف ہجرت کی یہاں بھی آتش نوائے دلوں کو مہرہ دیا اور میرے خطبات جو علما اجماعہ و اداری کو کھلا چیلنج تھے انہیں ایک آنکھ نہ بھلے، جب میں نے انہیں مناظرے کی دعوت دی تو انہوں نے پہنچتی کی اور لوگوں کو رد فکار حفظ امن کا مسئلہ بنا ڈالا حتیٰ کہ مجھے مضی بغداد کے ہال پناہ لینی پڑی۔

میں نے ان چند برسوں میں کیا کھدیا کیا پایا یہ تو شاید کبھی نہ کھاسوں لیکن جب میں قزاقوں کی قریب شخیصت کیسر بدل چکی تھی، میں بہت دُور نکل آئی تھی، کوٹ انا میرے بس کی بات نہ تھی، میراظم زور دیر اثر ہر بچارہ، لامعد ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزبی "دسویں قتل و زناست میں محسوس و تلاش ضرور تھا، وہ میرے رقیق تاب خیالات کا ساتھ کمال دے سکتا تھا، پھر وہ باب کا منکر تھا، ہماری صیغہ کی نگرانی تھی، اُسہی

مفلو نہ تھی قتل ہوا ملا محمد نے اپنے والد کا خون میرے سر پر تھوپا اور سازش میں شریک ہو گیا ہتھان لگایا چند روز بعد اعلیٰ قاتی نے اپنے آپ کو حکام کے
کے حوالہ کر دیا لیکن بھرنی طالعہ کا بدلہ نہ ہوا اس کی آتش انتقام بھڑکتی رہی، ایک روز گریبان چمک کر کے محمد شاہ کے حضور حاضر ہوا تو یوں دروازہ
کی - قاتلی قتل کر دیا گیا، یہ اس کا خون رائیگاں جانے کا ہوا عشاہ نے کہا - اصل قاتل بجائے گیا ہے، شریعت کا کوئی تاملی اس کی بجائے کسی معصوم کو سزا دینے
مست نہیں دینا، اگر تمہیں بغیر تازی طور پر آتش انتقام بھجانی ہے تو شرح کر بیچ میں کیوں لاتے ہو، یہ تھی بنا میرے جبروں ماضی طالعہ کی۔

اب میں بھی طرز پر بھالہ کی مہمان تھی، بھالہ اللہ ویر زادہ تھا، امیر کبیر تھا، وہ بھی میری طرح بھالہ اللہ کے عشق میں ایسے تھا اور اس کے دیدار سے
محروم، میں باب سے ملنے کے لیے بیاب تھی اور ماہ کو تباہا چاہتی تھی لیکن یہ ناکمل فعل تھا، بھالہ اللہ نے مجھے اس ہمارے سے باز رکھا۔

بازشت کے مقام پر باب کے متبعین نے اس کے قائم اور اہم محمود پر ہونے کا دعویٰ کیا، اس پر تھوڑے چنچا ہم روایات سے منکر
ہونے کا اعلان بھی کیا گیا، بادشت سے رشتے برائے مجھے راستے میں گرفتار کیا گیا۔ اب میری روح حال کا نترے کٹر میں نظر بند تھی، میں وہاں تین سال
رہی، قید کچھ ایسی سخت تھی، میں صاحب خاں کی مستورات سے بے تکلف لی لیتی تھی بلکہ انہیں وعظ و نصیحت بھی کرتی، کلا نتر کی بیوی نے میرا تعارف
ادھنے طبقے کی بیگمات سے کر دیا تھا وہ جو حق میری باتیں سننے کے لیے آئیں اور کمال تعلق پیش آتیں، سچ تو یہ ہے قیام طہران کے دوران میں
میری شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔

دن ششم اس گورے چارے تھے کہ ایک عاقبت اندیش باپ نے باب کی شہادت کا بدلہ لینا چاہا اور غم و خند سے پاگل ہو کر ناصر الدین
پر قاتلانہ حملہ کر دیا، شاہ کچھ کیا لیکن گورفت نے سب بایرون اس سازش کا دوسرا گر دانا، باپ کچھ چن کے گرفتار کیے گئے اور ان میں سے بیشتر موت
کے گھاٹ اتار دیئے گئے محمد خان کلا نتر نے جن وفاداری ادا کیا اور شاہ اور وزیر انہم کو یاد دلایا کہ میں اس کے کٹر میں نظر بند ہوں، شاہ اور وزیر میری
برحمتی جوئی ہر دلعزیزی سے خائف تھے اور بغیر مقدمہ چلانے سزائے موت دینے سے چھپکھپاتے تھے، چنانچہ طہران کے دو مجتہد اس کام پر
ماہور کئے گئے کہ وہ میرے ساتھ بحث و تمحیص کے بعد طے کریں کہ میں کس حد تک تصور وار ہوں لیکن کمال کی بحث اور کمال کی دلیل مافیٰ محکم تھا، مہنوں
نے فیصلہ دیا کہ یہ عورت خود گمراہ ہے، دو دوسروں کو گمراہ کرتی ہے، مفاہ عامہ اس امر کا متقاضی ہے کہ اسے سزائے موت دی جائے۔ گورفت نے یہ
فیصلہ منظور کر لیا اور اس کی تشہیر بھی کر دی، شہادت سے ایک روز قبل ناصر الدین شاہ نے مجھے اپنے حضور اب کیا اور پوچھا - تم باب کی کیوں محنت
ہو، میں نے جواب دیا

ولا انما اجعلدوت، ما جعلت ولا اتمتع اجعلدوت ما اجعلد لیکن دینکد ولی دین
وہ بھی کی دن تھا، مجھے زید علی بھی کو کبریا آخری وقت ان پہنچا ہے، اس روز میں نے حق کو اپنے منہ کی، بہترین سفید جامہ زیب تن
کیا، فردا فردا ہاں خاندان کے ادرار انہیں بنا دیا کہ اس رات میں ایک طویل سفر پر جانے والی تھی جب میرے قاتل مجھے لینے گئے تو میری تیاری مکمل تھی۔

لے اجل اسے ساعت عشرت قسریں	زندگی کی اسے دفائے آخریں
امیری حال تھو پہ جاں قربان ہے	ایک مدت سے تیرا رمان ہے
انگی ایک بار تو میسے سے لیے	پھل میں گندھ سے تیرے لیے
امیری آنکھوں میں آنسو بھی کے آ	چادر گل میں میری بون کے آ
اپنا بیگانہ ہو گا جب کہ پاس	رگ جھکے ہیں جلے کی رات

میں کوئی بن کے بھڑوں گی راست میں ! اپنے ملک سے بھول گئی راست میں
 ڈی گریڈ نہ میرے بھٹے جانے کا قصد رحمت نہیں لکھا قدرت کو یہی منظور تھا کہ ایک عظیم شاعرہ میں کی روح اُس کے جسم سے زیادہ خوبصورت
 تھی ایک ست شراب بہ کار حبش کی چابک دست چھانٹ کا شمار برادر اُداس کی فیم باں لاش ایک اندسے کنوئیں میں دھکیل کر پتھروں کا کھڈے کرکٹ
 سے کنوئیں پاٹ دیا جائے۔

یہ خود باقت فہم قیدان گناہ می
 دانستہ دہشتہ تیز ذکردن گناہ کیست ،

میرے ہم عصر سرچتے ہوں گے میں پاگل تھی ، عزت ، دولت خاندان و لادعا و شتم تج کی میں نے کیا پایا ؟ وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ کوئی کتنی قہق
 کہہ دینے ہی میں حقیقی مسرت کا راز پہنچا ہوا ہے ، کسی میں کھو کر ہم اپنے آپ کو پا سیتے ہیں
 در دل افسوسم دنیا غم مشوق شود باوہ گر خاک برد چہ تہ کشد شیشہ ما ،
 لیکن جب غم دنیا اپنے سے ماسر اہر تو خامی کہاں رہی ، میرا غم و غم تنگ نظر ملاؤں کی کوتاہ بینی اور عوام فریبی کے خلاف جذبات
 ایک ناقابلِ برداشت سوشل سسٹم کے خلاف بغاوت یہ سب باب کے مشق میں بدل گئے ، میرے شوق کی ہر گہری اُس پینم کی ترویج کے لیے وقف
 کر کے وہ گئی جس کا باب منظر اُقم تھا ، باب ایک منارِ ش کی صحیح سماجی کرت تھا اُس کے کردار میں میں نے وہ آدرش پایا تھا جس کی جستجو رسوں سے تھی ۔
 وہی تو ہیں کہ وہی تھی دنیا کوئی کمزوری صفت نہیں کرتی ، لاکھ خیروں کو بھلا کر ایک عیب پر ڈالتی ہے ، جسم روح کی صفت کے لیے "زینہ فوز"
 مسمیٰ لیکن جسم کی تعلیم کو بے جا اہمیت تو نہیں دیتی تھی ، جسم کی تعلیم کے دائمی روح کی تعلیم سے نا آشنا ہیں ، محض دیکھی عبادت کے بہجاری تزکیہ قلب
 اور دعوئے نفس کی لذات سے نا آشنا ہیں ، تیسرے کے دالوں کی گردش ہمیشہ رفتِ قلب کا ماتم نہیں دیتی ، ایک ایک داد گرنا ہے ، ڈھلکتا ہے ،
 عادت سے مجبور ،

خدا کے نیک بندے کو نہیں ؛ کسی کے دل میں خفا رہا نہ ہو میرے ذہن میں تو نہ تھا ، خدا کو اس سے زیادہ محبوب پہنچا ہر کی کو انسان
 مردم آزاری سے استہزاء کرے اور اُس کی مخلوق کے لیے جو کچھ بن پڑے کر ڈالے ، خود غرضی اور جوساکی سے بلا زہر کر ، اگر مجھے عملی بار فروش سے محبت
 ہوئی تو کسی کو اس سے کیا غرض ؟ اپنی ذاتی کمزوریوں کے لیے میں باری تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہوں اور شانِ کریمی سے معافی کی بلند ہے لیکن حقوق العباد
 خصب کرنے والے ، اپنے بھائی کا غولی چڑھنے والے ، اودے معامل میں خیانت کرنے والے ، حکومت کی اساس ظلم و تعدی پر رکھنے والے اصل عالم
 وہ تھے یا میں تھی ؟ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا یا میں نے ؟ ان لوگوں نے اپنا ضمیر شیطان کے ہاتھ میں بیچ ڈالا اور سمجھا کیے کہ کھٹے میں نہیں رہے
 دنیا و معنی دونوں حاصل کر لیے ، میرا خدا ایسے تاجر اور آیت بیگانہ ہے ، اگر نیت پر سارا معاملہ چلتا ہے تو مذہب کی تجارت کرنے والے
 کہاں جگہ پائیں گے ، محمد علی بار فروش دنیا بیچتا بنا نا خوب جانتی ہے !

نئی کتابیں

نوں جگر ہونے تک

فضل احمد کرم فضل، ریدے سے انداز کی پُرکار مغز میں کئے والے تھے، جو دلوں کو بھاتی بھی تھیں اور دلوں میں اترتی بھی تھیں۔ مگر زیرِ نظر کتاب ان کی مغزوں کا مجرہ نہیں بلکہ ناول ہے جو ساڑھے تین سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

یہ کتاب اگر ان کی مغزوں کا مجرہ ہوتی تو اچھا ہی ہوتا کہ ہم اس شخص میں نہ بچھتے کہ معلوم کریں کہ وہ شاعر اچھے ہیں یا ناول نگار۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ فضلی صاحب شاعر کی حیثیت سے اتنے بڑے نظر نہیں آتے، جتنے ناول نگار، تو آپ ہماری بات کو مانیں گے ہی کب۔ اس لیے کہ شاعر کی حیثیت سے انہیں سب جانتے ہیں اور ناول نگار کی حیثیت سے اب سامنے آئے ہیں۔

یہ ناول بنگال کے بارے میں ہے، جہاں کی زندگی میں مصرمیت، سادگی، شمعاس، راج اور نرم ہے۔ ناول پڑھتے جاتے ہیں محسوس ہوتا ہے گا جیسے ہم شرقی پاکستان کے کسی دیہات میں رہ رہے ہوں اور اس ناول کے مرکزی کردار غیر مریاں، محمد ارشد اور پھول محمد ہمارے سامنے آتے بیٹھے روتے پھرتے زندگی کی رو میں آنے سے ڈوبتے چلے آ رہے ہوں۔

اس ناول میں چھوٹے موٹے کئی تجربے کئے گئے ہیں۔ جو اپنی جگہ قابلِ توجہ ہیں۔ اس میں روایتی ناولوں کی طرح داستانِ حسن و عشق کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ در نہ مصنف کو خواہ خواہ ایک لڑکی کو دنیا جہان کی لڑکیوں سے خوبصورت بنا کر پیش کرنا پڑتا اور پھر ایک ہیرہ کی تلاش ہوتی تاکہ وہ دلوں میں لگ کر تابی کی توجہ کو اپنی جانب کھینچے۔ اس غامی کے باوجود یہ ناول دلچسپ استادِ لکچر کے قاری اس میں گم ہو رہتا ہے۔ مصنف کے نزدیک حسن، حسن صورت تک ہی محدود نہیں ہے ان کے نزدیک کردار میں بھی حسن ہوتا ہے۔ مناظر میں بھی حسن ہے، حتیٰ کہ بلاؤں میں بھی۔ اسی طرح عشق، حزن عشق، دنیا ہی نہیں بلکہ عشق لعلوت بھی ہے۔

یہ ناول دوسری جنگِ عظیم کی ابتدا سے خاتمے تک کی تفسیر ہے، اس عرصہ میں بنگال میں قحط آتا ہے، اس میں لوگوں پر جو کچھ گذرتی ہے وہ سب کچھ پڑا اور ناک بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔

یہ ناول بنگال اور بنگال کے لوگوں کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔ وہاں کی معاشرت اور وہاں کے ماحول کی جتنی جاندار سکا سکی اس ناول میں ملتی ہے، وہ شاید ہی کسی ناول میں ملے۔ مصنف نے اپنی زندگی کے میں بس بنگال اور بنگال کے دیہاتوں میں گزارے ہیں۔ یہی وجہ ہے

کہ یہ ناول شاہدہ کی گہرائی کی وجہ سے جائز اور کرداروں کے پتھر پتھر کی وجہ سے زندہ نظر آتا ہے۔ اس پر انشا کی خوبیاں مستزاد۔
 اس ناول میں مجید صناد جو ناول کا مصنف خود بھی (کا کردار بعض جگہ مدح خود کی وجہ سے ذرا اٹکتا ہے اور بس، شاید
 مصنف کے نزدیک ایسا گناہی مناسب ہو، اگر وہ اس سے کسی طرح بچ سکتے تو اور اچھا ہوتا۔
 یہ پہلی اردو کتاب ہے جسے کیسل اینڈ کمپنی لنڈن نے فور آفٹ پر پڑے خوبصورت اعداد میں چھاپا ہے۔ پاکستان میں تقسیم کنندہ
 ہیں۔ کراچی ایجوکیشن سوسائٹی مارون چیمبرس ساؤتھ ویسٹ روڈ کراچی ۷۔

(م۔ط)

داغ داغ اُجالا

مصنفہ رفیہ رحیمید۔ رات ۳۰ × ۳۰ صفحہ ۸۶ ۴ صفحہ کتابت، طباعت، مہاری جلد پختہ مع رنگین کردار پیش قیمت چھپے
 ناشر۔ ایک لینڈ۔ داغ داغ اُجالا اے بڈنگ۔ دی مال۔ لاہور
 چھپنے کو تو کتنے ہی بے ہنگم ناول روزانہ چھپتے رہتے ہیں مگر سچ کا اچھا ناول کبھی نظر آتا ہے۔ داغ داغ اُجالا اسی قسم کے
 ناولوں میں سے ایک ہے جو اندھیرے میں روشنی کی جھلک دکھاتے ہیں۔
 اس ناول کے مصنفہ رفیہ رحیمید ہیں جن کے افسانے اور فنیاتی مضامین اردو رسائل و جرائد میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔
 اگرچہ ناول نگار کی حیثیت سے وہ شاید پہلی مرتبہ سامنے آئے ہیں مگر ان کی گرفت مضبوط معلوم ہوتی ہے۔ پلاٹ کا نامنا ایسا ہے کہ واقعات
 کی کہانیاں خود بخود ٹپکی ٹپکی جاتی ہیں اور زمان و مکان کے گہرے شعور کا پتہ دیتی ہیں۔ دلفریب فضا میں تمام کردار جیسے جگمگاتے، چلتے پھرتے
 ہنستے بولتے، محبت کرتے اور کھسکیاں بھرتے نظر آتے ہیں۔ دواصل کافی کو آگے بڑھانے اور پلاٹ کو تکمیل تک پہنچانے کا سارا کام
 بیکر واری ادا کرتے ہیں اور ناول کی پوری کافی ان کرداروں ہی کے بل پر چلتی ہے۔ اس کی یہی خوبی اسے اردو کے اچھے ناولوں کی
 صف میں بیکر دینے کے لیے کافی ہے۔ البتہ زبان کہیں کہیں مصنف کے خیالات کا ساتھ نہیں دیتی۔ بعض جگہ روزمرہ اور محاورہ کی غلطیاں
 بھی نظر آتی ہیں جو امید ہے۔ نظر ثانی میں دور ہو جائیں گی۔

(ع۔ق)

کتب خانہ اسلامیہ



سیدھی پیٹھ اور مضبوط
اعضام کے لئے

اپنے ننھے بچہ کو
یہ خالص دودھ دیجئے



جو مائیں اپنے شیر خواہ بچوں کو ضرورت بھریا بالکل ہی چھاتی کا دودھ نہ پال سکتی
ہوں وہ آسٹرمیلک پر پورا بھروسہ کر سکتی ہیں۔ یہ بالکل خالص، قوت بخش
اور نہایت عمدہ دودھ ہے جسکو اس طرح سے بنایا جاتا ہے کہ بچوں کے
ہاضمہ کے موافق ہو۔ بچیوں اور راتوں کی مضبوطی کے لئے اس میں وٹامن ڈی
ملا یا جاتا ہے اور لوہا شامل کیا جاتا ہے تاکہ بچے خون کی کمی والی بیماری سے محفوظ
رہ سکیں۔ آپ اپنے بچے کی نشوونما سیدھی پیٹھ اور بازوؤں کی مضبوطی کے لئے آسٹرمیلک پر پورا
اعتماد کر سکتی ہیں۔ یہ خاص کر پاکستان میں شیر خواہ بچوں کے لئے سیدھ موزوں ہے۔

آسٹرمیلک

ماں کے دودھ سے قریب تر

ہر ماں کے لئے مفید مشورہ
بچہ کی دودھ پینے والی بوتل کو صاف اور جراثیم سے پاک رکھنے کے لئے
ایک برتن میں ٹھنڈا پانی لیجئے اس میں خالی بوتل ڈال کر اتنا گرم
کیجئے کہ آبلے لگے۔ چھ بوتل کال بھیجئے لیکن اس کے اندر نو فیصد کو
صاف کرنے والے وقت خشک نہ کیجئے۔

لیبیسٹ
ذمہ دار

(پاکستان)
چٹا گڑھ

لیبوریٹریز
لاہور

گلکے
کے بچے

ادارہ فروغِ اُردو۔ لاہور

(ایک روٹہ انارکلی)

یہ ادارہ آپ کا ہے۔ اس لئے کہ اس نے مقدر و بھر
اُردو ادب کی خدمت کی ہے۔۔۔ اور آپ کے تعاون سے
کی ہے۔

ہم نے ایسی ہی کتابیں چھاپی ہیں۔ جن کی ادبی حیثیت
بھی مستحکم ہے اور کاروباری اعتبار سے بھی منفعت بخش ہیں۔
آپ اس ادارہ سے زیادہ سے زیادہ تعاون کریں۔ یہ
آپ کے لئے کاروباری طور پر زیادہ سے زیادہ مفید ثابت ہوگا۔
اس ادارہ سے تعاون اپنی ذات سے تعاون کے مترادف
ثابت ہوگا۔ انشاء اللہ!

خدمت گزار
منیجر ادارہ



ہماری نامور کتابیں

نیلوں شوکت تھانوی کا نیا ناول، جو ان کے مشہور و معروف ناول غزالہ ہی کے انداز کا ہے۔ یوں تو شوکت تھانوی کی تمام تصانیف کو ہر احراری میں جو مقام حاصل ہے وہ اُردو کے کسی مصنف کو حاصل نہیں ہے۔ غزالہ شوکت صاحب کی سب سے دلچسپ اور مقبول کتاب ہے۔ نیلوں کا انداز تو غزالہ والا ہی ہے۔ مگر یہ دلچسپی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ وہی عشق و محبت کی حکایت ہے۔ وہی سراغِ رسانی کے تانے بانے ہیں وہی دلچسپ چھڑ چھاڑ ہے جو دل میں اتنی جلی جاتی ہے۔

نبی امی سیرت رسولؐ پر سب سے مستند اور کارآمد کتاب جسے سوانح نگاری کے اہم علم ابو النصر نے پیش کر کے عربی زبان میں فصاحت کی منزلیں طے کیں۔ اور اب اسے شیخ محمد احمد بانی جی نے اُردو کے قالب میں ڈھال کر اردو ادب کو ایک حیرانی کتاب دے دی۔ اس کا ہر فقرہ عشقِ رسولؐ میں ڈوب کر لکھا گیا ہے۔ مگر واقعیت اور حقیقت نگاری کو کہیں بھی ٹھیس نہیں لگنے دی۔ اس کا انداز بیان بے حد دلکش ہے۔ اس کے باوجود یہ ضعیف روایتوں کی داستان نہیں مستند تاریخ ہے۔ جسے ہم پورے فقر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

روزن اس دور کے جن بہت کم شاعروں کو بھرپور کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ ان میں قتیل شفائی کا نام قابلِ رشک حیثیت کا مالک ہے معلوم ہوتا ہے ترقی اور موثر نعروں کے زیرِ دم قتیل شفائی کے لوگوں کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔ ہندوستان و پاکستان میں شاید ہی کوئی شہر یا قصبہ ایسا ہوگا جہاں بہت بڑی تعداد میں لوگ قتیل شفائی کے نغمے نہ لگاتے ہوں۔ حالانکہ ان نعروں میں حسرتی عمومیت کہیں بھی نہیں ہے یہ سادگی و پرکاری، بخود دی و ہشاری ان کو امر بنا دیتی ہے۔ ان نعروں میں حیات بڑھ چکی و فراق کو کھپ چکا۔ قتیل شفائی کے زندہ و تابندہ کلام کا نیا مرقع در درخت جس کے جن جماعت کی ذمہ داری ہم لیتے ہیں۔ قیمت تین روپے

خلفائے محمدؐ ابو النصر شام کا سب سے بڑا مورخ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جتنی بھی سوانحی کتابیں لکھیں ان کا ساری دنیا میں کوئی نافی نہیں ہے۔ خلفائے محمدؐ میں اس نے ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ پر دنیا جہاں کی کتابیں پڑھ کر ایک ایسی کتاب لکھ دی ہے جو انی خلفائے سب سے میاری اور مستند کتاب ہے۔ ترجمہ بے حد سلیس قیمت دس روپے

صاحب یہ کتاب ان بچوں کا مجموعہ ہے جو محمدؐ طفیل مدثر نقوش نے وقتاً فوقتاً لکھے۔ ان بچوں میں پورے غلوں اور دیانت کے ساتھ مشہور ادیبوں اور شاعروں کی تمام اچھی اور بُری باتوں کو پیش کر دیا گیا ہے۔ اُس میں سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، شریک تھانوی، جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری، عابد علی، عابد اور احسان دانش کے اچھے شامل ہیں۔ قیمت تین روپے

شعاعہ طور یہ جگہ اور آبادی کا وہ مقبول نام مجموعہ ہے جسے اردو شاعری میں سب سے زیادہ قدر و منزلت حاصل ہوئی ہے ہمارے اس ایڈیشن کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اسے از سر نو مرتب کیا اور کئی کمزور اشعار کو حذف کر کے کئی ایک غیر فانی اشعار کا اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب کو اتنے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ قیمت سات روپے آٹھ آنے

بازار حیات یہ اچھا نثریہ قلمی مجموعہ ہے۔ قلم کار نے پاکستان کے بعد نئے معیاری افسانے نثر میں لکھے ہیں۔ اتنے اور کسی فسانہ نگار نے نہیں لکھے۔ اس مجموعے میں ان کے وہ تمام تازہ افسانے شامل ہیں جن پر تہذیب کو اور اردو افسانے کو فروغ دینا چاہیے۔ افسانوی ادب میں یہ محبوب و ناقابل فراموش ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

اردو غزل گوئی اردو تنقید میں غزل پر اتنی کام کی کتاب اور نہ ملے گی۔ اس لئے کہ اس کا مصنف فراق گورکھپوری غزل کا بہت بڑا شاعر ہے۔ فراق جتنا بڑا شاعر ہے اتنا ہی بڑا نقاد ہے۔ مغربی تنقید اور شرقی تنقید کا جتنا رچا ہوا مذاق فراق کا ہے اتنا اردو کے نہ کسی شاعر کو نصیب ہوا اور نہ کسی نقاد کو۔ قیمت دو روپے

انداز کے مستند فراق گورکھپوری۔ فراق جتنا بڑا شاعر ہے اتنا ہی بڑا نقاد ہے۔ انداز سے ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے پچھلے بیس برسوں میں اردو کے تنقیدی سرمائے میں اس سے بہتر کتاب پیش نہیں کی جاسکتی۔ اب اس مجموعہ کو بڑی اہم تبدیلیوں اور کئی نئے مضامین کے اضافے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ قیمت پانچ روپے

احرار و جان ادا اردو ادب میں سب سے دلچسپ اور سب سے معیاری ناول اگر کوئی ہے تو وہ صرف احرار و جان ادا ہی ہے۔ یہ ایک بیسویں صدی کی داستانِ حیات ہے جسے مرزا قاسم نے لکھ کر خود بھی داغی شہرت حاصل کر لی اور آدائے کے دار کو بھی لافانی کرداروں میں شامل کر دیا۔ اس ناول کو اگر زبان کے اعتبار سے ہی پڑھ لیا جائے تو بھی بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ یہ ناول اپنی فائنل پچھلوں کے ساتھ لکھنوی معاشرت کا مرقع بھی ہے۔ خورشید الاسلام کا مکتبہ الآریا بیاجر بھی اس کتاب کی زینت ہے۔ قیمت چار روپے

منٹو یہ سادہ حسن منٹو کی افسانوی رنگ میں سوانح ہے جسے منٹو کے بچپن کے دوست ابو سعید قریشی نے لکھا ہے یہی وجہ ہے کہ اس سوانح میں بڑا توازن اور بڑی کام کی باتیں ہیں۔ اس میں منٹو کی نہ تو بے جا تعریف ہے اور نہ ہی خدا واسطے کی دشمنی منٹو کو کچھ اور جیسا کچھ تھا، اسے ہو بہو ابو سعید قریشی نے پیش کر دیا ہے قیمت چار روپے چار آنے

قول و قرار یہ عدم کا مجموعہ کلام ہے۔ قدم اردو کا ایک ایسا غزل گو شاعر ہے جو بڑے سادے سے انداز میں عشق و محبت کے معاملات کو پانی کر کے رکھ دیتا ہے۔ بجا ہی بھر کم ترکیبوں اور استعاروں سے ان کا ذہن اور قلم بغاوت پر آمادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر غزل میں بناوٹ نہیں ہے۔ بلکہ فن کی تمام لطافتوں کے ساتھ ایک حقیقت ہے۔ قیمت تین روپے

بیچ و خم یہ بھی عدم کی ایک سو سے زائد مترنم، دلآویز اور پیاری پیاری غزلوں کا ایک سادہ سا مجموعہ ہے جسے اب پچاس نئی غزلوں کے اضافے کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کی ہر ہر غزل اور ہر ہر شعر پر جھوم جھوم اُٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ داغ کے بعد بقیہ روائی اور سلاست ان کے حصے میں آئی وہ اور کسی کو میسر نہیں ہے۔ قیمت تین روپے

سر کندوں کے پیچھے یہ منٹو کی آخری کتاب ہے جو مرحوم کی زندگی میں بھیجی تھی۔ منٹو ہی وہ بے باک اور نڈر افسانہ نگار ہے جس نے بڑی سے بڑی حقیقت کے اظہار میں کبھی تامل نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس پر مقدمے چلے اور "زیادہ سنجیدہ" حضرات نے

ناک بھوں چڑھائی مگر وہ لکھتا رہا۔ ادب کی بقا کی خاطر لکھتا رہا۔ اس کتاب میں بھی ان کے کئی زندہ رہنے والے افسانے شامل ہیں

قیمت تین روپے

تأملات نیاز اس مجموعہ میں نیاز فتح پوری کے ایسے ایسے نادر مضامین ہیں۔ جو ان کے پرچے "نگار" میں چھپ کر دنیا نے ادب میں جگہ برپا کر چکے ہیں۔ نیاز نے ہمیشہ کھوکھلے رسم و رواج اور نظریات کی وہ وہ وجہیں کھیری ہیں کہ چھوٹے نقدی مآب اور رسم و رواج کے سہارے زندہ رہنے والے بڑھاپے ہوئے۔

قیمت ڈھائی روپے

اصحاب کھف نیاز فتح پوری نے مصر کے ایک بڑے مشہور ڈرامہ نگار توفیق الحکیم کے ایک نادر ڈرامے کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ ڈرامہ قرآن کے ایک مشہور واقعہ سے متعلق ہے جو قرآن سے قدسے مختلف ہے۔ لیکن جو کچھ اس میں ہے اور اسے جس طرح پیش کیا گیا ہے۔ وہ بعید از عقل نہیں ہے۔ یہ ڈرامہ مصر میں بے حد مقبول ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اردو میں بھی بڑی مقبولیت ہوئی۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

یہ احمد ندیم قاسمی کے چار طویل افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اگر ان افسانوں کو معیار کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو سوائے کوشش چندر کے طویل افسانوں کے ان کا پورے ادب میں کوئی جواب نہیں ہے۔ ان افسانوں میں رومان کی دبی دبی چمکناؤں کے ساتھ فن اور زندگی کے وہ رموز پنہاں ہیں جنہیں ایک بڑے فن کار کا قلم ہی چھو سکتا ہے۔

قیمت تین روپے

یہ بھی احمد ندیم قاسمی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ پریم چند کے بعد جس انداز سے دیہاتی زندگی اور اس کے مسائل کو احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ وہ اردو کے کسی اور ادیب کو نصیب نہ ہو سکا۔ ندیم خود دیہات کا رہنے والا ہے۔ اس لئے وہ دیہاتیوں کی زندگی اور ان کے تمام مسائل کو بخوبی جانتا ہے اور ان کے اٹوٹ اور پھلے رومانس سے بھی آشنائے قیمت ۳/۲

جہان عالم انگریزوں نے اودھ کے آخری تاجدار و اجد علی شاہ کو جب معزول کر دیا تو انھوں نے اپنے آخری چند سال میا برج میں گزارے اودھ دن کس طرح کاٹے اور وہاں وہ کس حالت میں رہے اور ان کا وہاں کیا شغل رہا۔ ان تمام باتوں کا انھوں نے دیکھا حال اردو کے مشہور مؤرخ عبد الحکیم شوری نے اس کتاب میں پیش کر دیا ہے۔

قیمت دو روپے چار آنے

عزیزم کے نام یہ خطوط کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر تاثیر نے اپنے ایک شاگرد کے نام کیمبرج سے لکھے تھے۔ خطوط بہ ذات خود ایک دلچسپ چیز ہیں۔ اور اگر کوئی صاحب طرز لکھنے والا ہو۔ تو ان کی افادیت کے ساتھ ان کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ خطوط کا مجموعہ بعد دلچسپ، بڑا معلومات افزا، بڑا ہی کارآمد اور حد درجہ نازک اور علمی مسائل پر تبصرہ بھی ہے۔ قیمت ۳/۲

یدِ برصیا سید عابد علی عابد کے دل نشیں ڈراموں کا مجموعہ آغا حشر فتن ڈرامہ نگاری کے نام سے تھے۔ ان کے ڈراموں میں افلاک شان و شوکت اور قافیہ جہان کی معجزانہ کمالات تو حقین گزرم و نازک احساسات کا فقدان تھا۔ عابد صاحب نے اپنے ڈراموں میں اس غامی کو نہ صرف دور کیا ہے بلکہ اردو ڈرامے کے فن کو ادب کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اگر آغا حشر کے ڈرامے ماضی کی دکاش یادگار ہیں تو عابد صاحب کے ڈرامے حال اور مستقبل کا سرمایہ ہیں۔ اردو ادب میں ان سے بہتر ڈرامے کب تک پیش نہیں کئے جاسکے قیمت ۱/۵

سیاست الہیہ احام ابن تیمیہ کی یہ مکرر الا تصنیف اس سے پہلے بھی ایک بار اس ادارہ نے ہی پیش کی تھی اور یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی تھی کہ صرف دو مہینے کے اندر راند ر پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تھا۔ اس کتاب میں قرآن اور احادیث کی روشنی میں

زندگی کے ہر شعبہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مالکین وقت کے فرائض رعایا پر اور رعایا کے فرائض مالکین وقت سے پوری تفصیل سے درج ہیں۔

ہماری داستانیں اردو ادب کی سب سے دلچسپ صنف ہماری قدیم داستانیں ہی ہیں جو ہزاروں صفحوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان داستانوں سے ہر شخص لطف اندوز ہوا ہے۔ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک نے اگر کوئی داستان شروع کر لی ہے تو دن رات لگا کر اسے ختم ہی کیا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی نے اسے بچ میں چھوڑ دیا ہو۔ اتنی دلچسپ صنف ادب کے بارے میں اب تک کوئی کام کی تنقیدی کتاب نہ تھی۔ اس تصنیف سے نہ صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں داستان کا خلاصہ کیا ہے بلکہ یہ بھی کہ اس کا ادب میں کیا مقام ہے اور کیوں۔ تصنیف، سید وقار عظیم

نقوش لطیف مرتبہ احمد ندیم قاسمی۔ یہ کتاب زندہ رہنے والی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں اردو کی تمام نمائندہ افسانہ نگاروں کے منتخب افسانے ہیں۔ ہر قانون افسانہ نگار نے اپنے حالات زندگی بھی لکھے ہیں اور ادب کے بارے میں اپنے نظریات کا اظہار بھی کیا ہے۔ قریباً تمام افسانہ نگار خواتین کے قلم بھی شامل ہیں جس سے اس کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ قیمت چھ روپے

مضامین جمال الدین افغانی جمال الدین افغانی ریاض آباد رہے باک نہ تھا جس سے انگریزوں کی سلطنت کا پٹھی تھی۔ مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے کے لئے انھوں نے عربی میں ایک اخبار "العروۃ الوثقی" کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس میں جتنے مضامین نکلے تھے وہ سب اس کتاب کی زینت ہیں۔ قیمت چار روپے

استقاد سید عابد علی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ عابد صاحب نامور شاعر، بہترین افسانہ پرداز اور بے مثل نقاد ہیں۔ ان کی تنقید میں روایتی نقادوں کی طرح تعالوت اور یاد گوئی نہیں ہوتی۔ یہ جوبات بھی کتنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے مناسب الفاظ ڈھونڈتے ہیں اور سچی بات کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدوں میں شعروں کی سی محاسن اور فیصلوں میں تلوار کی سی کاٹ موجود ہے۔ ان کے نزدیک کسی لفظ کا غلط استعمال گناہ ہے اور یہ بھی گناہ ہے کہ نقاد اپنے ساتھ قادی کو بھی لے جائے۔ قیمت تین روپے

بارِ خاطر شوکت تھانوی کی وہ مکرر آثار تصنیف جس کا عرصے سے انتظار تھا، پھیل گئی۔ خطوط کا یہ مجموعہ ابوالکلام آزاد کے خطوط غبارِ خاطر کی دل نشیں پیروٹی ہے۔ توقع ہے کہ شوکت صاحب کی تصنیف اردو ادب کی زندہ رہنے والی کتابوں میں شمار ہوگی۔ جس میں ادبی، سیاسی، علمی اور دیگر معروف شخصیتوں کے نام خطوط درج ہیں۔ قیمت چار روپے

بے قاعدہ شوکت تھانوی کی یہ نئے انداز کی تصنیف اردو ادب میں بالکل انوکھی چیز ہوگی۔ اس قاعدے سے بچنے والی لطف اندوز ہوں گے اور بڑے ہی، بچے اسے دلچسپ تصنیف سمجھ کر پڑھیں گے اور بڑے اس سے زندگی کا شعور حاصل کریں گے۔ اس قاعدے کے حوت آپ کے تمام پسندیدہ ادیب ہیں۔ مثلاً اس قاعدہ میں آپ کو الف سے آئینہ پڑھایا گیا۔ بلکہ الف سے انتہا زلی تاج پڑھایا گیا ہے۔

مصور۔ قیمت دو روپے

ہماری مقبول عام کتبیں

قصایف شوکت تھانوی

مولانا یہ شوکت تھانوی کا نیا ناول ہے۔ یہ واحد لکھنے والے ہیں۔ جن کے قلم نے کبھی بھی اپنے میسار سے نیچے اُترنا گوارا نہیں کیا۔ یہی ان کی مقبولیت کا راز ہے۔ اس ناول میں شوکت تھانوی نے ہم اور آپ ایسے ایک صاحب کو خواہ مخواہ مولانا بنا کر جو اس کی گت بنوائی ہے وہ خدا کسی کی نہ بنائے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

غزالہ اس ناول میں مزاج تو ہے ہی اس لئے کہ اس کا مصنف شوکت ہے مگر مزاج کے علاوہ اور بھی کچھ ہے، کچھ کشمکش، کچھ جدوجہد، کچھ سراغ رسانی اور کچھ مقامات حیرت و استعجاب، شوکت تھانوی اپنے اس ناول میں کچھ نئے نئے سے کچھ بلے ہوئے سے اور کچھ اپنے محو سے ہٹے ہوئے سے نظر آتے ہیں۔ یہ انوکھا پن ہی اس ناول کی جان ہے قیمت چھ روپے

خدا نخواستہ ذرا فقور تو کیجئے، اگر آپ وہ ہو جائیں جو آپ کی یکم صاحبہ ہیں۔ اور یکم صاحبہ وہ ہو جائیں جو آپ ہی تو کیا ہو؟ اس کا جواب شوکت تھانوی سے سنئے جو انھوں نے اپنے مبسوط ناول 'خدا نخواستہ' میں دیا ہے۔ دنیا ہی اُلٹی نظر آتی ہے۔ قیمت تین روپے

سودیشی ریل شوکت تھانوی نے اپنی تمام مزاحیہ کائنات کا پتھر اس مجموعہ میں یکجا کر دیا ہے، پڑانے مضامین سے اپنے شاہکار خود منتخب کئے ہیں اور نئے مضامین بھی اپنے ہی انتخاب شریک کئے ہیں۔ مصنف کا خود اپنا انتخاب کیا ہو سکتا ہے۔ اس کی آئینہ دار یہ کتاب ہے قیمت تین روپے

کُتیا پالتو ہو یا جنگلی، بھونکتی غزو ہے اور اگر کاٹ لے تو دماغ پر غاص اثر پیدا کرتی ہے۔ اس کتیا نے ہمارے دماغ پر یہ اثر کیا کہ ہم مسلسل نہیں رہے ہیں۔ اس لئے کہ نہ یہ پالتو کتیا ہے نہ جنگلی۔ بلکہ یہ دراصل شوکت تھانوی کے ایک مزاحیہ ناول کا نام ہے جس میں شوکت صاحب کا آٹ اپنی تمام دنیاویوں کے ساتھ پڑھنے والے کے لمحات کو قمعوں سے پُر کر دینے کی قسم کھ کر پیش کیا گیا ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

سارنج کور آج یہ ناول ان مہاجرین پر ہے جو ہندوستان میں روٹی تک کو عاجز تھے اور پاکستان پہنچ کر اپنے آپ کو فواب کہنے لگے اور رکولانے لگے۔ یہ ناول ایسی ہی دو غریب حکایتوں پر اس انداز میں لکھا گیا ہے کہ پڑھ کر مارے نہیں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں قیمت ۲/۸

سُسرال یہ شوکت تھانوی کا نیا ناول ہے۔ اس ناول کا کچھ حصہ اہلنازہ نقوش، لاہور میں چھپ چکا ہے جسے ب نے اتنا پسند کیا تھا کہ ہم اسے جلد سے جلد مغل طرز پر کتابی صورت میں شائع کر دینے پر مجبور ہو گئے۔ یہ ناول اتنا دلچسپ اور لطیف ہے کہ اسے پڑھ کر ذہن مجموعہ اُٹھ جائے اور غماش پیدا ہوتی ہے کہ خدا سب کو ایسی ہی سُسرال بخشے، قیمت دو روپے چار آنے

کارٹون

شوکت قاضی کا ڈونٹس ہیں اس لئے کہ ان کے ایک لاجواب مزاحیہ ناول کا نام کارٹون ہے۔ اس ناول میں شوکت کا مسلم کس بھی اور دکاشکار نہیں سولہ ہے وہی رواں اور سبک آدمی بے ساختہ اور بے تکلف مزاح شروع سے آخر تک تبسم کی موجوں کا جال بچھاتا چلا گیا ہے۔ جو اس منفرد مزاح نگار کا طرہ امتیاز ہے۔

مابدولت شوکت کی دوسری شوکت، شوکت قاضی نے اپنے کو بھی نہیں بخشا، اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اپنا کچھ چھاپا پیش کر دیا ہے مابدولت میں ایک نہایت نازک موقع پر خود اپنے متعلق لکھتے ہیں "اُدھر سے پسندیدہ نظریہ رادھر سے اُن کی پذیرائی آؤ شیدان نے دونوں کو اپنی آنکھوں میں لے کر اس قدر جھینچا کہ ہم دونوں ایک ہو گئے۔"

بستر اوطاف یہ ایرانی حکیم بقراط کا تذکرہ یا سوانح نہیں بلکہ شوکت قاضی نے اپنے اس مزاحیہ ناول میں ایک ایسے کردار کو نمایاں کیا ہے جو ہر فن مولائی حیثیت رکھتا ہے شوکت قاضی کا مزاح اپنے اندر مقبوضوں اور کبھی کبھی مقبوضوں میں کیسے تعبیر کی گئی رکھتا ہے۔ اس کا اندازہ اس ناول کو پڑھ کر ہو سکتا ہے۔

جوڑ توڑ جوڑنا ایک مستقل کام ہے توڑنا ایک دوسرا مستقل کام ہے پھر توڑ کر جوڑنا اور جوڑ کر توڑنا یا بالکل یہ سلسلہ کبھی ختم ہی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے شوکت قاضی کا مزاحیہ ناول 'جوڑ توڑ' ملاحظہ فرمائیے۔ جب تک یہ ناول آپ کے مطالعہ میں رہے گا۔ آپ سوائے اس کے پلاسٹ میں گم رہے اور اس کے تبسموں میں سچکولے کھانے کے اور ہر طرف دنیا اور ہر روز گار سے آزاد رہیں گے۔

مضامین شوکت اگر کوئی شخص صرف شوکت قاضی کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہے تو وہ بلاشبہ اور کچھ بنے یا نہ بنے زبان دان تو بن جائے گا۔ اب کوڑ میں دھلی ہوئی مصفا زبان پلاٹ کی دلاؤ دیزی، شگفتہ و لطیف پہلے بیان — یہ ہیں وہ خصوصیات جو شوکت قاضی کے آرٹ کو زندہ جاوید بنائے ہوئے ہیں۔

قاضی جی (نئی جھٹ) مشہور ادیب تیدا امتیاز علی تاج کی رائے یہ سب کہ قاضی جی پاکستان کا پہلا مزاحیہ کردار ہے جسے شوکت قاضی نے پیش کیا ہے۔ ریڈیو سنسنے والے قاضی جی سے بخوبی واقف ہوں گے۔ ریڈیو پر ہر ہفتے قاضی جی ایک نئے روپ میں ایک نیا مسئلہ لے کر آتے ہیں۔ اور پھر سنسنے والے ان کے فقرے یاد کرتے رہ جاتے ہیں۔

غالب کے ڈرامے آپ حیران ہوں گے کہ غالب کا ڈرامے سے کیا تعلق، غالب کی نظم اور غالب کی نثر کا علم کس کو نہیں مگر شوکت قاضی نے غالب کے ڈرامے بھی پیش کر دیئے۔ شوکت کا خیال ہے کہ غالب کے بے شمار اشعار میں پیشیل موضوع چھپے ہوئے ہیں۔ چنانچہ شوکت نے پیشیل موضوع غالب کے کلام سے پھوڑے ہیں اور دنیا کو حیران کر دیا ہے کہ اس کو مرزا غالب کمال سمجھا جائے یا شوکت قاضی کا قیامت ۷/۸

دیگرہ وغیرہ سویشی ریل کے مصنف شوکت قاضی نے پھر اس مصنف ادب کی طرف توجہ کی ہے۔ جواب سے برسوں پہلے اس کی بے مثال اور خیر فانی شہرت کا سبب بنی، ان مزاح پاروں میں شوکت کا فن نکھلا اور سنوارا ہوا ہے اور انھوں نے جاہلیہ کی اور گرسے شاہ سے کام لے کر مہن کی ایسی چیلوریاں چھوڑی ہیں، اسی سے مقصود کی چیلوریاں رہتی دنیا تک برستی اور انسانی ذہن کو اجاگر رہیں گی۔

قیمت تین روپے

پندرہ اگست رشید اختر ندوی کا مقبول عام ناول۔ ناول اس دور کی تاریخ ہے۔ جب انسان آزادی ایسی نعمت ملے ہی حیوان بن گیا تھا آزادی ملے ہی مسلمانوں پر جو کچھ بیتی یہ ناول اس کی تفسیر ہے۔ جسے چھڑھ کر روکنے لکھڑے ہو جاتے ہیں۔ اتنی زبردست قربانیوں کے بعد مسلمانوں کی آنکھیں آج بھی بند ہیں۔ نہ جانے یہ ان کی کون تباہیوں کا پیش خمیر ہے۔ قیمت تین روپے

پانچ ناولٹ مرتبہ سید وقار علیم۔ اس مجموعہ میں منشو اشوک تھاوی، اشفاق احمد، اسے حمید اور انتصار حسین کے بہترین ناولٹ شامل ہیں۔ یہ مجموعہ بے حد مقبول تھا ہے۔ اس ایک مجموعے میں پانچ بہترین ناولٹوں کے علاوہ تین چار بہترین مقالے اور دو تین بہترین منظوم کہانیاں بھی شامل ہیں۔ قیمت تین روپے

تذکرہ شعرائے متغزلین مرتبہ شیخ محمد اسحاق پانی پتی۔ یہ تذکرہ نقوش کے عزال نمبر کے شعرا کے حالات زندگی اور کلام پر تبصرہ ہے۔ یہ مختصر سا جائزہ پہلے نقوش کے عزال نمبر میں شامل تھا۔ اب اسے الگ صورت میں بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ ۸

نقوش

مکاتیب نمبر	جلد بارہ روپے	کے چند غیر فی نمبر جو کئی کتابوں پر جاری ہیں
افسانہ نمبر	جلد بارہ روپے	شخصیات نمبر ۱
عزل نمبر	جلد ۸/۷ روپے	شخصیات نمبر ۲
		منشو نمبر
		۸/۷ روپے
		دس روپے
		چھ روپے

246311
NDQ 891.43909
W/Ref

یہ کتاب اس تاریخ کو جو سب سے آخر میں
ثبت ہے کتب خانہ سے مستعار لی گئی تھی اگر
اس کتاب کو معیاد مقررہ پر واپس نہیں کیا گیا تو
دو ہفتے روز کے حساب سے ہرجانہ وصول کیا جائیگا۔

1/1 AUG 1974 1 AUG 1974 Verol 23/9/2001		
--	--	--

باری نہ کیا جائیے۔

کتاب خانہ
جامعہ ملیہ اسلامیہ

اساتذہ جامعہ کے نام ایک وقف
بندوبست کتابیں جاری کی جائیں گی جنکو
دو ایک مہینے تک اپنے پاس رکھ سکیں گے۔
طلباء جامعہ کے نام (پرو پیکر) کتابیں
خانہ کے رکن ہوں) وقف میں صرف دو کتابیں
جاری کی جائیں گی جنکو زیادہ سے زیادہ
عام راکین ایک وقف میں صرف دو
کتابیں لے سکیں گے۔ کتابوں کو کچھ نقصان
اندرو اندر واپس کر دینا ضروری ہو جائے۔
اگر راکین سے کتابوں کو کچھ نقصان
پہنچا تو الکی دفعہ داری انہیں پرواپس نہیں کی
اگر کتابیں وقف ہو کر ناب کیلئے درپست
کیں تو مگر کتاب کیلئے درپست
روزانہ مگر جانہ وصول کیا جائیگا۔

1/Ref

3909

۶۹۶